ماہنامہ

کرن

اکتوبر 2017



کرن کا دسترخوان



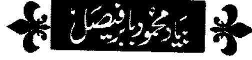
چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

MEMBER
APNS
CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

















زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---------- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 7000 روپے



مستقل سلسلے

اکتوبر 2017
جلد 40 شمارہ 7
قیمت 60 روپے

خط وکتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ



فلسطین سے لے کر افغانستان تک، مسلمان ہاتھیوں کی لڑائی میں گھاس کی طرح کچلے جا رہے ہیں۔ وہ لاشیں بھی اٹھا رہے ہیں، جینے کا حق بھی ان سے چھینا جا رہا ہے اور معتوب اور دہشت گرد بھی وہی ہیں۔

نیا ہجری سال اپنے آغاز ہی میں آزادی و حرمت کے متوالوں اور مظلوموں کو ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا درس دیتا ہے۔ ماہ محرم ہمیں ان شہدا کی یاد دلاتا ہے، جنہوں نے ظلم کے ساتھ زندہ رہنے کے بجائے ظلم کا مقابلہ کر کے مظلوموں کو حوصلہ دیا۔ جنہوں نے حق و صداقت، انصاف اور دین کی سربلندی کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا مگر آمریت کے سامنے سر نہ جھکایا۔ کربلا سر اٹھا کر جینے اور ظالموں سے سر ٹکرانے کا نام ہے۔

نئے ہجری سال کے آغاز پر پروردگار عالم سے دعا ہے کہ وہ دنیا بھر کے مصائب سے نجات عطا فرمائے اور ہم سب پر رحم فرمائے۔ آمین۔

سانحۂ ارتحال،

انشا جی کی اہلیہ محترمہ شکیلہ انشا اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ

انشا جی کی وفات کے بعد وہ خاندان کی بڑی تھیں۔ خاندان میں سب ہی ان کا احترام کرتے تھے اور وہ بھی سب سے انتہائی محبت و شفقت سے پیش آتی تھیں۔ ان کی وفات بہت بڑا نقصان ہے۔ ان کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں۔ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- بیاد محمود بابر فیصل "کچھ لوگ جاگ کر بھی جیا کرتے ہیں" مصباح علی سید،
- فنکارہ "میرا سیٹھی" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- "آواز کی دنیا سے" ارم کاشف کی باتیں،
- اداکارہ عنزلہ عباسی "کہتی ہیں میری بھی سنیے"،
- اس ماہ "ماہا کائنات خان" کے مقابل ہے آئینہ،
- "من مور کھ کی بات نہ مانو" آسیہ مرزا کا سلسلے وار ناول،
- تنزیلہ ریاض کا ناول "رابنزل، انتقام کی طرف"،
- "مہجور نشین" مصباح علی سید کا مکمل ناول،
- مریم جہانگیر کا مکمل ناول "رمز حب"
- "روشن چہرہ" عنبرین ولی کے ناولٹ کا آخری حصہ،
- ملیحہ راشد کا ناولٹ "زندگی کے انوکھے رنگ"
- "شہر درد میں ڈوبی تنہائی" قراۃ العین سکندر کا ناولٹ،
- نازیہ کنول نازی، شبانہ شوکت، ساجدہ حسین اور عمارہ خان کے افسانے اور مستقل سلسلے،

تحفہ،

کرن کتاب "کرن کا دسترخوان" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت حاصل کریں۔



ایک بحرِ بے کنار رواں ہے طواف میں
لگتا ہے جیسے سارا جہاں ہے طواف میں

اک بے خودی کی لہر لے جاتی ہے کہیں
کس کو خبر کہ کون، کہاں ہے طواف میں

ہے درمیان شمع کی صورت خدا کا گھر
پروانہ وار شعلۂ جاں ہے طواف میں

ہر ایک چیز سمٹی اسی کے دائرے میں
جیسے کہ کائنات رواں ہے طواف میں

وہ سب کی عرض سنتا ہے اور جانتا ہے
جس وقت، جو بھی اور جہاں ہے طواف میں

ایسا بھی وقت آتا ہے چلتا نہیں پتا
امجدؔ یقین ہے کہ گماں ہے طواف میں

امجد اسلام امجدؔ



بصد یقین و بصد اعتبار دیدہ وری
ہے تری ذات پہ تکمیل عظمتِ بشری

ترے وجود پہ فہرست انبیاء ہے تمام
تجھی پہ ختم ہے روح الامین کی نامہ بری

ہے ایک تُو ہی تو نیاضِ رحمتِ یزداں
ہے صرف تجھ پہ مدارِ شفاعتِ بشری

مرے کریم! مجھے ہے ترا کرم درکار
مرے مسیح! مجھے ہے تلاش چارہ گری

ترے حضور بصد شرم لے کے آیا ہوں
کچھ آنسوؤں کا تلاطم کچھ آنسوؤں کی تری

بنا لے پھر ہمیں اپنا کہ رحمتِ عالمؐ
دلوں میں بے خبری ہے دُعائیں بے اثری

احسان دانش

کچھ لوگ جا کر بھی جیا کرتے ہیں

مصباح علی سید



ڈوبتی رات کے آخری پہر چلنے والا ایک دھیما جھونکا خواب چہروں پر جو تراوٹ کا احساس بکھیر کر جو روشنی پھیلاتا ہے شاید اترتی شام کی قرمزی کرنیں بھی وہ تاثر پھیلانے میں عاری ہی ہوں۔ اس پل کی لذت وہی جان سکتا ہے، جس نے اس پل کو چرایا ہو، دیکھا ہو، پایا ہو، محسوس کیا ہو، میری بد قسمتی کہیے یا دنیائے ادب میں بہت دیر سے پیدائش' میں شورش دنیا میں اترتے اس ٹھنڈے میٹھے جھونکے جیسے نین بھائی کو نا چرا سکی، نا دیکھ سکی، نا پا سکی ہاں محسوس بہت کیا۔ وہ احساسات یک دم سے ایسے دھڑکے بے ہنگم سی باتیں ہونے لگیں۔

مجھے ریسیو ہونے والی کرن کے آفس سے روبینہ شریف کی کال بہت سی ریسیو ہونے والی کال سے اس قدر مختلف لگی کہ میں اس لمحے کے جذبات اگر لکھنا چاہوں تو شاید نوک قلم کا ایک قطرہ بھی اس کی نمائندگی نا کر پائے جب انہوں نے کہا۔

"محمود بابر فیصل کے بارے میں کچھ لکھنا چاہو گی"؟

ایک اعزاز ٹپکاتی چمک بنا آئینے کے مجھے اپنے چہرے پر بکھرتی محسوس ہوئی۔ محمود بابر فیصل یعنی ذوالقرنین، نین بھیا، نین تارا، نین جی کتنے نام یک دم سے ستاروں میں [illegible] کی طرح جگمگا گئے۔ وہ شخصیت جس [illegible] یادوں میں بے تکے سوال کرتی [illegible] کی حد تک سوال روز بار بار۔ اور وہ [illegible] پائے جاتے۔ جب جب [illegible] مرحوم کے ساتھ پر نگاہ جاتی دل [illegible] الحق "اللہ کچھ عمر اور [illegible] پھنا تھا" آج مجھے [illegible] میں نے سب

سے پہلے اور بھرپور اہتمام سے پڑھا۔ آن واحد میں مجھے اپنا آپ اعزاز کی طرح محسوس ہوا۔ بوکھلاہٹ میں ان کی بات کا جواب بھی نادار ہوا آنکھوں کے آگے چند برس پرانا منظر آکھڑا ہوا جب خالہ اور بہنیں

حفظ تو کیا کھا لینے کی حد تک خواتین، شعاع، کرن چاٹ جاتی تھیں، مجھے صرف دو چیزوں سے غرض رہی ماڈل کا لباس۔۔۔ اور پیارے نین بھائی "نہلے پہ دہلا" ایک ایک سوال پر برجستگی، بے ساختگی کا ایسا جادو چڑھ جاتا، کتنی بار تو میں خود کو نین بھائی تصور کرتی ان کے جواب ایسے رٹی تھی جیسے کورس کی کتاب ہو، اور حقیقت تو یہ ہے موقع کی مناسبت سے پھلجھڑی کی طرح چھوڑ کر دل میں نین بھائی کو داد کی تھپکی دیتی اور ان کی مغفرت کی دعا کرتی۔ کھلا روشن چہرا، باریک کمانیوں کی عینک کے پیچھے سے جھانکتی بے ریا، ذہین آنکھیں اور بھرے ہونٹوں سے خوشبو بکھیرتے شگفتہ جملے

"واہ اس طرح جیا کرے کوئی"

جس طرح چنبیلی کا پھول کھلتے ہی اپنی خوشبو ہواؤں کے سپرد کر دیتا ہے ایسے ہی نین بھائی نے اپنے جملوں کی شگفتگی ہر لکھاری کو امانتاً سونپ دی۔ اگر میرے کسی جملے میں کبھی کوئی بے ساختگی، کوئی برجستگی محسوس ہو تو نین بھائی کا وہ مجھ پر غائبانہ قرض ہے۔

"نین بھائی میں سچ کہہ رہی ہوں، ایمان سے۔۔"

(بھلے میری اپنی اماں میرے ایمان پر بھی ایمان نا لائیں۔۔ مگر آپ اماں تھوڑی ہیں)

اپنے دل کا درد چھپا کر دوسروں کے دلوں میں زعفران کا رنگ و بو بسا جائیں وہ لوگ روز پیدا نہیں ہوتے۔ میں یہ نہیں کہوں گی ان کی یاد میں میری آنکھیں چھم چھم برس رہی ہیں۔ بلکہ یہ کہوں گی آنکھوں میں عقیدت، چہرے پر مودب فخریہ مسکان، اور دل کی تہ سے ان کی مغفرت اور بلند درجات کی بے حد دعا ہے کہ۔

"کچھ لوگ جا کر بھی جیا کرتے ہیں"



میرا سیٹھی سے ملاقات

شاہین رشید



اولاد اللہ تعالیٰ کی ایسی تخلیق ہے جسے اپنے والدین سے بہت کچھ ورثے میں ملتا ہے۔۔۔ عادت و اطوار تو آتی ہی ہیں اگر والدین تخلیق کار ہیں تو بچوں میں بھی اثرات ہوں گے۔ فنکار گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے بھی بڑے ہو کر فنکار بنتے ہیں۔ "میرا سیٹھی" کو ہی لے لیں۔ ان میں اپنی ماں جگنو سیٹھی اور والد نجم سیٹھی کی بہت سی صلاحیتیں منتقل ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "میرا سیٹھی" قلم کار بھی ہے۔ اداکارہ بھی ہے صحافت سے بھی شغف ہے۔

★ "کیا حال ہیں میرا جی؟"

✳ "جی اللہ کا شکر ہے۔"

★ "کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

✳ "بہت اہم کام کر رہی ہوں۔۔۔ آج کل میں قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھ رہی ہوں اور کافی پڑھ چکی ہوں۔۔۔ اور دوسرے یہ کہ میں ایک کتاب لکھ رہی ہوں اور ان شاء اللہ جلدی اس کی اوپننگ بھی کروں گی۔"

★ "گڈ۔۔۔ اس لیے آج کل ٹی وی اسکرین سے دور ہیں؟"

✳ "کچھ یہ وجہ بھی ہے کچھ بہت اچھا میری پسند کا کام بھی نہیں ملا۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ بالکل ہی غائب ہوں۔ کچھ انڈر پروڈکشن ڈرامے ہیں جن پر کام ہو رہا ہے۔"

★ "شوبز میں آمد والدین کی وجہ سے ہوئی؟"

✳ "نہیں۔۔۔ میں خالصتاً" اپنی صلاحیت سے آئی ہوں۔۔۔ میں امریکہ میں ایک اخبار کے لیے کام کرتی تھی۔۔۔ صحافت کا بھی شوق تھا اور اداکاری کا بھی۔۔۔ مگر کبھی موقع نہیں ملا۔۔۔ مگر کہتے ہیں نا کہ موقعہ خود تلاش کرنا پڑتا ہے۔۔۔ اور موقعہ خود ہی تلاش کیا اور اللہ نے محنت کا صلہ دیا مجھے پہلا ڈرامہ ملا جو کہ سیریل تھا اور "مسلوٹیں" اس کا نام تھا اور اے آر وائی سے ٹیلی کاسٹ ہوا تھا۔۔۔ بہت پسند کیا گیا تھا اور اس سیریل نے مجھے شہرت دی اور مزید آفرز آئیں۔"

★ "اس کے بعد جو ڈرامے کیے وہ بھی بہت مقبول ہوئے۔ آپ کو زیادہ کون سا اچھا لگا کردار کے حوالے سے؟"

✳ "سب ہی اچھے تھے، مگر "دل بنجارہ" میں مجھے اپنا کردار بھی پسند آیا اور کہانی بھی۔۔۔ اور یہ ناظرین نے بھی بہت پسند کیا۔"

★ ''اس فیلڈ میں آنے کے بعد کوئی پچھتاوا؟''

✳ ''ہر گز نہیں... مگر یہ ضرور ہے کہ یہ فیلڈ بہت اچھی ہے۔ شہرت کا اور کام کا اپنا ہی مزا ہے... مگر بس پرائیویٹ لائف بہت متاثر ہوتی ہے۔ اور سب کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے کہ لوگ مغرور نہ کہیں یا ناراض نہ ہو جائیں۔''

★ ''شوبز میں شوق کا ہونا تو ضروری ہے... کامیابی کے لیے کیا کرنا ضروری ہے؟''

✳ ''شوق کے ساتھ لگن اور محنت بہت ضروری ہے اور سب سے بڑھ کر آپ کا باصلاحیت ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اگر آپ میں اداکاری کی صلاحیت نہیں ہے تو کسی کی پرچی، کسی کا نام آپ کو آگے بڑھنے کا موقعہ نہیں دے گا۔''

★ ''آپ کا پورا گھرانہ ماشاء اللہ صحافت کی فیلڈ سے وابستہ ہے اداکاری کے علاوہ کیا کیا شوق ہیں آپ کو؟''

✳ ''صحافت کے ہر شعبے میں مجھے لگاؤ ہے۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ امریکہ میں تھی تو اخبار سے وابستہ تھی۔ لکھنے لکھانے کا شوق ہے میری کتاب بھی عنقریب آنے والی ہے۔''

★ ''والدین میں کس کی صلاحیتوں کی معترف ہیں آپ؟''

✳ ''الحمد للہ میرے والدین دونوں ہی بہت باصلاحیت ہیں اور والدین کا رنگ اولاد پہ ضرور آتا ہے... یہی وجہ ہے کہ مجھ پہ دونوں کا رنگ ہے اور میرا بھائی ایک بہترین گلوکار ہے اور اس میں اور بھی بہت سی صلاحیتیں ہیں جنہیں بروئے کار لا کر وہ یقیناً ماں باپ کا سر فخر سے بلند کرے گا۔''

★ ''شوبز میں جگہ بنانے کے لیے کیا لڑکی اور لڑکے دونوں کا حسین ہونا ضروری ہے؟''

✳ ''سب سے پہلے تو باصلاحیت ہونا بہت ضروری ہے۔ حسن تو ایکسٹرا کوالٹی ہے... ہاں خوش شکل ضرور ہوں تاکہ دیکھنے والے کو بھی اچھا لگے اور ضد کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مطلب ڈٹ جائیں اپنے کام پہ۔''



★ ''اور جناب صحافت اور سیاست دونوں سے آپ کے والد کا تعلق ہے... آپ کو سیاست سے لگاؤ ہے؟''

✳ ''نہیں... بالکل بھی سیاست سے لگاؤ نہیں ہے۔ فیوچر کا کچھ کہہ نہیں سکتی۔ مگر فی الحال تو نہیں ہے۔''

★ ''آپ مارننگ پرسن ہیں؟''

✳ ''جب شوٹ پہ جانا ہو تو آٹھ بجے یا اس سے بھی جلدی اٹھ جاتی ہوں۔ ورنہ عموماً 9 بجے تک اٹھ جاتی ہوں... لیکن آپ مارننگ پرسن نہیں کہہ سکتیں جنہیں بہت صبح اٹھنے کی عادت ہوتی ہے۔''

★ ''اپنے ڈراموں میں آپ کا پسندیدہ ڈرامہ ''بنجارہ'' ہے۔ پسندیدہ کردار کون سا ہے؟''

✳ ''میں نے ایک سیریل کیا تھا ''خوشبو کا سفر'' جو کہ ٹی وی ون سے پیش ہوا تھا اس میں میرے کردار کا نام ''ردا'' تھا اور یہ کردار نہ صرف بہت اچھا تھا بلکہ میری زندگی کے بھی بہت قریب تھا۔''

★ ''آپ اس فیلڈ میں آئے تو لوگوں کا کیا ردعمل تھا؟''

✳ ''لوگوں کا ردعمل... بڑا عجیب ردعمل تھا... اکثر لوگوں نے کہا کہ آپ تو بہت بڑی پڑھی لکھی ہے۔



آپ کے والدین بھی ۔۔۔ پڑھے لکھے ہیں ۔۔۔ پھر آپ کیسے اس فیلڈ میں آ گئیں ۔۔۔ لوگوں کا ابھی بھی یہ تصور ہے کہ اس فیلڈ میں پڑھے لکھے لوگ نہیں آتے ' حالانکہ اس فیلڈ میں پڑھے لکھے لوگ آتے ہیں۔ کیونکہ بغیر تعلیم کے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔"

★ "ابھی تک جتنا کام کیا ۔۔۔ کوئی تشنگی ہے۔ آپ کو؟"

☼ "نہیں ۔۔۔ اللہ کا شکر ہے کہ جتنا بھی کام کیا اپنی پسند سے کیا اپنی پسند سے کردار لیا ۔۔۔ اس لیے کوئی تشنگی نہیں ہے۔"

★ "کوئی کردار جو کرنے کی شدت سے خواہش ہے؟"

☼ "میں پنجاب کی ایک "جٹی" کا کردار کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میرا قد کاٹھ ایسا ہے کہ میں یہ کردار با آسانی کر سکتی ہوں۔"

★ "پھر تو پنجابی بھی بولنی پڑے گی؟"

☼ "بالکل بولنی آتی ہے اور یہی تو میں بتانا چاہتی ہوں کہ میں بہت اچھی پنجابی بول سکتی ہوں ۔۔۔ کیونکہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ مجھے پنجابی بولنی نہیں آتی جبکہ ایسا نہیں ہے۔"

★ "زیادہ کام سے غصہ آتا ہے؟ یا یہ بتائیں کہ غصہ کب آتا ہے؟"

☼ "غصہ مجھے زیادہ کام کی وجہ سے نہیں آتا بلکہ تب آتا ہے کہ جب کسی کو کام کہوں اور وہ اسے پورا نہ کرے اور پھر شدید غصہ آتا ہے ۔۔۔ اظہار کے لیے کوئی غلط زبان استعمال نہیں کرتی نہ ہی کوئی توڑ پھوڑ کرتی ہوں۔ بلکہ جس طرح ایک نارمل انسان کو غصہ آتا ہے مجھے بھی آتا ہے ۔۔۔ اور مجھے اپنے ابو کے غصے سے خوف آتا ہے کیونکہ ان کا غصہ کافی تیز ہے۔"

★ "زندگی جدوجہد میں گزری یا سہل؟"

☼ "زندگی بہت جدوجہد میں گزری ۔۔۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت محنت کی۔ بہت جدوجہد کی۔ تب یہ مقام حاصل ہوا ہے اور محنت کے بعد جو مقام

اس ماہ فائزہ بھٹی کو "کچن اور آپ" میں انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ ادارے کی طرف سے فائزہ بھٹی کو تین ماہ کے لیے "ماہنامہ کرن" مفت دیا جا رہا ہے۔



ملتا ہے اسی کا مزا بھی ہوتا ہے۔۔۔ شوبز میں مقام بنانے کے لیے یا کسی بھی فیلڈ میں مقام بنانے کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔"

★ "اپنے کام کے لیے یا ویسے ہی تعریف پسند ہے یا تنقید پسند ہے؟"

✳ "اگر کوئی ہماری عدم موجودگی میں ہماری تعریف کرے تو وہ سچی تعریف ہوگی۔ اور اگر کوئی ہمارے منہ پر ہماری تعریف کرے تو وہ جھوٹ ہوگا یا بٹرنگ ہوگی۔۔۔ اس طرح کوئی آپ کے منہ پر تنقید کر رہا ہے تو وہ سچی ہو گی۔ مگر تنقید، کام پر ہونی چاہیے۔۔۔ ذات پر نہیں۔"

★ "سچی محبت کی آزمائش کیا ہے؟"

✳ "اپنے برے وقت میں ان کو آزما کر دیکھیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی واضح ہو جائے گا۔"

★ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

✳ "جی، جناب میرا نام "میرا سیٹھی" ہے اور مجھے پیار سے "میرو" بلاتے ہیں۔ 12 جنوری 1986ء میں، میں نے لاہور میں جنم لیا۔ میرا ایک ہی بھائی ہے جو کہ مجھ سے بڑا ہے اور ماشاء اللہ سے بہت باصلاحیت

ہے۔ بنیادی طور پر وہ گلوکار ہے اور انگریزی، اردو میں گاتے ہیں اور ان کو چاہنے والے ان کے گائیکی کو بہت پسند کرتے ہیں۔"

★ "آپ کی جو کتاب عنقریب ریلیز ہونے والی ہے۔ وہ اصل میں ہے کیا۔۔۔ اور اس کا نام کیا ہوگا؟"

✳ "نام تو ابھی نہیں بتا سکتی، کیونکہ ابھی فائنل نہیں ہوا، البتہ کتاب شارٹ اسٹوری پہ مبنی ہے اور اسے امریکہ اور برطانیہ سے ایک ساتھ ریلیز کیا جائے گا۔"

★ "میرا کافی لوگوں کے ساتھ کام کر چکی ہیں پھر بھی کوئی خواہش ہے آپ کی؟"

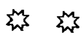
✳ "ہاں۔۔۔ بالکل خواہش ہے کہ میں نعمان اعجاز کے ساتھ کام کروں۔۔۔ دیکھیں کہ یہ خواہش کب پوری ہوتی ہے۔"

★ "سیاست سے تو آپ کو لگاؤ نہیں ہے۔۔۔ مگر پھر بھی اگر سیاسی پاور مل جائے تو کیا کریں گی؟"

✳ "میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ میں خواتین کے حقوق کے لیے قانون بناؤں گی۔۔۔ نہ صرف بناؤں گی بلکہ اس پہ عمل درآمد بھی کرواؤں گی۔"

★ ”نصیحت بری لگتی ہے یا اچھی؟“
✳ ”نصیحت بری نہیں لگتی۔۔۔ ہمارے فائدے کے لیے ہوتی ہے۔ مگر اگر کوئی کہے کہ ”صبر کرو“ تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔“
★ ”ملک سے باہر آتی جاتی ہیں۔ کون سی بات اپنے اوپر بھی اپلائی کی؟“
✳ ”میں نے باہر جا کر بہت کچھ سیکھا ہے۔۔۔ مگر وقت کی پابندی کو اپنے اوپر بھی اپلائی کیا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اگر آپ وقت کی پابندی کریں تو آپ کے بہت سے مسائل آسانی سے حل ہو جائیں۔“
★ ”فضول خرچ ہیں؟“
✳ ”اس لحاظ سے کہ اپنی فیملی پہ اور اپنے دوستوں پہ دل کھول کر خرچ کرتی ہوں۔۔۔ اپنے لیے تو میں نے صرف ”ونٹر جیکٹ“ ہی خریدی ہے۔ اپنے سے زیادہ دوسروں پہ خرچ کرنا اچھا لگتا ہے۔“
★ ”کھانا پکانے سے دلچسپی ہے؟ اور کھانے سے؟“
✳ ”پکانے سے دلچسپی ہے۔۔۔ مگر بہت زیادہ نہیں مگر پھر بھی میں ”چکن کڑاہی“ بہت اچھی پکا لیتی ہوں اور کھانے سے بھی بہت لگاؤ ہے۔۔۔ اور میرا دل چاہتا ہے کہ ڈائننگ ٹیبل پہ سلیقے سے کھانا لگا ہوا ہو اور پھر میں کھاؤں۔“
★ ”شہرت پانے کے بعد یا مصروفیات بڑھ جانے کے باعث آپ کے کن کاموں پر فرق آیا؟“
✳ ”کوئی خاص نہیں سوائے اس کے پہلے میں کپڑے خریدتی تھی پھر درزی کو دیتی تھی۔۔۔ اسے ڈیزائن سمجھاتی تھی۔۔۔ مگر اب کسی بھی اچھے سے بوتیک جا کر اپنی پسند سے کپڑے خرید لیتی ہوں۔“
★ ”شادیوں میں انجوائے کرتی ہیں یا بور ہو جاتی ہیں؟“
✳ ”میں انجوائے کرتی ہوں۔ رسموں میں شریک ہونا مجھے اچھا لگتا ہے اور جوتا چھپائی کی رسم مجھے بہت پسند ہے اور شادی میں تحفہ دینا بھی اچھا لگتا ہے۔“

★ ”فلم میں کام کرنے کی خواہش ہے یا فلم بنانے کی خواہش ہے؟“
✳ ”کام کرنے کی بھی خواہش ہے اور فلم بنانے کی بھی۔۔۔ میری خواہش ہے کہ ایک فلم بناؤں جس کو لکھوں بھی میں۔ جس میں پرفارم بھی کروں اور ڈائریکٹ اور پروڈیوس بھی میں ہی کروں۔۔۔ دیکھیں کہ میں ایسا کر سکتی ہوں یا نہیں۔“
★ ”اور زندگی میں کیا کام ایسا کرنا چاہتی ہیں کہ دنیا یاد رکھے؟“
✳ ”نہیں دنیا کے لیے تو نہیں البتہ اپنے پاکستان کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ جیسا کہ بتایا کہ عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرنا چاہتی ہوں‘ میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ پاکستان میں امن قائم ہو جائے۔ دہشت گردی ختم ہو جائے۔ کرپشن ختم ہو جائے اور ہم جمہوری راستوں پہ چلیں تاکہ دنیا میں ہمارا نام ہو۔“
★ ”میرا آپ لمبی بھی ہیں اور اسمارٹ بھی۔۔۔ قد تو قدرتی ہو گا۔۔۔ اور اسمارٹنس؟“
✳ ”اس کے لیے میں ایکسر سائز بہت کرتی ہوں اور میٹھے سے بھی پرہیز کرتی ہوں۔ مگر کھانا کھانے کی بہت شوقین ہوں۔ وہ میں باقاعدگی سے کھاتی ہوں اور کھانے میں گاجر‘ سلاد اور کھیرے کا استعمال ضرور کرتی ہوں کیونکہ یہ چیزیں بھی ہمارے جسم کو نارمل رکھتی ہیں اور موٹاپے سے روکتی ہیں۔“
اور اس کے ساتھ ہی ہم نے میرا سے اجازت چاہی۔



میری بھی سنئے

عنزلہ عباسی

شاہین رشید



1 "اصلی نام؟"

"عنزلہ عباسی-Anzila-"

2 "پیار کا نام؟"

"Anjoo...انجو-"

3 "تاریخ پیدائش؟"

"26جنوری 1998ء-"

4 "ستارہ؟"

"Aquarius'برج قوس-"

5 "مادری زبان؟"

"اردو-"

6 "آپ کی پسندیدہ زبان؟"

"میری پسندیدہ زبان انگریزی ہے- اس لیے کہ اس زبان میں میں بہت آسانی کے ساتھ اپنے خیالات کو ایکسپریس کر سکتی ہوں اور مجھے مزا آتا ہے انگریزی زبان بول کے-"

7 "بہن بھائی' آپ کا نمبر؟"

"میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں اور اکلوتی ہونے کی وجہ سے بہت انجوائے کرتی ہوں-"

8 "فیملی ممبرز؟"

"بہت چھوٹی فیملی ہے میرے والدین کے علاوہ ایک بہت پیاری اور محبت کرنے والی دادی ہیں- دو آنٹیاں (شاید دو پھوپھیاں) اور انکل ہیں-"

9 "تعلیم؟"

"ابھی میری پڑھائی جاری ہے اور نفسیات میرا



بنیادی مضمون ہے۔ ماہر نفسیات بننا چاہتی ہوں۔"

10 "شادی؟"

"اتنی جلدی اور اتنی کم عمری میں شادی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی 'ابھی میں اپنے کریئر پر فوکس کیے ہوئے ہوں اور بہت محنت کرنا چاہتی ہوں۔"

11 "شوبز میں آمد؟"

"میری پوری فیملی شوبز سے وابستہ ہے۔ اس لیے مجھے اس فیلڈ میں آنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ مجھے بہت کم عمری سے ہی آفرز تھیں مگر میں اپنی تعلیم میں بہت مصروف تھی اور ابھی بھی ہوں۔ مگر میں اب مینیج کرلوں گی اور ٹائم نکال لوں گی۔"

12 "آپ کے علاوہ کون ہے اس فیلڈ میں؟"

"میں نے جیسا کہ آپ کو بتایا کہ ہماری پوری فیملی کا تعلق اس فیلڈ سے ہے۔ میری دادی تو نہ صرف ڈاکٹر ہیں (ہومیوپیتھک) بلکہ بہت اچھی ہوسٹ بھی رہ چکی ہیں۔۔۔ میرے دادا زبیر عباسی بہت اچھے رائٹر تھے۔ میرے والدین اداکار ہیں اور میری پھوپھی اداکارہ ہیں اور میں تو ہوں ہی۔۔۔"

13 "گھر میں کسی نے رکاوٹ ڈالی؟"

"نہیں کسی نے نہیں سب لوگ بہت سپورٹیو ہیں۔"

14 "پہلا پروگرام یا ڈرامہ؟"

"گلہ' میرا پہلا سوپ تھا جس میں میرا لیڈنگ رول تھا۔"

15 "وجہ شہرت؟"

"یہی سوپ نے جس نے مجھے پوری دنیا میں متعارف کرایا۔"

16 "پہلی جاب؟"

"ورلڈ وائڈ فیڈریشن میں میں نے پہلی جاب کی اور یہی میری پہلی آفیشل جاب تھی۔"

17 "بچپن میں کیا سوچا تھا کہ بڑے ہو کر کیا بننا ہے؟"

"فزیالوجسٹ یا تھراپسٹ۔"

18 "آپ صبح جلدی اٹھ جاتی ہیں؟"

"اگر صبح کوئی کام ہو 'کوئی شوٹ ہو۔ تب ورنہ میں مارننگ پرسن نہیں ہوں۔"

19 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"

"میری پسند کا ناشتا ہو اور ہیوی ناشتا ہو مگر اٹھتے ہی کھانے کو دل نہیں چاہتا۔"

20 "آپ کے آن ایئر ڈرامے؟"

"فی الحال ایک ہی آن ایئر ہے "بے بی" کے نام سے اے پلس سے۔"

21 "کیا اچھا پکا لیتی ہیں؟"

"دال 'پاستا اور کڑاہی۔"

22 "پسندیدہ تہوار؟"

"میٹھی عید۔ (عید الفطر)۔"

23 "بھوک کو کم کرنے کے لیے کیا کھاتی ہیں؟"

"نوڈلز۔"

24 "تھکن میں کہاں جانے کو دل چاہتا ہے؟"

"شاور لے کر اپنے بستر پہ جانے کو دل چاہتا ہے اور سو نے لوں۔"

25 "آپ کو رونا آتا ہے؟"
"بہت آسانی سے۔"

26 "آپ اداس ہو جاتی ہیں؟"
"اکثر اداس ہو جاتی ہوں۔"

27 "غصے میں کیا کرنے کو دل چاہتا ہے؟"
"میں بہت چیختی ہوں جب میں غصے میں ہوتی ہوں۔"

28 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
"مما کے غصے سے۔"

29 "فضول خرچ ہیں؟"
"جی.... بہت فضول خرچ ہوں۔"

30 "کس پہ خرچ کرتی ہیں؟"
"اپنے ہی اوپر خرچ کرتی ہوں۔"

31 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"
"میں کوشش کرتی ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں۔ کیونکہ پھر جھوٹ بولنے کے بعد بہت گلٹی فیل کرتی ہوں۔"

32 "ایک وہم جو پریشان کرتا ہے؟"
"جب میں یہ سوچتی ہوں کہ میں اپنی ماں کے بغیر کیا کروں گی۔"

33 "آپ کی ایکسٹرا خوبی؟"
"گاتی بھی ہوں اور لکھاری بھی ہوں۔"

34 "ایک خواب جو بار بار دیکھتی ہیں؟"
"ڈرائیونگ میرا خواب ہے۔"

35 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"
"جی محبت اندھی ہوتی ہے۔"

36 "آپ کے بیگ کی تلاشی لیں تو کیا کیا نکلے گا؟"
"پانی کی بوتل کم سے کم دو کتابیں ہیڈ فون لمبی تار والا۔ چارجر Patches میرے پسندیدہ بینڈز والٹ بس یہی کچھ۔"

37 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"



"کھانا.... میری پسندیدہ رسم ہے شادی میں۔"

38 "بدلہ لیتی ہیں؟"
"نہیں.... معاف کر دینا اور بھول جانا چاہیے۔ درگزر کر دیتی ہوں۔"

39 "گھر آکر پہلی خواہش؟"
"اپنے بستر پہ جاؤں اور تھوڑی نیند لے لوں۔"

40 "اپنے ڈرامے دیکھتی ہیں؟"
"سچ میں میں ڈرامے نہیں دیکھتی۔"

41 "تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"
"گفٹ دینا چاہیے۔ کیونکہ گفٹ یاد رہتا ہے۔"

42 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا ہونا ضروری ہے؟"
"سرونگ اچھی ہونی چاہیے۔"

43 "پسندیدہ کھانا؟"
"چائنیز کھانا ہو اور ساتھ میں ایک مزے دار اچھی سی مووی ہونی چاہیے۔"

44 "لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟"
"پلیز ہمیں گانا سنا دیں۔"

45 "گھر کے کاموں سے دلچسپی؟"
"میں لڑکوں کی طرح ساری ذمہ داریاں نبھاتی ہوں۔ بینک جاتی ہوں گھر کا سودا سلف لاتی ہوں اور دیگر سارے کام کرتی ہوں۔ یوں سمجھئے کہ "میں گھر کا چھوٹو" ہوں۔"



46 ”آپ ضدی ہیں؟“
”بہت زیادہ۔“
47 ”بچپن کی ایک بری عادت جو ابھی تک موجود ہے؟“
”اپنے بالوں سے کھیلنا۔“
48 ”غصہ کب آتا ہے؟“
”جب وقت پر کھانا نہ ملے۔“

49 ”رول جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟“
”میں ہر طرح کے رول کرنا چاہتی ہوں، مگر رول ایسے ہوں جو کریٹیو ہوں، مختلف ہوں، اچھوتے ہوں، مجھے نگیٹیو رول بھی پسند ہیں وہ بھی کرنا چاہوں گی۔“
50 ”آپ کی شکل ملتی ہے؟“
”میری امی سے میں یہ نہیں کہوں گی کہ فلاں انڈین فنکار سے ملتی ہے۔ بلکہ مجھے فخر ہے کہ میری شکل میری امی سے ملتی ہے۔“
51 ”میری پہچان؟“
”میری امی ۔۔۔ جویریا عباسی ۔۔۔ اور میرے والد شمعون عباسی۔“
52 ”مجھے اچھا لگتا ہے؟“
”جب لوگ مجھے ان دونوں کے حوالے سے جانتے ہیں۔“
53 ”میں چاہتی ہوں کہ؟“
”اتنا اچھا کام کروں کہ میری اپنی ایک پہچان بن جائے۔“

☆ ☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... شیزا خان
میک اپ .... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی .... موسیٰ رضا

آواز کی دنیا سے

ارم کاشف

شاہین رشید

بقرہ عید کے دنوں میں کسی نے فیس بک پہ پوسٹ ڈالی کہ ''مردوں کا مقابلہ کرنے والی خواتین ذرا آگے آئیں اور ایک بیل گرا کر دکھائیں'' تو میں نے جواب دیا کہ اگر عورت جہاز اڑا سکتی ہے فوج میں جا سکتی ہے تو بیل بھی گرا سکتی ہے اسے چیلنج نہ دیں اور سچ تو یہی ہے کہ آج کی عورت بہت بہادر ہے ہر کام کر سکتی ہے ـــ اور کر رہی ہے۔

اس بار ''آواز کی دنیا سے'' آپ کی ملاقات ''ارم کاشف'' سے کروا رہے ہیں ـــ جو ایف ایم 101 سے اپنی آواز کا جادو جگا رہی ہیں۔

★ ''کیا حال ہیں ارم کاشف صاحبہ؟''

✳ ''جی الحمدللہ۔''

★ ''آپ کی ریڈیو سے وابستگی خاصی پرانی ہے اس پر بات کرنے سے پہلے آپ اپنی فیملی اور اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟''

✳ ''میرے آباؤ اجداد کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے اور اس لحاظ سے پکی حیدر آبادی ہوں۔ ''سنی اردو





اسپیکنگ" سید فیملی سے تعلق ہے۔ میرے والد "میر سردار علی" میکنیکل انجینئر ہیں اور انہوں نے مڈل ایسٹ اور سعودی عرب میں اپنے فرائض انجام دیے۔ میری والدہ کا نام "محمودہ بی" ہے اور وہ تدریس کے شعبے سے وابستہ رہی ہیں اور اب ماشاء اللہ دونوں ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں اور اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے ساتھ لائف انجوائے کر رہے ہیں۔ ہم تین بہن بھائی ہیں' مجھ سے بڑی ایک بہن ہیں اور افشاں جبیں ان کا نام ہے۔ اکنامکس میں انہوں نے ماسٹرز کیا' شادی شدہ ہیں اور کینیڈا میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ مقیم ہیں مجھ سے چھوٹا بھائی ہے اور وہ سافٹ ویر انجینئر ہے اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی اسسٹنٹ منیجر کی پوسٹ پہ کام کر رہا ہے اور وہ بھی شادی شدہ ہے۔ میں نے ماسٹرز کیا "آئی آر" میں۔ میری شادی الحمدللہ ہو چکی ہے اور شوہر سینئر نیوز پروڈیوسر ہیں ایک نجی چینل میں اور ان کا نام "کاشف بقائی" ہے میرا ایک بیٹا ہے محمد احمد بقائی اس کا نام ہے۔ اور ہاں میری تاریخ پیدائش 30 جون ہے۔"

★ "ریڈیو پہ آمد کیسے ہوئی؟"

☼ "ریڈیو پہ کسی کے توسط سے نہیں آئی۔ شوق بہت تھا اور جب ہم اسکول کے طالب علم تھے تو ایف ایم 100 کا اجراء ہوا تھا اور میں بہت شوق سے سنتی تھی۔ اور میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میں ریڈیو کی آواز بنوں ... اور جب میں کبھی گھر میں اکیلی ہوتی تھی تو خود سے باتیں کرتی تھیں بالکل اسی انداز میں جس طرح ریڈیو کے پریزنٹر کرتے تھے ... اب سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے کہ کس طرح میں خود سے باتیں کرتی تھی ... اپنے شوق کا اظہار اپنے گھر والوں سے کیا تو کہا گیا کہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو ... پھر جو دل چاہے آپ کریں ... اور جب میرا ماسٹرز مکمل ہو گیا تو میں دو تین ایف ایم چینلز پہ اپلائی کیا ... تو میری تعلیم کو دیکھتے ہوئے ایف ایم 103 جس کا نیوز ڈیپارٹمنٹ شروع ہونا تھا وہاں سے مجھے "انٹرن شپ" کی آفر ہوئی' انہوں نے مجھے کاپی رائٹر اور نیوز اینکر میں انٹرن شپ کی آفر کی جو کہ میں نے قبول کر لی۔ اس طرح ریڈیو سے وابستگی 2005ء میں ہو گئی۔ میں اپنے شوق کو اپنا پروفیشن بنانا چاہتی

تھی اور اللہ نے میرا ساتھ دیا اور مجھے کامیابی ہوئی۔۔۔ کافی محنت کی میں نے اور بہت کچھ سیکھا بھی میں نے اور بہت اچھے لوگ مجھے ملے۔۔۔ اور تقریباً ایک ماہ کے بعد اس چینل پہ مجھے جاب کی آفر ہو گئی اور یوں میری جاب بھی شروع ہو گئی۔"

★ "کیا پروگرام کرتی تھیں آپ؟"

✳ "ہم مختلف تہواروں کے موقع پر پروگرام کرتے تھے۔۔۔ کاپی رائٹنگ کرتی تھی۔۔۔ ہر گھنٹے کے بعد نیوز ہوتی تھیں تو نیوز کے لیے کام کرتے تھے۔۔۔ یعنی ہر شعبے میں کام کرنا ریڈیو سے ہی سیکھا۔۔۔ اور یہی شوق مجھے ٹی وی تک لے کر گیا۔۔۔ اور "سن" ٹی وی سے میں نے اپنا سفر شروع کیا۔۔۔ چونکہ بزنس چینل تھا تو نیوز اینکری بھی کی اور پروڈکشن بھی کی۔ اور ہر شعبے میں کام کیا۔۔۔ مگر ریڈیو کا ساتھ نہیں چھوڑا اور جب ریڈیو پہ اچھا خاصا ٹائم ہو گیا تو کچھ لوگ میرے انڈر آ گئے' جن کی میں نے ٹریننگ کی۔۔۔ اور آج الحمدللہ مجھے بڑا فخر ہے اس بات پہ کہ میرے تربیت یافتہ جو لوگ ہیں وہ بی بی سی سمیت مختلف نیوز چینل جو ریڈیو کے ہیں اپنی کارکردگی دکھا رہے ہیں اور کچھ ٹی وی کے نیوز چینلز پہ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔۔۔ سن ٹی وی پہ کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد میں نے "ٹی وی ون نیوز" جوائن کر لیا۔۔۔ وہاں بھی میں نے نیوز اینکری کی۔۔۔ 2010ء تک یہ دونوں سلسلے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔۔۔ اور میں نے اینکری بھی کی' کاپی رائٹنگ اور پروڈکشن بھی کی اور مختلف تہواروں پہ شوز کیے۔ میں نے اپنی لائف کا سب سے پہلا انٹرویو عبدالستار ایدھی صاحب کا کیا تھا اور ان سے مل کر مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ 2010ء میں میری شادی ہو گئی ک بقائی صاحب کے ساتھ۔۔۔ وہ بھی میرے ساتھ نیوز پروڈیوسر تھے۔ شادی کے بعد ٹی وی کو تو جاری نہ رکھ سکی البتہ ریڈیو سفر جاری رہا۔ مگر پھر جب میرے بیٹے کی پیدائش ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ میرے بیٹے کو میری زیادہ



ضرورت ہے۔ لہٰذا ریڈیو کو بھی خیرباد کہہ دیا پھر 2014ء میں اپنے میاں صاحب کے کہنے پر میں نے ایف ایم 101 جوائن کیا' کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یوں گھر بیٹھ کر مجھے اپنی صلاحیتیں ضائع نہیں کرنی چاہئیں۔"

★ "اس فیلڈ میں اپنے شوق سے آئیں آپ۔۔۔ گھر والے خوش ہوئے۔۔۔ کسی نے رکاوٹ تو نہیں ڈالی؟"

✳ "اس فیلڈ میں آنے والی میں اپنے خاندان کی پہلی لڑکی ہوں اور اپنے شوق سے آئی ہوں۔ کسی نے میری راہ میں روڑے نہیں اٹکائے اپنی محنت سے اور اپنے والدین کی رضامندی سے آئی ہوں۔ کچھ لوگ ایسے ضرور ملے جنہوں نے کہا کہ آپ یہ کیا کر رہی ہیں اور آپ نہیں کر سکتیں تو جب کوئی میری حوصلہ شکنی کرتا ہے تو مجھے مزید طاقت مل جاتی ہے کام کرنے کی اور میں زیادہ بہتر طریقے سے کام کرتی ہوں۔ اس لیے تنقید کو بھی ہمیشہ پوزیٹو وے میں لینا چاہیے۔۔۔ جب ایف ایم 101 جوائن کیا تو شوہر کا بھروسا' اعتماد اور حوصلہ افزائی ملی تو اور بھی زیادہ اچھا کام کرنے کو دل چاہا۔۔۔ اور پھر 101 کا ماحول بہت اچھا تھا۔۔۔ یہاں سے مجھے مزید سیکھنے کا موقعہ ملا۔"

★ "ایف ایم 101 سے آج کل کون سے شوز کر

رہی ہیں آپ؟"

* "آج کل میں تین شوز کر رہی ہوں۔ پروگرام "یادوں کے جھونکے" میری پہچان ہے یہ "ٹریبیوٹ شو" ہوتا ہے جس میں میں مختلف شخصیات کو ٹریبیوٹ پیش کرتی ہوں اور تقریباً" دو سال سے یہ پروگرام کر رہی ہوں.... اس کے علاوہ ایک پروگرام "میل بکس" ہے جس میں ہماری میڈم ربیعہ اکرم ہمارے ساتھ ہوتی ہیں۔ ایک شو کا نام "سوئیٹ ہوم ہے" اور اس کے تو نام سے ہی آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ کیسا ہو گا۔ اس کے علاوہ کچھ کمرشلز کرتی ہوں۔ "یو ایس ایڈ" پر ایک پروگرام ہوتا ہے اور یہ اپنے سینئر عدنان علی سید کے ساتھ کرتی ہوں اور ان سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقعہ بھی ملتا ہے۔"

★ "پروگرام کے لیے آپ کو فری ہینڈ دیا گیا ہے؟"

* "جی.... بالکل فری ہینڈ دیا گیا ہے 'ہماری جو پروگرام منیجر ہیں "میڈم ربیعہ اکرم" ان کی رہنمائی ضرور شامل ہوتی ہے۔ ان کی گائیڈ لائن ہوتی ہے باقی اسکرپٹ لکھنا وغیرہ میری ذمہ داری ہوتی ہے۔"

★ "کس کے ساتھ آپ کی کیمسٹری اچھی ہے؟ کمبائن شوز کیسے؟"

* "الحمدللہ میری سب کے ساتھ بہت اچھی دوستی ہے 'کمبائن شوز کرنے کا اتفاق بہت کم ہوا ہے اور اگر کمبائن شوز کرتے بھی ہیں تو پہلے سے کافی ساری باتیں ڈیسائیڈ کر لیتے ہیں اور کمبائن شو تو جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ کمرشل شو ہوتا ہے تو وہ میں عدنان علی سید کے ساتھ ہی کرتی ہوں۔"

★ "کبھی ٹریفک میں پھنس کر دیر سے پہنچی؟ پھر کیا ہوتا ہے؟"

* "ٹریفک میں پھنستی ہوں تو فوراً" میم ربیعہ کو کال یا ایس ایم ایس کر دیتی ہوں۔ کوئی بہانہ بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنے گھر میں شروع سے ہی نظم و ضبط اور وقت کی قدر کرنا سکھایا گیا تھا اور پھر جو میری فیلڈ رہی ہے (نیوز چینل) اس میں تو وقت کی پابندی نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

★ "موڈ خراب ہو۔ تو شو پہ اثر پڑتا ہے؟"

* "جب ہم اسٹوڈیو آ کے مائیک کے سامنے آتے ہیں تو ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا تھا۔ مائیک پہ ہم "ارم کاشف" یا آر جے پریزینٹر ہوتے ہیں.... اور پھر میوزک تو روح کی غذا ہے میوزک پلے کر کے تو ویسے ہی موڈ اچھا ہو جاتا ہے.... اور ریڈیو تو میرا جنون ہے اور یہ میری نس نس میں بسا ہوا ہے.... تو موڈ خراب کا پروگرام پر کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ مائیک کے آگے ہم اپنی ذات کو بھول جاتے ہیں۔"

★ "ریڈیو میں کیا کشش ہے اور کیا کیا کر چکی ہیں؟"

* "ریڈیو ایسا میڈیم ہے جو وہاں تک پہنچ جاتا ہے جہاں تک کوئی اور میڈیم نہیں پہنچ پاتا.... ریڈیو انٹرٹینمنٹ کا بہترین ذریعہ ہے.... جہاں سے ہم اپنی ہر بات سامعین تک پہنچا سکتے ہیں.... ریڈیو ایک اسٹرونگ میڈیا ہے اس لیے ریڈیو پسند بھی ہے اور اس لیے ریڈیو کا انتخاب بھی کیا۔ وائس اوور بھی میں نے کیا ہے کچھ پیکجز وغیرہ ہوتے ہیں ان کی وائس اور کی ہے۔ البتہ ٹی وی کمرشل کی وائس اوور نہیں کی.... اور اب بہت کچھ اس فیلڈ میں کرنا چاہتی ہوں۔"

★ "ریڈیو کے علاوہ کیا مصروفیات ہیں؟"

* "ریڈیو کے علاوہ گھر کی مصروفیات ہیں 'جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ماشاءاللہ سے ایک صاحبزادے ہیں میرے اور گھر کی پوری ذمہ داری مجھ پر ہے 'اس لیے ریڈیو کے علاوہ اور کچھ نہیں کر پا رہی۔ کیونکہ بیٹے 'گھر اور شوہر کو میری زیادہ ضرورت ہے.... حالانکہ گزشتہ دنوں مجھے اداکاری کی آفر بھی ہوئی ہے۔ اور اس آفر کو اس لیے بھی قبول نہیں کیا کہ اداکاری کی فیلڈ کے کچھ تقاضے ہیں جو میں پورے نہیں کر پاؤں گی اور سچ پوچھیں تو وقت بھی نہیں ہے۔"

★ "شاپنگ کرنا پسند ہے؟ بارگیننگ کرتی ہیں؟ لوگ آواز سے پہچان لیتے ہیں؟"

* "شاپنگ کرنا پسند ہے.... مگر بارگیننگ کرنا پسند



ں ہے۔ جہاں فکس پرائز ہوتے ہیں میں وہیں ہالی ہوں۔ اس لیے ریڈیو کا حوالہ دینے کی بھی ورت پیش نہیں آئی۔۔۔ لوگ پہچانتے ضرور ہیں ں مل کر بھی کسی نے اظہار نہیں کیا۔"

▲ "ہو تم میں کبھی ٹی وی جوائن کرنے کا ارادہ ہے؟"

● "ہو سکتا ہے کہ ٹی وی جوائن کرلوں اور یہ وقت ت جلدی بھی آسکتا ہے، لیکن اداکاری نہیں بلکہ را شعبہ ہوگا اینکری ہوگی۔ پروڈکشن ہوگی۔"

▲ "2005ء سے ریڈیو سے منسلک ہیں۔۔۔ کچھ یپ کے بعد 2014ء میں پھر ریڈیو جوائن کیا۔۔۔ تو پ کے اور پہلے کے ایف ایم میں کیا فرق پایا؟"

● "فرق تو ہے۔۔۔ 2005ء میں جب ریڈیو جوائن یا تھا تو اس وقت سب اپنے کام سے مخلص تھے ونڈ تھے۔۔۔ اور میں 101 کی بات نہیں کر رہی یونکہ یہاں تو پھر بھی پروگرامنگ پہ زور دیا جاتا ہے ر فیملی انٹرٹینمنٹ ہے اور فیملی کے تمام تقاضوں کا یال رکھا جاتا ہے کہ آپ کے چینل کو آپ کے گھر لے بھی سن رہے ہوں گے۔ اگر ہم کہتے ہیں کہ ف ایم 101 ایک فیملی چینل ہے تو ہم اس کو ثابت ی کرتے ہیں۔ لیکن دیگر ایف ایم کو آپ سنیں تو پ خود فرق محسوس کریں گی۔ دیگر چینلز میں بہت لی گفتگو کی جاتی ہے۔۔۔ اور اس طرح کے ضوعات پہ گفتگو ہوتی ہے کہ فیملی کے لوگ ایک تھ بیٹھ کر سن بھی نہیں سکتے ایک دوسرے سے ریں نہیں ملا سکتے۔۔۔ جب ہم نے ریڈیو اسٹارٹ کیا تو ریڈیو ایسا نہیں تھا۔۔۔ اب تو زبان وبیان کا خیال ں کیا جاتا۔۔۔ گفتگو نہیں اچھی ہوتی۔۔۔ اور یہ بڑا یہ ہے اور دیگر چینلز کا تو ماحول بھی اچھا نہیں رہا۔"

"مزید کیا مشاغل ہیں؟"

"کتابیں پڑھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔۔۔ اچھا میوزک نا مجھے اچھا لگتا ہے اور ڈائری لکھنا بہت اچھا لگتا ہے کچھ لکھنے کا بھی شوق ہے تو ٹائم مل جائے تو کچھ لکھ لیتی ہوں۔۔۔ اور دلچسپ بات بتاؤں کہ اپنی پرانی چیزوں کو نکال کر دیکھنا اور یادوں کو تازہ کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔۔۔ کیونکہ یادیں انسان کا سرمایہ ہوتی ہیں۔"

★ "پرانی یادوں کی بات کر رہی ہیں تو ٹی وی کے پروگراموں سے بھی کچھ یادیں تازہ کرتی ہیں؟"

✳ "بالکل جی۔۔۔ صرف اپنی زندگی کی یادوں کو تازہ نہیں کرتی، بلکہ مجھے معین اختر (اللہ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام دے) کی میزبانی بہت پسند تھی اور انور مقصود صاحب کے ساتھ کیے گئے پروگرام مجھے بہت پسند ہیں تو وہ ریکارڈنگ بھی دیکھ کر انجوائے کرتی ہوں۔۔۔ فارغ وقت میں اپنے شوز کی تیاری بھی کرتی ہوں۔۔۔ اور اپنے پروگرام "یادوں کے جھروکے" کے لیے مجھے کافی ریسرچ کرنی پڑتی ہے۔ اپنے بیٹے کے ساتھ کھیلنا اور وقت گزارنا بہت اچھا لگتا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے ارم کاشف سے اجازت چاہی۔ اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے اپنا وقت دیا۔

✡ ✡

مقابل ہے آئینہ

ماہا کائنات خان

ادارہ

س : "اصلی نام کیا ہے گھر والے پیار سے کیا بلاتے ہیں؟"

ج : "اصلی نام ماہا کائنات خان ہے۔ پیار کے بہت سے نام ہیں' امی چھوٹی کہتی ہیں' بہن' بنو' بھائی بے بی' دوستوں میں ملی 'کاجل' کیٹ۔ ان ہی سے مشہور ہوں اور پاپا منی۔"

س : "آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟"

ج : "آئینہ البتہ کچھ نہیں کہتا' لیکن میں ہر بات (جب کوئی نہ ہو بات کرنے کو) آئینہ سے کہتی ہوں اور آئینہ دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ ایک مکمل انسان بنایا۔"

س : "حسین صورتیں دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟"

ج : "کاش لوگ اتنے وفادار بھی ہوتے۔ جتنے حسین ہوتے ہیں۔"

س : "اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟"

ج : "تو بہت کچھ نکلے گا۔ میرا فون' لپ اسٹک' پرفیوم' پیسے' چاکلیٹ اور گلاسز (بلیک)۔"

س : "بھوتوں سے ڈرتی ہے؟"

ج : "آآہ! مطلب بہت خاص کر رات کے وقت اور اکیلے میں ایسا لگتا ہے کوئی ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔"

س : "مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟"

ج : "جو اطلاع دے کر آئیں۔ بن بلائے مہمان اور اچانک آنے والے پسند نہیں۔"

س : "کھانے میں کیا پسند ہے؟"

ج : "ملک شیک سے تو عشق ہے اور جو دوسرے کھانا پکا کر دیں خود پکانے کی دفعہ تو کچھ بھی پسند نہیں۔"

س : "اگر آپ کو حکومت مل جائے تو؟"

ج : "معذرت کر کے ایک طرف ہو جاؤں گی۔"

س : "پسندیدہ شاعر؟"

ج : "وصی شاہ' احمد فراز' مرزا غالب اور فیض احمد فیض۔"

س : "مزاجاً لڑاکا ہیں؟"

ج : "ویسے تو بہت نرم مزاج ہوں' لیکن اگر سامنے والا چپ نہ ہو تو میں بھی شروع ہو جاتی ہوں۔ اگر بندہ کب تک برداشت کرے۔"

س : "کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟"

ج : "نرم مزاج کے' کم بولنے والے' دوسروں کی (Care) کرنے والے۔"

س : "اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو؟"

ج : "تو کیا ہی بات تھی۔"

س : "اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟"

ج : "تنہائی میں۔ صبح اور رات کو۔"

س : "کفایت شعار یا فضول خرچ؟"

ج : "بہت زیادہ فضول خرچ ہوں۔ اکثر بچت کیے ہوئے پیسے بھی اڑا دیتی ہوں۔"

س : "کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟"

ج : "اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

س : "وہ کون سا کام ہے جسے کرتے وقت سوچتی ہیں دنیا کیا کہے گی؟"

"اچھا ا/ کام یا برا کرو' دنیا تو ہر بات پر کچھ نہ کچھ ... میں یہ سوچ کر کرتی ہوں کہ اگر اس کام ... فائدہ ہے تو ضرور کرنا ہے۔ دنیا کا کیا ہے کچھ ..."

س: "اگر آپ سنسان راستے سے گزر رہی ہیں اور ... لگ جائے تو؟"

ج: "تو کتے کی خیر نہیں ایک تو دوڑ میں وہ مجھ سے ہار ... گا۔" (کیونکہ میں آگے ہوں گی) دوسرا کتے کو ... کانوں کا علاج کرانا پڑے گا (میری خوب صورت آواز کی وجہ سے)

س: "آپ کی نظر میں محبت کیا ہے؟"

ج: "اس کا جواب رہنے ہی دیں (کیونکہ میں محبت کے بارے میں کچھ نہیں جانتی)

س: "آپ تعریف سن کر خوش ہوتی ہیں کیا؟"

ج: "آج کل تعریف اور خوشامد میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کچھ خاص خوشی نہیں ہوتی۔"

س: "ڈرامے دیکھتی ہیں؟"

ج: "جی ہاں! ٹی وی کے نہیں۔ محلے والوں اور رشتے داروں کے یہ لوگ تو ایکٹر کو بھی مات دیتے ہیں۔ ڈرامہ کیا فلم بھی دکھا دیتے ہیں۔"

س: "اگر دوست ناراض ہو جائے تو کیسے مناتی ہیں؟"

ج: "خود کو نقصان پہنچاتی ہوں کہ میں نے ناراض کیا ہی کیوں؟ مجھے تکلیف میں دیکھ کر خود ہی راضی ہو جاتے ہیں۔"

س: "حقیقی خوشی کب محسوس ہوتی ہے؟"

ج: "جب اکثر میں سوئی ہوں میری بہن ناشتا تیار کر کے مجھے اٹھائے اور خود کھلائے اور ہاں اکثر اپنی سالگرہ بھول جاتی ہوں تو میری بہن رات بارہ بجے کارڈ دے کر کیک چھت پر تیار کرتی ہے اور مجھے اوپر لے کر آتی ہے تب۔ (آئی لو یو سس)

س: "زندگی سے کیا سبق سیکھا؟"

ج: "لکھوں گی تو پورا رسالہ بھر دوں گی۔ رہنے دے۔"

س: "ستاروں پر یقین؟"

ج: "تھوڑا بہت کر ہی لیتی ہوں۔"

س: "کوئی آخری بات؟"

ج: "میری کوئی بھی بات آخری نہیں ہوتی جب تک سانس ہے۔"

س: "کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہے؟"

ج: "والدین کی خوب خدمت کرنا' ملک کے لیے کام کرنا' معذوروں کے کام آنا' ہر ضرورت مند کی کرنا' کیونکہ برا وقت ہر ایک پر آتا ہے۔"

✡ ✡

آسیہ مرزا

حسن ہو جس کی بات سناؤ

عباد گیلانی بلڈ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی بیوی مومنہ کو طلاق دے کر اپنے بیٹے حازم کو اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور دوسری شادی عاظمہ سے کر لیتا ہے۔ حازم اپنی ماں عاظمہ اور بھائی بابر کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہا ہوتا ہے مگر اپنے باپ عباد گیلانی کی بیماری کی وجہ سے فکر مند رہتا ہے۔ جب کہ عاظمہ اور بابر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ عباد گیلانی کو اپنی بیماری میں احساس ہوا ہے کہ اس نے حازم کی ماں مومنہ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ عباد گیلانی مومنہ کے باپ یاور علی کو بلاتا ہے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے اور حازم کو خاص طور سے اس کے نانا یاور علی سے ملواتا ہے، مگر حازم اپنے نانا سے مل کر اچھے تاثرات کا اظہار نہیں کرتا، مگر بعد میں اپنے باپ کی خواہش پر ان کے ساتھ اپنے نانا کے گھر جاتا ہے اور اپنی ماں مومنہ سے ملتا ہے۔ ماں سے مل کے تمام شکوے بھول جاتا ہے اور اسے احساس ہو ہے کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

حوریہ مومنہ کی بھتیجی ہے بے حد محبت کرتی ہے اور مومنہ بھی اسے بے تحاشا چاہتی ہے، حازم جب حوریہ کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں حوریہ کے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھرتے ہیں اور یہ ہی حال حوریہ کا بھی ہوتا ہے۔ عباد گیلانی حوریہ سے مل کر بہت خوش ہوتا ہے کیونکہ حوریہ میں اسے مومنہ کا عکس نظر آتا ہے اور حازم سے پوچھ کر اس کے نانا یاور علی سے دونوں کی شادی کی بات کرتا ہے۔

حوریہ اپنی دوست فضا سے بہت محبت کرتی ہے، فضا کی ایک امیرزادے سے دوستی ہے اور وہ گھر والوں سے چھپ کر اس سے ملتی ہے۔ حوریہ کو اس بات سے اختلاف ہے، وہ فضا کو بہت سمجھاتی ہے کہ اس راستے پر نہ چلے، مگر فضا نہ مانی اور آخر کار ایک دن محبت کے نام پر بربادی اپنی قسمت میں لکھوا لیتی ہے اور اس بات کا پتا اس کی سوتیلی ماں جہاں آرا کو چل جاتا ہے اور وہ اپنے بھانجے نصیر سے اس کی شادی کرنے کا پروگرام بنا لیتی ہے جبکہ فضا اس پر راضی نہیں ہوتی۔ حوریہ کو جب پتا چلتا ہے تو وہ فضا کو سمجھاتی ہے اس امیرزادے کو کہے کہ وہ اس سے شادی کرے اور فضا اس کو مجبور کرتی ہے کہ یہ با



والدہ اس کو سمجھائے اور فضا کے مجبور کرنے پر جب وہ بابر سے ملتی ہے تو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوتا ہے بابر سے
اسے نہیں ماننا چاہیے تھا اور اس بات پہ بھی افسوس ہوتا ہے کہ اس نے ایک غلط لڑکی کو دوست بنایا۔۔۔ (اب آگے)

بیسویں قسط



"تمہارے آنے سے تو کوٹھی میں رونق ہو گئی ہے۔ زندگی کا احساس دوڑنے لگا ہے۔" عاطمہ حوریہ کو گلے لگا کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
جو خود کسی اجڑے مزار کے بجھے دیئے کی مانند ہو وہ کسی گھر کی کیا رونق ہو سکتی ہے' وہ مسکرا دی اور فقط سوچ کر رہ گئی۔
"اس جگنو کے بغیر تو بالکل خالی خالی ہو گیا تھا میرا گھر۔" عاطمہ' علی شاہ کو نفیسہ کی گود سے لے کر اپنے بازوؤں میں بھر کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔
"آؤ بیٹھو۔" حوریہ کو یونہی کھڑے دیکھ کر وہ پیار سے بولیں پھر نفیسہ کی طرف چہرہ موڑتے ہوئے بولیں۔
"نفیسہ.... حوریہ اور علی شاہ کے بیگز روم میں رکھ آؤ۔"
"میں کچھ دیر ریسٹ کروں گی۔" حوریہ دھیرے سے بولی۔
"ہاں ہاں اٹس او کے' تم ریسٹ کرو۔ علی شاہ میرے پاس ہی ہے۔" عاطمہ برا منائے بغیر بولیں۔ "بابر تو اسے بہت ہی مس کر رہا تھا۔" وہ علی شاہ کے ننھے منے گداز ہاتھوں کو اپنی انگلیوں میں دبا کر لبوں سے لگا رہی تھیں۔ کبھی چوم رہی تھیں۔ ان کے لبوں کی تراش میں محبت بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ علی شاہ کو پا کر حقیقی مسرور دکھائی دے رہی تھیں۔
حوریہ ان کے اس انداز پر دل ہی دل میں خفیف سی ہو رہی تھی۔ عجیب مخمصے میں تھی کہ بے زاری کے باوجود بے زاری کا اظہار نہ کر پا رہی تھی۔ ان کے اس نثار ہونے والے انداز پر بے بسی سی محسوس کر کے رہ گئی تھی۔
گیلانی ہاؤس والوں کی یہ چاہتیں اسے زنجیر کی طرح باندھ کر رکھ دیتی ہیں وہ بے کل ہو کر رہ جاتی۔
وہ اپنی خواب گاہ میں چلی آئی۔ ہر شے اسی طرح قرینے سے پڑی تھیں جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ حتیٰ کہ حازم کی ڈائری' اس کا قلم' اس کی رسٹ واچ رائٹنگ ٹیبل پر سجی تھیں۔ اس نے ٹیبل کی سطح پر ہاتھ پھیرا گرد نام کو نہ تھی۔ وہ یکدم پلٹی اور کھڑکی کی بلائنڈ کھولنے لگی۔ اسے حبس کا احساس ہونے لگا تھا۔ شیشے کی چمکتی سلائڈ کھلتے ہی باغیچے کے خوش نما حصہ دکھائی دینے لگا اور خوش گوار جھونکے اس کے چہرے سے ٹکرائے۔
اس نے ایک گہری سانس کھینچ کر ان جھونکوں کو جیسے اپنے پھیپھڑوں میں اتارا تھا۔ اسی پل اس کے شولڈر بیگ میں رکھا اس کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے چونک کر شولڈر بیگ کی طرف دیکھا پھر بے دلی سے سیل فون نکالا۔ کال مومنہ کی تھی۔ فون بند ہو کر ایک بار پھر بجنے لگا۔
اس نے سوچا لائن ڈس کنکٹ کر دے اور اپنی ناراضی کا کھلا اظہار کرے۔ مگر دوسرے پل داجی (یاور علی) کا خیال آگیا تو کال ریسیو کرتے ہوئے نزدیکی کرسی پر بیٹھ گئی۔
"ہیلو۔"
"کیسی ہو میری جان! خیریت سے پہنچ گئیں۔" مومنہ کے لہجے میں بے نام سی تڑپ تھی۔
"جی.... پہنچ گئی۔"
"خفا ہو۔"
"نہیں۔" وہ ہلکی سانس بھر کر رہ گئی۔ "آپ سے کیوں خفا ہونے لگی۔ آپ خود میری طرح بے اختیار ہیں۔ مجھے اپنی تقدیر کا لکھا قبول کرنا ہی ہے۔" اس کے لہجے میں چھپی کاٹ نے جیسے مومنہ کو ایک پل چپ سا کر دیا۔
"وہاں تو سب خیریت ہے نا۔ داجی کی طبیعت کیسی ہے اب۔" وہ پوچھنے لگی۔
"ہاں وہ ٹھیک ہیں پہلے سے بہتر' تمہیں یاد کر رہے تھے خوش بھی ہیں کہ تم اپنے گھر میں ہو۔"
"یہ میرا گھر نہیں ہے اب۔ آپ جانتی ہیں اچھی طرح' علی شاہ کی خاطر میں یہاں رہ رہی ہوں۔ اور اب یہ

احساس شدت سے ہونے لگا ہے کہ عورت کا اپنا کوئی گھر ہوتا ہی نہیں ہے۔" وہ بری طرح ہرٹ دکھائی دے رہی تھی۔

"عورت تو خود ایک گھر کی طرح ہوتی ہے پگلی۔" جس میں مرد پناہ تلاش کرتا ہے۔ وہ تو خود ایک چھاؤں ہوتی ہے۔ اپنی چھاؤں سے دھوپ سمیٹ لیتی ہے۔ اچھا خیر تم آرام کرو۔ میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ ابا جی کی طبیعت کافی بہتر ہے۔" مومنہ بات سمیٹتے ہوئے بولی۔ وہ اس پل حوریہ کی ذہنی حالت سے باخوبی واقف تھی۔ مگر وہ یہ کڑوا گھونٹ پینے پر مجبور تھی۔ خدا حافظ کہہ کر لائن منقطع کر دی۔

حوریہ نے موبائل ایک طرف پھینک دیا اور صوفے کی پشت پر سر ٹکا کر خود کو اس ذہنی آزار سے نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔



بابر سے اس کی ملاقات صبح ناشتے کی میز پر ہوئی۔ وہ آفس جانے کے لیے مکمل تیار دکھائی دے رہا تھا۔ بلیک پینٹ اور رائل بلیو شرٹ میں خاصا ترو تازہ دکھائی دے رہا تھا۔ میز کے پاس کھڑا چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرتے ہوئے حوریہ پر نگاہ ڈالی پھر اس کے پلٹنے پر جلدی سے بولا۔

"میں آفس کے لیے نکل رہا ہوں۔ تم سکون سے ناشتا کر سکتی ہو۔" پھر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "بے خوف و خطر۔"

حوریہ لحظہ بھر ٹھٹکی تاہم پلٹی نہیں پھر بجائے ناشتے کی میز کی طرف آنے کے بیٹھک کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا موڈ پہلے ہی کوئی خوش گوار نہیں تھا اسے دیکھ کر تو اور بھی برا ہونے لگا۔

"میں اپنی بات پر قائم ہوں۔" بابر چلتا ہوا اس سے ذرا فاصلے پر رک گیا۔ حوریہ نے بے ساختہ پلٹ کر اسے دیکھا سوالیہ نگاہوں سے۔

"جب تک ہو سکے تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔" اس کے پلٹنے پر وہ بھنوؤں کو ہلکی سی جنبش دے کر بولا۔ پھر ہلکی سانس کھینچی۔

"اور اس پر قائم ہوں۔ رات دانستہ میں کمرے میں ہی رہا۔ کہ تم سے سامنا نہ ہو۔ اور یہ ابھی بھی اتفاق ہے۔ کہ تم سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا۔" اس کے لہجے میں طنز یا کاٹ نہیں تھی ایک خوش گواریت تھی۔ بظاہر وہ کہہ رہا تھا مگر اس کے چہرے اور آنکھوں سے ظاہر تھا وہ اس ملاقات پر خاصا مسرور تھا۔ اور یہ بات حوریہ کو بے حد ناپسند تھی اس کے چہرے کے زاویوں میں ایک کھنچاؤ آ گیا تھا وہ رخ موڑتے ہوئے بولی۔

"میں بھی یہی چاہوں گی کہ تم اپنے وعدے پر قائم رہو۔" وہ پلٹ کر ڈائننگ کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کے زاویوں میں ابھی تک کھنچاؤ تھا۔

"خیر وعدہ تو نہیں کیا تھا میں نے ہاں البتہ کوشش کرنے کو ضرور کہا تھا۔" بابر یکدم میز کی سطح پر ہتھیلیاں ٹکا کر اس پر جھک آیا۔ اور خاصی متانت سے بولا مگر اس کی آنکھوں میں ایک نرم سی مسکراہٹ تھی۔ پھر اس کے بولنے سے پہلے خود ہی بول پڑا۔

"او کے تم بریک فاسٹ کر لو اور یہاں آزادانہ گھوم پھر سکتی ہو۔ روم میں محصور ہونے کی ضرورت نہیں۔ یوں بھی میں دو دن کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔"

حوریہ نے صرف نظریں ذرا سی اٹھا کر بابر کو دیکھا تھا پھر نظریں جھکا لیں۔ اس کے چہرے پر بڑی سنجیدگی بلکہ کسی حد تک افسردگی بھی جھلک رہی تھی۔

"تمہارے لیے یہ یقیناً "گڈ نیوز" ہوگی۔"
"بالکل بہت زیادہ۔" وہ فلاسک اٹھا کر مگ میں چائے انڈیلتے ہوئے بولی۔ اس کا لہجہ چڑا ہوا سا تھا۔
"چلو اسی بہانے تم خوش تو رہو گی۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔" بابر مسکرایا اور میز سے اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے اس پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ حوریہ کے اندر جیسے کوئی تپتا ہوا سلگتا ہوا انگارہ چبھتا تھا۔
"ہاں جس طرح تم نے علی شاہ کو دو دن کے لیے میرے پاس بھجوایا تھا اس سے بھی باخوبی اندازہ ہو گیا کہ تم مجھے بہت خوش دیکھنا چاہتے ہو۔"
"کبھی کبھی کچھ اس طرح کے فیصلے کرتے ہوئے آدمی خود بھی اندر سے زخمی ہوتا ہے مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ میری طرح۔"
بابر اس کے طنز اور اس کڑواہٹ کو تحمل سے سہتے ہوئے آہستگی سے بولا۔ اس کے لہجے کی تہ میں ایک عجیب حزن تھا۔ حوریہ کا ہاتھ چائے کے مگ پر جانے کیوں کانپ سا گیا۔
"اینی ویز سچ تو یہ ہے کہ تمہاری نفرت بھی میرے لیے بے حد قیمتی ہے۔ نفرت کا ہی سہی ایک تعلق کا احساس تو رہتا ہے۔" وہ موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھا کر اس کے جھکے سر پر نگاہ ڈال کر چلا گیا۔
چائے کا گرم گرم گھونٹ بھرتے ہوئے حوریہ کو اپنے اندر چائے کے ہمراہ ایک سلگتا احساس حلق سے روح تک میں اترتا محسوس ہوا۔ اس کے اعصاب پر پتھر پڑا تھا۔ اسے چائے کی بھاپ پوری کی پوری اپنی آنکھوں میں گھستی محسوس ہوئی۔ چائے کا مگ اس نے آہستگی سے میز پر رکھ دیا۔ بے نام سی افسردگی دل کو لپیٹ میں لینے لگی۔
"نفرت کا تعلق بھی دل کو خوش اور مسرور کر سکتا ہے بھلا عجیب آدمی ہے یہ بابر بھی۔"
ایک بے نام سی اذیت کے ساتھ اس نے کرسی کی پشت پر سر ٹکا لیا۔
کبھی کبھی جملے کسی سفاک حقیقت کو بے نقاب کرتے ہوئے روح میں گرم گرم سلاخ کی طرح گھس جاتے ہیں۔ وہ بھی اپنے جسم کو ایسی ہی اذیت میں مبتلا محسوس کرنے لگی جیسے کئی سلاخیں اس کے اندر بھی جا گھسی ہوں۔ وہ بابر کے اس رویے پر دہشت زدہ ہو گئی۔ بابر اسے اسی جگہ کھڑا دکھائی دے رہا تھا جہاں وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ اس کی برہمی، بے زاری اور ناراضی بلکہ اس کھلی نفرت پر اپنا راستہ بدل لے گا۔ اس کے رویوں میں تبدیلی آ گئی ہو گی۔ مگر اس کی آنکھوں میں اسے اپنا ہی عکس دکھائی دیا تھا۔ وہ اس کی نفرت میں بھی خوش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس سے شاکی نہیں تھا۔ وہ اس سے محبت کا تقاضا بھی نہیں کر رہا تھا۔ بس اس کے ہونے کے احساس سے خوش مطمئن تھا۔
یہ محبت کی بڑی خطرناک صورت ہوتی ہے شاید جنون کی صورت کوئی کہ مقابل کی نفرت کو بھی آپ شہد کی طرح پی رہے ہوں۔
"اوف۔" ہزار اندیشے، واہمے اس کے دل کے گرد مکڑی کے جال کی طرح بننے لگے۔ یکدم اس کا دل بہت سا رونے کو چاہا۔ مگر اس نے آنکھوں کو زور سے میچ کر اس سیلاب کو اندر ہی اتار لیا۔
اس نے سوچا اگر وہ روئے گی تو کمزور پڑ جائے گی اور عمر بھر روتی رہے گی۔
آنسو آدمی کو کمزور کر دیتے ہیں۔ اس کے قدموں کو اکھاڑ دیتے ہیں۔ فیصلوں کی طاقت چھین لیتے ہیں اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اسے بہت سہج سہج کر اور سوچ سمجھ کر یہاں رہنا تھا۔ خود اپنے آپ کو ہی اس آنے والے طوفان سے بچانا نہیں تھا بلکہ بابر کو بھی بچانا تھا۔ اس نے سلگتی آنکھیں کھول کر ایک گہری سانس سینے کی تہ سے کھینچ کر آزاد کی اور بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"بی بی آپ نے ناشتا بھی نہیں کیا؟ نفیسہ ٹرالی میں ناشتے کے لوازمات سجائے حوریہ کے کمرے میں آکر بولی۔
"آپ کا ناشتا یونہی پڑا ہوا رہ گیا تھا۔ ابھی میں گرم گرم سب بنا کر لائی ہوں۔"
"ارے موڈ نہیں ہے تم نے یوں ہی زحمت کی۔ بس چائے دے دو مجھے ایک کپ۔" اس نے مڑتے ہوئے کہا پھر خیال آنے پر بولی۔ "علی شاہ سو رہا ہے کیا؟"
"جی... وہ بابر صاحب کے روم میں ہے۔ صبح دراصل بابر صاحب اسے اپنے ساتھ گاڑی میں لے گئے تھے۔ پھر خود ہی اسے آکر سلا دیا ہے اور کہہ کر گئے ہیں کہ اسے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔"
نفیسہ نے تفصیل بتاتے ہوئے حوریہ کو دیکھا پھر یکدم گڑبڑا کر بولی۔
"آ... آپ کہیں تو میں اسے اٹھائے دیتی ہوں۔"
"نہیں سونے دو بس چائے دے دو مجھے۔"
"خالی چائے نہ پئیں بی بی! تھوڑا بہت ناشتا کرلیں رات کو بھی آپ نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ عاظمہ بی بی مجھ پر خفا ہوں گی کہ میں آپ کا خیال نہیں رکھتی۔"
نفیسہ ٹرالی اس کے بیڈ کے نزدیک لا کر روکتے ہوئے بولی' حوریہ ہلکے سے مسکرا دی۔
"ایسا نہیں ہے تم تو بہت خیال رکھتی ہو یہاں سب کا۔"
"آپ ابھی تو رہیں گی ناں یہاں۔ میرا مطلب ہے لائبہ بی بی کی منگنی تک تو یہیں ہیں ناں۔" نفیسہ اس کے لیے مگ میں فلاسک سے چائے انڈیلتے ہوئے پوچھنے لگی۔ حوریہ نے اس کو دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔
"لائبہ کی منگنی۔ کب ہے اس کی منگنی۔"
"آتے ہفتے کو جی۔ عاظمہ بی بی بھی کہہ رہی تھیں کہ حوریہ آجائے گی تو اس کے ہمراہ خوب شاپنگ کریں گے۔"
"کس کے ساتھ ہو رہی ہے' میرا مطلب ہے اس کا منگیتر کون۔" یہ پوچھتے ہوئے اس کے ذہن میں پہلا خیال بابر کا ہی آیا تھا۔ مگر نفیسہ کے جواب نے اسے حیران کر دیا۔
"پتا نہیں جی' ان کے ابا کے کسی دوست کا بیٹا ہے شاید۔ پر دیکھنے میں ہے اچھا۔ عاظمہ بی بی کے موبائل پر ان کی تصویر دیکھی تھی جی میں نے۔"
"ہوں۔" وہ ہنکارا بھر کر رہ گئی اور نفیسہ کے ہاتھ سے چائے کا مگ تھام لیا۔



مومنہ نماز سے فارغ ہو کر جائے نماز تہ کر رہی تھی کہ رقیہ بھابھی اس کی طرف چلی آئیں۔ ان کے چہرے پر پریشانی دکھائی دے رہی تھی۔
"حوریہ سے تمہاری بات ہوئی یا نہیں۔ وہ ٹھیک ہے ناں۔ میری تو کال ریسیو نہیں کرے گی۔ مجھے پتا ہے۔"
مومنہ نے تسبیح جائے نماز کے اندر ہی رکھ کر جائے نماز ایک طرف رکھتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔
"ہاں ہوئی تھی بات میری۔"
"کیسی ہے' وہ ٹھیک ہے' خفا تو نہیں ہو رہی تھی ناں۔ بہت غصے میں بھی تو گئی تھی۔ اور سچ پوچھو تو مجھے فون کرتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے نا جانے کیا ری ایکشن ہو گا اس کا۔" رقیہ بھابھی ایک افسردہ سی سانس بھر کر تخت پر بیٹھ گئیں۔
"وہ مجھ سے اور عادل سے خفا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہم ایک بزدل اور ظالم ماں باپ ہیں اس کے لیے کچھ

نہیں کرسکتے۔اس کے حق کے لیے آواز تک نہیں اٹھاسکتے۔"

"ارے نہیں بھابھی۔وہ ایسا کچھ نہیں سوچتی۔" مومنہ نے رقیہ بھابھی کے کندھے کو نرمی سے دبایا۔ "وہ تو بس اس کا وقتی غصہ تھا جو وہ نکال رہی تھی۔"

"نہیں مومنہ! وہ ہم سے متنفر ہے کہ ہم بابر پر کوئی کیس نہیں کرسکتے۔" رقیہ بھابھی کی آواز رندھ گئی وہ بے بسی کے احساس سے نڈھال دکھائی دے رہی تھیں۔

"تم ہی بتاؤ۔کہاں ایک رئیس زادہ۔اس کا اتنا اثر رسوخ اور کہاں تمہارے بھائی ایک مڈل کلاس ایک سیلف میڈ آدمی۔وہ یہ سب کیسے افورڈ کرسکتے ہیں۔نہ اثر رسوخ نہ پیسا نہ کوئی سورس پھر تم ہی بتاؤ کیسے آواز اٹھائیں۔کیس کباڑوں میں تو بہت پیسہ اٹھ جاتا ہے اور خواری الگ۔"

"آپ دل چھوٹا مت کریں۔میں نے کہا نا۔وہ اس کا وقتی غصہ تھا۔اور جو معاملے اللہ کی عدالت میں سونپ دیے جائیں ان کے بہتر نتائج نکلتے ہیں۔وہ جذباتی ہے کم عمر ہے اس لیے اس طرح کی باتیں کرتی ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ سمجھ آجائے گی۔جیسے جیسے زخم بھرے گا صبر آتا جائے گا۔ایڈجسٹ ہوجائے گی پھر۔" مومنہ کا لہجہ تسلی دیتا ہوا تھا۔

"تم نے بھی تو اتنی کم عمری میں اتنا کچھ دیکھا۔صبر کیا تمہاری زبان پر تو حرف شکایت نہیں آیا۔تم نے تو اباجی کو کبھی موردالزام نہیں ٹھہرایا تھا۔"

مومنہ نے ان کی طرف دیکھا۔وہ حد سے زیادہ غم زدہ اور ملول دکھائی دے رہی تھیں۔آنکھوں کی سطح پر چمکتا پانی جھلملایا تھا۔ایسا لگ رہا تھا ابھی چھلکا کہ تب چھلکا۔

مومنہ ان کا غم سمجھتی تھی وہ ماں تھیں حوریہ کے غم نے انہیں اندر ہی اندر توڑ کر رکھ دیا تھا۔

"تو اچھا ہے ناں...وہ میری طرح نہیں ہے۔شور مچالیتی ہے رولیتی ہے شکوہ کرلیتی ہے۔جی کا غبار نکال لیتی ہے۔یہ غبار نہ نکلے تو بوجھ کی طرح سینے پر پڑا رہتا ہے سانس لینا بھی دشوار ہوجاتا ہے۔" مومنہ نے اٹھ کر جگ سے پانی بھر کر گلاس رقیہ بھابھی کی طرف بڑھادیا۔

"وہ شکوہ کرتی ہے تو اسے کرلینے دیں۔اسے رونے چلانے دیں۔حبس بڑھ جائے تو بڑے تیز جھکڑ چلتے ہیں مگر پھر سب معمول پر آجاتا ہے۔" رقیہ بھابھی نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے افسردگی سے سرہلادیا۔پھر پانی پی کر گلاس ایک طرف رکھ دیا اور تخت سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"اب تمہاری اس سے بات ہو تو اس سے کہنا وہ مجھے ضرور فون کرکے اپنی خیریت بتادے۔بس ایک بار اس کی آواز سن لوں تو تسلی ہوجائے۔" جواباً مومنہ فقط سرہلا کر رہ گئی۔



سوبار چمن مہکا سو بار بہار آئی
دنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی

بابر اپنی سوچوں میں الجھا ٹہلتا ہوا ٹیرس سے اتر کر باغیچے کی شفاف راہداری پر آیا تھا۔رات اپنے قدم جما چکی تھی۔مگر باغیچے کی مدھم لائیٹس اندھیرے کا سینہ چیر کر رات کی ہیبت کو کم کررہی تھیں۔وہ اپنی سوچوں میں غلطاں تھا کہ گانے کی آواز پر ٹھٹکا۔

دیکھے ہیں ہم نے بہت پیغام محبت کے
آغاز بھی رسوائی انجام بھی رسوائی

کسی ملازم کے کوارٹر سے ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ مغنیہ کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ اسے لگا گانے والی اس کے دل کی حالت سے آگاہ ہو اور اسی لیے ڈوب کے گا رہی ہو۔ وہ ہلکے سے مسکرایا اور پلٹ کر اندر کی جانب ہو لیا۔ اس کی سوچوں کے انتشار میں سستی آگئی تھی۔ یوں ٹہلتے رہنے سے اعصاب کسی حد تک سنبھل چکے تھے۔

وہ لابی میں آیا۔ معمول کا سناٹا بکھرا ہوا تھا۔ اس نے یونہی باورچی خانے کی طرف دیکھا وہاں کھٹر پٹر کی آوازیں آرہی تھیں۔ اسے یکدم چائے کی خواہش ہوئی وہ باورچی خانے کے حصے کی طرف آگیا۔

"امیر علی۔ ایک کپ چائے مل جائے گی۔" وہ باورچی خانے کا رخ کبھی نہیں کرتا تھا۔ ایک عرصے بعد وہ اس حصے کی طرف آیا تھا دروازے پر رک کر اس نے اندر جھانکتے ہوئے پکارا۔ اس کا خیال تھا امیر علی ہی اس وقت یہاں موجود ہو سکتا تھا مگر اچانک اس کی پکار پر پلیٹ کسی کے ہاتھ سے ٹکرا کر چمکتے ماربل کے فرش پر گری تھی۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز بے حد مہیب اور وحشت ناک سی محسوس ہوئی۔

بابر نے سٹپٹا کر اندر جھانکا تو حوریہ کو متوحش سا ایک طرف کھڑے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی دوسرے پل وہ نادم سا ہو گیا۔

وہ شاید اپنے میں مگن تھی بابر کی غیر متوقع موجودگی نے اسے ڈرا دیا تھا نتیجتاً" اس کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ چھوٹ گئی تھی۔

"اوہ... سس، سوری سوری فار دیٹ۔ میں سمجھا کہ امیر علی ہو گا۔ اس لیے چائے کا کہنے چلا آیا۔" وہ اس صورت حال پر حقیقی نادم دکھائی دے رہا تھا اور جلدی سے اپنی موجودگی کی وضاحت دیتے ہوئے بولا۔ "سوری! آئی فرائٹنڈ یو (معافی چاہتا ہوں! اگر آپ کو خوف زدہ کر دیا میں نے۔) مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ تم اس وقت کچن میں ہو گی۔" وہ اندر آگیا اور فرش پر بکھرے کانچ کے ٹکڑے دیکھ کر ڈسٹ بن کے لیے ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔

حوریہ اپنی خفت اور خوف پر جلدی سے قابو پا کر جلدی سے فرش سے کانچ کے ٹکڑے اٹھانے کو جھکی۔ جھکنے پر دوپٹے سے اس کے سلکی بال پھسل کر ادھر ادھر بکھر کر اس کا چہرہ چھپا گئے۔ بابر از خود رفتہ سا اسے دیکھتا رہ گیا۔

"میں امیر علی کو بلا لاتی ہوں۔ وہ آپ کو چائے بنا کر دے دے گا۔" وہ بابر کی نگاہوں کی محویت کو توڑتے ہوئے بولی اور سیدھی ہو کر دروازے کی جانب بڑھی بابر جلدی سے ایک طرف ہٹتے ہوئے بولا۔

"نہیں پلیز... اس کی ضرورت نہیں۔ وہ شاید اپنے کوارٹر میں چلا گیا ہو گا۔"

"میں نے لائٹ کھلی دیکھی تو یونہی چائے کی خواہش ہو گئی۔ امیر علی ہوتا تو بنا دیتا۔ سوری میں نے تمہیں ڈسٹرب کر دیا۔"

وہ جواباً" اس پر فقط ایک نظر ڈال کر کانچ کے ٹکڑے ڈسٹ بن میں ڈالنے لگی۔ بابر کچن سے نکلنے لگا تب وہ آہستگی سے بولی۔

"میں بنا دیتی ہوں۔" بابر نے تحیر آمیز بے یقینی سے چہرہ ذرا سا موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اس کی طرف رخ موڑے برنر کھول رہی تھی۔

بابر تھینک یو کہتا کچن سے باہر نکل گیا۔ بڑا ہی خوش کن احساس تھا جس نے پل بھر کو دل کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ وہ اس خوش کن لمحے کو لابی کے صوفے پر بیٹھ کر آنکھیں موندے انجوائے کر رہا تھا۔ اسے پتا ہی نہ چلا کب وہ اس کے آگے تپائی پر چائے کا کپ رکھ کر جا چکی تھی۔

اس نے چائے کا مگ لبوں سے لگایا تو اسے لگا کوئی امرت ہو جو اس کے لبوں کو چھو گیا ہو۔ وہ اس کے ہاتھوں کی لذت گویا چائے میں محسوس کرنے لگا۔ اس کے وجود کی مہک میں گم ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

حوریہ کمرے میں آئی تو جیسے تھکن رگ رگ کو چھو رہی تھی یہ جسمانی نہیں روح کی تھکن تھی۔
تنہائی کی اذیت آمیز تھکن تھی۔ خود سے مسلسل جنگ لڑتے رہنے کی تھکن تھی۔ منفی سوچوں کی یلغار نے اسے تھکا ڈالا تھا۔

بابر کو چائے دے کر آئی تو اسے لگا۔ وہ بہت لمبی مسافت طے کر کے کمرے تک پہنچی ہو۔ بستر پر دراز ہو گئی مگر بستر پر لیٹتے ہی جیسے تھکن اور بڑھ گئی۔ رگ رگ میں خون کے ساتھ ایک درد دوڑتا محسوس ہونے لگا۔

"حازم۔" ایک سسکاری اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔ اس کا دل بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔

"مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے حازم۔ میں اس منہ زور ہوا کے رستے میں بیٹھ کر کیسے خود کو بچاؤں گی۔" اس نے سلگتی آنکھیں زور سے میچ لیں۔

ایسی تیز ہوا میں پیارے
بڑے بڑے منہ زور دیے بھی کم جلتے ہیں
لیکن پھر بھی ہم جلتے ہیں
ہم جلتے ہیں اور ہمارے ساتھ تمہارے غم جلتے ہیں
دل کے آتش دان میں شب بھر
تیری یاد کا ایندھن بن کر
ہم جلتے ہیں

جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ آنکھ کھلی جب فجر کی اذان کانوں میں پڑی۔ ادھ کھلی کھڑکی سے یہ مسحور کن پکار اس کے کانوں کو سکون بخشنے لگی۔ وہ یونہی چت لیٹ کر پوری اذان سننے کے بعد اٹھی اور وضو کر کے نماز ادا کی اور کتنی دیر جائے نماز پر بیٹھی رہی اسے داجی (یاور علی) کی باتیں یاد آنے لگیں۔

"ہم سکون ڈھونڈنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں جبکہ سکون تو ہمیں خود پکارتا رہتا ہے پانچوں وقت اذان کی صورت میں۔"

"آہ! مگر انسان بے شک خسارے میں ہے۔"

جائے نماز سے اٹھی تو وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ پھر دوپٹے سے خود کو اچھی طرح ڈھانپ کر ٹیرس میں چلی آئی۔ صبح کی خوش کن ہوائیں چہرے سے ٹکرائیں تو سکون بخش احساس ہونے لگا۔ وہ کلمہ کا ورد کرتے ہوئے دھیرے دھیرے ٹہلنے لگی۔ تب اچانک وہ چونکی۔

مین پھاٹک کھلا تھا اور کوئی اندر داخل ہوا تھا وہ ٹیرس کے کنارے پر چلی آئی یہ دیکھنے کے اتنی صبح کوٹھی میں کون داخل ہوا ہے۔ آنے والا لان کے بالائی حصے سے ہو کر روش پر آیا تو اس کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی۔ سفید شلوار قمیص اور سر پر ٹوپی جمائے بابر اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ امیر علی تیز تیز قدموں سے اس کی طرف آیا تو بابر نے سر سے ٹوپی اتار کر امیر علی کو تھمائی۔

"جوس لاؤں آپ کے لیے یا جاگنگ کے بعد پئیں گے۔" امیر علی کی آواز اسے سنائی دی۔ وہ بابر سے مخاطب تھا۔

"جاگنگ تو میری ہو جاتی ہے امیر علی۔ نماز سے اچھی ایکسرسائز اور کوئی نہیں۔ خاص کر مسجد سے پیدل چل کر آتا ہوں تو خود کو بہت ہلکا پھلکا اور تازہ دم محسوس کرتا ہوں۔" بابر امیر علی سے کہتا اس کے ہمراہ اندر کی طرف بڑھ

رہا تھا۔ "بہت سکون ملتا ہے مسجد میں جاکر۔ آج تو قبرستان بھی ہو کر آیا ہوں۔"

"یہ تو بڑا اچھا کام ہو گیا۔" امیر علی نے سراہنے والے انداز میں سرہلایا۔

"ہاں بہت دنوں سے جا نہیں سکا تھا۔ اب تم مجھے ایک زبردست ناشتا بنا کر کمرے میں دے جاؤ۔" بابر امیر علی کے کندھے پر ہاتھ ہلکے سے مار کر اندر چلا گیا اور حوریہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ امیر علی بابر کی ٹوپی اپنے سر پر جمائے اپنے کوارٹر کی طرف چل دیا۔ وہ نفیسہ کو بلانے جا رہا تھا۔

حوریہ گم صم سی کیفیت میں ریلنگ سے لگ کر کھڑی رہی جیسے اعصاب پر کوئی بڑا دھچکا لگا تھا پھر دھیرے سے ریلنگ کے ساتھ لگی کرسی پر بیٹھ گئی۔

بابر کا فجر کی نماز پڑھنے جانا۔ قبرستان جانا۔ اس کے لیے دھچکا ہی تھا۔ اس نے کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر ایک گہری سانس کھینچی۔ جیسے اپنے اعصاب کو نارمل کر رہی ہو۔ پھر آنکھیں بند کرلیں۔ کوئی بیتا منظر جیسے آنکھوں میں گھوم گیا تھا۔

"حازم پلیز اٹھ جائیں اب۔ نماز کا وقت نکل رہا ہے۔ اوہو اٹھیں نا حازم۔"

وہ مسلسل حازم کو لیپ ٹاپ میں مصروف دیکھ کر ہر دو منٹ کے بعد اسے متوجہ کر رہی تھی اور وہ ہر بار یہی کہتا "ہاں بس دو منٹ ڈیئر۔"

"نماز کا وقت نکل جائے گا۔ کتنی بری بات ہے حازم! یہ دنیاوی کاموں میں دو دو چار چار گھنٹے لگاتار گزار دیتے ہیں اور نماز کے لیے پانچ منٹ بھی نہیں نکال سکتے۔" وہ حازم کے سر پر سوار ہو گئی۔ کوئی مہینہ بھر سے اس نے جیسے کمر کس لی تھی کہ وہ حازم کو نماز کا عادی بنا کر دم لے گی۔

حازم نے ہی اسے کہا تھا۔ "وہ نماز کا ہمیشہ سے چور رہا ہے شاذ و نادر ہی اس نے نماز پڑھی ہو گی وہ بھی شاید جمعہ کی۔ مجھے بہت سستی ہوتی ہے نماز کے لیے۔"

"سستی تو ہو گی ناں۔ واجی کہتے ہیں ہر نیکی کے راستے پر شیطان کھڑا ہو جاتا ہے مگر انسان قدم نہ روکے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ وہ بہت کمزور دیوار ہے اگر انسان ثابت قدم رہے اسے گرانے کا ارادہ باندھ لے تب۔"

"تم میری ہیلپ کرو نا پھر۔"

"ضرور۔" وہ سرہلاتی تھی اور اس روز سے وہ حازم کے سر ہو جاتی۔ کبھی وہ پڑھ لیتا کبھی سنی ان سنی کر لیتا اور انگڑائی لے کر سوتا بن جاتا۔ مگر وہ بھی ہمت نہ ہارتی۔

"مجھے لگتا ہے تم مجھے پکا نمازی بنا کر چھوڑو گی۔" وہ لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کر کے اسے گھورتا ہوا کھڑا ہو گیا' وہ ٹوپی جلدی سے اس کے سر پر جماتے ہوئے اس کے لیے دروازہ کھولنے لگی۔

"کہاں باہر دھکیل رہی ہو۔ گھر میں ہی پڑھ لیتا ہوں۔ مسجد نہیں جا رہا ہوں۔"

"چلیں گھر پر ہی پڑھ لیں۔ یہ بھی غنیمت ہے۔" وہ مسکرادی۔ اسی پل دروازے پر بابر نے ہلکے سے ناک کیا تھا۔ دروازہ کھلا دیکھ کر اس نے اندر جھانکا اور حازم کو ٹوپی پہنے دیکھ کر یکدم اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ اس کا انداز سراسر تضحیک آمیز تھا۔

حوریہ کے چہرے پر یکلخت ترش سی سنجیدگی بکھر گئی تاہم وہ چپ سی ایک طرف کھڑی رہی۔

"تو تمہیں پکا مولوی بنانے کی سازش ہو رہی ہے ہاؤ فنی۔ تم پر تو بڑا تیزی سے رنگ چڑھ رہا ہے حوریہ بھا۔۔۔ابھی کا۔" یہ کہتے ہوئے حوریہ کی طرف خاصے طنز سے دیکھا اور لبوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ سمیٹتے ہوئے حازم کو دیکھا۔

"اوکے۔۔۔ تمہارا یہ اسلامیات کا پریڈ ختم ہو جائے تو باہر آجانا۔ ماما کال یو۔" اس کے لہجے میں سمایا طنز حوریہ کی

پور پور میں اتر گیا۔
"یہ صرف اسلامیات کا پریڈ نہیں ہے اخلاقیات کا بھی ہے اور اخلاق سے ہی انسان مکمل ہوتا ہے۔" وہ بابر کے پلٹنے پر دروازہ بند کرنے کی نیت سے آگے آتے ہوئے بولی۔ "اور نماز خدا نے فرض کی ہے میں نے نہیں۔"
بابر ذرا سا اس کی طرف گھوما اس کے جملے کے جواب میں ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
"اب تو فرض نبھانے میں ہی بے چارے حازم کی لائف گزرے گی۔ آہ۔"
اس نے نگاہوں کو کچھ اس انداز سے جنبش دی کہ حوریہ کے ہونٹ سکڑ گئے۔
"تم دین کا مذاق اڑا رہے ہو۔ تمہارے نزدیک نماز پڑھنا۔ سر پر ٹوپی رکھنا مضحکہ خیز اور شیم فل بات ہے۔"
اس نے متاسفانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا بلکہ گھورا۔
"اوں... ہوں 'کم آن حوریہ لیو اٹ۔" حازم نے جلدی سے ان دونوں کے درمیان آنا ناگزیر سمجھتے ہوئے بولا
۔ "ڈونٹ ٹیک اٹ سیریسلی۔ اس کی تو مذاق کی عادت ہے۔"
"دین کا مذاق اڑانا مجھے پسند نہیں ہے۔ نماز میرے رب کا تحفہ ہے جو ہم خوش نصیب مسلمانوں کو ملا ہے اور اس تحفے کی قدر و قیمت کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو عقل کی بینائی رکھتے ہیں۔" وہ بابر پر چلچلاتی نظر ڈال کر اندر چلی گئی۔
بابر کے لبوں پر پھیلی استہزائیہ مسکراہٹ کچھ اور پھیل گئی۔ اس نے حازم کی طرف دیکھا اور بھنوؤں کو جنبش دے کر ایک خفیف سی سانس کھینچی۔
"تم فرض ادا کر لو برادر۔ میں نے ناحق تمہیں ڈسٹرب کر دیا۔" وہ پلٹ کر چلا گیا۔ حازم حوریہ کی طرف آ گیا جو بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھی تھی۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی وہ کارپٹ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی اپنا غصہ ضبط کر رہی تھی۔
"تم بھی ناحق اس سے الجھتی ہو۔ تمہیں کتنی دفعہ کہا ہے اس کی باتوں پر اریٹیٹ (چڑا) مت ہوا کرو۔"
"بات اریٹیشن کی نہیں ہے دکھ اور افسوس کی ہے۔" وہ بیڈ سے اٹھی۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں کی سطح پر پانی جھلملا رہا تھا۔
"آپ بھی تو اسی گھر کے فرد ہیں حازم۔ ایک ہی ساتھ پلے بڑھے ہیں پھر اتنا فرق کیوں ہے آپ دونوں میں۔"
"وہ چھوٹا ہے مجھ سے ابھی۔ شاید اس لیے۔ اینی ویز اب غصہ تھوک دو۔" وہ پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے نزدیک کرتے ہوئے بولا۔
"تمہارے جیسی پیاری سمجھ دار بیوی اس کو بھی مل جائے گی تو وہ بھی سدھر جائے گا۔" وہ اسے چھیڑنے لگا۔
حوریہ نے اسے مصنوعی پن سے گھورا پھر ہنس پڑی۔
یکدم اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹا تھا۔ وہ ماضی سے باہر نکلی ایک گہری سانس اس کے سینے کی تہ سے آزاد ہو گئی۔
آج ویسی ہی ٹوپی جس پر بابر ہنستا تھا کچھ نہ کچھ کمنٹس دیتا رہتا تھا آج خود اس کے سر پر سجی تھی۔ وہی حلیہ جو اس کے خیال میں عجیب مضحکہ خیز اور شیم فل تھا۔ وہ خود ہی زیب تن کیے ہوئے تھا۔
مگر اس پر کوئی زبردستی نہیں کر رہا تھا۔ کوئی اصرار کر کے مسجد نہیں بھیج رہا تھا۔ وہ خود اپنی قلبی خواہش کے ساتھ جا رہا تھا اپنی رضا سے... اور وہ اسے اس کا ناٹک قطعی نہیں کہہ سکتی تھی چونکہ صبح سویرے مسجد تک کا سفر پھر قبرستان جانا محض دکھاوا نہیں ہو سکتا تھا وہ تو خود بے خبر تھا کہ حوریہ اس بات سے واقف ہے۔ وہ ٹیرس سے نکل کر باغیچے میں چلی آئی۔ اور ٹھنڈی گیلی گھاس پر ننگے پیر بے قرار روح کی مانند چکر کاٹنے لگی۔

"ایسا لگ رہا ہے تم کچھ پریشان ہو۔ اینی پرابلم۔" بابر کی آواز نے اسے سٹپٹا دیا۔ وہ رک کر پلٹی۔ بابر اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں اورنج جوس سے بھرا گلاس تھا جس کے ہلکے ہلکے سپ لیتا' وہ اسے خاصی دیر سے دیکھ رہا تھا پھر روش سے اتر کر خود بھی گھاس کے احاطے میں اتر آیا۔ وہ خلاف معمول اسے دیکھ کر بے زار ہونے کی بجائے شانت سے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں... بس یونہی صبح کی ہوا اچھی لگ رہی تھی۔"

"مجھے بھی کچھ دنوں سے احساس ہونے لگا ہے کہ نیچر اپنے اندر بہت خوب صورتی رکھتی ہے بس اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

وہ اس کے ہمراہ قدم اٹھاتے ہوئے بولا۔ حوریہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر سر جھکا کر دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگی۔

"جب ہم اسلام آباد میں تھے تو حازم کے ہمراہ صبح صبح چہل قدمی کرتے دور تک نکل جاتی تھی۔ قدرت کا حسن تو میں نے ان دونوں اپنے بے حد قریب محسوس کیا تھا۔" وہ ماضی کے کسی منظر میں جیسے گم ہونے لگی۔

"میں حازم کو پہلے پہل زبردستی پکڑ کر لے جایا کرتی تھی۔ پھر وہ بھی عادی ہو گئے تھے انہیں بھی مزا آنے لگا تھا۔"

بابر بھی ایک پل افسردگی کے سحر میں گرفتار ہوا تھا۔ حازم کی کمی دل کے کسی کونے سے پل بھر کے لیے شدت سے اٹھی تھی۔ تاہم اس نے حوریہ کا تسلسل توڑا نہیں۔ خاموشی سے اس کے مزید بولنے کا منتظر رہا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے جنگلے کے پاس کھڑے ہو گئے تھے۔

پہلی بار وہ حازم کی باتیں اس سے شیئر کر رہی تھی۔ ایک دوستانہ ماحول میں۔

"حازم میری اسی دیوانگی پر ہنستے تھے۔ مجھے قدرتی حسن ہمیشہ اٹریکٹ کرتا رہا ہے۔ بناوٹ سے پاک 'شفاف۔" وہ یہ کہہ کر جنگلے پر ہاتھ پھیرنے لگی پھر ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے بولی۔

"سچ ہی کہتے ہیں کہ وہ تعلق خاطر ہی کیا جس پر دوریاں' فاصلے اثر انداز ہو جائیں۔ اصل چیز تو ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس ہے' دل میں رہنے والے اپنی غیر موجودگی میں بھی ہمارے قریب ہی محسوس ہوتے ہیں۔ ہم جتنے بھی تنہا ہوں ان کی موجودگی کا احساس ہمیں تنہا نہیں ہونے دیتا۔" اس نے آنکھیں بند کر کے حازم کے تصور کو جیسے قید کرنا چاہا۔

"ہاں مگر فقط احساس سے زندگی تو' نہیں گزاری جا سکتی ناں۔ موجودگی کا احساس ہی کافی نہیں ہوتا۔ موجود ہونا بھی ضروری ہے اسپیشلی ایک عورت کے لیے مرد کا سائبان ضروری ہے۔" بابر کی آواز اسے اپنے خیالات سے باہر نکال لائی اس نے چونک کر بابر کی طرف دیکھا اور جیسے اس کی بات کا پس منظر جان کر اس کے چہرے پر یک بیک سنجیدگی سمٹ آئی۔ ایسی سنجیدگی جس میں ناراضی واضح تھی۔

"تو تم مجھے بے سائبانی کا احساس دلا رہے ہو۔"

"نہیں میں فقط حقیقت بتا رہا ہوں۔"

"میں اکیلی نہیں ہوں میرا بیٹا ہے نا میرے پاس' وہ بنے گا میرا سائبان۔" وہ تنک کر پلٹنے لگی بابر یکدم اس کی راہ روکتے ہوئے بولا۔

"وہ خود ابھی سہارے کا محتاج ہے تم اس کے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔" حوریہ نے اس کی طرف دیکھا وہ جو کہنا چاہتا تھا شاید کہہ نہیں پا رہا تھا مگر وہ ساری تحریر اس کی آنکھوں میں لکھی دکھائی دے رہی تھی اور یہی بات حوریہ کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔

مگر دوسری بار وہ پوری انکوائری لے کر آیا تھا کہ میں ہی فضا کی والدہ ہوں۔ اس نے مجھ سے بڑی منت سماجت کی کہ میں اسے تمہارا کانٹیکٹ نمبر دے دوں۔ مگر میں نے نہیں دیا۔" جہاں آرا کی باتیں اس کے لیے کسی آزار سے کم نہ تھیں وہ اس دھچکے پر کچھ بول نہ پائی۔

وہ اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا اس سے معافی مانگنے کے لیے۔ وہ اپنی ماضی کی زیادتی پر نادم تھا پشیمان تھا۔ وہ گھر آئی تو رگ رگ میں اداسی گھلی ہوئی تھی۔ وہ ساری رات بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ نصیر سے سب کچھ شیئر بھی نہیں کر سکتی۔ وہ اس معاملے میں خود کو بالکل اکیلا محسوس کر رہی تھی ایک جہاں آرا کا ہی آسرا تھا۔

وہ اس آگ میں کئی روز تک جلتی رہی۔ اور وہ جانتی تھی یہ آگ اسی طرح بجھے گی جب بابر سے رابطہ ہو گا۔ کچھ سوچ کر اس نے جہاں آرا کو ساری بات بتادی۔ تب جہاں آرا نے گویا اندھیرے میں اسے راہ سجھائی تھی۔

"تم اس سے ملنے اس کے گھر کیوں نہیں چلی جاتیں۔ کچھ اتا پتا تو ہو گا ناں تمہیں۔ کہاں رہتا تھا وہ۔"

"گھر..... مگر وہ تو بہت دور رہتا تھا..... ڈیفنس میں۔"

"لو ڈیفنس کون سا دوسرے شہر میں ہے کہ تم سوچ میں پڑ گئیں۔"

"نہیں گھر جانا کچھ مناسب نہیں لگتا اماں۔" وہ ان کی بات فی الفور رد کر کے آ گئی۔ مگر گزرتے دنوں کے ساتھ اس کی بے چینی بڑھنے لگی تو اس نے سوچا۔

اسے بابر سے ملنا چاہیے اس کے گھر جانے میں کوئی حرج نہیں تھا اور پھر وہ کون سا کسی بری نیت سے جا رہی تھی۔ اس نے جیسے خود اپنی ہمت باندھی۔

رات اس نے نصیر سے بات کی کہ..... "وہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے جانا چاہتی ہے کل اسے گاڑی کی ضرورت ہے۔ نصیر بلا حیل و حجت مان گیا۔

"ٹھیک ہے میں دوکان پر پہنچ کر شفیق (دکان پر کام کرنے والا لڑکا) کے ساتھ گاڑی بھیج دوں گا۔ وہ تمہیں لے جائے گا۔" پھر چونکتے ہوئے بولا۔

"کس سہیلی کے پاس، میرا مطلب ہے وہ کہاں رہتی ہے۔" وہ اپنا حساب کتاب کا رجسٹر اور موبائل بند کر کے ایک طرف رکھ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔

"ڈیفنس میں جانا ہے۔" فضا بے خیالی میں بول گئی مگر دوسرے پل نصیر کی حیرت سے اٹھنے والی نظروں سے سٹپٹا کر رہ گئی۔

"حو..... حوریہ کی طرف جاؤں گی ناں۔"

"مگر..... حوریہ کے یہاں تو اس روز میں نے تمہیں ڈراپ کیا تھا غالباً" مگر وہ علاقہ ڈیفنس کا تو نہیں تھا۔" نصیر کے اس سوال پر وہ لحظہ بھر چپ رہی پھر تکیہ بے وجہ درست کرنے لگی اور جیسے بہانہ بناتے ہوئے بولی۔

"وہ تو اس کا میکا تھا ناں اس کی سسرال ڈیفنس میں ہے ناں میں نے سوچا۔ میکے میں جانے کے بجائے وہیں چلی جاؤں۔ وہ میکے میں کہاں آتی ہے۔"

"اچھا اچھا۔" تھکن کے باعث نصیر کی آنکھیں ویسے ہی بند ہو رہی تھیں وہ مطمئن سا ہو کر کروٹ بدلتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے چلی جانا میں بھیج دوں گا گاڑی۔"

فضا نے اس کی پشت پر نگاہیں جماتے ہوئے ایک ہلکی سی سانس کھینچی۔ ایک پل اسے نصیر کی اس معصومیت اور سادگی پر بے طرح پیار آیا۔ اسے یہ جھوٹ بولتے ہوئے افسوس ضرور ہوا تھا مگر اپنے دل پر رکھے اس بوجھ کو کم کرنے کا اسے یہ واحد حل ہی دکھائی دے رہا تھا۔



لائبہ کے نکاح سے چند روز پہلے سبینہ نے ڈھولکی کے نام سے بہت بڑی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ عاظمہ حوریہ کو بھی ساتھ چلنے پر اصرار کرنے لگیں۔

"میرا بھلا وہاں کیا کام آنٹی۔"

"خود کو اس خول سے باہر نکالو حوریہ ڈیئر ورنہ زندہ کیسے رہ پاؤ گی اتنی چھوٹی عمر ہے ابھی تو تمہاری۔" پھر نرمی سے اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے بولیں۔ "اتنی ڈپریسڈ کیوں ہو۔ کوئی پرابلم ہے۔"

"ارے نہیں ڈپریشن کی بات نہیں ہے۔" حوریہ جلدی سے بولی۔ پھر بیڈ پر بکھرے دمکتے کپڑوں پر نگاہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"آپ نے ناحق اتنی شاپنگ کرلی۔ میں اس طرح کے کپڑے کہاں پہنتی ہوں۔ نہ اس طرح کی پارٹیز میں جاتی ہوں۔"

"نہیں جاتیں تبھی تو لے جا رہی ہوں۔ اچھا چلو زیادہ دیر مت بیٹھنا۔ ایک آدھ گھنٹا بیٹھ کر آجائیں گے۔ اوکے۔" عاظمہ کا انداز دلدارانہ تھا۔ "دیکھو میری خوشی کے لیے لائبہ بھی خوش ہو جائے گی۔ اچھا یہ والا سوٹ دیکھو کتنا ڈیسنٹ ہے کام بھی بیوی نہیں ہے سوفسٹیکیٹڈ (نفیس) ہے۔" عاظمہ نے ہینگر اٹھایا اور اس سے جوڑا نکال کر حوریہ کی طرف بڑھایا۔

نیلے اور سیاہ ہلکی کڑھائی والا بے حد پیارا نفیس سا جوڑا تھا۔ جس کے دوپٹے کے کناروں پر بھی ہلکا کام تھا۔

"اسے پہن کر دکھاؤ۔ آلٹریشن (ترمیم) کی تو ضرورت نہیں ہے۔" حوریہ ان کے بے حد اصرار پر جانے پر راضی ہو گئی تاہم یہ جوڑا پہن کر دکھانے میں تامل کرتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہی لگ رہا ہے مجھے تو۔ بس پہن لوں گی۔"

"تھینک یو سو مچ ڈیئر۔ تم نے میرا دل خوش کر دیا۔" پھر سوٹ کا دوپٹا اٹھا کر اس کے کندھے پر رکھنے لگیں۔

"واؤ زبردست۔" ان کی نگاہوں میں توصیف تھی۔

حوریہ نے آہستگی سے دوپٹا کندھے سے ہٹا دیا اور تہ کرنے لگی۔

اس کا دل افسردگی میں ڈھل گیا۔ اسے یاد تھا ایسے کپڑوں کی وہ کتنی شوقین تھی جب بھی حازم اس کے لیے اس طرح کا کوئی نیا جوڑا لاتا وہ خود اسے زیب تن کر لیتی تھی۔ اس کی خوش نما آنکھوں میں اداسی بکھر گئی وہ سوٹ ہینگ کرنے لگی۔

"بابر کو بھی میں نے اسلام آباد جانے سے روک لیا ہے وہ تو آج ہی جا رہا تھا۔" عاظمہ کپڑے اٹھا کر وارڈروب کی طرف پلٹتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"اب بھلا بتاؤ ہم ٹوٹل تین ممبر تو ہیں گیلانی ہاؤس کے اس میں سے بھی وہ چلا جائے تو کیا رہ جاتے ہیں۔ اور پھر اس نے لائبہ کو ہرٹ بھی کیا ہے اچھا خاصا۔ اب نہیں جائے گا تو وہ اور بھی ہرٹ ہو گی یا نہیں۔" وہ وارڈروب کھول کر کپڑے لٹکانے لگیں۔

"لائبہ کو کیوں ہرٹ کیا ہے اس نے۔" حوریہ چونکی اور بے اختیار پوچھ بیٹھی۔ جواباً" عاظمہ کے لبوں سے ایک گہری ہوک نما سانس آزاد ہو گئی۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس ایک مبہم سی خاموشی کے پیچھے پناہ لیتی محسوس ہوئیں۔ چند لمحے خاموشی کے بعد وہ وارڈروب بند کر کے اس کی جانب آتے ہوئے بولیں۔

"چلو آؤ۔ چائے پیتے ہیں اور نفیسہ کے ہاتھ کے بدمزا سے اسنیکس کھاتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر

کمرے سے باہر آگئیں۔



ایک عرصے بعد اس نے اتنا کلر فل اور کامدانی سوٹ پہنا تھا۔عاظمہ نے زبردستی اسے ہلکا پھلکا گولڈ پہنایا تھا۔وہ دونوں پارکنگ ایریا میں آئیں تو بابر اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے ان کا منتظر تھا۔کلف لگے بلیک شلوار قمیص اور سیاہ لیدر کی چپلوں میں وہ سادہ سے انداز میں تیار تھا مگر جانے کیوں بے حد خاص لگ رہا تھا۔حوریہ کو عاظمہ کے ساتھ آتے دیکھ کر اس کا دل یکبارگی کسی کالج بوائے عاشق کی طرح دھڑکا۔
نیلے اور سیاہ رنگ کے کنٹراس سوٹ میں وہ بے حد اچھی لگ رہی تھی۔حازم کے انتقال کے بعد وہ شاید پہلی بار اتنے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔تاہم چہرہ اب بھی میک اپ سے بے نیاز تھا۔گولڈ کی نفیس جیولری اور بلیک نیلی کڑھائی والا دوپٹا اسے بے حد خاص بنا رہا تھا۔بابر نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنی غیر معمولی دھڑکن کو گویا سنبھالا دیا تھا۔
وہ جانتا تھا کہ وہ عاظمہ کے بے پناہ اصرار بلکہ اس دو روزہ محنت شاقہ کے بعد وہ اس اہتمام سے تیار ہونے پر راضی ہوئی تھی۔اور وہ اب اپنی نظروں کو مزید سرکش کر کے اسے خفا نہیں کرنا چاہتا تھا۔اس کے نزدیک آنے پر نظروں کا زاویہ بدل گیا۔
بابر کے نزدیک سے گزر کر گاڑی کے دروازے تک آتے ہوئے حوریہ کے قدم لحظہ بھر لرزے تھے۔اس کی نظریں دروازہ کھولتے ہوئے بے اختیار بابر کی جانب اٹھی تھیں۔اور دوسرے پل وہ پلکوں کی باڑھ جھکا گئی تھی۔وہ ایک عجیب سی جھجک محسوس کر رہی تھی۔اس طرح سج سنور کر وہ بابر کے سامنے آنے سے حتی الامکان گریز ہی کرتی تھی اور ادھر بابر بھی سوچ رہا تھا کہ اس طرح اہتمام سے اس کے سامنے نہیں آ کر اچھا ہی کرتی ہے۔ورنہ سرکش منہ زور فطری جذبوں کی لگامیں کھینچنا بڑا مشکل ہو جاتا تھا اس کے لیے۔
"ارے ڈرائیور کہاں ہے؟"عاظمہ' بابر کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتا دیکھ کر بولیں۔
"میرے گاڑی چلانے پر آبجیکشن (اعتراض) ہے آپ کو۔"
"کم آن آبجیکشن کیوں ہونے لگا۔"عاظمہ بھی پچھلی سیٹ پر حوریہ کے ہمراہ بیٹھ گئیں۔علی شاہ کو حوریہ نے اپنی گود میں بٹھالیا تھا۔
پرفیوم کی مدھم مہک' بابر کے بیٹھتے ہی گاڑی کی فضا سے ہم آہنگ ہو کر بابر کی موجودگی کا احساس بن کر حوریہ کو بے نام سی وحشت میں مبتلا کر گئی۔یہ وہی خوشبو تھی جو اکثر حازم استعمال کرتا تھا۔اور حازم نے ہی اسے بتایا بھی تھا کہ یہ اس کا فیورٹ پرفیوم ہے۔جو بابر اسے گفٹ کرتا ہے۔جب وہ بئی جاتا ہے اس کے لیے ضرور لے کر آتا ہے۔
"کتنے بجے آپ لوگ فری ہو جائیں گے۔"وہ پارکنگ سے گاڑی نکالتے ہوئے عاظمہ سے مخاطب تھا۔
"اب ڈھولکی ہے۔کوئی ٹائم لمٹس تو نہیں ہوتی نا اس طرح کی رسموں کی۔"
"اوکے.....میں کچھ دیر بیٹھ کر چلا جاؤں گا۔پھر ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔"



مبینہ آپا کی کوٹھی کا بڑا سا خوب صورت باغیچہ آراستہ پیراستہ تھا۔جگر جگر کرتی لائٹوں اور پیلے پھولوں سے پورا لان بے حد خوش نما دکھائی دے رہا تھا۔ایک طرف ڈھولکی لے کر بیٹھنے والی لڑکیوں کے لیے بڑا سا اسٹیج بنایا گیا تھا جہاں مووی میکرز سب سے زیادہ تھے۔
مہمانوں کے لیے ایک طرف صوفے تھے اور ایک طرف میز اور کرسیاں سجائی گئی تھیں۔صوفوں پر زیادہ تر عمر

رسیدہ خواتین براجمان تھیں۔ کچھ لڑکیاں ڈھولک لیے جمع تھیں اور کچھ ادھر ادھر گھوم کر سلفیاں بنا رہی تھیں۔
عاظمہ، علی شاہ کو لیے سبینہ اور دوسری عمر رسیدہ خواتین کی جانب بڑھ گئی تھیں۔
ڈیک فل والیوم سے بج رہا تھا۔ حوریہ اپنے قدموں کو سرخ کارپٹ پر جماتی قدم اٹھانے لگی۔ مگر اسے لگا یہاں آ کر اٹھنے والی بہت سی نظروں سے اس کا اعتماد دھوپ میں رکھی برف کی طرح پگھلنے لگا ہو۔ اوپر سے گانوں کی تیز تیز آوازیں۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ کرسی سے ٹکرائی مگر پیچھے آنے والے بابر نے جلدی سے اس کا بازو تھام لیا تھا ورنہ وہ کرسی کے ہمراہ خود بھی ضرور الٹ جاتی۔
"بی کیئر فل حوریہ۔" بابر کا لہجہ حوصلہ دیتا ہوا تھا۔
"تھتھ... تھینک یو۔" وہ نادم سی ہو گئی اور جلدی سے اس کی گرفت سے ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھی۔
"یہیں بیٹھ جاؤ۔" بابر اس کے لیے ایک میز سے منسلک کرسی کھینچتے ہوئے بولا "مام بھی کہاں چلی گئی۔ تمہیں ساتھ ہی لے جاتیں۔"
"آئی ایم فائن۔" وہ خود کو سنبھال کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ "آنٹی کے ساتھ میں کیا کروں گی۔ میں تو یہاں کسی کو جانتی بھی نہیں ہوں۔" وہ اطراف میں نگاہیں دوڑانے لگی۔
بابر نے اسے دیکھا پھر مبہم سے انداز میں مسکرایا۔
"میرے ساتھ بھی یہی پرابلم ہے۔ میں بھی یہاں کسی کو نہیں جانتا۔" یہ کہہ کر وہ کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے حوریہ کچھ کہتی وہ بولا۔
"مما سے میں نے کہا بھی تھا کہ لیڈیز گیدرنگ میں میرا کیا کام... اینی ویز ایسا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو کمپنی دیتے ہیں۔ کیا خیال ہے۔"
"اول تو یہ کہ مجھے یہ خالص لیڈیز گیدرنگ تو نہیں لگ رہی ہے اور دوسرا یہ کہ تمہاری کزن ہے لائبہ۔ اور تمہارے اور بھی بہت سے کزنز جاننے والے یہاں ہوں گے ہاں تم یہاں بیٹھنا چاہ رہے ہو یہ الگ بات ہے۔" وہ طنز سے بولی تھی اور اطراف سے گزرتی لڑکیوں کو دیکھنے لگی۔
بڑی خوب صورت لڑی ہو رہی تھی۔ وہ دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ لائبہ کو اپنی ہونے والے شوہر کے ہمراہ خوب صورت سے لہنگے سوٹ میں اسٹیج پر آئی تو موی میکرز کی لائٹوں نے پورے اسٹیج کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہر طرف کے کیمرے آن ہو گئے تھے۔
"بہت پیاری لگ رہی ہے لائبہ۔" حوریہ بھی پوری دلچسپی سے لائبہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔
کچھ بھی تھا اسے بابر کا دم غنیمت لگ رہا تھا۔ وہ خود کو اس پارٹی میں مس فٹ محسوس کر رہی تھی بابر کی موجودگی میں اسے تقویت مل رہی تھی اور وہ خود بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ بابر بھی محض اسی کی خاطر یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وگرنہ اس کے جاننے والے یہاں اچھی خاصی تعداد میں تھے۔
"ہاں بہت خوب صورت۔" بابر کرسی کی پشت پر سر ٹکائے ہوئے حوریہ کو بہ نظر غور دیکھتے ہوئے مدھم سے لہجے میں بولا۔ حوریہ نے اس کے لہجے کا غیر معمولی پن محسوس کر کے چہرے کا رخ اسی کی جانب کیا پھر سٹپٹا کر جلدی سے بولی۔
"میں لائبہ کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔" بابر یکدم ہنس پڑا۔ "تھینکس کہ تم لہجوں کو تو پہچاننے لگی ہو کہ میں یہ بات تمہارے لیے کہہ رہا تھا۔"
"بابر، بی سیریس۔" "مجھے اس طرح کے بے ہودہ مذاق بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔" وہ برا مان گئی اس کی پیشانی پر سلوٹ پڑ گئی۔

"تمہیں ایسا کیوں لگا ہے کہ میں مذاق کر رہا ہوں تم سے۔" وہ لبوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ سمیٹتے ہوئے بولا۔
"ناٹ فار جوک۔"

"اسے مذاق تک ہی رہنے دو۔۔۔ آج لائبہ واقعی اچھی لگ رہی ہے اور تم نے ایک اچھی لڑکی کو کھو دیا۔"
بابر نے کچھ کہنا چاہا کہ ویٹر چلا آیا اور ہاتھ میں پکڑی ٹرے سے جوس کے دو گلاس ان دونوں کے درمیان ٹیبل پر رکھتے ہوئے ان پر ایک نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گیا۔

"میں یہاں نہ لائبہ کو دیکھنے آیا ہوں۔ نہ اس کی تعریفوں کے پل باندھنے تم اس ٹاپک کو رہنے ہی دو تو اچھا ہے۔" وہ جیسے چڑ کر بولا تھا پھر گلاس اپنی طرف کھینچ کر اسٹرو سے ہلکے ہلکے سپ لینے لگا۔
حوریہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا وہ یکدم چڑا ہوا دکھائی دینے لگا تھا۔ جیسے حوریہ کا یہ جملہ اسے بے حد برا لگا ہو۔ "پتا ہے بابر کبھی کبھی ہم جس دوستی کے لیے بہت سے جگنو پیچھے چھوڑ آتے ہیں اور جب اس روشنی کے دھوکے میں اس تک پہنچتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہاں تو اور بھی گہرا اور دبیز اندھیرا ہے۔ تب آپ بہت اونچائی سے گرتے ہیں ایک ایسے خلا میں جہاں ہیبت ناک تنہائی اور اس سے بھی زیادہ گہری تاریکی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"
بابر نے جواباً "بڑے انہماک سے اس کی طرف دیکھا تھا۔
"اور میں نہیں چاہتی کہ بابر تم بھی کسی ایسے خلا کا حصہ بن جاؤ۔"
بابر کو یکدم اپنے اعصاب کھنچتے ہوئے محسوس ہوئے مگر صرف لمحہ بھر کے لیے۔ دوسرے پل اس نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اس کے میز پر رکھے نرم ملائم ہاتھ پر مضبوطی سے جما دیا۔
"سب کچھ جاننے کے باوجود آپ اس خلا میں بھی اترنے سے نہ ڈریں پھر؟"
اس کے لہجے میں ویسا ہی اضطراب تھا تڑپ تھی۔ اس کے ہاتھ کے مضبوط دباؤ میں حوریہ کا صرف ہاتھ ہی نہیں پورا وجود کانپ کر رہ گیا تھا۔
اندر سے ایک تلاطم لہرا اٹھی مگر پھر تحمل اور ضبط کی ریت میں جذب ہو گئی۔
"خود کو دھوکے اور ایک مسلسل اذیت میں رکھنے کا فائدہ۔" اس نے معمولی زور آزمائی کے بعد اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

"تم نے ابھی صرف لائبہ کو کھویا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ خود کو بھی کھو دو۔"
"اب یہاں نفع و نقصان کا حساب کسے رکھنا ہے۔" وہ دل گرفتگی سے ہنس پڑا۔ پھر ذرا سا آگے ہو کر براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔
"اگر تم کو پانے کے لیے خود کو بھی کھونا پڑے تو اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ جاں کے زیاں تک جا سکتا ہوں حوریہ تم آزماؤ تو سہی۔"

حوریہ سن سی پتھر کی مورت کی طرح کرسی پر گویا گڑی رہ گئی۔ اس کی قربت۔ اس کی لمس کی برقی لہریں اور اس کے جملوں کی آتشیں گولیاں اس کے اعصاب پر بہت بھاری ثابت ہو رہی تھیں مگر وہ اس سے پہلے کہ کچھ کہتی رد عمل ظاہر کرتی بابر یکدم کرسی سے جھٹکے سے اٹھا تھا۔
اس کی نظریں علی شاہ پر اٹھی تھیں جو کب عاظمہ کی گود سے اتر کر سیڑھیوں کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اب کسی بچے کے دھکے سے سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ خود کو سنبھال نہ پا رہا تھا۔ بابر کے کرسی دھکیلنے پر کرسی الٹ گئی تھی بابر دوڑتا ہوا اسٹیج کی جانب بھاگا تھا جہاں پہلے ہی افراتفری مچ گئی تھی۔ علی شاہ کی نازک نرم سفید پیشانی سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا حوریہ بھی دہشت زدہ سی پیچھے لپکی تھی۔ ایک چیخ اس کے لبوں پر پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

اطراف کھڑے لوگ منتشر ہو گئے تھے خواتین ہائے۔اف' ویری سیڈ کا شور مچاتی ایک طرف ہوئی تھیں بابر علی شاہ کو اٹھا کر باہر کی جانب بھاگا تھا۔

"ارے یہ تو شاید عاظمہ کا پوتا تھا۔" ایک آواز ابھری۔"ویری سیڈ بہت بری طرح انجرڈ (زخمی) ہوا ہے۔ بھئی عاظمہ کو تو انفارم کرو۔" مختلف آوازیں تھیں حوریہ بھی سنی ان سنی کرتی بابر کے پیچھے لپکی تھی۔

"کم آن ہری اپ۔" بابر نے حوریہ کے قریب آنے پر علی شاہ کو اس کی گود میں تھمایا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔حوریہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"بہت خون بہہ رہا ہے۔" حوریہ ٹشو سے اس کی پیشانی دبائے ہوئے لرزیدہ آواز میں بولی اس کی انگلیاں خون میں ڈوب گئی تھیں اور کپکپا رہی تھیں۔

"ہمت کرو یہ ٹشو ہٹاؤ اور اپنا دوپٹا باندھو۔" بابر بے حد رش انداز میں گاڑی بھگانے لگا۔

"مما حد سے زیادہ کیرلیس (لاپروا) ہیں۔انہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔کوئی خیال ہی نہیں ہے انہیں۔" وہ سخت خائف ہو رہا تھا اور عاظمہ کو موردالزام ٹھہراتا گاڑی بھگا رہا تھا۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اڑانے لگے۔حوریہ کی اپنی حالت بے حد پتلی ہو رہی تھی بہتا ہوا خون اس کے اعصاب کو بری طرح متاثر کر رہا تھا وہ بامشکل اپنے آنسو روکے بیٹھی تھی اور علی شاہ کی پیشانی پر دوپٹا لپیٹنے لگی تھی۔



علی شاہ کو فوری ایڈمٹ کر لیا گیا تھا اسے فرسٹ ایڈ دے دی گئی تھی بابر ڈاکٹر کے روم سے آیا تو حوریہ علی شاہ کے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھی ہلکے ہلکے سسکیاں بھر رہی تھی۔بابر کو دیکھ کر جھٹکے سے اٹھی۔

"بابر! میرا بچہ ٹھیک تو ہو جائے گا ناں۔" وہ تکلیف دہ احساس سے علی شاہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں کیوں نہیں۔" بابر نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ جیسے اپنا سارا ضبط کھو بیٹھی۔ذہن اپنے خلفشار اور شکستگی کے درد سے پہلے ہی چور تھا' اس ضرب نے اس کے اعصاب کو بالکل ڈھیلا کر دیا۔وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر بندھ توڑ بیٹھی۔بابر کے سینے سے سانس بامشکل آزاد ہوئی تھی وہ دم سادھے رہ گیا۔اسے اپنا کندھا یوں جلتا ہوا محسوس ہوا جیسے اس پر آتشی سیال گر رہا ہو۔

"ڈونٹ وری سب ٹھیک ہے نا' دیکھو اللہ نے بچا لیا۔" اس نے نرمی سے اس کا کندھا تھپک کر اس کا سر اونچا کر کے اسی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

آنسوؤں سے لبریز سلگتی شہد رنگ آنکھیں اس کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔وہ خالی خالی نظروں سے پہلے تو بابر کو دیکھنے لگی پھر جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹی جیسے گہری نیند سے بیدار ہوتے ہی کوئی خوف زدہ منظر دیکھ لیا ہو۔بہتے آنسو ٹھٹھر کر رک گئے۔بابر کا ہاتھ اس کے کندھے سے پھسل کر پہلو میں گر گیا تھا۔

"فسٹ ایڈ تو دے دی ہے ناں۔بس ایک آدھ گھنٹے میں ہوش آجائے گا تو اسے گھر لے جائیں گے۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا یا خود کو کسی احساس کے سحر سے نکالنے کی غرض سے بولا تھا۔

"میں تمہارا یہ احسان عمر بھر نہیں بھولوں گی بابر۔" وہ رخساروں پر بہتے آنسو ہتھیلی سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

"احسان۔" بابر نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔وہ سٹپٹا کر ہونق کی طرح بابر کو دیکھنے لگی جس کے چہرے پر غصہ لہرا گیا تھا۔

"یو مین..... میں تم پر کوئی احسان کر رہا ہوں۔اپنے بچے کو بچانا احسان ہے۔"

"مم... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ گڑبڑا کر پیچھے ہٹی۔
"میں بہت ٹینس ہوگئی تھی' میرا علی شاہ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔" اس کا لہجہ دل گرفتہ سا تھا۔
"میرا بھی علی شاہ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔" بابر جوابا" آہستگی سے یہ کہہ کر اس پر ایک نظر ڈال کر پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ حوریہ دم سادھے کھڑی رہ گئی تھی۔



گیلانی ہاؤس میں ہر کوئی علی شاہ کے زخمی ہونے پر پریشان تھا۔ عاظمہ ندامت محسوس کرتے ہوئے بار بار حوریہ سے معافی مانگ رہی تھیں۔
"ارے آنٹی بچے تو گرتے رہتے ہیں۔ بھلا اس میں آپ کا کیا قصور۔" وہ ان کا دل رکھنے لگی۔
"بابر تو مجھے ہی بلیم (قصوروار ٹھہرا) کر رہا ہے بہت خفا ہے مجھ سے اور وہ غلط نہیں ہے میں ہی کیئر لیس ہو گئی تھی۔" وہ علی شاہ کی پٹی میں بندھی پیشانی بار بار چوم رہی تھیں۔
"آئی ایم ساری میری جان۔"
ادھر بابر علی شاہ کی وجہ سے آفس بھی نہیں گیا۔ اس کے لیے کھلونوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ اور خود علی شاہ کا خیال رکھ رہا تھا۔ ملازموں کو الگ ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا۔ شام ہوئی تو وہ علی شاہ کو لان میں لے کر چلا آیا اور اسے آرام دہ چیئر پر بٹھا کر اس کے کھلونوں سے کھیلتے ہوئے اسے خوش کرنے لگا۔ تب پھاٹک کا چوکیدار اس کی طرف آیا۔ اور اس کو مہمان خاتون کے آنے کی اطلاع دی۔
"اوکے امیر علی سے کہو اسے ڈرائنگ روم میں بٹھائے۔ میں آتا ہوں۔"
وہ کسی مہمان خاتون کا سن کر حیران ہوا تھا تاہم کوئی سوال نہیں اٹھایا اور گھاس کے فرش سے کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ گیا اور علی شاہ کو اٹھا کر اندر کی جانب چل دیا۔



فضا... گیلانی ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر جیسے کھو سی گئی۔ اس کی آرائش زیبائش نے چند لمحے اسے گم صم سا کر دیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ دولت سے حسن کس طرح جنم لیتا ہے۔
دروازے پر کھٹکا ہوا تو اس نے ہلکی سی سانس سینے کی تہ سے آزاد کرتے ہوئے بے حد اعتماد کے ساتھ دروازے کی جانب دیکھا جہاں سے بابر اندر داخل ہو رہا تھا۔ مگر چند قدم کے بعد اپنے سامنے کھڑی فضا تنویر کو دیکھ کر اسے اچھا خاصا ذہنی جھٹکا لگا تھا۔
جبکہ بابر کو دیکھ کر فضا کے لبوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ سکڑ کر حیرت میں بدل گئی تھی۔ اس کی نظریں بابر کی گود میں موجود علی شاہ پر جمی تھیں۔ اسے ایسا ہی ذہنی جھٹکا لگا تھا جیسے بابر کو... اسے بہت اچھی طرح یاد تھا کہ یہ بچہ "حوریہ" کا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



ناولٹ

ملیحہ راشد

زندگی کے انوکھے رنگ

سیڑھیوں کی سمت سے ابھرتی قدموں کی چاپ وہ با آسانی پہچان سکتی تھی۔ لائٹ کی بندش کے باعث آنے والا سنبھل سنبھل کر قدم بڑھا رہا تھا۔ پلنگ پر پڑی چھوٹی سی ٹارچ کو اس نے بے حد احتیاط سے اٹھایا تھا اور پھر انگلیوں کی پوروں سے ٹٹول کر بٹن دبا کر آن کرتے ہی ہلکی سی روشنی پورے کمرے میں پھیل گئی تھی۔ اس نے ٹارچ کا رخ داخلی دروازے کی طرف موڑا تھا۔ تاریکی میں ابھرنے والا سایہ اب ٹارچ کی روشنی کی زد میں آچکا تھا۔ آنے والے کی آنکھیں چندھیانے لگی تھیں۔

"اوہو! ہٹاؤ روشنی کو۔" سارینہ نے دایاں ہاتھ آنکھوں پر رکھتے ناگواری سے کہا تھا۔ بیڈ پر بیٹھی حریم کا دل شرارت پر آمادہ ہونے لگا تھا۔ چونکہ چارج نہ ہونے کی وجہ سے ٹارچ کی روشنی بے حد مدھم تھی اس لیے وہ سارینہ کو نظر نہیں آسکتی تھی اور اسی کا وہ فائدہ اٹھا کر اسے تنگ کرنے لگی تھی۔

"آپا... بول کیوں نہیں رہی ہو کدھر ہو۔" سارینہ نے سرگوشی کے سے انداز میں جھنجلاتے ہوئے کہا تھا۔ حریم جانتی تھی کہ سارینہ کو خاموشی سے خوف آتا تھا اسی لیے وہ سب کچھ برداشت کر لیتی تھی مگر اس کی خاموشی نہیں اور ایسا ہی ہوا تھا۔ سارینہ کے چہرے پر پریشانی کے ساتھ ساتھ خوف کے آثار بھی نمودار ہونے لگے تھے۔ وہ چپ چاپ بیٹھے اس کی پل پل بدلتی حالت کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔

"آپا... نہیں... آپا نہیں۔" یکدم ہی سارینہ کی آنکھوں سے جھرنے بہنے لگے تھے اور وہ جو اس کی حالت سے محظوظ ہو رہی تھی سب کچھ بھول کر برق رفتاری سے اس کی طرف لپکی تھی۔

"سیری... میری جان۔" اس نے مضبوطی سے بانہوں کے حصار میں لیتے اسے پکارا تھا۔

"آپا چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی ناں... کہیں نہیں جاؤ گی ناں۔" وہ ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامتے بے یقینی سے اسے تکتے بولی تھی۔

"نہیں میری جان... سارینہ میں کیوں تمہیں چھوڑ کر جاؤں گی۔ تم تو میری روح میرا دل ہو۔" اس نے ماتھے پر بوسہ دیتے اسے خود سے اور قریب کیا تھا۔ اس کا دل اپنی اس حرکت پر نادم ہونے لگا تھا۔ خود کو دل ہی دل میں ملامت کرتے وہ سارینہ کا ہاتھ تھامتے اسے بیڈ تک لائی تھی۔ سارینہ کی حالت دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا تھا۔



"اے بخشی! کم بخت اٹھ جا... دیکھ دن کتنا چڑھ آیا ہے۔" بلقیس بیگم کی چنگھاڑتی آواز پر چارپائی پر پڑے چھپکلی جیسے وجود میں ہلکی سی جنبش ہوئی تھی۔

"کیا۔" بے حد کراہتے ہوئے بخشی نے کروٹ بدلتے کہا تھا اور اسی ذرا سی کوشش سے ہی اس کے منہ سے رال بہنے لگی تھی۔ جسے بلقیس بیگم نے ہاتھ میں پکڑے گیلے تولیے سے صاف کیا تھا اور پھر وہی تولیہ باقی چہرے پر بھی پھیر دیا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر کھڑی حریم کا دل متلانے لگا تھا یہ سب کچھ دیکھ کر۔

"پھوپھی! میں چائے بنا لاؤں۔" اس نے ہاتھ میں



پکڑی ناشتے کی ٹرے جلدی سے پاس پڑی دوسری چارپائی پر رکھتے بلند آواز میں کہا تھا اور تیزی سے قدم باہر کی طرف بڑھائے تھے۔ اسے زور سے ابکائی آنے لگی تھی۔

"اف!" کچن میں آتے ہی اس نے لمبے لمبے سانس لیے تھے۔ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا تھا۔

"یا اللہ! رحم کر ہم سب کے حال پر۔" ماربل کی شیلف پر ہاتھ جمائے اس نے آنکھیں مضبوطی سے بند کر کے دل سے رب کو پکارا تھا۔

"کہاں رہ گئی حریم چائے کا ایک کپ بنانے میں کیا پورا دن لگے گا۔" بلقیس بیگم کی چنگھاڑ ایک بار پھر پورے گھر میں گونجی تھی۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھولتے دروازے کی طرف دیکھا تھا کہ مبادا آ ہی تو نہیں گئیں کچن میں اور پھر جلدی سے چولہے کی آنچ تیز کرتے دیگچی چڑھائی تھی۔

"اتنی دیر۔۔۔" وہ جیسے ہی چائے لے کر کمرے میں گئی پھوپھی اس پر برس پڑی تھیں۔

"کب سے میرا بچہ سوکھے توس چبا رہا ہے۔ مگر تمہیں کیا فکر۔۔۔ تمہاری تو جانے بلا۔" کپ ہاتھ سے لیتے وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھیں اور یہ ان کا واحد من پسند کام تھا جو وہ ہر لمحہ سرانجام دینے کے لیے سرگرم رہتی تھیں۔

"اچھا۔۔۔ اب یوں کرو یہ برتن لے جاؤ اور پہلے صفائی کر لو گھر کی، ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے صفائی کے بعد ناشتا لے جانا۔" بخشی کے سینے پر تولیہ لگا کر وہ انہیں چائے پلاتے اگلا آرڈر دے رہی تھیں اور وہ چپ چاپ دل پر جبر کر کے انہی قدموں لوٹ گئی تھی۔ نمکین پانی حلق میں اترنے لگا تھا۔ اس نے آنکھوں کو مسلتے جلدی سے جھاڑو اٹھائی تھی اور صحن صاف کرنے لگی تھی۔

✡ ✡ ✡

"سیری!" کمرے میں داخل ہو کر اس نے ہولے سے پکارا تھا۔

"ابھی تک ناراض ہو مجھ سے۔" جواب نہ ملنے پر وہ شرمندہ سی بیڈ پر اس کے پاس بیٹھ گئی تھی جب کہ سارینہ نے ہنوز چادر تانی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ مت بولو۔۔۔ لے لو بدلا اپنا۔۔۔ میں بھی ایسے ہی بھوکی بیٹھی رہوں گی۔" حریم نے اس کی چادر کھینچنی چاہی تھی مگر سارینہ نے سختی سے چادر کو سر کے نیچے لپیٹا ہوا تھا۔ رات والے واقعے کی بنا پر وہ حریم سے شدید خفا تھی۔

"اچھا میں برتن دھونے جا رہی ہوں۔ بھوک تو بہت لگ رہی تھی مجھے مگر جب میری کسی کو فکر ہی نہیں تو واویلا کیا مچانا۔ اچھا ہے بھوکی مر جاؤں گی۔" اس نے روہانسی آواز بنا کر اونچی آواز میں کہا تھا اور تیر سیدھا نشانے پر جا لگا تھا۔

"آپا۔" وہ اٹھنے ہی لگی تھی کہ سارینہ تیزی سے چادر ہٹاتے بولی تھی۔ اور حریم کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

"کتنی بری ہو تم آپا۔۔۔ پہلے خود ہی شرارت کرتی ہو اور پھر جذباتی بلیک میلنگ کرنے لگتی ہو۔ ایک شرط پر معاف کروں گی۔" اس نے چادر پرے کرتے آلتی پالتی مارتے کہا تھا۔

"کیا۔" حریم نے ناشتے والی پلیٹ درمیان میں رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کل مجھے ناشتے میں آملیٹ بنا کر کھلاؤ گی۔" سارینہ نے پراٹھے کا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے معصومیت سے کہا تھا۔

"کوشش کروں گی۔" حریم نے اس کی معصوم صورت پر نظریں ٹکاتے کہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ پھوپھی فریج کو تالا لگا کر رکھتی ہیں اور ہر چیز کو گن کر پورے حساب کتاب کے ساتھ ترتیب دے کر محفوظ کر لیتی ہیں اپنے اور بخشی کے لیے۔

"کوشش نہیں مجھے پکا وعدہ دو۔" سارینہ نے ایک دم اسے آنکھیں دکھائی تھیں اور چائے کا کپ ٹرے میں واپس رکھ دیا تھا۔ یہ اس کے احتجاج کا طریقہ تھا۔

"اچھا بابا! تم ابھی پراٹھا، چائے ختم کر لو میں تمہیں

کل آملیٹ بنادوں گی۔" حریم نے جلدی سے اسے چائے کا کپ تھماتے کہا تھا۔

"یاہو... یہ ہوئی نا بات۔" سارینہ نے خوشی سے نعرہ لگایا تھا جبکہ حریم اس کے چہرے کے رنگوں کو بغور دیکھتے ہوئے آملیٹ کے بندوبست کا منصوبہ بنانے لگی تھی۔ خواہش تو بہت بے ضرر سی تھی مگر ظالم وقت نے اسے مشکل بناڈالا تھا۔

☆ ☆ ☆

عبدالرحمن کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ جن کو وراثت میں چار مرلے کا مکان ہی مل سکا تھا۔ خود عبدالرحمن ایک میڈیکل اسٹور کے گارڈ کی نوکری کرتے تھے۔ ماں باپ کی وفات ہو چکی تھی اور ایک بہن تھی جو چند سال پہلے بیوہ ہو کر واپس انہی کے گھر اپنے چھ سال کے بیٹے کے ہمراہ آگئی تھیں۔ عفت جہاں ایک صابر و شاکر خاتون تھیں جو ہر طرح کے حالات میں اپنے شوہر کے شانہ بشانہ کھڑی ہوتی تھیں۔ عفت جہاں سے ان کی دو بیٹیاں ہوئیں حریم اور سارینہ۔ حریم ابھی پانچویں کلاس میں تھی کہ ایک دن عفت جہاں اور عبدالرحمن بازار سے سودا سلف خرید کر واپس آتے تیز رفتار ویگن کی زد میں آگئے۔ شدید زخمی حالت میں انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ مگر وہ دونوں جانبر نہ ہو سکے اور یوں آٹھ سالہ حریم اور تین سالہ سارینہ یتیم ہو کر پھوپھی کے زیر عتاب آگئیں۔

بلقیس بیگم جو کہ انتہائی شاطر اور تند خو مزاج کی تھیں اب اور بھی زیادہ حاکمانہ مزاج دکھانے لگی تھیں۔ پہلے چند سال تو انہوں نے برادری والوں کے ڈر سے حریم کو اسکول جانے دیا مگر حریم کے مڈل کرتے ہی انہوں نے اسے یہ کہہ کر گھر بٹھالیا کہ جوان لڑکی کی حفاظت کا معاملہ ہے وہ کسی بھی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتی اور اس طرح برادری والے بھی ان کی سمجھ داری کو سراہنے لگے اور ان کے اس مخلصانہ اقدام کی تائید کرنے لگے۔

بلقیس بیگم کو شوہر کے حصے کی زمین سے اتنی آمدن ہو جاتی تھی کہ وہ گزر بسر کر سکیں۔ بخشی ان کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ بھی معذور اس لیے گھر کے اخراجات پورے کرنا ان کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ حریم کو اسکول سے اٹھواتے ہی انہوں نے گھر کے کام پر لگا دیا تھا۔ جبکہ سارینہ کو ایک سرکاری اسکول میں داخل کروایا تھا۔ جب بھی کوئی برادری کی خاتون آتیں تو وہ حریم سے پر شفقت رویہ اختیار کر لیتیں جس سے آنے والے کو رتی بھر بھی محسوس نہ ہو پاتا کہ یہی بلقیس بیگم ان کے جاتے ہی کیسی خوں خوار ہو کر حریم پر جھپٹ پڑتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"حریم! میں ذرا ابھی آرہی ہوں۔ دروازہ اچھی طرح بند کر لو۔" وہ کچن میں ناشتے کے برتن دھو رہی تھی جب صحن سے پھوپھی کی آواز آئی۔

"جی اچھا۔" اس نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھے صحن

کی طرف قدم بڑھائے تھے۔
"اور کوئی بھی آئے دروازہ مت کھولنا۔" وہ چادر کی بکل مارتے خشمگیں نگاہوں سے گھورتے اسے تنبیہہ کرنے لگی تھیں۔
"جی بہتر۔" اس نے مختصراً" جواب دیا تھا اور خاموشی سے دروازے کا لاک لگایا تھا اور پھر ایک دم جیسے اس کا دل جھومنے لگا تھا وہ سرپٹ کچن کی سمت بھاگی تھی اور جلدی سے چھپایا ہوا انڈہ نکال کر آملیٹ بنانے لگی تھی۔ آج کل دسمبر کی چھٹیوں کی وجہ سے سارینہ گھر پر ہی ہوتی تھی اور اسی لیے حریم اسے جلدی نہیں اٹھاتی تھی۔ آملیٹ تیار کر کے اس نے جلدی سے سب برتن دھو ڈالے تھے۔ اور شیلف کو بھی رگڑ کر صاف کیا تھا کہ کہیں بھی انڈہ یا پیاز ٹماٹر وغیرہ گرا نظر نہ آجائے پھوپھی کو۔ ٹرے میں آملیٹ کی پلیٹ، پراٹھا اور چائے کا کپ رکھ کر اس نے رومال سے ڈھانپ دیا تھا اور جلدی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔
"سیری! میری جان ناشتا تیار ہے۔" اس نے خوشی سے جھومتے کہا تھا۔ سارینہ کی چھوٹی چھوٹی معصوم خواہشیں پوری کر کے اسے بے حد مسرت ملتی تھی اور آج بھی وہ بے حد خوش تھی۔
"آپا! کتنا مزا ہے ناں تمہارے ہاتھ میں۔" سارینہ نے آملیٹ کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔ جبکہ وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا اپنا بچپن اتنا ترستے نہیں گزرا تھا جتنا سارینہ کا۔ اسے اپنے امی ابا کا پیار، لاڈ سب ملا تھا مگر سارینہ نے ہوش سنبھالنے کے بعد صرف اور صرف پھوپھی کے ظلم ہی دیکھے تھے۔ حریم کا دل صرف اور صرف سارینہ کے لیے دھڑکتا تھا دونوں ایک دوسرے کی جان تھیں اور اس وقت بھی سارینہ کے چہرے کو خوشی کو دیکھ کر وہ سب کچھ بھلا بیٹھی تھی یہاں تک کہ دروازے پر مسلسل ہوتی دستک بھی اسے سنائی نہیں دی تھی۔
"میں پوچھتی ہوں حرافہ کدھر مر گئی تھی۔" اس کے دروازہ کھولتے ہی پھوپھی نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے تھے اور اسے بالوں سے پکڑ کر ایک طرف کر کے اندر آتے دوسرے ہاتھ سے دروازہ لاک کیا تھا۔
"پھوپھی کہیں نہیں صفائی کر رہی تھی۔" اس نے لڑکھڑاتی آواز میں کھنچتے بالوں کو چھڑوانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے سر میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔
"پورے آدھے گھنٹے سے دروازہ بجا بجا کر میرے ہاتھ ٹوٹ گئے اور کمبخت کیسے کہہ رہی ہے کہ صفائی کر رہی تھی۔ اگر نیچے تھی تو فوراً" کیوں نہیں کھولا، ہیں... بتا کیا کر رہی تھی مجھ سے چھپا کر۔" اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے حریم کی نازک کمر کی دھنائی کرتے وہ فرعون کا دوسرا روپ لگ رہی تھیں۔
"قسم سے پھوپھی... میں نے کیا کرنا ہے۔ بس سیری کو اٹھانے گئی تھی ابھی۔" درد سے کراہتے الفاظ بمشکل اس کے منہ سے نکلے تھے۔ ایک جھٹکے سے اس کے بالوں کو چھوڑتے بلقیس بیگم سیدھی ہوئی تھیں۔
"دیکھا نکلی ناں سیدھی بات، میرے جاتے ہی مہارانی اوپر بھاگ گئی تھی آرام فرمانے۔" فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں۔ جبکہ زمین پر حریم کا وجود کسی کوڑے کی مانند ڈھیر تھا اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔
"اپنی اس نفسیاتی بہن کا تو بہت خیال ہے تجھے اور وہ جو تیرا منگیتر اندر چارپائی پر پڑا سسک رہا ہے وہ نہیں نظر آتا۔ اس کا حال نہیں دیکھا ہوگا جا کر، مجھے پتا ہے۔" وہ مسلسل بڑبڑاتی کمرے کی طرف بڑھنے لگی تھیں۔ کہ پھر رک کر کچن کو دیکھنے لگیں۔ حریم کا سانس رکنے لگا تھا خوف سے اور پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں اندر سے بخشی کی ہنکاریں ابھرنے لگی تھیں۔ پھوپھی تیزی سے اندر بڑھی تھیں اور حریم نے سینے میں اٹکا ہوا سانس فضا میں خارج کیا تھا۔ وہ کپڑے جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے آج کی واردات پر ذرا بھر بھی کوئی غم نہ تھا کیونکہ اس کا دل سارینہ کی خواہش پوری ہونے کی بدولت سرشار تھا۔



"خالہ آپ فکر نہ کریں میں اس پر اچھی سی کوئی بیل کاڑھ دوں گی اور گلے کا ڈیزائن بھی پیارا سا بنا دوں گی۔" حریم نے خالہ نور جہاں سے قمیص کا پیس اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تھا۔

"آئے! جیتی رہ میری بچی خوش رہو میں جانتی تھی کہ اتنے کم وقت میں صرف یہ کام تم ہی کر سکتی ہو۔ ویسے بھی تمہارے ہاتھ میں بہت صفائی ہے۔" خالہ نور جہاں نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے ممنون لہجے میں کہا تھا جبکہ پھوپھی کو یہ پیار کے مظاہرے ایک آنکھ نہ بھا رہے تھے مگر وہ اپنی ڈپلومیٹک طبیعت کے طفیل خاموش تھیں۔

"تم فکر نہ کرو نور جہاں گھر کے کام تو ویسے بھی نہ ہونے کے برابر ہیں بھئی افراد جو چار ہیں اور جو تھوڑے بہت ہیں بھی تو وہ میں کر لوں گی۔ بس صرف تمہاری خاطر اور نہیں تو' ورنہ میری طبیعت بہت خراب ہے کل سے مگر تم سے دہری رشتے داریاں ہیں۔ تمہاری خاطر میں حریم کو سب کام چھڑوا کر ابھی مشین پر بٹھاتی ہوں۔" بلقیس پھوپھی نے نور جہاں کو اپنے احسانوں کی فہرست سناتے ہوئے اپنی فراخ دلی کا راگ الاپا تھا۔ جس پر نور جہاں جز بز سی ہونے لگی تھیں۔

"ارے بلقیس..... یہی تو میں کل ہی توصیف کے ابا سے کہہ رہی تھی کہ برادری کی سب عورتیں ایک طرف اور بلقیس کا رکھ رکھاؤ ایک طرف' ہر آڑے وقت میں کام آنے والی واحد عورت ہے برادری میں۔" نور جہاں نے بلقیس بیگم کے پاس چارپائی پر بیٹھتے کہا تھا اور کس دل سے وہ یہ سب کہہ رہی تھیں یہ وہ جانتی تھیں یا ان کا خدا۔ دونوں گھرانوں کے درمیان ایک ہی دیوار تھی اور وہ خوب جانتی تھیں کہ بلقیس کس قماش کی عورت تھی۔ اور آج بھی وہ صرف قمیص کا بہانہ لے کر حریم کی خیریت دریافت کرنے آئی تھیں کیونکہ کل انہیں بلقیس کے مارنے پیٹنے کی آواز آ رہی تھی مگر وقت کا تقاضا تھا کہ وہ بلقیس بیگم کو رام کرنے کے لیے ان کی جھوٹی تعریفیں کر رہی تھیں۔

"اچھا خالہ! آپ کڑھائی کے لیے دھاگا بھجوا دینا رانی کے ہاتھ۔" نور جہاں جانے کے لیے اٹھ رہی تھیں جب اس نے کچن سے انہیں آواز دے کر یاد کرایا تھا۔ وہ تیزی سے برتن دھو رہی تھی جو کہ دھلے ہوئے تو تھے مگر پھوپھی کو نجانے کیوں ان میں سے بدبو آ رہی تھی اور اسی لیے انہوں نے سب برتن دوبارہ سنک میں پھینکتے ہوئے حکم شاہی جاری کیا تھا کہ دوبارہ دھوئے جائیں وہ جانتی تھی کہ وہ یہ سب جان بوجھ کر صرف اس سے مشقت کروانے کی غرض سے کرتی ہیں۔

"اچھا بلقیس! میں ذرا جاتے ہوئے حریم سے دھاگوں کے رنگ کے بارے میں پوچھ لوں۔" نور جہاں نے لجاجت سے کہتے بلقیس سے اجازت چاہی تھی۔

"ہاں.... ہاں میں بلاتی ہوں اسے۔" انہوں نے ہاتھ پکڑ کر نور جہاں کو بٹھانے کی کوشش کرتے کہا تھا۔

"ارے وہیں کر لیتی ہوں جا کر بات۔" نور جہاں نے مروتاً مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ بلقیس بیگم کبھی بھی اکیلے میں حریم کے پاس کسی بھی عورت کو جانے نہیں دیتیں۔

"حریم.... حریم۔" اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بہانہ گھڑتیں یا کچھ کہتیں بلقیس بیگم حریم کو آوازیں دینے لگی تھیں۔ نور جہاں بھی چپ چاپ واپس بیٹھ گئی تھیں۔

"جی پھوپھی۔" وہ جلدی سے برآمدے میں ان دونوں کے پاس آتے ہوئے بولی تھی۔

"حریم! بیٹا دھاگے کس رنگ کے بھجواؤں۔" نور جہاں پر شفیق نظروں سے اسے دیکھتی گویا ہوئی تھیں۔

"خالہ.... دو رنگ کے دھاگے سے بیل اچھی لگے گی۔ قمیص کی زمین پیلی ہے۔ اس پر گہرا نیلا اور فیروزی اچھا لگے گا۔" اس نے چارپائی پر پڑی قمیص کو کھول کر پھیلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا پھر یوں کرو میرے ساتھ سارینہ کو بھیج دو۔ میں ابھی اسٹور سے دھاگے لے کر اس کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔ کیونکہ کل یا پرسوں تک تو ماہین نے شادی پر جانے کے لیے پہننا ہے۔" خالہ نور جہاں نے قمیص کو دوبارہ تہ لگا کر واپس شاپر میں ڈالتے جلدی سے کھڑے ہوتے کہا۔

"خالہ! اسے تو کل رات سے بخار ہے۔ دوائی بھی نہیں لی ابھی۔" حریم نے فکرمندی سے کہتے ہاتھ مسلے۔

"اے نور جہاں! خود ہی دے جانا تم، کون سا دور سے آنا ہے تم نے۔" پھوپھی نے خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ اور بلقیس بیگم نے صد شکر ادا کیا تھا ان کے اٹھنے پر، ان کی طبیعت زیادہ دیر کسی کے آجانے سے مکدر ہونے لگتی تھی۔ ویسے بھی انہیں نور جہاں سے چڑ تھی۔



وہ جلدی جلدی سب کام سمیٹ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اسے سارینہ کی فکر کھائے جا رہی تھی جس کو رات سے سخت بخار تھا اور حسب معمول پھوپھی نے دوائی لا کر دینے سے انکار کر دیا تھا وہ شدید پریشان تھی کہ کیا کرے۔ بخشی کے لیے کالی مرچ اور ثابت گرم مسالا ڈال کر اس نے مرغی کی یخنی بنائی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ تھوڑی سی سارینہ کو دے آئے کیونکہ بخار کی وجہ سے اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔

"حریم! یخنی تیار ہو گئی کیا۔" پھوپھی کچن کے دروازے کے بیچ و بیچ کھڑی پوچھ رہی تھیں۔

"جی بس ہونے والی ہے۔" اس نے دیگچی کو ڈھکتے آنچ تیز کی تھی۔ شدت سے اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ پھوپھی کمرے میں چلی جائیں اور وہ تھوڑی سی یخنی نکال لے۔ مگر پھوپھی بھی شاید اس کے ارادے بھانپ گئی تھیں یا پھر انہیں خدشہ تھا کہ کہیں وہ ان پانچ بوٹیوں میں سے کوئی بوٹی غائب نہ کر لے جو انہوں

نے گن کر یخنی کے لیے دی تھیں۔

"اچھا بس ٹرے میں دیگچی ہی رکھ دو' اور پیالیاں چمچے بھی میں خود ہی لے جاتی ہوں۔ تم پیاز کاٹ لو دوپہر کی ہانڈی کے لیے۔" انہوں نے شیلف پر پیالیاں رکھیں تو وہ فوراً" بولی تھی۔

"دیگچی کیوں.... پیالیوں میں نہیں ڈالنی کیا۔" اس نے دل کے بین دباتے ایک امید بھری تھی اور لفظ خود بخود زبان سے پھسلے تھے۔

"نہیں ٹھنڈی ہو جاتی ہے جلدی اس لیے دیگچی ہی دے دو۔ اور زیادہ سوال مت کیا کرو۔ کھڑے کھڑے بندہ سوکھ جائے مگر تمہارے سوالوں کی ٹاریاں بند نہیں ہوتیں۔ ایک ذرا سا کام کرتے دس گھنٹے گزار دیتی ہو۔" وہ نخوت سے ٹرے اٹھاتی اسے صلواتیں سنانے لگی تھیں اور وہ اپنا سامنہ لے کر خالی جلتے چولہے کو دیکھنے لگی تھی۔ اس نے چائے کا پانی چڑھایا تھا اور پلیٹ میں رات کی سوکھی روٹی رکھی تھی۔ انسان جب انسانیت سے گرتا ہے تو وہ شیطان کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

یہی حال بلقیس بیگم کا تھا۔ وہ بھی بھول چکی تھیں کہ یتیم بھتیجیوں کے باپ کی سگی بہن ہیں وہ اور اس بھائی کی بہن جس نے بیوگی کے بعد اپنے گھر میں انہیں پناہ دی۔ آج وہ اسی گھر پر قابض تھیں۔ اور اپنے اکلوتے مرحوم بھائی کی اولاد کے ساتھ وہ سلوک کر رہی تھیں جو شاید کوئی جانور کے ساتھ بھی نہیں کرتا مگر وہ شاید بھول چکی تھیں کہ وقت کا پہیہ ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ جو نیچے والے حصے کو اوپر اور اوپر والے حصے کو نیچے سدا گھماتا رہتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"میری۔" وہ اوپر اپنے کمرے کے آگے بنے چھوٹے سے برآمدے میں جھاڑو لگا رہی تھی جب کسی کی مدہم سی سرگوشی اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

"میری.... ادھر۔" اس نے چھت پر نظر دوڑائی تھی کہ منڈیر کے آخری سرے پر اسے سایہ سا نظر آیا تھا۔ وہ جانتی تھی یہ توصیف ہے۔ وہ ہاتھ جھاڑتی دوپٹا درست کرتی اس کی طرف چلی آئی تھی۔

"سارینہ کی طبیعت کیسی ہے اب۔" سلام دعا کے بعد توصیف نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے فکرمندی سے کہا تھا۔

"اچھا! ایک منٹ۔" وہ جلدی سے کہتا لکڑی کی سیڑھی سے ہی نیچے اترتے بولا۔ خالہ نورجہاں کا گھران کے ساتھ ہی تھا مگر چھت کے لیے سیڑھی نہیں بنی ہوئی تھی ان کی طرف اور بہت ضروری کام ہوتا تھا تو توصیف لکڑی کی سیڑھی لگا کر چھت پر آتا تھا۔ آج بھی یقیناً" اسے خالہ نورجہاں نے بھیجا ہوگا۔

"یہ لو۔ اماں نے بھجوائی ہے یخنی سارینہ کے لیے اور یہ دوائی ہے اس کی۔" چند ہی لمحوں بعد وہ دوبارہ منڈیر تک آتے جلدی سے ڈبا پکڑاتے بولا۔ اور حریم حیرت کے سمندر میں ڈوب گئی تھی کہ اللہ ایسے بھی مدد کر سکتا ہے۔

"ویسے تو اماں خود لے کر آسکتی تھیں تمہارے گھر مگر تمہیں تو پتا ہے پھوپھی بلقیس کا اس لیے مجھ سے کہا کہ سیڑھی لگاؤ اور میں پچھلے ایک گھنٹے سے کھڑا تھا کہ کب تم اوپر آؤ اور تمہیں یہ دوں۔" توصیف نے وضاحت بھرے انداز میں کہتے اس کے صبیح چہرے پر نگاہیں ٹکائی تھیں اور حریم کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگی تھیں۔

"او.... او میڈم! یہ رم جھم نہیں چاہیے۔ میری ننھی سی بہن منتظر ہے اس دوائی کی' جلدی سے اسے یہ یخنی پلا کر دوائی دو۔ اور ہاں...." اس سے پہلے کہ آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر بہہ نکلتے توصیف نے دبنگ انداز میں اسے چھیڑا۔

"کیا۔" ایک دم اس نے آنکھیں اٹھاتے توصیف کی طرف دیکھا۔

"اور یہ کہ تم بھی پی لینا۔ ندیدوں کی طرح دیکھتی مت رہنا۔" توصیف نے سرگوشی کے سے انداز میں کہتے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور وہ بس اسے گھور کر رہ گئی

تھی۔

"اچھا اب جاؤ اور خالی برتن ادھر لٹکا دینا۔ میں کسی وقت بھی اٹھا کر لے جاؤں گا۔" توصیف نے اپنے گھر کی طرف منڈیر میں لگی کیل کی طرف اشارہ کرتے کہا تھا اور پھر سیڑھی اترنے لگا تھا وہ بھی جلدی سے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے تھکن سے چور بدن کو بمشکل کھینچتے کروٹ بدلی تھی۔ مگر جیسے پورے کمرے میں توصیف کا ہنستا مسکراتا چہرہ کسی خوب صورت تصویر کی طرح آویزاں تھا۔ وہ سونے کی غرض سے آنکھیں بند کرتی تھی تو پلکوں کی باڑ پر جیسے اس کے نام کی دستک ہونے لگتی تھی۔ وہ بند آنکھوں سے ہی مسکرائی تھی۔ توصیف کو سوچنا اسے بے حد اچھا لگتا تھا۔ اس کا ساتھ ایسے لگتا تھا جیسے کڑی دھوپ میں یکدم کہیں سے بادل کا ٹکڑا آ گیا ہو اور اس کالے بادل نے پوری طرح اس کے وجود کو اپنے حصار میں جکڑ لیا ہو مگر اس کالی گھٹا میں یکدم بجلی کی مانند پھوپھی بلقیس گرج پڑی تھیں اور اس کی خیالات کی رو توصیف سے ہوتی ہوئی پھوپھی پر آن رکی تھی۔

خالہ نور جہاں اور پھوپھی بلقیس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ اماں کے ساتھ ہی اس ساتھ والے گھر میں بیاہ کر آئی تھیں۔ اور کچھ برادری بھی ایک ہی تھی لہٰذا شروع دن سے ان کے اور اماں کے تعلقات بے حد دوستانہ تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اماں جب بھی ساگ یا کڑی جیسی کوئی ڈش بناتی تھیں تو خاص طور پر اس کے ہاتھ خالہ نور جہاں کو بھجواتی تھیں۔ شاید یہ تعلق یونہی پیار کی ڈور میں بندھا رہتا اگر پھوپھی بلقیس کسی بوسیدہ ولن کی طرح انٹری نہ مارتیں۔ ان کے آجانے سے حالات بدلنے لگے تھے۔ گھر کا ماحول عجیب ڈرا ڈرا اور سہما سہما سا رہنے لگا تھا۔ اماں اور ابا چپکے چپکے باتیں کرنے لگے تھے۔ شاید جوان بہن کے بیوہ ہو جانے کی وجہ سے غم زدہ اور پریشان تھے اور پھر انہی دنوں ان کے گھر میں ایک پیاری سی پری نے جنم لیا۔ اس کا سارا دھیان اب سارینہ میں لگا رہتا تھا۔ اور پھر وہ اسکول جانے لگی تھی۔ توصیف شام کو ان کے ساتھ کھیلنے آتا تھا اور پھوپھی بلقیس اسے ڈانٹنے لگتی تھیں کہ لڑکوں میں جا کر کھیلو مگر وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔ ان کی ڈانٹ ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے اڑا دیتا۔ اماں بھی چپ چاپ انہیں کھیلتا دیکھ کر مسکراتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھار خالہ نور جہاں بھی شام کو توصیف کے ساتھ آجاتی تھیں۔ یہ سب پھوپھی بلقیس کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ مگر وہ بے بس تھیں اور پھر جلد ہی قدرت نے انہیں اپنی من مانی کرنے کا سنہری موقع دے دیا۔

اماں ابا کی اچانک وفات نے پھوپھی کے دل میں تیار لاوے کو باہر نکلنے کا بھرپور موقع فراہم کر دیا تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے توصیف کا گھر میں داخلہ بند کیا تھا اور پھر رفتہ رفتہ نور جہاں کو بھی یہ باور کروا دیا تھا کہ اب وہ اس گھر کی مالکن ہیں۔ مگر گزرتے دن اور بے بس زندگی کے باوجود اس کے دل میں توصیف کی محبت کسی چڑھتے سورج کی مانند چمکنے لگی تھی۔ فجر کی اذان کی آواز فضا میں گونجی تھی۔ اس نے ساتھ لیٹی سارینہ کی طرف دیکھا تھا اور پھر تمام سوچوں کو جھٹکتی اٹھ کر وضو کرنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"حریم ..... جلدی سے پانی لے کر آ بخشی کے لیے۔" وہ دوپہر کا سالن بنا رہی تھی جب پھوپھی نے پکارا تھا۔

"جی لاتی ہوں۔" اس نے مٹر کے دانے پیالے میں ڈالتے جواب دیا تھا اور پھر جلدی سے ہاتھ دھو کر پانی کا گلاس بھر کر کمرے میں چلی آئی تھی۔

"جلدی دے اور یہ گولیاں نکال پیکٹ سے۔" پھوپھی نے گلاس پکڑتے ہی ٹیبل پر بڑے لفافے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ آج صبح ہی سے بخشی کی طبیعت ناساز تھی۔ ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے اس کی ہڈیوں میں

شدید تکلیف تھی اور اسی وجہ سے بخار بھی چڑھنے لگا تھا۔ اس نے ہیٹر کو اور قریب کیا تھا پھوپھی اب بخشی کا سر اپنی ٹانگوں پر رکھتے اس کو سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"اے کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہے۔ مدد کر میری۔" پھوپھی نے دھاڑتے ہوئے کہا تھا اور وہ کسی روبوٹ کی طرح آگے بڑھی تھی۔ مگر اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے کیونکہ بخش الدین بھلے ہی معذور تھا مگر جوان تھا۔ اس سے عمر میں پانچ چھ سال کا ہی فرق تھا۔ اسی لیے وہ اس کو ہاتھ لگاتے کتراتی تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے اس کے سر کو پھوپھی کی ٹانگوں پر سے اٹھانے کی کوشش کی تھی پھوپھی نے گلاس اس کے لبوں کو لگایا تھا اور گولی اس کے حلق میں رکھی تھی جس سے وہ یکدم کھانسنے لگا تھا اور اس کا سر حریم کی گود میں گرنے لگا تھا۔ حریم یکدم اسے چھوڑتی چارپائی سے پیچھے ہٹی تھی۔

پھوپھی بلقیس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب اسے سخت سست سننے کو ملیں گی اور شاید روٹی نہ دے کر وہ سزا بھی دیں۔ مگر وہ سب کچھ سہنے کو تیار تھی۔ آنے والی شام کے لیے وہ خود کو تیار کرنے لگی تھی۔ مگر اب کے پھوپھی بھی شاید ترپ کا پتا لیے بیٹھی تھیں۔



"اے سارینہ! ادھر آ۔" شام کو سارینہ اس کے پاس کچن میں چوکی پر بیٹھی ہوم ورک کر رہی تھی جب پھوپھی برآمدے میں آکر اسے آواز دینے لگیں۔ حریم کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

"جی پھوپھی!" سارینہ کاپی وہیں پر رکھتی ان کی طرف بڑھی تھی۔

"ایسا کر اپنا بستہ اور سب کتابیں لے کر آ میرے پاس۔" بلقیس بیگم وہیں بچھی چارپائی پر براجمان ہو کر سپاٹ لہجے میں بولی تھیں۔ سارینہ چپ چاپ حریم کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اس نے نظروں ہی نظروں میں اسے سیڑھی کی طرف جانے کا اشارہ کیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ چھت سے اپنا بیگ اور کتابیں اٹھا لائی تھی۔

"اچھا اب یوں کر اس بستے کو اور کتابوں کو رکھ یہیں اور جا کر حریم کے ساتھ گھر کا کام کروا۔ آج سے تیری پڑھائی بند۔" پھوپھی کے الفاظ ان دونوں پر کسی پہاڑ کی مانند گر پڑے تھے۔

"مگر کیوں پھوپھی! سارینہ ابھی بہت چھوٹی ہے اور پھر میں اکیلی یہ سب کام کر رہی ہوں ناں۔" وہ کچن کی دہلیز سے بھاگتی برآمدے تک آئی تھی۔ سارینہ کے ٹپ ٹپ گرتے آنسو اس کا دل چیرنے لگے تھے۔

"بات صرف گھر کے کام کی نہیں ہے اب بخش الدین کو میں بوڑھی اکیلی جان نہیں سنبھال سکتی لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اگلے مہینے سادگی سے تمہارا نکاح بخش الدین سے کر دیا جائے۔ تم سنبھالو اپنے شوہر کو اور یہ سنبھالے گی اب سے گھر۔" پھوپھی کی زبان اس وقت ایک توپ کی مانند لگ رہی تھی جو الفاظ کی صورت میں سامنے کھڑے نہتے وجود پر گولے برسائے جا رہی تھی۔ اور اس کا وجود چھلنی ہو رہا تھا۔

"مگر پھوپھی بخش الدین سے میرا نکاح کس طرح ہو سکتا ہے۔ وہ..... وہ تو....." اس کے الفاظ حلق میں پھنسنے لگے تھے۔

"ہاں بول..... بول کیا وہ تو..... ارے ڈاکٹروں نے بھی کہا ہے کہ اسے ایک مسیحا کی ضرورت ہے۔ اس کے ٹھیک ہونے کے چانسز ہیں اس طرح اور خبردار جو میرے جوان جہان بیٹے کے بارے میں ایک بھی لفظ منہ سے نکالا تو زبان گدی سے پکڑ کر کھینچ لوں گی تیری۔" پھوپھی بلقیس نے سختی سے اس کے جبڑے کو ہاتھوں میں دبوچتے شعلہ بار نگاہوں سے اسے جھلساتے کہا اور پھر اس کا منہ ایک جھٹکے سے چھوڑا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی والی تھی کہ سارینہ نے اسے جلدی سے تھاما تھا۔

"مگر پھوپھی! سارینہ اسکول ضرور جائے گی۔ آپ..... آپ اس کی تعلیم بند نہیں کریں گی۔" اس نے

پختہ لہجے میں سپاٹ نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے لیے ہر ظلم سہہ سکتی تھی مگر وہ سارینہ کے لیے کسی بھی حد سے گزرنے کو تیار تھی۔ اس کے لیے سارینہ کا مستقبل' اس کی آرزوئیں اپنی جان سے بھی بڑھ کر تھیں اور یہ بات پھوپھی بلقیس بھی اچھی طرح جانتی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ تیری شادی اگر بخشی سے ہو جاتی ہے تو تم سارینہ کے لیے جیسا چاہو کرو مجھے کوئی اعتراض نہیں اور اگر تم یہ شادی نہیں کرو گی تو دوسری صورت میں تم دونوں کو یہ گھر چھوڑنا ہو گا۔" بلقیس بیگم نے سفاکی سے اپنی عیاری اور مکاری کی پٹاری کھولی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ حریم شادی کے لیے آسانی سے رضامند نہیں ہوگی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا۔" حریم نے آنکھیں پھاڑے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔ اس لمحے اسے شدت سے احساس ہوا تھا کہ اپنے اور غیر سب ایک سے ہوتے ہیں مگر فرق صرف احساس کا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی لوگ اپنے ہوتے ہوئے بھی احساس و محبت سے عاری ہو کر غیروں سے بڑھ کر اجنبی لگنے لگتے ہیں۔ اور کبھی کبھی غیر بھی محبت کا سکہ کشکول میں ڈال کر اپنے ہونے کا احساس جگا جاتے ہیں۔

"ارے ننھی کاکی مت بنو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ یتیم کا وارث کوئی نہیں بنتا۔ یہ میں ہی تھی جس نے دو بچیوں کی ذمہ داری نبھائی اور اچھی طرح پالا پوسا بیوہ ہوتے ہوئے بھی تم دونوں کے اخراجات پورے کیے۔ تعلیم دلوائی ورنہ لوگ تو جوتی کی نوک پر رکھتے ہیں ایسے ایسوں کو کجا کہ خرچ کریں کچھ۔" بلقیس بیگم کے منہ سے کف بہنے لگا تھا مگر وہ ہاتھ نچا نچا کر اپنے احسانوں کی فہرست گنوا رہی تھیں وہ احسان جو کسی سیاست دان کی طرح صرف لفظوں میں ہی زندہ تھے بس۔ اور وہ دونوں کسی ہارے ہوئے عوام کی طرح سر جھکائے کھڑی تھیں۔

"سوچ لے... جب جواب مل جائے اپنے دل کا تو مجھے بتا دینا۔ یہ سامان بھی تبھی ملے گا اب۔" بلقیس بیگم نے بستہ اور کتابیں سمیٹتے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا اور ان دونوں کو بت بنے کھڑے وہیں چھوڑ کر کمرے کی طرف چل دی تھیں۔ ان کا من بارش میں بھیگی مورنی کی طرح ناچ رہا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ حریم کی دکھتی رگ سارینہ ہے اور کب کب۔ کیسے کیسے انہوں نے یہ رگ دبائی تھی۔

"آپا! اب کیا ہو گا۔" شام کا سورج ڈھل کر رات کی تاریکی میں بدلنے لگا تھا۔ پھوپھی نے کچن کو تالا لگا دیا تھا' اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر اپنے حق کی آواز بلند کرنے کی سزا میں فاقوں سے نوازی جاتی تھی۔ مگر اس بار معاملہ جسمانی اذیت کا نہیں بلکہ روحانی اذیت کا تھا۔

"آپا!" وہ اس وقت سے بیٹھی زندگی کے بکھرے تنکوں کو سمیٹنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کہ سارینہ کی آواز اسے حال میں کھینچ لائی تھی۔ اس نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"ہوں۔" بہت دیر بعد اس نے خشک لبوں پر لگی چپ کو توڑا تھا۔

"آپا! کیا تم اس ہڈیوں کے ڈھانچے سے شادی کر لو گی۔" سارینہ نے جھرجھری لیتے معصومیت سے پوچھا۔

"اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔" اس نے بستر پر پڑی چادر کی لکیروں کو ہاتھ کی پوروں سے چھوتے افسردگی سے کہا۔

"آپا ایک اور حل بھی ہے۔" سارینہ آلتی پالتی مارے جلدی سے اس کے قریب کھسکی تھی۔

"کیا۔" حریم کو اس کی چمکتی آنکھیں دیکھ کر حیرانگی ہوئی تھی۔

"تم... تم توصیف بھائی کے ساتھ شادی کر لو۔' اس نے ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ دباتے سرگوشی کی تھی۔

"سیری پاگل ہو تم بھی۔" حریم کی حیرانگی اب ہنسی میں بدلی تھی۔ اسے سارینہ کی یہ بات اچھی تو لگی تھی مگر وہ حقیقت پسندانہ سوچ رکھتی تھی۔

"کیوں..." اس میں پاگل والی کیا بات ہے۔ مجھے پتا ہے کہ تم بھی انہیں پسند کرتی ہو۔" سارینہ نے اپنے آئیڈیلز کو رد کیے جانے پر منہ بسورتے کہا۔ حریم کو اس پر پیار آنے لگا۔

"پگلی بات پسند کی نہیں ہے۔ توصیف ابھی انجینئرنگ کر رہا ہے۔ وہ تو خود ابھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا تو مجھے کیسے سنبھالے گا۔ اور پھر پھوپھی ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گی۔" اس نے آہستگی سے سارینہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دباتے ہوئے اسے سمجھایا تھا۔

"تم دونوں ایک بار شادی کی بات کرو تو سہی آپا۔ خالہ نور جہاں تمہیں اتنا چاہتی ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتیں کہ ہم کون سا مخمل کے سوٹ پہنتے ہیں جو ان کے اخراجات پر بوجھ بنیں گے۔" سارینہ مسلسل اپنی رائے پر قائم تھی اسے بس حریم کے ساتھ بیٹھنے والے دولہے کی فکر تھی۔ جبکہ حریم کی سوچوں کا گھوڑا بہت دور تک دوڑ رہا تھا۔ وہ اسے کیسے سمجھاتی کہ اس کے پیروں میں سارینہ کے پیار کی زنجیر بندھی ہے۔ وہ کسی اور کے ساتھ شادی کی صورت میں سارینہ کو پیچھے اکیلے نہیں چھوڑ کر جا سکتی اور نہ ہی جہیز کے بجائے ایک عدد بہن کو پلیٹ میں سجا کر سسرال والوں کے آگے سجا سکتی تھی۔ بخشی سے شادی کی صورت میں وہ سارینہ کے لیے بہتر فیصلے کر سکتی تھی وہ کسی بھی طرح سارینہ کو وہ سب دکھ جو اس نے جھیلے تھے ان سے بچانا چاہتی تھی۔ بھلے اس کے لیے اسے اپنی زندگی کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ اس نے ایک نظر پاس لیٹی سارینہ پر ڈالی تھی جو نجانے کب بیٹھے بیٹھے یونہی لیٹ کر سو گئی تھی اس نے اسے سیدھا کرتے کمبل اوڑھایا اور خود کمرے کے آگے بنے چھوٹے سے برآمدے میں آکر آسمان تکنے لگی تھی۔

"توصیف۔" اس کے لبوں نے ہولے سے اس خوب صورت نام کو پکارا تھا۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی توصیف کو اپنا ہمدرد اور بہترین دوست پایا تھا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی توصیف بھی اسے ایک دوست سے زیادہ کی اہمیت دیتا تھا مگر ان سب باتوں کے باوجود اس نے کبھی بھی اپنی زبان سے کھل کر حریم کے سامنے اظہار محبت نہیں کیا تھا اور دوسری طرف خالہ نور جہاں بھی بھلے ہی ہر آڑے وقت میں کسی مہربان سائے کی طرح اس کے ساتھ رہی تھیں مگر انہوں نے بھی کبھی ایسا اشارہ نہیں دیا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ توصیف سے محبت کرتی ہے مگر وہ کسی بھی طرح خود کو اپنی نظروں میں گرانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی نس نس میں عزت نفس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اور پھر سب سے بڑی بات سارینہ کو وہ کسی بھی صورت پھوپھی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ وہ کیسے صرف اپنی خوشیوں کے بارے میں خود غرض بن کر سوچ سکتی تھی۔ نہیں کبھی نہیں۔" اس کے دل سے آواز آئی تھی۔



صبح کی نماز ادا کرتے ہی وہ نیچے چلی آئی تھی۔ پھوپھی بھی جائے نماز پر بیٹھی تھیں۔ وہ اکثر سوچتی تھی کہ ایسے لوگ بھی اللہ کے حضور کتنی آسانی سے جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے دل نہیں کانپتے اس کے حضور کھڑے ہو کر کتنی آسانی سے انسان اپنے گناہوں سے لتھڑے وجود کو لے کر اپنے خالق کے حضور جا کھڑا ہوتا ہے۔ ایسے کیسے اس مٹی کے پتلے میں اتنی طاقت' اتنی دیدہ دلیری آجاتی ہے کہ وہ سب ظلم فراموش کیے اس پاک ہستی کے حضور حاضر ہونے کی جرات کر لیتا ہے۔ یا شاید یہ سب کچھ اس لیے آسان ہے کہ انسان کے تمام اعمال کسی ظاہری وجود سے عاری ہیں۔ کسی ناسور کی طرح وہ اس کی روح سے تو چمٹ سکتے ہیں مگر پھوڑے کی مانند ظاہر نہیں ہو سکتے۔ یا شاید تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ہمارا خالق سائے کی مانند ہر جگہ ہر پل ہمارے ساتھ ہوتا ہے مگر کمزور انسان کو اپنے سامنے ہر ہر عمل کی اسی وقت جزا و سزا دینے کے لیے اس نے ظاہری وجود نہیں رکھا۔ اگر وہ دنیا میں ہی اپنے آپ کو ظاہری شکل کی طرح

ظاہر کر دیتا تو انسان اپنا مکروہ ترین چہرہ کیسے لے کر اس کے حضور جا سکتا تھا۔ پھوپھی سلام پھیر چکی تھیں اس نے انہیں اپنی آمادگی سے آگاہ کر دیا تھا اور پھر سارینہ کی چیزیں اٹھائے چھت کی طرف چل دی تھی۔ سیڑھیوں پر قدم رکھتے اس کا دل بے حد بوجھل تھا۔ وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی مانند اوپر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس نے پوری رات اپنے فیصلے پر غور کیا تھا اور ہر ہر پہلو سے سوچا تھا مگر وہ جتنا سوچتی تھی اتنا ہی الجھتی جا رہی تھی۔

اماں ابا کے بعد نہ ہی ننھیال اور نہ ہی ددھیال میں سے کبھی کسی نے ان کی خبر لی تھی اور یہ رشتے تھے بھی بہت مختصر افراد پر مشتمل۔ ابا دو ہی بہن بھائی تھے اور اماں کی دو بہنیں تھیں جو خود غربت کی چکی میں پس رہی تھیں۔ اور پھر مہنگائی کے اس دور میں ہر شخص ایک دوسرے سے نگاہیں چراتا پھرتا ہے۔ بخشی کے ساتھ شادی کی صورت میں وہ سارینہ کے لیے دیکھے ہوئے سب خواب پورے کر سکتی تھی۔ اس طرح سارینہ اس کی نظروں کے سامنے بھی رہے گی۔ اگرچہ اس کا دل بار بار توصیف کے لیے کھچا چلا جاتا تھا مگر وہ دل کی جذباتیت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کوئی غلط قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی اور نہ ہی اپنا اور سارینہ کا وجود کسی کے لیے بوجھ بنانا چاہتی تھی۔ خالہ نور جہاں بھلے ہی اسے بے حد پیار کرتی تھیں مگر کیا معلوم آنے والے وقت میں وہ بھی پھوپھی بلقیس کا روپ دھار لیں۔ اسے اب کسی پر بھی بھروسا نہیں رہا تھا۔ اس لیے اس نے بخشی کا ساتھ قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لینے کا فیصلہ کیا تھا۔



پھوپھی بلقیس نے اگلے ہی دن مٹھائی منگوا کر پورے محلے اور برادری میں تقسیم کروائی تھی۔ یہ سب کرتے ان کے چہرے پر سجی فاتحانہ مسکراہٹ نے حریم کے پورے وجود کو جلا کر بھسم کر دیا تھا مگر وہ چپ چاپ خاموش تماشائی بن کر رہ گئی تھی۔ سارینہ اس سے سخت خفا تھی اور اس سے ناراض ہو کر کمرے میں منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

وہ جب اسکول سے آئی تھی تو پھوپھی نے اس کے ہاتھ مٹھائی سب کے گھروں میں بھیجی تھی اور ہر گھر ہی سے اسے کچھ نہ کچھ سننے کو ملا تھا۔ کوئی ہمدردی کی آڑ میں طنز کرتے نہیں تھک رہا تھا اور کوئی ان کی یتیمی کو کوس رہا تھا مگر اسے زیادہ غصہ اس معاشرے کے دوغلے پن پر تھا جو کھائی میں گرتا دیکھ کر دکھ تو ظاہر کرتے ہیں مگر گرنے سے بچانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھاتے۔ وہ اسے سمجھانے کی کوشش میں خود بھی نڈھال ہونے لگی تھی۔

پھوپھی کی اس کاری ضرب نے اس کی سوچنے سمجھنے کی سب صلاحیتیں ماؤف کر دی تھیں۔ نیچے سے آوازیں آنے لگی تھیں شاید کوئی محلے کی عورتیں آئی تھیں۔ وہ سارینہ کو اسی طرح چھوڑتی نیچے کچن میں چلی آئی تھی۔

"اے بلقیس... تمہیں یہ کیا بیٹھے بٹھائے بخشی کی شادی کی سوجھی۔" سامنے والی کنیز بی بی کی حیرت میں ڈوبی آواز اسے کچن میں کھڑے بھی صاف سنائی دی تھی اور یکدم اس کی ساری توجہ کمرے میں ہونے والی گفتگو کی طرف مبذول ہوئی تھی۔

"ارے بیٹھے بٹھائے کیوں بھئی... خیر سے دونوں ہی شادی کی عمروں کو پہنچ رہے ہیں تو کیا میں فرض نہ ادا کروں۔" پھوپھی بلقیس نے وضاحتی انداز میں کہا تھا۔

وہ چائے کپوں میں ڈال کر ٹرے میں رکھ کر کمرے کی طرف چلی آئی تھی۔

"فرض ہی ادا کرنا تھا بلقیس تو بخشی کا علاج پہلے مکمل کروانا تھا۔ یہ تو خود کو نہیں سنبھال سکتا تو اپنی بیوی کو کیسے سنبھالے گا۔" کنیز بی بی کے ساتھ آنے والی دوسری خاتون درزدیدہ نگاہوں سے ٹیبل پر چائے رکھتے حریم کی طرف دیکھتے بولی تھیں۔

"ہاں بہن چاہتی تو میں بھی ایسا ہی تھی مگر ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس کی شادی کروا دو تو ٹھیک ہونے کے چانسز بڑھ سکتے ہیں۔ اور پھر حریم کے اصرار پر ہی مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا۔" پھوپھی کی غم میں ڈوبی آواز نے دہلیز

پیار کرتے اس کے قدموں کو جکڑا تھا۔
"حریم کے اصرار پر۔۔۔" آنے والی خواتین کو بھی اس کی طرح اچنبھا ہوا تھا۔
"بہت بھلی مانس بچی ہے میری حریم کہنے لگی پھوپھی زمانہ بہت خراب ہے۔ جہیز کے ٹرک ہیں ناں ہی ڈگریوں کے انبار اور پھر آپ سب کو کس کے آسرے پر چھوڑ کر جاؤں۔" زمانہ شناس بلقیس بیگم نے ایک ہی وار کر کے میدان مار لیا تھا اور بظاہر خود مظلوم بن کر آنے والی دونوں خواتین کو آئینہ دکھا دیا تھا جو کافی عرصہ سے اپنے بیٹوں کے لیے رشتے تلاش کر رہی تھیں اور ان کی ترجیحات کو پھوپھی بلقیس بخوبی جانتی تھیں۔
وہ دونوں اپنی جگہ جزبز سی ہونے لگی تھیں۔ مگر ان سب کی کیفیات سے بے خبر وہ باہر کھڑی پھوپھی کے اس روپ کی گتھیاں سلجھا رہی تھی جو ہر گھڑی بدلتا رہتا تھا کسی گرگٹ کی طرح۔ ظلم بھی اسی کے ساتھ ہونے جا رہا تھا اور قصوروار بھی اسی کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔ وہ قسمت سے شکوہ کناں ہونے لگی تھی۔



دن ڈھل کر شام کا لبادہ اوڑھ چکا تھا۔ مگر اس کا انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے کتنے ہی چکر چھت کے لگائے تھے۔ دروازے پر ہونے والی ہر دستک پر اسے خالہ نورجہاں کے آنے کا گمان ہوتا تھا مگر نہ تو چھت پر توصیف نے آکر کوئی شکوہ شکایت کی اور نہ ہی خالہ نورجہاں آئیں۔
اس نے بے دلی سے سب کام سمیٹے تھے اور پھر پھوپھی سے اجازت لے کر اوپر چلی آئی تھی۔ دل میں ایک طوفان برپا تھا۔ کتنی امیدیں ٹوٹی تھیں آج اسے پورا یقین تھا کہ خالہ نورجہاں سب سے پہلے دوڑی چلی آئیں گی۔ اسے ساتھ لگا کہ گلہ کریں گی۔ پھوپھی سے شکوہ کریں گی اور کچھ نہیں تو اس کے جلتے ہوئے بدن پر تسلی کا پھایا ہی رکھ دیتیں آکر اور توصیف۔۔۔ وہ بھی نہیں آیا۔ پہلے تو ذرا سی کسی بات کی بھنک پڑ جانے پر دوڑا چلا آتا تھا چھت پر اور اب۔۔۔ اتنی بڑی بات ہو گئی اور اس نے ایک بار بھی آکر حال نہیں پوچھا تھا۔
شاید وہ ان کی یتیمی کی وجہ سے ہمدردی کرتا تھا۔ اسے کیا فکر۔۔۔ حریم کی شادی کہیں بھی ہو۔ رات کی تاریکی میں نجانے کتنے ہی آنسو اس کی امیدوں کی طرح ڈوب چکے تھے۔ وہ لیٹے لیٹے خود سے قیاس آرائیاں کر رہی تھی مگر دل تھا کہ کسی طور بھی اس بات کو ماننے نہیں پا رہا تھا کہ توصیف اس سے محبت نہیں کرتا۔ اس کی چمکتی سیاہ آنکھوں میں بارہا اس نے اپنا عکس دیکھا تھا اور پھر نجانے کب نیند کی دیوی نے اس کے تھکے ہوئے ذہن کو اپنی آغوش میں بھر لیا تھا۔



اگلے دن وہ سارینہ کا یونیفارم ہاتھ سے دھو رہی تھی جب دروازے پر زور کی دستک ہوئی تھی۔ پھوپھی نے کمرے سے نکل کر پہلے نل کے پاس بیٹھی حریم کو دیکھا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ انہیں آگے بڑھتا دیکھ کر وہ پھر سے کپڑے نتھارنے لگی تھی۔
"السلام علیکم بہن بلقیس!" دہلیز سے آتی بھاری مردانہ آواز پر وہ چونک کر پلٹی تھی۔ دروازے سے داخل ہوتے توصیف کے ابا اور خالہ نورجہاں کو دیکھ کر وہ ہاتھ جھاڑتی جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
پھوپھی کی ہمراہی میں وہ اندر آتے اس کے پاس رک گئے تھے۔
"کیا حال ہیں میری دھی رانی کے۔" اس کے سلام کے جواب میں خالو اکبر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے پوچھا تھا۔ وہ چونکہ ابا کے رشتے دار بھی تھے لہٰذا کبھی کبھار خاص مواقع پر ہی آتے جاتے تھے۔ اور ہمیشہ ہی ان دونوں بہنوں سے بے حد شفقت سے ملتے تھے۔
"ٹھیک ہوں خالو جی۔" اس نے ہولے سے جواب دیا تھا۔ اور پھر وہ دونوں بخشی والے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ پیچھے پیچھے بوکھلائی سی پھوپھی بلقیس بھی چل رہی تھیں۔ اکبر علی کے آنے نے ان کے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجا دی تھیں اور وہ اندر ہی

اندر خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرنے لگی تھیں حریم دوپٹے سے ہاتھ خشک کرتی کچن کی طرف چل دی تھی۔

جب سے نکاح کی تاریخ طے ہوئی تھی پھوپھی نے اپنے ہر آنے والے کے لیے چائے بنانے کی تاکید کر دی تھی ورنہ وہ یہ دریا دلی بہت کم دکھاتی تھیں۔ وہ جلدی جلدی چائے تیار کرنے لگی تھی تاکہ چائے لے جاکر بہانے سے اندر ہونے والی گفتگو سن سکے۔ وہ جانتی تھی اگر خالو اکبر آئے ہیں تو ضرور اس کے پیچھے کوئی وجہ ہی ہو گی۔ چائے ٹرے میں رکھ کر اس نے ایک پلیٹ میں مٹھائی نکالی تھی اور پھر سب کچھ ٹرے میں سیٹ کر کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"دیکھو بلقیس! یہ صرف ہمارے ہی منہ کی بات نہیں ہے۔ برادری کا ہر شخص تمہارے اس فیصلے کے خلاف ہے۔" اس سے پہلے کہ وہ اندر داخل ہوتی' خالو اکبر کی آواز نے اس کو چونکایا تھا وہ قدرے غصیلے انداز میں بول رہے تھے۔

"اکبر بھائی میرا منہ نہ کھلواؤ تم۔۔۔ برادری والوں کو جس بات کی وجہ سے مرچیں لگ رہی ہیں ناں وہ میں خوب جانتی ہوں۔ آج اگر اس مکان سے بے دخل کر دوں ناں حریم کو تو پھر مجھے بتایئے گا کون وارث بننے کو تیار ہو گا ان بچیوں کا۔" پھوپھی بلقیس بھی انہی کی طرح غصے سے دھاڑی تھیں۔

"ٹھہرو حریم!" وہ چائے ٹیبل پر رکھ کر جانے لگی تھی کہ خالہ نور جہاں نے اسے پکارا تھا وہ حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"بیٹھو یہاں اور جو بھی بات ہو گی اب تمہارے سامنے ہو گی۔" خالو اکبر نے دو ٹوک انداز میں کہتے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"بڑوں کے معاملات میں آپ ان معصوموں کو کیوں گھسیٹ رہے ہیں بھائی صاحب!" پھوپھی بلقیس نے یکدم پینترا بدلا تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں حریم منہ نہ کھول دے۔

"انہی کے تو معاملات ہیں تو پھر ان سے کیسا پردہ۔" خالو اکبر نے دبنگ انداز میں کہتے ان کا منہ توڑا تھا۔

"یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں آپ لوگ جانتے ہیں کہ یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے۔ آپ سے تعلق داری کی بنا پر میں اگر کڑوی کسیلی برداشت کر رہی ہوں تو اسے میری کمزوری مت سمجھیے گا۔" پھوپھی بلقیس نے وارننگ دینے کے سے انداز میں کہا تھا۔ وہ اس وقت شدید غصے میں تھیں۔ اور ان کے لال بھبوکا چہرے کو دیکھ کر حریم کا دل سہما جا رہا تھا۔

"لیکن یہ کسی معصوم کی زندگی کا سوال ہے۔ ہمیں ایک بار حریم کی مرضی معلوم کر لینے دو۔" انہوں نے پھر سے جلتی پر تیل چھڑکنے کے مترادف کام کیا تھا۔ اور اب سب کی نظریں اس پر ٹک گئی تھیں۔

"میں۔۔۔ میں کیا مرضی بتاؤں۔" وہ اس اچانک جملے پر بری طرح بوکھلاتے ہوئے بولی تھی۔

"حریم بیٹا۔۔۔ تم بتاؤ کہ تم اس شادی کے لیے راضی ہو یا تم پر زبردستی کی جا رہی ہے۔" اکبر خالو پیار بھرے لہجے میں رسانیت سے بولے تھے۔ وہ یک ٹک ان کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ دل تو چاہتا تھا کہ سب زنجیریں توڑ کر خود کو اس مفلوج زدہ ماحول سے آزاد کر لے۔ ایک جیتی جاگتی سانس لیتی زندگی جینے کی امنگ لیے دل کے قلعے میں پھڑکنے لگی تھی۔

"میں۔۔۔ میں۔" اس کے لفظ سوچوں کی بیڑیوں میں الجھنے لگے تھے۔

"بولو بیٹا۔" خالو اکبر نے ہمت بندھاتے کہا تھا۔

"آپا۔۔۔ چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی ناں۔۔۔ بولو۔" اس کے کانوں میں سارینہ کی آوازیں گونجنے لگی تھیں اور پھر پورا کمرہ جیسے اس کی آوازوں کی بازگشت سے گونج اٹھا تھا۔ سب کچھ پس منظر میں چلا گیا تھا۔

"نہیں خالو۔۔۔" یکدم وہ پختہ عزم کے ساتھ کہتی کھڑی ہوئی تھی۔

"کیا نہیں۔" اس کے ادھورے جملے پر جہاں خالو اکبر اور خالہ کے چہرے پر امید کی کرن جگمگائی تھی وہیں پھوپھی بلقیس کا سیاہ پڑتا چہرہ بھی اسے حیران کر گیا تھا۔

"مطلب مجھ سے کوئی زبردستی نہیں کی جا رہی میں نے یہ فیصلہ دل سے قبول کیا ہے۔" اس نے حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سنایا تھا اور پھر وہاں رک نہ پائی تھی۔ دل کی نوحہ کنائیوں کو پیروں تلے روندتی وہ بھاگ کر اوپر چلی آئی تھی۔ پیچھے یقیناً" خالو اکبر اور خالہ نور جہاں' پھوپھی بلقیس سے کھڑی کھڑی سن رہے ہوں گے۔

وہ جانتی تھی کہ انجانے میں یا شاید جانتے ہوئے آج اس کی وجہ سے وہ دونوں بلقیس بیگم کے زیر عتاب آئے ہیں۔ مگر وہ کیا کرتی زندگی اس کے لیے دو دھاری تلوار کی مانند بن گئی تھی اور اسے اس تلوار کے وار صرف اپنی جان پر سہنے تھے۔ وہ کسی بھی دکھ کا سایہ سارینہ پر نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ توصیف کا ساتھ قبول کرکے وہ آنے والے وقت میں سارینہ یا توصیف کو کسی بھی آزمائش میں ڈالے۔

کچھ دن کی ہلچل کے بعد زندگی پر پھر سے جمود طاری ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے نہ تو کوئی رشتہ دار آیا اور نہ ہی پھر خالہ نور جہاں آئیں۔ دکھ تو اسے اس بات کا تھا کہ توصیف نے بھی پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔ نکاح کے دن قریب آتے جا رہے تھے اور اس کے لیے ایک ایک لمحہ کانٹوں بھری راہ گزر کی مانند بن گیا تھا۔

اب پھوپھی بلقیس کی زیادہ تر کوشش ہوتی تھی کہ وہ بخشی کے سب کام حریم سے ہی کروائیں مگر اس نے انہیں صاف الفاظ میں منع کر دیا تھا کہ وہ نکاح سے پہلے کسی بھی طور پر ذمہ داری قبول نہیں کر سکتی جس پر پھوپھی بلقیس نے نخوت بھرے لہجے میں اسے کہا تھا کہ وہ کب تک بھاگے گی اس ذمہ داری سے۔ مگر اس نے بھی ہر طرف سے کان لپیٹ لیے تھے۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ زندہ لاش بن کر رہ گئی ہے۔ جس کی تدفین کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔

اس دن بھی پھوپھی بلقیس اس کے لیے نکاح کا جوڑا لینے بازار گئی ہوئی تھیں۔ سارینہ کے اسکول سے آنے میں ابھی کافی وقت تھا اور بخشی کی گھر میں موجودگی ہونے نہ ہونے کے برابر ہی تھی وہ چپ چاپ اس تین مرلے کے مکان کے در و دیوار کو تکتی ماضی کو تلاشنے لگی تھی۔ نیچے والے حصے میں ایک کمرہ' ایک بیٹھک اور کچن تھا چھت کی طرف جاتی سیڑھی کے نیچے چھوٹا سا واش روم بنا کر خالی جگہ کو مناسب طریقے سے کور کیا گیا تھا اور ساتھ ہی کھرا بنا کر ٹونٹی لگائی ہوئی تھی جہاں کپڑے وغیرہ دھونے کی جگہ تھی۔

جب پھوپھی بیوہ ہو کر آئیں تو جگہ کی قلت محسوس ہونے کی وجہ سے ابا نے چھوڑی ہوئی جمع پونجی خرچ کر کے اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ اور اس کے آگے برآمدہ بنوا دیا تھا اور اس طرح بخشی اور پھوپھی اوپر رہنے لگے تھے۔ ابا' اماں کی وفات کے بعد سب سے پہلے پھوپھی نے ان دونوں بہنوں کو سامان سمیٹ کر اوپر بھیج کر نیچے والے حصے کو اپنا مسکن بنایا تھا اور انہیں اوپر تک محدود کر دیا تھا۔ جب تک حریم نے اسکول جانا نہیں چھوڑا تھا ان دونوں کا کھانا پھوپھی بناتی تھیں اور اسے آج تک وہ باسی روٹی یاد ہے۔ جو وہ ان بہنوں کو دو وقت دیتی تھیں۔ پھر جب سے حریم نے کچن سنبھالا وہ بہت احتیاط سے اتنی ہی روٹی بناتی تھی جو اگلے وقت کے لیے بچ ہی نہ سکے۔ اس طرح وہ کم سے کم باسی روٹیوں سے بچ گئی تھیں۔ جانے وہ کب تک بیٹھی ماضی کی راکھ کریدتی رہتی کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ وہ بے دلی سے چلتی دروازے تک آئی تھی اور پھوپھی بلقیس کے آنے کا سوچتے ہوئے بنا پوچھے ہی دروازہ کھول دیا تھا۔

"آپ...." آنے والے نے اسے بری طرح چونکایا تھا۔

"شکر ہے تمہیں میرا وجود یاد تو ہے۔" آنکھوں میں چھلکتا درد شکوہ بن کر لبوں سے پھسلا۔

"یہ آپ کہہ رہے ہیں توصیف۔" اس نے بے یقینی سے اس کے پرملال چہرے کو دیکھا۔

"کیوں کیا ہے تم نے یہ سب۔" توصیف نے چوکھٹ پر ہاتھ جمائے اس کی نظروں میں نظریں ملاتے غصے سے پوچھا تھا۔ جواباً" وہ نظریں چرا گئی تھی۔

"میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے' یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔" اس نے بھی غصے سے پھنکارتے کہا۔ بے بسی اسے جھلسائے دے رہی تھی۔

"مگر تمہارے اختیار میں یہ تو تھا کہ تم ابا جی کے سامنے سب کچھ بتا سکو تم نے ایک پل میں سب پیار' محبت کے ناطے ختم کر کے انہیں لاجواب کر دیا۔ ایک بار بھی نہ سوچا کہ صرف تمہارے لیے انہوں نے سب برادری کے آدمیوں سے بات کی اور سب کی رائے لے کر ہی وہ دونوں تم تک آئے تھے تم اتنی کمزور نہیں تھی بس ایک بار زبان تو کھول کر دیکھتی۔" بنا سانس لیے وہ بولتا چلا جا رہا تھا اور وہ بے یقینی سے اسے آج پہلی بار اس طرح غم و غصے کی حالت میں دیکھ رہی تھی۔

"توصیف آپ کیوں نہیں سمجھ رہے میری زندگی پر صرف میرا حق نہیں ہے۔ سارینہ کا وجود بھی منسلک ہے میری زندگی سے۔" وہ ٹوٹنے لگی تھی۔

"مجھے اتنا تو پوچھنے کا اختیار ہے ناں کہ تم نے کس لمحے سارینہ کے لیے میری محبت' میری شفقت میں کمی پائی ہے۔" اس نے شکوہ کناں ہو کر رخ پھیرتے کہا تھا۔

"بات کمی کی نہیں ہے۔ بس میں اسے کسی بھی کسوٹی میں نہیں ڈالنا چاہتی اور نہ ہی رشتوں کو آزمائشوں کے پرت تلے دبانا چاہتی ہوں۔" وہ دانتوں سے گلابی ہونٹوں کو کاٹتے آزردگی سے بولی تھی۔

"تم یہ سب اچھا نہیں کر رہی ہو حریم جبر کی چکی میں کب تک پستی رہو گی۔" وہ ملتجی لہجے میں بولا تھا۔

"ہونہہ! یہ سب تقدیر کا لکھا ہے توصیف۔ اسے کاتب تقدیر ہی بدل سکتا ہے۔" اس کے لبوں سے ٹھنڈی آہ نکلی تھی اور پھر اسے یکدم احساس ہوا تھا کہ وہ لوگ نجانے کب سے اسی طرح دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔

"توصیف آپ جائیں یہاں سے پلیز.... پھوپھی بھی آنے والی ہوں گی۔" اس نے ذرا سا سر دروازے سے باہر نکالتے گلی میں ادھر ادھر دیکھا تھا۔ صد شکر تھا کہ صبح کے اس وقت کوئی نہیں تھا گلی میں۔

"ایک بات یاد رکھنا حریم.... زندگی کے کسی بھی موڑ پر پیچھے دیکھو گی تو کسی کو اسی طرح کھڑے اپنا منتظر پاؤ گی۔" مدھم لہجے میں سلگتی محبت اسے صاف دکھائی دے رہی تھی اور آنکھوں میں مچلتا شکوہ اسے نڈھال کرنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ ضبط کی گرہیں ٹوٹ کر موتیوں کی صورت آنکھوں سے بہہ نکلتا وہ دروازہ بند کر گئی تھی۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ توصیف کے بکھرے وجود کو دور جاتا دیکھ سکتی' اپنی اور اس کی محبت کی شدت کا اندازہ اسے آج ہوا تھا۔ مگر شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔



گہرے نارنجی رنگ پر کار کام بے حد دمک رہا تھا۔ زندگی میں شاید پہلی بار پھوپھی نے اس کی ذات پر کچھ خرچا کیا تھا۔ وہ نکاح کا جوڑا اور ساتھ میں کچھ ضروری چیزیں لے کر آئی تھیں جو اب بہت فخر سے اسے دکھا رہی تھیں۔

"اے اتنا قیمتی سوٹ لائی ہوں کہ کبھی زندگی میں نہیں پہنا ہو گا تو نے۔ اللہ بخشے میرے بھائی کو بے چارہ کسمپرسی میں چلا گیا اس دنیا سے۔" وہ سوٹ کو واپس ڈبے میں رکھتے ہوئے بولی تھیں اور حریم کا دل چاہا تھا کہ انہیں کہتی کہ بھائی کے سینے پر آپ جیسی بہن بیٹھی ہو تو اس کا دنیا سے چلا جانا ہی بہتر ہے۔ مگر وہ ہونٹ سیے بیٹھی رہی۔ اسے ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ سب محض ایک دکھاوا ہے کہ برادری والے منہ بند رکھیں۔ ورنہ ان کا بس چلتا تو ایسی حالت میں حریم کا نکاح پڑھوا دیتیں اور ہمیشہ جیسے وہ عید تہوار کے کپڑے انہیں بنوا کر دیتی تھیں اسی طرح آج بھی کہہ دیتیں کہ کون سا گھر سے باہر جانا ہے۔ جو خواہ مخواہ کی فضول خرچی کی جائے۔

"اب کون سے مرثیے پڑھ رہی ہے دل ہی دل میں۔ دعائیں تو کیا دینی تجھ جیسی نے مجھ کمبخت کو۔" وہ اپنے خیالوں میں مگن تھی جب پھوپھی کی دہائی اس

کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

"کہیں نہیں۔" لبوں سے آہ کی صورت بمشکل دو لفظ نکلے تھے۔

"چل پھر احتیاط سے اٹھا سب سامان اور اندر میرے کمرے میں رکھ کر آ۔" وہ چارپائی پر پھیلے شاپر سمیٹنے لگ گئی تھی۔ زندگی کس اذیت سے گزر رہی تھی یہ وہ ہی جانتی تھی یا پھر وہ، جو جس نے اسے تخلیق کیا تھا۔

٭ ٭ ٭

یہی وفا کا صلہ ہے تو کوئی بات نہیں
یہ درد تم نے دیا ہے تو کوئی بات نہیں
یہی بہت ہے کہ تم دیکھتی ہو
ساحل سے سفینہ ڈوب رہا ہے تو کوئی بات نہیں
رکھا تھا آشیانہ دل میں چھپا کر تم کو
وہ گھر تم نے چھوڑ دیا ہے تو کوئی بات نہیں
بالآخر زیست کے قابل بنا ہوں
بڑی مشکل سے پتھر دل بنا ہوں
وہ آئے ہیں سراپا جسم بن کر
میں گھبرا کے مجسم دل بنا ہوں
یہاں مقتول ہی ٹھہرتے ہیں مجرم
یہی سوچ کے قاتل بنا ہوں
بڑا محتاط ہوں محفل میں تیری
تیری جانب سے سو غافل بنا ہوں
میں کھا کے ٹھوکریں تیری گلی کی
بڑا مرشد بڑا کامل بنا ہوں
کوئی سمجھے گا کیا مجھ کو
میں خود اپنے لیے مشکل بنا ہوں

کاغذ پر بکھرے لفظ کسی خنجر کی مانند اس کے دل پر وار کر رہے تھے۔

وہ اسٹور کی صفائی کر رہی تھی جب اسکول سے واپسی کے بعد سارینہ نے گھر آتے ہی چپکے سے ایک کاغذ اسے پکڑایا تھا۔ اس وقت وہ کھول کے دیکھ نہیں سکی تھی سو اس نے پرانے کپڑوں کے شاپر میں چھپا دیا تھا کہ مبادا پھوپھی کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ سب کام سمیٹ کر جواب وہ اوپر آ کے پڑھنے لگی تھی تو ہر ہر لفظ میں توصیف کے جذبات عیاں ہو رہے تھے۔ کاغذ ہاتھ میں دبائے وہ روئے جا رہی تھی۔ اس کے خوابیدہ جذبات ایک بار پھر سے جاگنے لگے تھے۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ہماری طلب میں شدت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ ہمارے تمام لفظوں کو مفلوج کر دیتی ہے۔ اس کے پاس بھی تمام حروف تسلی مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ کیسے توصیف کے تڑپتے دل پر محبت کا پھایا رکھتی وہ تو خود مجسم اذیت تھی۔ اس وقت وہ بے حد چلانا چاہتی تھی مگر اس کے لب ساکت تھے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آپ کا جسم مجسم دعا بن جاتا ہے۔ آپ کی التجا تڑپ میں تبدیل ہو کر آپ کے لفظوں کو مفلوج کر دیتی ہے اور جسم کا ہر ہر حصہ خود دعا بن جاتا ہے۔ اس کے پاس بھی کوئی راستہ نہیں رہا تھا سو مفلوج لفظوں کو لیے بارگاہ الٰہی میں چلی آئی تھی۔

عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر وہ نجانے کب تک ساکت لبوں سے خالق کے حضور اپنے لیے روشنی طلب کرتی رہی تھی اور شاید دعا کی تڑپ ہی ہوتی ہے۔ جو رب کو اپنے بندے کی طرف بہت جلد متوجہ کر لیتی ہے اور وہ بھی اپنے رب کو متوجہ کرنے میں محو تھی اور تقدیر کہیں دور کھڑی اس معصوم پری پیکر کے سربسجود وجود کو دیکھ کر مسکرائی تھی جس سے وہ بے خبر تھی۔

٭ ٭ ٭

بخشی کی طبیعت یکدم بہت خراب ہوئی تھی۔ چند دن سے پھوپھی اپنی مصروفیات کے باعث اس پر بالکل بھی دھیان نہیں دے پا رہی تھیں۔ جنوری کی سرد ہوا میں اس کے کمزور جسم کو اور نحیف کر گئی تھیں۔ اسے شدید نمونیا ہوا تھا ڈاکٹر اسے چیک کر کے دوائی لکھ کر دے گیا تھا۔ پھوپھی ڈاکٹر صاحب کو دروازے تک چھوڑنے گئی تھیں۔

"اے بخشی! تجھے بھی کیا یہی دن ملے تھے بیماری

کے لیے کل تیرا نکاح ہے اور آج تو نے اپنی منحوسیت پھیلا دی گھر میں۔" دروازہ بند کرتے ہی بلقیس بیگم اونچی آواز میں بڑبڑاتے کمرے کی طرف آرہی تھیں وہ جو بخشی کے سرہانے کھڑی ان کی بات پر مسکرا رہی تھی یکدم سنجیدہ ہوئی تھی۔

"جا اس کے لیے یخنی بنا۔" کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بے زاری سے بولی تھیں اور وہ مسکراہٹ دباتے سر جھکائے جلدی سے کچن کی طرف بڑھی تھی پھوپھی کے چہرے پر پھیلی پریشانی نے اسے یک گونہ سکون دیا تھا۔

"وہ سارینہ کے اور اپنے ہاتھوں پر مہندی لگالینا۔ شام میں محلے کی عورتیں آئیں گی ابٹن لگانے۔" وہ یخنی لے کر آئی تو بلقیس بیگم نے مہندی کا شاپر اسے پکڑاتے کہا تھا۔ جو اس نے مردہ دلی کے ساتھ پکڑ لیا تھا۔

"اور ہاں..." وہ باہر جانے لگی تھی جب انہوں نے کچھ یاد آنے پر پھر سے اسے پکارا تھا "کسی کے بھی ہمدردی کے بول سن کر رجھ نہ جانا۔ سب اوپر سے ہانکتے ہیں اندر سے کوئی نہیں سچا۔" وہ طنزیہ انداز میں کہتی اسے بہت کچھ باور کراتے بولی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ ان کا اشارہ خالہ نور جہاں کی طرف تھا۔ مگر وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئی تھی۔

شام کو اس نے سارینہ کے کپڑے تبدیل کروائے تھے اور پھر کاموں میں لگ گئی تھی۔ نہ ہی تو سارینہ نے مہندی لگائی تھی اور نہ ہی اسے اپنے ہاتھوں پر ارمانوں کا خون سجانے کی چاہ تھی سو دونوں بہنیں کام میں لگ گئی تھیں۔ سارینہ بار بار رونے لگ جاتی تھی۔ کبھی کبھی اسے بھی برا بھلا کہنے لگتی کہ وہ کیوں اس مردے سے شادی کر رہی ہے۔ وہ کبھی ہنس کر اور کبھی پیار بھری گھوری دے کر ٹال رہی تھی۔ ادھر بخشی کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ اس کے سینے میں شدید درد تھا۔ پھوپھی پھر سے ڈاکٹر کو بلانے گئی تھیں۔ اور ادھر محلے کی چند خواتین آنا شروع ہو گئی تھیں۔



حریم عبدالرحمن سے حریم توصیف تک کا سفر ایک ہی دن میں طے ہو جائے گا یہ کبھی اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ پوری رات بخشی کی طبیعت بے حد خراب رہی تھی۔ اسے ٹھیک سے سانس نہیں آ رہا تھا لہٰذا خالو اکبر اور چند دیگر محلے والے اسے ایمبولینس میں ہسپتال لے کر گئے تھے۔ برادری کی سب عورتوں کی لعنت ملامت کے باوجود پھوپھی بلقیس اپنی ضد پر قائم تھیں اور صبح ہوتے ہی نکاح خواں کو بلاوا بھجوا دیا تھا۔ حریم کو چند گھنٹوں پہلے ہی انہوں نے پڑوس کی ایک لڑکی سے تیار کروایا تھا۔ ادھر بخشی کی اچانک حالت بگڑنے لگی تھی جس پر اسے فوراً ہسپتال لے کر گئے تھے۔

"اے لو آ ہی گئے وہ لوگ میں تاں کہتی تھی کہ اکثر ایسے طبیعت ہو جاتی ہے بخشی کی مگر تھوڑی ہی دیر میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔" باہر ایمبولینس کا سائرن بجا تھا اور پھوپھی بلقیس عورتوں کے جھرمٹ میں سے نکل کر دروازے کی جانب بھاگتے ہوئے بولی تھیں۔ وہ یہ سب ایک زندہ لاش کی طرح بیٹھی دیکھ رہی تھی کہ باہر سے آتی پھوپھی کے چیخنے کی آوازوں نے سب کو چونکایا تھا۔ وہ بھی سب کے ساتھ باہر کی طرف لپکی تھی۔

داخلی دروازے کی بیچ و بیچ پھوپھی اپنے سر کو پیٹ رہی تھیں اور آدمی ایمبولینس سے بخشی کی لاش لے کر دروازے کی طرف آ رہے تھے۔ پورا گھر پھوپھی کی دہائیوں سے لرز رہا تھا۔ وہ لبوں پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے کبھی چارپائی پر پڑی بخشی کی لاش کو اور کبھی اپنے سجے سنورے روپ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کیسے اللہ نے آزمائش میں پڑے بنا ہی اسے سرخرو کر دیا تھا اس کی دعائیں وہ اس صورت میں بھی مستجاب کرلے گا یہ کون جانتا تھا۔ بھلے ہی اس نے بخشی کے لیے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا اور نہ ہی کبھی اسے بخشی سے نفرت تھی اسے تو اس کے جوان معذور وجود پر رحم آتا تھا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس سب کے باوجود اس نے کبھی اس کی زندگی کے لیے دعا بھی نہیں کی

تھی۔

جنازے کے بعد خالو اکبر سب لوگوں کو لے کر پھوپھی بلقیس کے پاس آئے تھے۔ اور حریم کا ہاتھ توصیف کے لیے مانگا تھا۔ چونکہ اب انکار کی کوئی وجہ ہی نہیں رہی تھی لہٰذا پھوپھی نے چپ چاپ فیصلہ حریم پر چھوڑ دیا تھا۔ ان کی حالت اس وقت اس پرندے کی مانند لگ رہی تھی جس کے پر اونچی اڑان کی بدولت جل چکے تھے۔ حالات کے یکدم پلٹ جانے پر وہ بے سدھ ہو کر رہ گئی تھیں۔ آنے والے وقت کا خوف ان کی آنکھوں میں آنسو بن کر بہنے لگا تھا۔

خالو اکبر اور چند برادری کے لوگ اس کے پاس آئے تھے۔ اس نے ایک شرط رکھ کر اپنی رضامندی دے دی تھی اور اس طرح اسی نکاح خواں نے توصیف اور حریم کا نکاح پڑھایا تھا جو اس کے اور بخشی کے لیے خود پھوپھی بلقیس لے کر آئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

آج بخشی کے دسویں کا ختم تھا اور آج شام سادگی سے اس کی رخصتی ہونی تھی ان دس دنوں میں پھوپھی بلقیس ہر لمحہ اس سے نظریں چراتی رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ وقت کے پہیے نے اپنی گردش سے انہیں آگاہ کر دیا ہے۔ ختم کے بعد وہ کچن کے کام سمیٹ رہی تھی جب پھوپھی اس کے پاس آئیں۔

"حریم!" ان کی کانپتی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

"جی۔" وہ حیران ہو کر مڑی تھی۔

"نہیں پھوپھی.... ایسا نہ کریں۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں۔ انہوں نے اس کے آگے روتے ہوئے ہاتھ جوڑے تھے۔

"مجھے معاف کر دے۔" روتے ہوئے بمشکل ان کے لب ہلے تھے اور وہ جو سمجھتی تھی کہ پھوپھی کے دل کو کبھی نرم نہیں کر سکے گی آج ان کا یہ روپ دیکھ کر ورطہ حیرت میں ڈوب گئی تھی۔

"میں اپنے بوڑھے وجود کو تم پر مسلط کرنا چاہتی تھی۔ میں نے بخشی کو بھی ایک لاٹھی بنا کر استعمال کیا۔ اس لاٹھی سے تمہیں ہانک کر اپنے لیے فائدہ اٹھانا چاہا اور اوپر والے کی لاٹھی سے بے خبر ہو گئی تھی۔ سب کچھ اپنے اختیار میں سمجھنے لگی تھی۔" اس کے ہاتھوں کو تھامے وہ روتے ہوئے کہے چلی جا رہی تھیں۔

"آج احساس ہوا کہ انسان بھلے کتنی ہی چالیں چل لے مگر اوپر والے کی چال ہی کامیاب ہوتی ہے۔ میں نے تم پر ظلم تو بہت کیے اور میں معافی کی طلب گار بھی نہیں کیونکہ میرا گناہ بہت بڑا ہے۔ مگر پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ جو کچھ میرے دل میں ہے آج کہہ دوں۔ ورنہ یہ بوجھ میرے دل کو بند کر دے گا۔" وہ ہانپنے لگی تھیں۔ اس نے قریب پڑی چوکی پر بیٹھا کر انہیں پانی کا گلاس دیا تھا۔

"پھوپھی! میرے دل میں کوئی ملال نہیں میرے رب نے مجھے ہر آزمائش میں سرخرو کیا ہے اور مجھے آپ سے بھی کوئی شکوہ نہیں اور اگر مجھے آپ سے کوئی گلہ ہوتا یا انتقام لینا ہوتا تو میں توصیف کے لیے ہاں کرتے ہوئے وہ شرط نہ رکھتی اس لیے آپ بھی کچھ مت سوچیے۔" اس کے جواب نے انہیں لاجواب کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے چہرے کو تکنے لگی تھیں۔ کتنا غلط سمجھا تھا انہوں نے اسے اب اپنے ہی گریبان میں جھانکتے شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہ آزردگی سے سوچنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ حجلہ عروسی میں بیٹھی رب کی چال پر حیران و متشکر تھی کہ دروازہ کھولنے کی آواز پر سیدھی ہوئی تھی۔ قدموں کی آہٹ قریب سے قریب ہوتی جارہی تھی۔ اس کا دل زور سے دھڑکا تھا اور ہتھیلیوں میں پسینہ آنے لگا تھا۔

یونہی بے سبب پکارا کیجیے
کچھ تو تعلق کا گمان ہوتا ہے

توصیف کی مسرور آواز اس کے کانوں میں رس گھولنے لگی تھی۔ اس نے شرما کر چہرہ اور جھکا لیا تھا اور توصیف اس کی اس ادا پر نثار ہونے لگا تھا۔

"جان توصیف! منہ دکھائی سے پہلے آپ کی امانت حاضر ہے۔" توصیف نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ اس کی طرف بڑھائے تھے۔ اس نے ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"سارینہ کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے اس مکان کو اس کے نام قانونی طور پر منتقل کروا دیا ہے میں نے۔" توصیف نے کاغذات کھول کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا اور حریم کی آنکھوں میں تشکر کے جذبات امڈ آئے تھے۔

"آں....ناں ناں میری پیاری بیوی۔ یہ آنسو بہت قیمتی ہیں۔ انہیں اب اور زیادہ مت بہاؤ جتنے بہانے تھے بس بہا لیے۔" اس کے گلابی گال پر گرے موتی اپنی انگلیوں کی پوروں پر سمیٹتے وہ بولا تھا۔

"حریم! ایک بات یاد رکھنا مجھے اتنا دکھ اس وقت نہیں ہوا تھا جب مجھے محبت میں تمہاری طرف سے نارسائی ملی۔ مجھے اس وقت بھی تمہاری بے اعتباری سارینہ کے حوالے سے گھائل کر گئی تھی۔ سارینہ میرے لیے میری چھوٹی بہن جیسی ہے اور میں کبھی بھی اسے کم نہیں سمجھتا اور یہ بات تم بھی سن لو اور مجھے تمہارا فیصلہ بھی بہت پسند آیا تم نے پھوپھی کو معاف کر دیا اور یہ بہت ظرف کی بات ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولتا اسے اپنے دل کے بے حد قریب محسوس ہوا تھا اور ایک بار پھر اس کا دل مجسم دعا بنا تھا۔

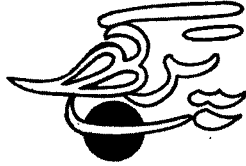
اپنی آنے والی زندگی کی خوشیوں کے لیے وہ ایک بار پھر مفلوج لفظوں کے ساتھ دعا مانگنے لگی تھی۔ وقت کی چال نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا خالو اکبر سے اس نے نکاح کے وقت جو شرط رکھی تھی وہ یہ تھی کہ شادی کے بعد وہ پھوپھی اور سارینہ کے ساتھ اسی گھر میں رہے گی اور توصیف بھی اس کے ساتھ رہے گا۔ وہ پھوپھی اور سارینہ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی اور سب نے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

یوں آج وہ اپنے ہی گھر کے اوپر اپنے ہی پرانے کمرے میں ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے جارہی تھی۔ سارینہ اور پھوپھی نیچے والے پورشن میں تھے۔

فجر کی اذانیں ہونے لگ گئی تھیں۔ اس نے قریب لیٹے توصیف پر ایک پیار بھری نظر ڈالی تھی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی آج کی صبح کا اجالا اسے اپنی روح میں روشنی بکھیرتا محسوس ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھی ایک ہی لمحے میں زندگی بدل جاتی ہے اور یوں لگنے لگتا ہے جیسے کسی خواب سے بیدار ہوئے ہوں آج اسے بھی اپنی کل تک کی زندگی ایک خواب لگنے لگی تھی۔ وہ خاموش لبوں سے اپنے رب سے اس صبح کے اجالے پوری حیات کے لیے مانگنے لگی تھی دور افق پر تقدیر کا ستارہ ابھرنے لگا تھا۔

☼ ☼

نازیہ کنول نازی



کہانیاں اب بدل گئی ہیں
نہ اب وہ موسم کہ جن میں خوابوں کے سارے
موسم
گلاب موسم بنے ہوئے تھے
نہ اب وہ شامیں کہ جن میں تیری تیری حسین
باتیں
رفیق لگتی تھیں ذہن ودل کو
وہ سارے منظر بدل گئے ہیں
نہ وصل کا کوئی خواب باقی' نہ اب وہ حرف سخن رہا
ہے
کہانیاں اب بدل گئی ہیں
تمہارے جانے کے بعد یوں بھی......
جو خواب آنکھوں میں چاہتوں کا یقین بن کر ٹھہر
گئے تھے
وہ خواب سارے بکھر گئے ہیں
ملال دل میں اتر گئے ہیں
نہ زندگی ہے' نہ زندگی میں وصال موسم کی چاہ کوئی
نہ شاعری ہے' نہ شاعری میں جو دکھ ہے اس سے
پناہ کوئی
جو سچ تھا اب جھوٹ ہو گیا ہے
جو دن میں سورج بنا ہوا تھا
وہ شب کی تاریک وادیوں میں ہی کھو گیا ہے
کہانیاں اب بدل گئی ہیں



بارش ٹوٹ کے برسی تھی۔ تین بسیں بدل کر جس وقت وہ گھر میں داخل ہوئی' مارے تھکن کے اس کا پورا جسم چور چور ہو رہا تھا۔ اوپر سے ہلکی ہلکی حرارت اور سر میں شدید درد نے جیسے رہی سہی ہمت بھی ختم

کر ڈالی تھی۔ بجلی معمول کے عین مطابق پچھلے کئی گھنٹوں سے غائب تھی۔ ابہل نے چادر اٹھا کر دیوار کے ساتھ لگے اسٹینڈ کے سپرد کردی۔ ابھی وہ کچن سے پانی کی بوتل لانے اٹھ ہی رہی تھی جب نمل اس کے قریب چلی آئی۔

"آج خیر تھی؟ اتنی دیر کردی گھر واپسی میں؟"

"ہوں... بارش کی وجہ سے جگہ جگہ سڑکیں تالاب کا منظر پیش کررہی تھیں، بڑی مشکل سے تین بسیں بدل کر گھر آئی ہوں۔"

"امی پریشان ہورہی تھیں تمہارے لیے۔"

"ظاہر ہے ماں ہیں تو پریشان تو ہوں گی۔ مگر میں اب کوئی بچی تھوڑی ہوں۔ تیس سال کی خاصی میچور "دوشیزہ" ہوں۔ امی سے کہہ دیا کریں میرے لیے پریشان نہ ہوا کریں۔"

"کہتی ہوں، مگر ماں کے لیے بچے جتنے بھی بڑے ہوجائیں، وہ بچے ہی رہتے ہیں، خیر تمہیں ایک بمباسٹک خبر سنانی تھی۔"

"بمباسٹک خبر... کیا؟"

"فائزہ چچی کی چھوٹی رملہ ہے نا؟"

"ہوں... کیا ہوا اسے؟"

"اس نے کورٹ میرج کرلی ہے یار۔ اپنی ایک قریبی دوست کے بھائی سے۔ وہ بھی آؤٹ آف کاسٹ۔ چاچا جی اور چچی تو کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں رہے۔ امی اور عدنان بھائی ہو کر آئے ہیں ادھر سے۔ کہہ رہے تھے ایسا لگتا ہے جیسے گھر میں کسی کی موت ہوگئی ہو۔ بہت بڑا قدم اٹھایا ہے رملہ نے۔"

"ایسا تو ہونا ہی تھا۔" گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا تھا۔ جواباً" نمل نے خاصی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"صحیح اور سچ کہہ رہی ہوں۔ بتیس سال کی ہوگئی ہے رملہ، مگر ابھی تک اگلے پانچ سالوں میں اس کی شادی کا کوئی نام و نشان نہیں۔ راحیلہ باجی اڑتیس سال کی ہونے والی ہیں، اب کہیں جاکر صرف منگنی ہوئی ہے ان کی۔ آپ خود سوچیں چالیس سال کی عمر میں بچے پیدا کرکے کیا وہ ان کی جوانی دیکھ پائیں گی؟ وہ عمر جو احساسات و جذبات کی ہوتی ہے۔ خواب دیکھنے اور زندگی کا لطف کشید کرنے کی ہوتی ہے۔ اس عمر کا لہو نچوڑ کر اگر جوانی ڈھل جانے کے بعد ہمارے والدین، ہماری قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں تو میرے خیال میں اس سے بڑا ظلم کوئی نہیں۔ خود ہمارا مذہب بھی ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔"

"تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو ابہل... ماں، باپ اولاد کا برا نہیں سوچتے بھلا ہی کرتے ہیں، انہیں بہتر پتا ہوتا ہے، کب بچوں کی شادی ہونی چاہیے، کب نہیں۔ یہاں کتنی ایسی لڑکیاں ہیں جو کم عمری میں شادی کے سبب بچے کی پیدائش کے وقت زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ میچور خواتین کے ساتھ یہ مسئلہ زیادہ نہیں ہوتا۔ اس لیے بہتر ہے کہ پہلے انسان سمجھ دار اور ذمے دار ہو، پھر اپنی میرڈ لائف شروع کرے۔" نمل کی سوچ وہی تھی جو اس کے بڑوں کی سوچ تھی اور بڑوں کی سوچ... ان کے خیالات و تجربات، ان کی نصیحتیں... فرماں برداری... یہ ساری چیزیں تو جیسے اس کی گھٹی میں پڑی تھیں۔ ابہل کے لبوں پر بے جان سی مسکراہٹ دم توڑ گئی۔

"آپ کو پتا ہے نمل آپا۔ غلط بات کو غلط ماننا چاہیے۔ میں باغی نہیں ہوں۔ ماں، باپ اور خاندان کے بزرگوں کا احترام مجھ پر بھی اتنا ہی فرض ہے جتنا کہ آپ پر، مگر جہاں ہمارے بڑے غلط ہوں، وہاں انہیں سمجھانا نا کہ ان کی اندھی تقلید کرنا، ہمارا فرض ہے۔ آپ خود دیکھیں آپ کی دوست ماریہ کے ساتھ کیا ہوا؟ ہر رشتے کے لیے جو ان کی کاسٹ کا نہیں تھا، ان کے گھر والے انکار کرتے رہے، ہر بہتر سے بہترین رشتے کو ٹھکراتے ہوئے ان کا ایک ہی موقف ہوتا تھا کہ ہم اپنی برادری سے باہر شادی نہیں کرتے، خواہ برادری میں کسی ٹھیلا لگانے والے کا رشتہ آجاتا، مگر

برادری اور ذات سے باہر کسی ڈاکٹر، انجینئر کو بھی نہیں دیتا عجیب منطق ہے بھئی۔ جب ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق کسی کالے کو کسی گورے پر کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، سوائے تقویٰ کے۔ پھر کیوں یہ ذات برادریاں ہماری زندگیاں، ہماری خوشیاں نگل رہی ہیں۔ جیسے آپ کی دوست کی نگل گئیں۔"

"اس کا مسئلہ اور تھا۔" ایمل کی جذباتیت پر نمل نے سرد آہ بھری تھی۔ جب وہ پھر بولی۔

"جی نہیں۔ ہم لڑکیوں کے مسئلے کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ یہاں لڑکیوں کے ساتھ ساتھ لڑکوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگی ہیں۔ عدنان بھائی کو دیکھ لیں۔ چالیس کے قریب ہو رہے ہیں، مگر ابھی تک شادی کا کوئی نام و نشان نہیں۔ آخر کب تک وہ اپنے جذبات مارتے رہیں گے۔ کب تک ہم ان کی کمائی کھانے کے چکر میں ان کی زندگی کے قیمتی سال ضایع کرتے رہیں گے؟" وہ ضرورت سے زیادہ حساس تھی۔ نمل کے لبوں پر چپ لگ گئی۔



حسیب احمد صاحب ایک متوسط طبقے کے سفید پوش انسان تھے۔ قدرت نے انہیں ادھیڑ عمر میں ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کی نعمت سے نوازا تھا۔ ان کا تعلق ایسی برادری سے تھا جن میں بچوں کی شادیوں کا رواج نہیں تھا۔ وہ بیالیس سال سے اوپر کے تھے۔ جب ان کے سہرے کے پھول کھلے اور قدرت کی طرف سے یکے بعد دیگرے انہیں تین بچوں کا تحفہ ملا۔ ان کی بیگم سکینہ بی بی ان سے چار سال بڑی تھیں۔ تین تین سال کے وقفے سے تین بچے پیدا کرنے کے بعد وہ مزید بچے پیدا کرنے کے قابل ہی نہیں رہی تھیں۔

عدنان دونوں بہنوں سے بڑا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی وہ سن بلوغت تک پہنچا، حسیب احمد صاحب کی ہمت جواب دے گئی۔ ان کی زمینیں تھیں۔ وہاں سے خرچا آتا رہا۔ یوں بچوں کی پڑھائی مکمل ہوئی۔ نمل ابھی دس سال کی تھی، جب سکینہ بی بی گھر کے کام کاج سے ہاتھ روک کر بیٹھ گئیں۔ ان کی ہڈیوں میں اب پہلے سا دم خم نہیں رہا تھا۔ ایمل سب سے چھوٹی تھی، اس کا دل چاہتا تھا کہ جیسے اس کی فرینڈز کی مائیں ان کے لاڈ اٹھاتی ہیں، ویسے ہی اس کی ماں بھی اس کے لاڈ اٹھائے، مگر ایسا نہیں تھا۔ سکینہ بی بی عمر کے جس حصے میں پہنچ چکی تھیں۔ وہاں ایسی خواہشات نری خرافات کے سوا اور کچھ نہیں تھیں۔ یہیں سے ایمل کے مزاج میں ضد اور غصے نے جگہ بنائی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے اسے شعور آتا گیا، اس کے اندر بہت سی چیزیں جگہ بنا چکی تھیں۔ وہ بہت غصیلی اور حساس ہو گئی تھی۔ یہ غصہ اور حساسیت اس وقت مزید بڑھ گئی جب اس کے بھائی عدنان کے سارے دوست اور بہن نمل کی ساری دوستیں پار لگ گئیں مگر ان کے گھر میں شادی کا ذکر تک نہیں ہوتا تھا۔ ہر آنے والے رشتے کو اس کے ماں باپ انکار کر کے باہر کا راستہ دکھا دیتے۔ ایک سال، دو سال، تین سال وقت جیسے جیسے آگے بڑھتا جا رہا تھا اس کے مزاج میں تناؤ آتا جا رہا تھا۔

عدنان کے سر میں سفید بال نظر آنا شروع ہو گئے تھے مگر وہ ایسا صابر کہ زبان سے ایک لفظ تک نکالنا گوارہ نہیں تھا جسے، نمل کی آنکھوں کے خواب بھی آہستہ آہستہ مرنے لگے تھے مگر صبر میں وہ بھی کسی طور اپنے بھائی سے پیچھے نہیں تھی۔

نمل پینتیس سے اوپر کی ہو گئی تھی جب ان کے گھر اس کے لیے رشتے آنا شروع ہوئے وہ بھی اپنی ہی برادری سے مگر نمل کو اس سارے قصے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے لیے اپنا گھر اور گھرداری ہی سب سے اہم تھے۔ ایمل کو اس کی اسی چپ سے چڑ ہوتی تھی۔

انتالیس سال کی عمر میں خدا خدا کر کے اس کا رشتہ پکا ہو گیا تھا۔ ادھیڑ عمر کے سانولے سلونے ریاض حسین کے ساتھ، جس کا اپنا شوروم تھا موٹر سائیکلز کا،

عدنان بھائی اس رشتے سے بہت خوش تھے۔ ایمل بھی ان کی خوشی میں خوش تھی۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ نمل کا رشتہ پکا ہو گیا تھا۔ اکتالیس سال کی عمر میں ہی سہی۔

خود وہ اب اٹھائیس سال کی ہو رہی تھی اور اسے ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں میڈیا منیجر کی جاب مل گئی تھی۔ تنخواہ اچھی تھی لہٰذا گھر والے بھی متعرض نہیں تھے۔ روز وہ صبح آرام سے اٹھ کر ناشتا کر کے جاتی اور پھر شام ڈھلے گھر واپس آتی۔ اس کے والدین اب بے حد ضعیف ہو چکے تھے۔ والد کو تو آنکھوں سے صحیح طرح دکھائی بھی نہیں دیتا تھا۔ جبکہ والدہ بلڈ پریشر اور شوگر کی وجہ سے ویسے بھی بستر سے لگ کر رہ گئی تھیں۔

ایسے میں اس نے کئی بار اپنی ماں سے بات کی اور انہیں سمجھایا کہ اب نمل کی شادی کے ساتھ ساتھ گھر میں بہو بھی آجانی چاہیے تاکہ کچھ رونق ہو، نسل آگے بڑھے اور عدنان کو بڑھاپے میں خوار نہ ہونا پڑے مگر ہر بار سکینہ بی بی نے اسے جھڑک کر رکھ دیا۔

ان کے نزدیک یہ بڑوں کے معاملات تھے اور بچوں کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ بڑوں کے معاملات میں ٹانگ اڑائیں' نتیجتاً" وہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتی مگر حقیقتاً" اسے اس ماحول سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔

نمل کی شادی کے لیے دونوں بہنوں نے تیاری شروع کر دی تھی۔ تب ہی اس روز مارکیٹ میں شاپنگ کے دوران اس پر ایک نیا انکشاف ہوا' نمل حسین کی محبت کا انکشاف...... وہ لوگ جیولر شاپ میں تھیں جب ایک سوٹڈ بوٹڈ سا خوب صورت شخص ان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ ایمل نے چونک کر اسے دیکھا تھا جب نمل اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔

"چلو ایمل ہم پھر کسی دن آجائیں گے یہاں۔" اس نے ایمل کا بازو پکڑا تھا۔ تب ہی وہ شخص تڑپ کر آگے بڑھا۔

"میری بات سن کر جاؤ نمل' وہ شخص تمہارے قابل نہیں ہے بہت بڑا فراڈ ہے' پچھتاؤ گی اس کے پلے پڑ کر۔" مگر نمل نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ ایمل کا ہاتھ پکڑ کر سحر کسی ٹیکسی کی تلاش میں شاپ سے باہر نکل آئی تھی۔ وہ شخص بھی ان کے پیچھے آیا تھا۔ ایمل نے ہاتھ چھڑا لیا۔

"کون ہے یہ شخص؟"

"پتا نہیں' میں نہیں جانتی۔" پیشانی پر چمکتی پسینے کی ننھی ننھی بوندوں کے ساتھ نمل نے بے ساختہ اس سے نظریں چرائی تھیں۔ ایمل کو دال میں کچھ کالے کا احساس ہوا۔ تب ہی وہ مشکوک انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اگر آپ اسے نہیں جانتیں تو وہ آپ کے پیچھے کیوں آرہا ہے؟"

"پتا نہیں۔"

"میں پتا کرتی ہوں۔" نمل کے ہاتھ سرد ہو رہے تھے مگر اس نے پروا نہیں کی۔

"کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔" وہ پیچھے آنے والے شخص کے مقابل جا کھڑی ہوئی تھی۔ تب ہی وہ بولا تھا۔

"شیور۔" نمل پاؤں پٹختی رہ گئی مگر اس نے پروا نہیں کی۔ اگلے بیس منٹ میں وہ لوگ ایک درمیانے درجے کے ریستوران میں بیٹھے تھے۔

"جی تو کیا فرما رہے تھے آپ؟" کولڈ ڈرنک آفر کرنے کے بعد اس نے اس شخص کی طرف نگاہ کی تھی جو بے حد وجیہہ تھا۔ نمل سر جھکائے بیٹھی رہی۔ تب ہی وہ شخص بولا تھا۔

"میرا نام سمعان ہے' نمل کی دوست ماریہ میری بہن ہے عرصہ تقریباً" دس سال سے میں اور نمل ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں' صرف نمل کے لیے میں نے اپنی پوری زندگی داؤ پر لگا دی' ہمارے ہاں کسی صورت برادری سے باہر شادی نہیں کی جاتی مگر نمل کے لیے میں خاندان کی اس ریت سے بھی ٹکرا گیا' کیا کیا نہیں کیا میں نے اس کے لیے مگر پھر بھی اس نے

میرا ساتھ نہیں دیا' جب بھی میں نے رشتہ بھیجنے کی بات کی۔ اس نے منع کردیا' یہ کہہ کر میرے گھر والے ابھی شادی نہیں کرسکتے دس سال سے یہی ایک جواب سن سن کر میرے کان پک گئے تھے۔ ادھر گھر کا اکلوتا بیٹا ہونے کے ناطے ابو جی نے بے حد مجبور کرکے اپنی بہن کی بیٹی کے ساتھ زبردستی نکاح پڑھوادیا' اب جبکہ میں حالات اور تقدیر پر صبر کرچکا ہوں' یہ ایک ایسے شخص کے ساتھ شادی رچانے جارہی ہے جسے میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں' ایک نمبر کا شکی مزاج اور آوارہ شخص ہے وہ۔" ہنار کے' ایک ہی سانس میں اس شخص نے ساری کہانی سامنے رکھ دی تھی۔

ایمل ہکا بکا سی بیٹھی اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ زیست کا اتنا بڑا راز اور سچ نمل نے اس سے چھپایا' اپنی سگی بہن سے؟ اسے کسی طور یقین نہیں آرہا تھا۔



ریستوران سے نکل کر گھر پہنچنے تک وہ دونوں بالکل خاموش رہی تھیں۔ گھر پہنچی تو شام ڈھل رہی تھی۔ اور عدنان نک سک سا تیار کہیں باہر جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔

ایمل فریش ہوکر بستر میں جا گھسی' نمل نے گھر سمیٹنا شروع کردیا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے کسی بھی وقت بارش کا امکان ہوسکتا تھا۔

عدنان اپنے دوستوں کے ساتھ گھر سے نکل گیا تو وہ رات کے کھانے کی تیاری میں جت گئی۔ کھانے پکا کر اماں کے پاس آئی تو وہ اسے کہنے لگیں۔

"عدنان مری گیا ہے دوستوں کے ساتھ گھومنے' تمہاری پھوپھو کی کال آئی تھی آج انگلینڈ سے۔"

"خیریت... پھوپھو کو کیسے یاد آگئی ہماری؟"

"ارے یاد کیسے نہ آتی۔ نیٹ پر عدنان کی تصویریں دیکھی ہیں اس نے' بہت پسند آیا ہے' اسے اپنی چھوٹی بیٹی کے لیے کہہ رہی تھی رشتے کا۔"

"پھر آپ نے کیا جواب دیا؟"

"ابھی تو کچھ نہیں کہا۔ مگر وہ لڑکی میری دیکھی ہوئی ہے۔ ماشاءاللہ بہت پیاری اور سمجھ دار بچی ہے۔ سوچ رہی ہوں تمہارے ابا سے مشورہ کرکے اسی ہفتے منگنی پکی کردوں۔ آخر کو سمجھ دار ہوگیا ہے میرا عدنان' گھر بار چلانے والا ہوگیا ہے۔"

"جی... ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔" نمل کہہ نہیں سکی کہ سمجھ دار تو وہ کئی سال پہلے ہی ہوگیا تھا' جہاں تک گھر چلانے کی بات تھی تو اس بات کو بھی صدیاں بیتنے والا حساب تھا۔

رات میں کھانے سے فارغ ہوکر وہ کچن میں چائے بنانے آئی تو ایمل پہلے سے وہاں موجود برتن دھو رہی تھی۔

"اماں سے بات کی تم نے ریاض بھائی کے بارے میں؟" برتن دھوتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"نہیں..."

"کیوں؟"

"بس... موقع ہی نہیں ملا۔ ویسے بھی میرے پاس کوئی جواز نہیں اس بات کا اگر وہ پوچھ لیں کہ تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی' تم کہہ دیتیں کہ میری دوست کے بھائی کا دوست ہے۔ اسی نے سب بتایا ہے۔"

"نہیں... میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے۔"

"کمال ہے۔ تمہاری پوری زندگی کا معاملہ ہے اور تم اتنی لاپروائی سے کام لے رہی ہو۔"

"اللہ مالک ہے۔ اگر بڑوں نے اس شخص کو میرے لیے پسند کیا ہے تو کچھ سوچ کر ہی کیا ہوگا۔ مجھے اپنے ماں' باپ سے زیادہ ماریہ کے بھائی پر اعتبار نہیں ہے۔"

"بہت فضول لڑکی ہو تم نمل' بتا رہی ہوں میں تمہیں۔" ان دونوں میں گہری دوستی بھی تھی اور چھوٹے بڑے کا احترام بھی لہٰذا ایمل کبھی اسے آپا کہتی تو کبھی صاف برابری کے مقام پر آجاتی۔ اس وقت بھی یہی ہو رہا تھا۔

نمل نے چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیا۔ "تمہیں

ایک خوش خبری سنائی تھی۔ انگلینڈ سے پھوپھو کا فون آیا تھا۔ اپنی چھوٹی بیٹی کے لیے انہوں نے عدنان بھائی کا رشتہ مانگا ہے۔"

"واؤ! یہ تو واقعی بہت بڑی خوش خبری ہے۔ امی نے کیا کہا پھر۔"

"کیا کہنا تھا۔ امی راضی ہیں۔ کہہ رہی تھیں۔ ابو سے بات کر کے اسی ہفتے بات پکی کردیں گی۔"

"سچ؟" ایمل کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ نمل نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ تو واقعی بہت بڑی خوش خبری ہے۔ عدنان بھائی کو پتا چلے گا تو وہ بہت خوش ہوں گے۔"

"واقعی۔۔۔ ان کے لیے سرپرائز رکھتے ہیں۔" ایمل نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

اس رات بہت ٹھنڈ تھی۔ عدنان گھر پر نہیں تھا۔ لہٰذا وہ لوگ سرشام ہی بیرونی دروازہ لاک کر کے بستروں میں دبک گئے تھے۔ صبح چار بجے کے قریب نمل کی آواز فون کی تیز بجتی گھنٹی سے کھلی تھی۔

"ہیلو۔" ریسیور اٹھا کر بوجھل آواز میں اس نے کال پک کی تھی جب دوسری طرف سے بنا کسی سلام و دعا کے پوچھا گیا۔

"عدنان احمد کا گھر ہے یہ؟"

"ہاں جی۔" نمل کی نیند بھک سے اڑ گئی۔ "آپ کے لیے ایک بری خبر ہے۔"

"بری خبر؟" اس کے حلق سے بمشکل نکلا، جبکہ دل پوری شدت سے دھڑکا تھا۔

"ہاں جی بری خبر ہی ہے، عدنان احمد کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ جانبر نہیں ہوسکا۔" خبر کیا تھی، ایک قیامت تھی۔ نمل کو لگا جیسے اس کے وجود میں جان ہی نہ رہی ہو۔ ریسیور ہاتھ سے چھوٹ کے کب گرا اسے خبر ہی نہیں ہوسکی تھی۔ ایمل جو بستر پر اس کی واپسی کا انتظار کررہی تھی۔ کافی دیر تک اس کے واپس نہ آنے پر خود بستر سے نکل کر لاؤنج میں آئی تو نمل کو ساکت بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"کیا ہوا؟ کس کا فون تھا؟" مگر وہ جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔ اگلے چند گھنٹوں کے بعد اس کی چپ ٹوٹی تو گویا کہرام مچ گیا۔ "عدنان کا بیج" کا واحد چراغ گل ہوچکا تھا۔ حسیب احمد کی نسل ختم ہوگئی تھی۔ ماں، باپ کے بڑھاپے کی لاٹھی ٹوٹ چکی تھی۔ اسی روز سہ پہر میں عدنان احمد کا زخموں سے چور بدن لاش کی صورت گھر واپس آچکا تھا۔ زندگی کی چالیس بہاریں دیکھنے کے باوجود وہ شخص دنیا سے ویسے ہی جارہا تھا جیسے دنیا میں ماں کے پیٹ سے نکل کر آیا تھا۔

سارے خواب جو اس نے اپنے مستقبل کے لیے دیکھ رکھے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دم توڑ گئے۔ ساری حسرتیں اور خواہشات مٹی ہوگئیں۔ سکینہ بی بی کا رونا دیکھا نہ جاتا تھا۔ ان کا تو گلشن ہی ویران ہوگیا تھا۔ نمل اور ایمل پر بار بار بے ہوشی طاری ہورہی تھی۔ مگر۔۔۔ جو نقصان ہونا تھا ہوچکا تھا۔ حسیب احمد صاحب جو پہلے ہی مفلوج تھے۔ ان کی کمر مزید ٹوٹ گئی۔ عدنان ہی تو انہیں سنبھالتا تھا۔ وہی تو ان کی آنکھوں کا نور تھا۔ انہیں لگا جیسے ان کی آنکھیں بالکل نابینا ہوگئی ہوں، ساری دنیا ایک دم سے تاریک ہوگئی ہو۔ اگلے ایک ماہ تک ان کے گھر افسوس کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا تھا۔ ایمل کے لبوں پر مستقل چپ نے ڈیرہ ڈال لیا۔

سکینہ بی بی اب ہمہ وقت ایک ہی بین کرتے ہوئے دکھائی دیتی تھیں کہ کاش وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی اس کے بالغ ہوتے ہی کردیتیں تو آج ان کے گھر میں ایسا سناٹا نہ ہوتا۔ بیٹے کی نشانی کے طور پر کچھ تو ان کے پاس ہوتا۔۔۔ بہو۔۔۔ بچے۔۔۔ پچھتاوا تھا کہ کسی طور کم ہی نہ ہوتا تھا، مگر اب اس پچھتاوے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ کیونکہ جانے والا تو اپنی ساری خواہشات و جذبات اپنے ساتھ ہی لے کر منوں مٹی تلے ابدی نیند سو گیا تھا۔ نمل کی شادی بھی التوا کا شکار ہوگئی۔ گھر کی فضا میں پہلے ہی وحشت کا راج تھا۔ اب مزید ویرانی بکھر گئی۔ نہ کسی کا کھانا بنانے کو دل چاہتا تھا، نہ کھانے کو۔

عدنان کو دنیا سے گزرے چھ ماہ ہونے کو آئے تھے۔
جب نمل کے رشتے سے جواب ہوگیا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کے بیٹے نے اپنی پسند سے کہیں اور شادی کرلی۔ لہٰذا ان کی طرف سے معذرت ہے۔
گرتی ہوئی شکستہ دیواروں کو ایک اور دھکا لگ چکا تھا۔ حسیب احمد صاحب بالکل ہی بستر سے لگ کر رہ گئے۔
ان کی بیٹی عمر کے جس حصے میں تھی وہاں اس کے لیے دوبارہ سے نیا رشتہ ڈھونڈ کر بات طے کرنا بہت مشکل تھا۔ لہٰذا نمل کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔
ایمل کی جاب کو سات سال کا عرصہ پورا ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس روز پھر بہت ٹوٹ کے بارش ہوئی تھی۔ وہ اپنا کام مکمل کرکے ابھی آفس سے نکلنا ہی چاہ رہی تھی، جب کسی نے اسے پکار لیا۔
"مس ایمل۔۔۔" وہ چونکی تھی اور چونک کر پلٹی تھی۔
"جی فرمایئے۔" اپنے سامنے ایک گریس فل سے شخص کو کھڑے دیکھ کر اس نے خالص پروفیشنل انداز میں پوچھا تھا جب وہ بولا۔
"میرا نام اشعر حسین ہے، پچھلے چار سال سے میری کمپنی آپ کے ادارے کے تھرو اپنی ایڈورٹائزنگ کررہی ہے، مگر بے حد افسوس کی بات ہے کہ ایک کلائنٹ کو آپ سے پھر بھی شکایت ہے کہ آپ لوگ اپنا کام ایمان داری سے نہیں کررہے۔"
سارا آفس خالی ہو چکا تھا۔ وہ اس شخص کی گفتگو سن کر حیران رہ گئی۔
"میں سمجھی نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔"
"میں سمجھا دیتا ہوں، اگر آپ کہیں بیٹھ کر بات کرسکیں تو۔۔۔"
"جی شیور۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے واپس پلٹ کر اپنے آفس کا دروازہ کھول دیا تھا۔
"تشریف رکھیے۔" ہاتھ سے کرسی کی جانب اشارہ کرتی وہ خود بھی اپنی سیٹ پر ٹک گئی تھی۔ اشعر حسین نے اس کے مقابل اپنی سیٹ سنبھال لی۔
"کیا آپ یہاں میڈیا مینیجر ہیں۔"
"جی ہاں۔"
"گڈ۔۔۔ پھر تو آپ کے علم میں ہوگا کہ فیروز اینڈ سنز کے کئی ایڈ مختلف پیپرز کے لیے آپ کی کمپنی کے تھرو بک ہوتے ہیں اور وہ بھی ہینڈسم اماؤنٹ کے ساتھ۔"
"جی ہاں۔۔۔ میرے علم میں ہے۔ آپ کسی شکایت کے سلسلے میں تشریف لائے ہیں۔"
"میں فیروز اینڈ سنز کا چیف ہوں، میرے میڈیا مینیجر کے مطابق آپ لوگوں نے پچھلے ڈیڑھ سال سے ایک ادارے کو پے منٹ نہیں کی، جبکہ ہماری طرف سے آپ کو مقررہ وقت پر چیک ملتے رہے ہیں۔" اس شخص نے اپنی بات واضح کی تھی۔ وہ حیران ہی تو رہ گئی۔ بھلا ایک اونر بندے کو خود چل کر کسی ایڈورٹائزنگ کمپنی میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟
"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں۔ یقین نہیں آرہا میری بات کا؟"
"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ اصل میں ہماری طرف سے کسی بھی ادارے کی پے منٹ رکی ہوئی نہیں ہے۔"
"مگر ہمیں تو شکایت موصول ہوئی ہے۔"
"تو پھر میں معذرت چاہوں گی کہ آپ کو غلط گائیڈ کیا گیا ہے۔"
"میرے پاس ثبوت ہے اس بات کا کہ آپ کی طرف سے پے منٹ کلیئر نہیں ہوئی۔" وہ شخص بضد تھا۔ ایمل کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔
"اگر ایسا کوئی معاملہ ہے تو پلیز آپ شفیق صاحب سے براہ راست ملیں۔ وہی اس کمپنی کے مالک ہیں اور سیاہ و سفید کے مالک بھی، فی الوقت آفس ٹائمنگ ختم ہوچکی ہے۔ میں معذرت چاہوں گی، مجھے گھر جانا ہے۔" اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی، جب وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
"ٹھیک ہے، کاروباری معاملات کے سلسلے میں بھی شفیق صاحب سے مل لوں گا، لیکن اگر رشتہ داری کا

کوئی معاملہ ہو تو کس سے ملوں؟"
"میں سمجھی نہیں۔" اپنا بیگ اٹھاتے اٹھاتے اس نے رک کر سامنے بیٹھے شخص کی طرف دیکھا تھا۔

جب وہ بولا۔
"میں آپ کو پرپوز کرنا چاہتا ہوں۔"
"کیا...! یہ ممکن نہیں ہے۔"
"کیوں... کیوں ممکن نہیں ہے؟"
"اس لیے کیونکہ میں آپ کو نہیں جانتی' دوسری بات میری زندگی میں فی الحال شادی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔"
"سو واٹ...! میں اپنا تعارف کروا دیتا ہوں' باقی آپ تسلی سے سوچ لیجیے گا' مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔"
"مگر...."
"تو اگر مگر پلیز... میں آپ کو آپ کے تمام سوالوں کے جواب دوں گا مگر وقت آنے پر۔"
"مجھے آپ کے جوابات کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کو صاف لفظوں میں بتا چکی ہوں کہ میری زندگی میں شادی کے لیے قطعی گنجائش نہیں ہے۔ آپ نے پرپوز کیا بے حد شکریہ' اب اجازت چاہوں گی' خدا حافظ۔" اس کا لہجہ بے حد سرد اور سپاٹ تھا۔ اشعر دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں پر ٹھوڑی ٹکائے چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتا رہا گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر پہنچی تو تھکن سے جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ نمل آٹا گوندھ رہی تھی۔ وہ کچن میں ہی آ گئی۔ "ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟"
"ہوں کیوں نہیں' ابھی بنا دیتی ہوں۔"
"مہربانی... میں ذرا فریش ہو لوں۔" کہتے ہی وہ کچن سے نکل گئی تھی۔ اپنے کمرے میں آئی تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آج جو شخص اسے آفس میں ملا وہ کون تھا اور اسے کب سے' کیسے جانتا تھا' مگر وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ اسے عدنان کی موت کے بعد اس گھر میں عدنان کا کردار ادا کرنا تھا۔ اپنی ادھیڑ عمر بہن اور ضعیف ماں' باپ کا سہارا بننا تھا۔ وہ ان سب کو روند کر اپنی خوشیوں کی سیج نہیں سجا سکتی تھی۔ جو راحت' اس کے بھائی اور بہن کو نہ مل سکی تھی' وہ راحت بھلا وہ کیسے پا لیتی؟ آنسو بہتے رہے' گال جلتے رہے اور وہ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارتی رہی۔ نمل چائے لے کر آئی تو وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔
"آج پھر لیٹ ہو گئیں تم؟" بیڈ پر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا' جب وہ بولی۔
"ہاں... کچھ اضافی کام نکل آیا تھا۔"
"چلو خیر ہے' آج ماریہ آئی تھی گھر ملنے کے لیے۔"
"اچھا... کیا کہہ رہی تھی؟"
"کہنا کیا ہے' اپنے دکھ رو رہی تھی۔ ماں' باپ نے برادری کی وجہ سے برادری سے باہر شادی نہیں کی' ہر بہترین سے بہترین رشتے کو ٹھکرا کر برادری میں راج گیری کرنے والے کے پلے باندھ دیا۔ اب جبکہ چار بچوں کی اماں بن گئی ہے' تو وہ کام چھوڑ کر بیٹھ گیا ہے۔ سارا سارا دن گھر پڑا چارپائی توڑتا ہے اور بچے اس کی جان کھاتے ہیں' اپنی خوراک اور ضرورتوں کے لیے... بہت رو رہی تھی۔ ماں' باپ بھی کیا کر سکتے ہیں اب بھلا؟ کہتے ہیں اپنے نصیب کے ساتھ سمجھوتا کرو' ہم نے تو اچھا ہی دیکھا تھا۔ مزے کی بات جس برادری کے لیے اس کی زندگی برباد کی وہی برادری اب مشکل میں کام آنے کے بجائے تماشا دیکھتی ہے۔"
"یہی ہونا تھا' میں جانتی ہوں۔"
"خدا نہ کرے کہ تمہارے ساتھ ایسا کچھ ہوا ایمل' خدا تمہیں زندگی کی ہر خوشی دے۔" نمل نے اس کے سرد آہ بھرنے پر خلوص دل سے دعا کی تھی' تب وہ مسکرا دی۔
"خدا اپنے بندوں کے ساتھ برا نہیں کرتا آپا' یہ ہم انسان ہیں جو اپنے ساتھ برا کرتے ہیں اور پھر پچھتاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملتا'

جیسے اب امی اور ابا کو عدنان بھائی کے لیے نہیں مل رہا' کتنے اچھے تھے ہمارے عدنان بھائی۔" اہمل کی آنکھیں بات کرتے کرتے بھر آئی تھیں۔ نمل کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔

"پتا نہیں عدنان بھائی نے کیا' کیا خواب دیکھ رکھے ہوں گے اپنی زندگی کے لیے۔۔۔ مگر۔۔۔ وقت نے وفا نہیں کی' سب کچھ مسمار کر دیا اجل نے' کاش ان کی شادی ہوئی ہوتی تو آج ہم یوں اکیلے نہ ہوتے' ہماری بھابھی اس گھر کو سنبھالنے کے لیے یہاں موجود ہوتی اور عدنان بھائی کے بچے اب تک وہ بھی دس دس بارہ بارہ سالوں کے ہو چکے ہوتے' کتنی رونق ہوتی ہمارے گھر میں ان کے ہونے سے' اب جو وحشت ٹپکتی ہے یہ تو نہ ہوتی۔"

"ہوں' صحیح کہتی ہو' کبھی بھی بڑوں سے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں' چلو خیر' تم یہ چائے پیو اور آرام کرو' میں ذرا ابو کو واش روم تک لے جاؤں' کب سے آوازیں دے رہے ہیں۔"

"میں لے جاتی ہوں۔"

"نہیں تم تھک کر آئی ہو' آرام کرو شاباش۔" اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے نمل کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ اہمل نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"میں آپ کو پرپوز کرنا چاہتا ہوں۔" یہ لفظ' یہ لہجہ بار بار اس کی سماعتوں میں گردش کر رہا تھا۔ وہ ٹھٹکنے لگی۔

"کون ہو سکتا ہے یہ شخص اور اسے بھلا کیسے اور کب سے جانتا ہے؟ کہیں وہ اس کا مذاق تو نہیں اڑا رہا تھا۔ اس میں تو ایسا کچھ بھی خاص نہیں تھا کہ کوئی بغیر جانے بوجھے یوں ایک دم سے پرپوز کر دے۔"

اگلے روز آفس جاتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کیا خبر وہ آج بھی اس کے رستے میں آ جائے' مگر وہ نہیں آیا تھا۔ گھڑی کی ٹک ٹک کرتی سوئیاں اس کے دل کی ایک ایک دھڑکن کے ساتھ آگے بڑھتی گئی تھیں۔ ہر ہر آہٹ پر بے ساختہ اس نے چونک کر دیکھا تھا' مگر وہ نہیں آیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس کے ساتھ مذاق ہوا ہے' بھلا کوئی ایسے پروپوز بھی کیسے کر سکتا ہے۔ زندگی کوئی ناول یا افسانہ تو نہیں ہوتی۔ آفس ٹائمنگ کے بعد وہ جان بوجھ کر آدھا گھنٹہ لیٹ بیٹھی رہی تھی' مگر کوئی نہیں آیا تھا۔ تب ہی آفس سے نکلتے ہوئے اسے بے ساختہ اپنے الفاظ یاد آئے۔

"مجھے آپ کے جوابات کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کو صاف لفظوں میں بتا چکی ہوں کہ میری زندگی میں شادی کے لیے قطعی گنجائش نہیں ہے۔ آپ نے پرپوز کیا بے حد شکریہ۔ اب اجازت چاہوں گی۔" جب خود ہی دروازہ بند کر دیا تھا اب سماعتوں کو آہٹوں کا انتظار کیسا؟ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے وہ آفس سے نکل آئی تھی۔ اس کی زندگی میں واقعی اب شادی کی گنجائش نہیں رہی تھی۔



ضروری میٹنگ سے فارغ ہو کر اس نے رخصت کے لیے باس کے کمرے میں قدم رکھا' تو دہلیز پر ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ اشعر حسین اس کے باس کے آفس میں موجود تھا اور دونوں کسی بات پر خوب کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ اہمل کے قدم جیسے من من کے بھاری ہو گئے۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہل سکی تھی۔

"ارے مس اہمل' آیئے۔" باس کی نظر اس پر پڑی تو انہوں نے پکار لیا۔ اشعر حسین نے بے ساختہ اسے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ بمشکل اپنا ازلی اعتماد بحال کرتی آگے بڑھی تھی۔

"ایکسکیوزمی سر۔ مجھے آج ذرا جلدی گھر جانا ہے' میرے والد کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ جا سکتی ہیں' کوئی مسئلہ نہیں۔" ہمدانی صاحب جو کمپنی کے مالک تھے' بے حد شفیق اور بااخلاق انسان تھے۔ اہمل ان کا شکریہ ادا کرتی واپس پلٹ آئی۔ اشعر حسین کی نظریں دہلیز تک اس کا تعاقب کرتی رہی تھیں۔

وہ گھر آئی تو نمل رو رہی تھی۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ "نمل۔۔۔ سب خیر تو ہے؟" پرس پھینک کر وہ تیزی سے اس کے قریب آئی تھی، جب نمل اٹھ کر اس کے گلے لگ گئی اور مزید شدت سے رونے لگی۔ ایمل کا جیسے سانس بند ہونے لگا تھا۔

"نمل مجھے بتاؤ پلیز کیا ہوا ہے۔ امی، ابو کہاں ہیں، سب ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں۔۔۔" روتے روتے اس نے بھرائی آواز میں کہا تھا اور پھر اس سے الگ ہو کر آنکھیں صاف کریں۔

"اگر امی، ابو بالکل ٹھیک ہیں تو تم ایسے کیوں رو رہی ہو؟ اور مجھے کیوں بلوایا ہے آفس سے؟"

"مجھے خود بھی نہیں پتا ایمل کہ میں کیوں رو رہی ہوں۔"

"کیا مطلب؟ پلیز کھل کر بتاؤ کیا ہوا ہے۔"

"میں بتاتی ہوں، ادھر آؤ۔" اماں نہ جانے کب دہلیز پر آ کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ پلٹ کر انہیں دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں کے کمرے میں ہی ابا چارپائی پر چت لیٹے تھے، مگر ایمل دیکھ سکتی تھی کہ ان کے چہرے پر ایک عجیب سا سکون بکھرا تھا۔

"بیٹھو۔" اماں نے اسے اپنے قریب ہی اپنی چارپائی پر بٹھا لیا تھا۔

"نمل کا رشتہ طے کر دیا ہے ہم نے، اسی مہینے کے آخر میں شادی ہے۔"

"کیا۔۔۔ مگر کیسے؟" وہ اچھل ہی تو پڑی تھی۔ اماں مسکرا دیں۔

"بس۔۔۔ جب میرا سوہنا رب کسی کی سچی توبہ قبول فرما کر اس کے بگڑے کام سنوارتا ہے تو اسی طرح اپنی رحمت کے خزانوں کے منہ کھول دیتا ہے۔ مجھے یقین تھا میری بچی کا نصیب ضرور کھلے گا اور دیکھ لو میرے پاک رب نے میرا یقین ٹوٹنے نہیں دیا۔" اماں کی آنکھوں میں بھی شکر کے آنسو تھے۔ ایمل کی اپنی آنکھیں بھر آئیں۔

اللہ رب العزت کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے اماں، یہ تو واقعی بہت بڑی خوش خبری ہے۔ "مگر یہ ہوا کیسے؟"

"یہ تو رب سوہنا ہی جانتا ہے بیٹے، مجھے تو صرف اتنا پتا ہے کہ میرے رب نے مجھے سرخرو کر دیا۔ آج شام میں وہ لوگ پھر آئیں گے، تم بھی مل لینا۔"

"جی ضرور۔" وہ اندر تک سرشار تھی۔ اماں گہری سانس بھرتے ہوئے مطمئن سی واپس پلٹ گئیں۔



اگلے پچیس دن کیسے گزرے، کچھ خبر ہی نہ ہو سکی۔

پلک جھپکتے میں جیسے شادی کی ساری تیاری مکمل ہو گئی تھی۔ نمل کے چہرے پر کھلنے والے خوابوں کے خوش رنگ گلاب ایمل کی نگاہوں سے قطعی پوشیدہ نہ رہ سکے تھے۔ وہ جتنا بھی اپنے سوہنے رب کا شکر ادا کرتی کم تھا۔

برات والے دن نمل پر ٹوٹ کر روپ آیا، خود ایمل بھی بہت اہتمام سے تیار ہوئی۔ نکاح ہو گیا تھا۔ ایمل نے دیکھا، نمل کا ہونے والا شوہر بے حد خوب صورت اور چارمنگ پرسنالٹی کا مالک تھا۔ اسے بعد میں پتا چلا تھا کہ اس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے جنہیں ماں کے خالص پیار کی اشد ضرورت تھی۔ نمل اس کے بچوں کو خالص ماں جیسا پیار دے سکتی ہے۔ اس بات کی گارنٹی ماریہ کے بھائی نے دی تھی۔ اسی بھائی نے جو کبھی نمل کو دل و جان سے پسند کرتا تھا۔ نمل کا شوہر شاہ ویز اس کا قریبی عزیز دوست تھا۔ لہٰذا اس نے اپنا پیار اپنے عزیز دوست کی جھولی میں ڈال دیا۔

شاہ ویز جتنا خوب صورت تھا اتنا ہی امیر بھی تھا۔ ماں، باپ حیات تھے۔ صرف ایک بہن تھی جو اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ملک سے باہر رہتی تھی۔ ایک چھوٹا بھائی حال ہی میں یونی ورسٹی سے فارغ ہو کر اب کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ ایمل کے پاؤں مارے خوشی اور مسرت کے زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ نکاح کے بعد ابھی کھانا شروع ہی ہوا تھا جب وہ کسی کام سے پلٹی تو اشعر حسین سے ٹکرا گئی۔ ٹکر شدید تھی، مگر سامنے کھڑے بندے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ

گئی تھیں۔

"آپ یہاں؟" جانے کیسے بے ساختگی میں اس کے منہ سے نکلا تھا۔ جواباً" اس کے سامنے کھڑا وہ خوابوں کے شہزادے جیسا شخص مسکرا دیا۔

"شکر ہے آپ نے پہچان لیا' ورنہ میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ کون کون سے حوالے دے کر اپنا تعارف کروانا پڑے گا۔" اس کی مسکراہٹ مقابل کو زیر کرنے والی تھی۔ ایمل کی نظریں جھک گئیں۔

"کیا ہم صرف چند منٹ بیٹھ کر بات کرسکتے ہیں پلیز؟" اس کی جھکی پلکوں کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے التجا کی تھی۔ ایمل اس بار اسے مایوس نہ کرسکی۔ اوپر چھت پر مہمان نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ اس کے سنگ اعتماد سے قدم اٹھاتی وہیں چلی آئی۔

"کہیے' کیا کہنا ہے آپ کو؟" اس کا دل بہت تیز دھڑک رہا تھا۔ اشعر حسین کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بات کہاں سے شروع کرے۔ تب ہی چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس کی لرزتی پلکوں کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

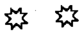
"شاہ ویز حسین میرے بڑے بھائی ہیں اور آپ کی بہن نمل الحمدللہ میری بھابھی بن چکی ہیں۔ ماریہ آپی نے مجھے نمل بھابھی اور آپ کی تصاویر دکھائی تھیں۔ ان ہی کے منہ سے آپ کے بارے میں اتنا کچھ سنا کہ بنا دیکھے آپ کو زندگی میں شامل کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی۔ اصل میں میری طبیعت عام مردوں سے ذرا ہٹ کر ہے۔ مجھے عورت کی صرف خوب صورتی اپیل نہیں کرتی' میں چاہتا ہوں عورت خوب صورت ہو یا نہ ہو' مگر پراعتماد ضرور ہو' زندگی کی الجھنوں اور آزمائشوں کا ڈٹ کر بہادری سے سامنا کرنا ضرور جانتی ہو۔ یہی چیز میں نے آپ کی شخصیت میں دیکھی تو آپ کو پرپوز کردیا' مگر آپ نے نہایت سہولت کے ساتھ بنا سوچ و بچار کی زحمت کیے میرا پرپوزل ٹھکرا دیا' آپ کے اس سلوک نے میری مردانہ انا کو گہری چوٹ پہنچائی اور میں خاموش ہوگیا۔

مجھے ماریہ آپی نے ہی آپ کی جاب کے بارے بتایا تھا۔ اصل میں ماریہ آپی اور میرے گھرانے کے بہت اچھے اور قریبی تعلقات ہیں' کافی آنا جانا ہے ہمارا ایک دوسرے کے گھر' آپ کے آفس آیا تو آپ کا باس بھی میرا قریبی دوست نکل آیا۔ اس نے بھی آپ کی ذات اور کردار کی بہت تعریف کی۔ میرا حق نہیں بنتا کہ ایک بار ریجیکٹ ہونے کے بعد میں دوبارہ آپ کے سامنے دست سوال دراز کروں' مگر حقیقت یہی ہے ایمل کہ میں واقعی آپ جیسی لڑکی کو کھونا نہیں چاہتا' کیا اب بھی آپ وہی کہیں گی جو پہلے کہہ چکی ہیں؟"

ذرا سا جھک کر وہ اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ایمل کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہوگئیں۔ جانے کیسے اس کا سر خود بخود نفی میں ہل گیا تھا۔ اشعر حسین کے چہرے پر بکھرنے والی مسکراہٹ اس سے مخفی نہ رہ سکی۔

"تھینک یو' تھینک یو سو مچ۔" وہ خوش تھا۔ ایمل مسکرا کر ایک والہانہ نظر اس پر ڈالتے ہوئے پھر سے نیچے بھاگ گئی۔ زندگی میں سب ہی موسم آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں' اس کی زندگی سے بھی خزاں کا موسم رخصت ہوچکا تھا اور اب پیار محبت کا ہاتھ تھامے' خوش رنگ خوابوں کی لوری سناتی اس کے دل کے بند کواڑوں پر دستک دے رہی تھی اور ایمل رضا لاکھ جذباتی سہی' مگر اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ اب بھی دل کے بند کواڑ نہ کھولتی۔

اوپر چھت پر اشعر حسین اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا' جبکہ نیچے خوب صورت لان میں وہ اپنے رب کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ساری محفل کو مسکرا کر دیکھ رہی تھی کہ اب دل کے موسم نے جو اندر پھول ہی پھول کھلا دیے تھے۔



مصباح علی سید

ازمیر اور مریم آسٹریلیا کے شہر وکٹوریہ میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی روائیبہ شادی کے گیارہ سال بعد پیدا ہوئی۔ غیر معمولی خوب صورت اور معصوم روائیبہ کی سالگرہ جندب نے وہاں کے مشہور نیشنل گرین فورسٹ میں ارینج کی۔ جندب ازمیر کے پرانے دوست رضا حیات کا بیٹا ہے۔ جو آسٹریلیا میں پڑھ رہا ہے' جندب اور روائیبہ کی پرخلوص دوستی ہے۔ جندب اسے پسند بھی کرتا ہے' مگر اظہار نہیں کرتا۔

میرزکا فیصل آباد کے نواحی گاؤں میں مانے ہوئے زمیندار اور اہم سیاسی شخصیت ہیں۔ بیوی وفات پا چکی ہے۔ ان کے دو بیٹے خیام زکا' حنبل زکا ہیں۔ خیام کی دو بچے اعشال اور ازلان ہیں۔ ان کی بیوی آئمہ روایتی زمیندارنی اور حویلی پر حکمران ہیں۔ میرزکا کی والدہ ماں جان فالج کی مریضہ ہیں۔

زینب حویلی میں جدی پشتی خدمت گزار ہے' لیکن حنبل کی پرکشش شخصیت کے سحر میں بری طرح جکڑی ہے اسی لیے اپنے ہر آنے والے رشتے کو ٹھکراتی رہتی ہے۔

شہروز کمال ایک اکھڑ دماغ شخص ہے۔ دولت مند ہونے کے ساتھ رنگین مزاج بھی ہے۔ صبرینہ سے پسند کی شادی کرنے کے باوجود اس سے اکتایا رہتا ہے۔ وجہ چار بیٹیوں کی اوپر تلے پیدائش ہے اور وہ بیٹے کا تمنائی ہے۔



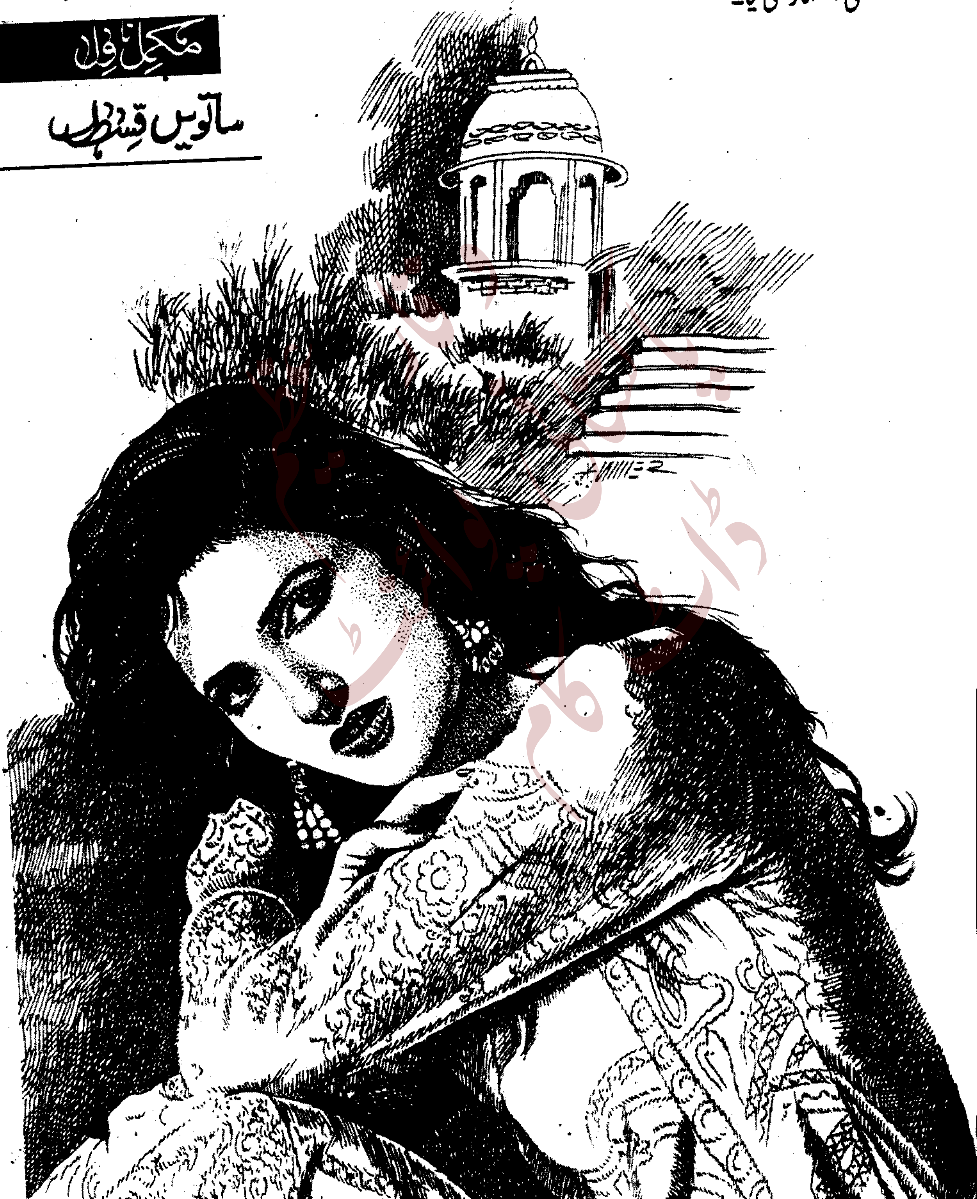
اماں جان کی طبیعت شدید خراب ہوتی ہے وہ اپنے بیٹے ازمیر سے ملنے کی خواہش رکھتی ہیں۔ جب کہ میرز کا کی ان سے ناراضی چل رہی ہے کیوں کہ ازمیر نے ان کی سالی کو طلاق دے کر آسٹریلین کرسچن لڑکی مریم سے شادی کی تھی، لیکن اب ماں کے اصرار پر حنبل ذکا ازمیر کو پاکستان بلانے کے لیے قائل کرلیتا ہے۔

رضا حیات کی بیٹی ماہم کی منگنی ہے انہیں پتا چلتا ہے ازمیر پاکستان آرہا ہے وہ شرکت کی دعوت دے دیتے ہیں۔

ازمیر مریم دونوں پاکستان آتے ہیں۔ کچھ ناراضی کے اظہار کے بعد میرز کا نے انہیں معاف کردیا روائیبہ کو نہ لانے پر خفگی کا اظہار بھی کیا۔

مکمل ناول

ساتویں قسط



ازمیر اور مریم ہفتے بعد ماہم کی منگنی اٹینڈ کرنے اسلام آباد جارہے تھے راستے میں ہی ایئر کریش میں ان کی وفات ہو جاتی ہے۔

شہروز کمال کے طعنے اور رنگینی عروج پر ہے جس سے صبرینہ ہر وقت پریشان ہے۔ آئمہ کی بہن سلویٰ' صبرینہ کی خالہ زاد ہونے کے ساتھ گہری سہیلی ہے اور اس کا دکھ اپنی تسلی سے کم کرتی رہتی ہے۔

ماں باپ کی وفات پر روائیبہ پاکستان آتی ہے۔ سب اس سے پہلی بار ملتے ہیں۔ اس کی اداسی کے سبب سب ہمدرد ہیں۔ کچھ عرصے بعد وہ واپسی کا تقاضا کرتی ہے تو میرزکا اسے روکنے کے لیے اس کی شادی کے درپے ہیں اور ازلان کا رشتہ پیش کرتے ہیں۔ یہ رشتہ ماں جان کو پسند نہیں وجہ پرانی رنجش ہے۔ ازمیر نے آئمہ کی پھپھو ہاجرہ کو طلاق دی تھی۔ ہاجرہ صبرینہ کی والدہ تھیں جواب مرحومہ ہیں۔ ماں جان حنبل کا رشتہ روائیبہ کے لیے قبول کرلیتی ہیں۔ سلویٰ حنبل کی بچپن کی منگیتر تھی۔ اپنی منگنی ٹوٹنے پر بہت دل برداشتہ ہے۔ جندب بھی اس رشتے سے بری طرح ٹوٹا ہے۔ میرڈین اور اسمتہ ان دونوں کے دوست ہیں اور دونوں کو سمجھاتے ہیں۔

روائیبہ اور حنبل کی مرضی کے بغیر طے پانے والی شادی کچھ ہی عرصے اور واقعات کے بعد محبت میں بدل جاتی ہے۔ شوخ چنچل ازلان اپنی چاچی سے بہت محبت کرتا ہے' ہم عمر ہونے کے سبب بہت فری ہے۔ جب کہ حنبل بڑی عمر کا ہونے کے سبب سوبر۔

جرمنی میں نیا کاروبار شروع کرنے کی غرض سے حنبل شادی کے چار ماہ بعد ہی جرمنی چلا گیا ہے۔ روائیبہ اس کی غیر موجودگی میں بے حد اداس ہے اور ازلان اس کی اداسی دور کرنے کے لیے اکثر اپنے کسی کام میں الجھائے رکھتا ہے۔

ازلان رات کو صحن میں بانسری بجا رہا تھا۔ روائیبہ سننے کے لیے باہر آجاتی ہے۔ حنبل کا فون آنے کے سبب اسے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آنا پڑتا ہے۔ فون سنتے ہوئے اسے کمرے سے باہر کسی کے ہونے کا گمان ہے۔ پھر دروازہ پر دستک شروع ہو جاتی ہے۔ وہ فون بند کرکے دروازہ کھولتی ہے۔

(باقی آگے پڑھیے)

"تم کہاں اتنی دور جاکر بیٹھ گئیں۔ یہاں بیٹھو ہمارے پاس۔" آئمہ نے اسے پیار سے ڈپٹتے سلویٰ کے پاس اسٹیج پر بٹھایا تھا۔ خادماؤں نے کھانوں کی ڈشز اٹھا کران کے سامنے رکھی گئیں میزوں پر سجادیں۔

"چلو کھانا ڈالو۔" آئمہ کا اس کے ساتھ نرم رویہ سلویٰ کو ذرا اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر آج کا دن اس کے لیے بہت خاص تھا۔ اپنے ہی جیسے ایک اونچے گھرانے کی فرد بن چکی تھی۔ بے شک احمد ریاض حنبل جیسی شخصیت کا مالک نہیں تھا مگر کاروباری دنیا میں اس سے ملتا جلتا ہی تھا۔ روائیبہ کے پاس بیٹھتے ہی سلویٰ کی گردن اچھی خاصی تن گئی تھی۔ جسے روائیبہ نے قطعاً محسوس نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے لیے تھوڑا سا کھانا نکالا تھا۔ بمشکل چند نوالے لیے ہوں گے اس کا دل متلانے لگا۔ ہاتھ میں پکڑے چمچے پر گرفت ڈھیلی پڑی۔

"کیا بات ہے۔۔۔ ٹھیک ہو۔۔۔" آئمہ اس کے قریب ہی بیٹھی تھیں تب ہی محسوس ہوا۔ اسے ابکائی آنے لگی نسرین کو آواز دے کر اسے ڈریسنگ روم میں بھجوایا تھا۔ اس کے وہاں سے اٹھنے اور جانے تک سلویٰ آئمہ کو تیکھے چتون سے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد آئمہ بھی اس کے پاس پہنچ گئیں۔ واش روم سے آکر وہ نڈھال سی بیڈ پر بیٹھی تھی۔ نسرین کو اشارے سے باہر بھیجا پھر روائیبہ کے پاس بیٹھ گئیں۔

"مجھے تو اپنی عقل پر اب رونا آرہا ہے۔۔۔ بالکل یاد نہیں رہا تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔۔۔ تمہارے سامنے ہی دیکھ لو' کتنی مصروف رہی ہوں۔" آئمہ کا انداز خفت بھرا تھا۔ وہ انہیں دیکھتے پھیکا سا مسکرائی۔

"کوئی بات نہیں بھرجائی۔۔۔"

"ایسے ہی کوئی بات نہیں۔" انہوں نے مصنوعی خفگی سے ڈپٹا تھا۔ "اور تم' تم بھی تو یاد کرواسکتی تھیں' دوبارہ تم نے ذکر تک نہیں کیا۔"

"آپ کہہ تو رہی تھیں نکاح کے بعد فری ہوجائیں گی۔ اس لیے میں۔۔۔"

"میری باتوں پر مت جایا کرو' ایک کچھ کردیتی ہوں'

دوسری کچھ۔۔۔" وہ کچھ توقف سے بولیں۔

"خیر اب ایسا کرتے ہیں، تم ازلان یا اپنے بھائی کے ساتھ گھر چلی جاؤ، آرام کرو۔۔۔ میں صبح آجاؤں گی۔ کل ہی ڈاکٹر کا ٹائم لیتی ہوں۔ حنبل کو پتا چلا تو بہت خفا ہو گا مجھ پر۔۔۔"

"نہیں میں اکیلی کہیں نہیں جا رہی۔۔۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں کل یہاں سے ہی ڈاکٹر کے چلیں گے پھر گھر اور حنبل کیوں کچھ کہے گا۔ اس ٹاپک پر میری ان سے بات تک نہیں ہوئی۔" آئمہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم فی الحال آرام کرو۔۔۔ میں کچھ بھجواتی ہوں تمہارے لیے۔۔۔"

"مجھے کچھ نہیں کھانا۔" انہوں نے گھور کر دیکھا تھا۔ "انسان بنو۔۔۔"



وہ دھپ سے اس کے پاس آکر بیٹھا تھا اور بہت مدھم آواز میں جرمن انگلش لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"تم پاکستان سے ہو۔۔۔؟"

"ہاں۔" حنبل نے بالکل عام انداز میں کہا تھا۔

اس نے کچھ دیر اثبات میں سر ہلایا۔

"کب سے۔۔۔؟"

"تین ماہ ہونے والے ہیں۔۔۔ مگر کیوں پوچھ رہے ہو۔۔۔؟" حنبل کو اس کا انداز کچھ عجیب سا لگا تھا۔

"ویسے ہی۔۔۔ تم دیکھنے میں پاکستان کے لگ رہے ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ حنبل کی جانب بڑھایا حنبل نے تھام لیا۔

اسے یہاں سے کر فرااسٹینڈ نیم ۔65 جانا تھا مگر وہ کر فرااسٹینڈ نیم ۔52 پر اتر گیا۔ بس سے باہر اچھی خاصی خنکی تھی اپنے فلیٹ پر جانے کے لیے اسے یہاں سے دوسری بس چاہیے تھی، مگر اس اسٹاپ پر رکنا نہیں چاہ رہا تھا کیوں کہ سیاہ پینٹ والا شخص بھی اسی اسٹاپ پر اتر چکا تھا اور وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پول رائٹ سے ذرا فاصلے پر کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ حنبل سڑک پر آگے آگے چلنے لگا یہ رات کا پہلا پہر تھا اور اس وقت صرف آسمان سیاہ دکھائی دے رہا تھا باقی تو ہر جانب دن سے زیادہ روشنی تھی۔ رنگ برنگی جلتی بجھتی یک لخت گزرنے والے پر بہت سے رنگ پھینک کر سمیٹ دینے والی روشنیاں۔

سڑک کراس کرتے اس نے دیکھا تھا اسٹاپ کے پاس کھڑا شخص اب وہاں نہیں تھا۔ خود بخود ادھر ادھر نگاہ گئی۔ وہ کہیں نہیں تھا، حنبل کو اپنے وہم پر خاصی ہنسی آئی تھی۔ پھر فلیٹ پر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ مختلف مالز دیکھنے لگا اونچی اونچی کئی کئی منزلہ عمارتیں پھر وہ ایک آٹھ منزلہ پلازہ میں گیا۔ ہر طرح کی ضروریات زندگی سے بھرا، لوگوں کے قہقہوں اور خوشبوؤں سے مہکتا۔ وہ ایک لیڈیز کلیکشن میں داخل ہو گیا تھا۔ بہت دیر ادھر ادھر پھرنے کے بعد کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا پہننے اوڑھنے کی کوئی ایک چیز بھی اسے ایسی نہیں لگی جو وہ روائیبہ کے لیے لے لیتا۔ جیولری کاؤنٹر سے اس نے اس کے لیے ایک بریسلٹ پیک کروائی اور اسے کوٹ میں رکھتا ہوا باہر نکل آیا اسے ایک بار پھر لگا تھا جیسے وہ شخص یہاں گزرا تھا۔

حنبل کو سمجھ نہیں آرہا تھا اگر وہ اس کے پیچھے ہے تو کیوں۔۔۔ اور اگر کام ہے تو بتائے۔ وہ وہاں سے تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا اور اپنی مطلوبہ بس میں بیٹھ کر فلیٹ کے قریب اسٹاپ پر اترا تھا۔ بس میں اسے وہ شخص دکھائی نہیں دیا تھا، لیکن جب اس نے اپنے فلیٹ کا لاک کھولا اس کے ساتھ وہی شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔ لمحہ بھر کے لیے حنبل سٹپٹا گیا تھا۔

"کون ہو۔۔۔ کس سے ملنا ہے؟"

"یہی بتانے آئے ہیں۔۔۔" اس شخص کے پیچھے وہ دوسرا شخص اندر داخل ہوا جو بس سے اترتے ہوئے اپنی ایڑھی اس کے پاؤں پر رکھ گیا تھا اب وہ دونوں اس کے سامنے تنے کھڑے تھے حنبل بھی انہیں ان ہی کے انداز میں گھور رہا تھا۔ وہ بہت چبا کر بولا تھا۔

"میرا خیال ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، جاؤ جا کر کنفرم کرو۔۔۔"

وہ کہہ کر واش روم کی جانب بڑھنے لگا ان میں سے ایک اپنی جیب سے پستول نکالتا اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور بھنوؤں سے اسے بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

"بیٹھو۔۔۔"

"کیوں۔۔۔؟" حنبل کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو چکی تھیں وہ پستول کو تانے صرف بھنوؤں سے اشارے کر رہا تھا۔

"اچھا!" حنبل استہزائیہ مسکرایا۔ "تم مجھے جس چیز سے ڈرا رہے ہو' اس سے زیادہ بڑی بڑی ہر وقت میرے ارد گرد رہتی ہیں۔" اس نے الٹا ہاتھ اتنی زور سے پستول پر مارا تھا وہ آدمی کے ہاتھ سے چھٹ کر واش روم کے دروازے تک جا گری تھی۔

"اے۔۔۔" دوسرا شخص دھاڑتا ہوا اس پر چڑھ دوڑا اور اپنی پستول کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ حنبل کے اطمینان سے لگتا تھا اسے پورا یقین ہے وہ ان کے ہاتھ مرنے والا نہیں۔ وہ تحمل بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے مسئلہ حل ہو سکتا ہے' اگر بیٹھ کر بات کرو' کیوں آئے ہو' کیا کام ہے۔۔۔ ڈسکس کرو مجھ سے۔۔۔"

"او کے۔۔۔" تینوں صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ ان میں سے ایک ر خنگی سے بولا تھا۔

"ظہیر تقی سے کیا تعلق ہے؟" حنبل کی بھنوویں کچھ سمجھنے کے انداز میں سمٹ کر کھلیں۔

"ہم وطن ہے۔۔۔"

"صرف ہم وطن۔۔۔؟"

"جی۔۔۔ لیکن کیوں پوچھ رہے۔"

"چند دن پہلے اس کا تمہارا کوئی ایگریمنٹ ہوا ہے۔" حنبل نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر صوفہ بیک سے پشت لگائی۔ اطمینان سے بولا تھا۔

"ایگریمنٹ ہوا نہیں' ایگریمنٹ ٹرانسفر ہوا ہے اور اس بات کو ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔" وہ اس کی بات سمجھنے کے بجائے اپنے سوال کر رہے تھے۔

"اور اس ایگریمنٹ میں اس نے تمہیں اپنا کزن شو کیا ہے۔۔۔ درست۔۔۔"

"بالکل کیا۔۔۔ کچھ پروفائلز پرابلمز تھے۔۔۔ اتنا سفر کر کے آپ مجھ سے یہی پوچھنے آئے ہیں۔۔۔؟ یہ سب بس میں بھی پوچھ سکتے تھے۔"

"پوچھ سکتے تھے' مگر ہمیں تمہارا ایڈریس چاہیے تھا۔"

"او۔۔۔" حنبل کو ہنسی آئی۔ ٹانگ سے ٹانگ اتار کر قدرے آگے جھک کر بتایا۔ "ایگریمنٹ میں یہ پتا چلا لیا کہ کزن شو ہو رہا ہوں۔۔۔ ایڈریس کیا مس پرنٹ تھا۔۔۔؟"

"مسٹر ہمیں باتوں میں مت الجھاؤ۔۔۔ ہمیں ظہیر تقی کا ایڈریس چاہیے۔"

"اس کا ایڈریس پیپرز پر ہے۔"

"ہاں' مگر وہ اس ایڈریس پر پچھلے ایک سال سے نہیں ہے۔" حنبل کو کچھ اچنبھا ہوا' مگر وہ فوراً" ہی سنبھل گیا تھا۔

"پھر میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تم جانتے ہو۔۔۔ کچھ دن پہلے تم نے اس کے ساتھ ہوٹل میں ڈنر بھی کیا۔"

"تو پھر مسئلہ کیا ہے' جب اسے ہوٹل میں دیکھا تھا تو اس سے مل لیتا تھا۔"

"میری بات سنو۔۔۔" اب پہلے والا بہت جم کر بولا۔ "مسئلہ بہت سیریس ہے' ظہیر تقی ہمیں مطلوب ہے اور بہت کوشش کے بعد اسے سی سی ٹی وی نے صرف تمہارے ساتھ کئی جگہوں پر دکھایا ہے' تم ٹریس ہو گئے' وہ نہیں ہو رہا' اس کا نام ای سی ایل (ایگزٹ کنٹرول لسٹ) میں ہے' تم اس سے ملتے رہے ہو' اس کا ٹھکانا جانتے ہو گے۔ تمہیں ہماری مدد کرنی چاہیے۔" وہ کچھ توقف کے بعد مزید کہہ رہا تھا۔

"دوسری صورت میں تمہارے خلاف بھی کوئی ایکشن ہو سکتا ہے۔"

"میرے خلاف خواہ مخواہ میں ہو سکتا ہے۔" حنبل کے چہرے پر اب تشویش ہوئی تھی۔ "وہ مجھ سے ملتا رہا' درست ہے۔۔۔ ہماری ڈیل ہوئی' درست ہے' ہم

نے ڈنر کیا یہ بھی درست ہے' لیکن میں یہ نہیں جانتا وہ اس وقت کہاں ہے' ایک بار میں نے اسے پوٹسڈم پلز پر ڈراپ کیا تھا' وہیں کہیں وہ اپنا فلیٹ بتا رہا تھا' اس کا کانٹیکٹ نمبر ہے میرے پاس' آپ اس پر ٹریس کریں۔"

حنبل نے کہتے ہوئے اس کا نمبر ملانا شروع کیا وہ مسلسل بند جا رہا تھا۔ حنبل کو اندر سے پریشانی ہونے لگی۔ وہ کچھ دیر مزید سوال کرتے رہے پھر اس سے مدد کی امید رکھتے ہوئے رخصت ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

لینڈ کروزر حویلی میں داخل ہوتے ہی اسے بہت سی سوچوں نے آن گھیرا تھا۔ خوف' پریشانی' گھبراہٹ اور کسی حد تک خوشی۔ ہدایت اللہ نے جلدی سے اتر کر ان کے دروازے کھولے۔ آئمہ اور روائیبہ باہر نکل آئیں۔ اعشال پہلے ہی میرزکا کے ساتھ حویلی آچکی تھی۔ آئمہ نے روائیبہ کے ساتھ اسپتال جانا تھا وہاں سے فارغ ہو کر وہ سیدھی حویلی آگئیں۔ آئمہ کے چہرے پر خاص قسم کی مسکان تھی وہ روائیبہ کو اپنے ساتھ لیے جب حویلی میں داخل ہوئیں وہ مسکان یک دم سمٹ گئی تھی۔ کیوں کہ لاؤنج میں خیام ذکا اور میرزکا صرف بیٹھے ہی نہیں تھے بلکہ ان کے چہروں پر پھیلی پریشانی تشویش پھیلا رہی تھی۔ انہوں نے میرزکا کو خیام ذکا سے کہتے سنا تھا۔

"لیکن اس میں حنبل کا کیا قصور ہے' وہ کیوں اتنا پریشان ہے۔"

"قصور تو نہیں ہے' لیکن وہ ایک ایویڈنس (ثبوت) تو ہے۔"

"کیسا ایویڈنس۔۔۔؟" میرزکا کو خیام کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

"وہ اس سے ملتا رہا ہے' ایک ثبوت ہے تعلق ہونے کا' ایک معاہدہ ہوا ان کے درمیان' یہ چیزیں ثابت کر رہی ہیں آپس کا تعلق پھر کم از کم اتنا تو کنفرم ہے چند دن پہلے تک نقی وہاں تھا وہ صرف حنبل بتا

سکتا ہے۔"
"اسے کہو لعنت بھیجے ہر چیز پر' واپس آئے۔"
"ایسے کیسے آجائے۔۔۔ کروڑوں کا سرمایہ لگ چکا ہے۔" کچھ توقف سے بولے۔
"دیکھو کچھ حل تو نکالتا ہے ناں جنبل۔۔۔"
روائیبہ نے اندر قدم رکھتے ہی پوچھا تھا۔
"کیا ہوا ہے جنبل کو۔۔۔ وہ ٹھیک تو ہے۔۔۔؟"
"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔" میر زکا نے سرسری سا سر ہلایا خیام البتہ کہہ رہے تھے۔
"یہ کیا طریقہ ہے گھر میں داخل ہونے کا' سلام نا دعا۔۔۔ کچھ نہیں ہوا اسے' بیٹھو۔۔۔"
"لیکن آپ لوگ اس کی بات کر رہے تھے۔"
آئمہ خاصی نظر شناس تھیں دونوں مردوں کے چہرے سے اندازہ لگا چکی تھیں کوئی خاص پریشانی ہے' روائیبہ سے بہت دھیمے لہجے میں کہا تھا۔
"تم جاؤ اپنے کمرے میں۔" جب وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھی تو آئمہ نے پوچھا تھا۔
"جنبل خیریت سے ہے۔۔۔؟" خیام چپ رہے میر زکا ذرا الجھ کر بولے تھے۔
"نہیں ہی شوق تھا پردیسوں میں کاروبار کرنے کا۔۔۔ یہاں پورا نہیں پڑ رہا تھا بے چاروں کا۔۔۔ دس دس بچے ہیں نا' جن کے لیے محل تعمیر کرنے ہیں۔"
آئمہ کو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ کمرے کی جانب بڑھتی روائیبہ نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا تھا۔ آئمہ نے آنکھوں سے اسے جانے کا اشارہ کیا تھا۔
"کیا مطلب۔۔۔ کوئی بزنس ایشو ہے۔۔۔"
"کچھ نہیں۔۔۔" اب خیام ذرا سختی سے بولے تھے۔
"اور تم لوگ کیوں رک گئی تھیں' شہر کیوں جانا تھا۔"
وہ اطمینان سے صوفے کو ٹیک لگا کر بتانے لگیں۔
"میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی' شادی سے تھکاوٹ ہو گئی تھی' ڈاکٹر کے پاس جانا تھا' روائیبہ کو کچھ سامان چاہیے تھا اسی لیے دونوں نے پروگرام بنا لیا' مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔" آئمہ کو حیرت تھی پہلے کبھی ان کے آنے جانے پر کوئی سوال جواب نہیں کیا

گیا اب یوں۔۔۔ اور جو وجہ تھی وہ بتانا اس وقت قطعاً" مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ دونوں گھر کے بڑے خاصے الجھے ہوئے تھے خیام ان کا جواب سنتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔
"گھر میں تم نظر نہیں آوگی' پوچھنا تو تھا۔۔۔" خیام کے جانے کے بعد میر زکا نے آئمہ کو تمام تفصیل بتادی تو وہ بھی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔



اپنے وجود کا احساس دلانے میں شہوز کمال کا اپنا ہی انداز تھا۔ اس کی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی' وہ تقریباً" لڑکھڑاتے ہوئے اترا تھا۔ جیسے نیند میں چلتا انسان آگے کی جانب بڑھ رہا ہو' کچھ ایسی حالت میں وہ داخلی دروازہ دھاڑ سے مار کر اندر داخل ہوا۔ آتے ہی صوفے پر ڈھے گیا۔
"سبرینہ۔۔۔!" اس کی چیخ نما آواز پر وہ فوراً" باہر نکلی تھی۔
"کبھی ہوش میں ہوتی ہو۔۔۔ میاں کب سے گھر آیا ہوا ہے' مجال ہے کوئی پانی پلانے والا ہی سامنے ہو۔"
اس نے فوراً" میز پر رکھے جگ سے پانی نکال کر اسے پیش کیا۔
"آخ گرم۔۔۔" اس نے غصے سے گلاس وہاں ہی الٹ دیا تھا۔ اتنی شدید سردی میں بھی اسے ٹھنڈا فریج کا پانی چاہیے تھا۔
"جو چیز سامنے پڑی ہو' وہی میرے منہ پر مار دیا کرو' بس تمہیں ملنے جلنے کی زحمت نہ ہو۔" اس نے اسے ناگواری سے دیکھا بنا بولے فریج کی جانب بڑھ گئی۔ ٹھنڈا پانی لا کر اسے تھمایا ساتھ خود بھی صوفے پر بیٹھ گئی تھی اسے گہرے سانس آرہے تھے شہوز کمال نے اسے طنزیہ نگاہ سے دیکھا تھا۔
"ایکٹنگ تو تم ایسے کر رہی ہو' جیسے میلوں پیدل بھگایا ہو میں نے۔۔۔ ایک گلاس پانی لا دینے میں کچھ گھس نہیں گیا تمہارا۔۔۔" وہ پانی پی کر خالی گلاس ٹیبل پر پٹختے ہوئے اٹھا تھا۔

"آرام کرلینے سے تمہاری صلاحیتیں بدل نہیں جائیں گی' کرنا تم نے وہی کارنامہ ہے۔۔۔ لیکن یاد رکھنا سبرینہ! اگر اب بیٹا نہ ہوا تو اسپتال سے مجھے اپنی شکل دکھانے گھر مت آنا' وہاں کہیں دفان ہوجانا۔۔۔" وہ دانت جمائے بے بسی سے اسے دیکھتی رہی ابھی کل ہی اس نے اسے اپنی رپورٹس دکھائی تھیں تب بھی اس نے نخوت سے چھین کر ایک جانب پھینک دیں۔

"تو میں کیا کروں' میری زندگی میں تم نے صرف سر جھکانے کا سامان ہی لانا ہے۔" اور اب اسے دھمکاتا زینے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ سبرینہ کی نگاہیں اس کی پشت پر گڑھی تھیں۔ آنکھیں اور جبڑے بے حد بھاری ہوگئے۔

"ہر بار ایک ہی دھمکی' اسپتال سے گھر مت آنا' یہاں نہ آؤں تو کہاں جاؤں' آخر میرے رب' تو مجھے کب تک اس امتحان سے گزارے گا' ایک لڑکا' صرف ایک لڑکے کے پیدا کرنے پر بھی مجھے اختیار نہیں' کیا جاتا تیری بادشاہت کا اگر اتنے سے پر ہی مجھے اختیار دے دیتا' صرف ایک چیز تجھ سے برسوں سے مانگ رہی ہوں' گڑگڑانے پر' منتیں کرنے پر' بار بار صرف ایک لڑکا' کیا میرے مولا میں اتنی بری ہوں کہ تو پکارنے پر بھی لڑکا نہیں دے گا' دنیا کو تو بن مانگے عطا کرتا ہے' مجھے مانگنے پر بھی نہیں دے سکتا۔"

اس نے بری طرح ٹوٹے شخص کی طرح اپنا سر صوفے کی پشت پر مارا آنکھوں کے دونوں اطراف سے آنسو ابل پڑے اس کے شکستہ پا دل و روح کے الفاظ عرش معلی کو ہلا گئے تھے۔

✡ ✡ ✡

دو ہفتے ہی گزرے تھے اس کی طبیعت میں واضح اتار چڑھاؤ آنے لگا۔ اس پر سستی طاری ہوجاتی دل دماغ ہر وقت حنبل کی طرف جکڑ کر رہ گیا تھا۔ آئمہ سے بار بار پوچھنے پر بالآخر انہوں نے ساری بات روائیبہ کو بتادی تھی۔ ان دنوں وہ وہاں اتنا الجھا ہوا تھا کہ فون تک کرنا یاد نہیں رہتا اس نے کرنے کی جب جب کوشش کی وہ مصروف ہوتا تھا بمشکل چند منٹ کی بات کرکے یہی کہہ دیتا تھا۔ "اچھا میں ابھی ٹھہر کر دوبارہ کرتا ہوں۔۔۔"

وہ بہت بہت دیر انتظار کرتی رہتی جب آئمہ نے یہ بتایا ظہیر تقی نے ایک قتل کررکھا ہے اور ان ہی دنوں وہ حنبل سے ملتا ہوا پایا گیا۔ تو روائیبہ کی تشویش بڑھ گئی تھی۔ حنبل نے میرزکا اور خیام ذکا کو منع کیا تھا گھر میں کسی کو نہ بتائیں' لیکن آئمہ کے پتا چلنے پر روائیبہ کو پتا چل گیا۔ ایسے میں وہ اپنی طبیعت کا اسے کیا بتاتی۔ بتانے کو یہ ایک بہت اچھی خبر تھی دنیا میں اس کے نام سے کوئی وجود آنے والا ہے' لیکن جس طرح سے وہ الجھا ہوا تھا مزید اپنی پریشانی دینا۔ آئمہ نے خود تو کسی کو نہیں بتایا تھا اور نہ اسے بتانے سے منع کیا تھا۔ صرف اتنا کہہ دیا تھا۔

"روائیبہ تمہاری مرضی ہے' بتانا ہے بتادو' لیکن وہ اتنی دور ہے اور جس قسم کی الجھن کا شکار ہے' آتو سکتا نہیں' مزید اسے پریشان ہی کرنا ہے' تم دعا کرو اللہ سے اس منحوس ظہیر تقی کا پتا چل جائے کہاں چھپ گیا ہے۔۔۔ خیام مجھے بتارہے تھے جرمنی کا قانون بہت سخت ہے۔"

ان کے آخری جملے پر روائیبہ کا منہ وا ہوگیا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب تو مجھے بھی نہیں پتا۔۔۔ تم بس پریشان مت ہوا کرو۔۔۔ میں ہوں ناں' ہم سب ہیں تمہارے ساتھ۔" انہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

روائیبہ کی روندھی ہوئی آواز نکلی۔

"پھر آپ مجھے اس کے پاس بھجوادیں۔ مجھے حنبل بہت یاد آرہا ہے۔"

"وہاں جانا اتنا آسان نہیں ہے' جتنا سمجھ رکھا ہے' چاچو نے ایک سال سے اپلائی کررکھا تھا۔" پاس سے گزرتے ازلان نے کہا تو وہ پہلے اسے پھر آئمہ کو بے بسی سے دیکھنے لگی۔

"تم سے کسی نے کہا ہے' رائے دینے کو۔۔۔" آئمہ نے اسے ڈپٹا پھر روائیبہ کو تسلی دی تھی۔

"ہاں میں تمہارے بھائی سے بات کرتی ہوں۔۔۔ حنبل سے بھی کہتی ہوں کچھ کرے تمہیں بلانے کا بندوبست۔" اگلی کال پر آئمہ نے حنبل سے ذکر ہی کیا تھا کہ "روائیبہ بہت ڈسٹرب ہے' اسے وہاں بلالو۔۔۔" وہ چھوٹتے ہی بولا تھا۔

"کیسی باتیں کررہی ہیں آپ' میں پہلے ہی پریشان ہوں' اسے یہاں بلا کر مزید ایک پریشانی پال لوں۔۔۔ ابھی تو میں نے بتایا نہیں مسئلہ کتنا بڑھ گیا ہے۔۔۔ وہ یہاں آگئی تو اس کی سیفٹی کا پرابلم بن جائے گا۔ آپ جیسے مرضی اسے سمجھائیں۔"

روائیبہ کو اس کا واضح انکار بہت برا لگا تھا۔ اس کا فون بھی اٹینڈ نہیں کیا۔ ایسی میں آئمہ اس کے بہت قریب ہوگئی تھیں۔ اس کے کھانے پینے' آرام کا خیال کرتیں۔ جب کہ اعشال کو یہ سب بہت برا لگتا تھا اور وہ تو ایسے لوگوں میں سے تھی جو چیز پسند نہیں اس کا منہ پر اظہار' منافقت اس سے نہیں ہوسکتی تھی۔ کئی بار تو اس نے منہ پر کہہ دیا تھا۔

"ایک بچے کا دنیا میں آنا' کوئی انوکھا کام تو نہیں جو آپ ہلکان ہورہی ہیں۔"

"اعشال تم اپنے کام سے کام رکھا کرو۔۔۔ مجھے اختلاف ذرا پسند نہیں ہے۔۔۔" پھر اس نے حقیقتاً "اپنے کام سے کام رکھا تھا اختلاف تو کیا وہ کسی رائے میں بھی شامل ہونا پسند نہیں کرتی تھی۔

ایبیسی گئے ہوئے تھے۔ خیام جرمنی حنبل کے پاس جانا چاہ رہے تھے۔ اعشال ہال کمرے میں اپنا لیپ ٹاپ کھولے کچھ پیجز دیکھ رہی تھی۔ کسی پوسٹ پر کمینٹ کردیتی کسی کو نظرانداز تب زینب داخلی دروازے سے اندر آئی۔

"اعشال جی۔۔۔ ہدایت اللہ کہہ رہا ہے' کوئی مہمان آیا ہے' روائیبہ بی بی سے ملنا ہے۔ مہمان خانے میں بٹھادیا ہے۔"

"نہیں۔۔۔" اسے اچنبھا ہوا۔ اسے اس وقت کون ملنے آگیا۔۔۔؟ پھر چڑ کر بولی تھی۔ "میرے سر پر کیا کھڑی ہو' اسے جاکر بتاؤ۔۔۔" وہ روائیبہ کے کمرے کی جانب بڑھی تھی تب اعشال نے سوچا کوئی اجنبی شخص اسے مہمان خانے میں بلا رہا ہے کیوں۔۔۔ کون ہوسکتا ہے اس نیک پروین سے ملنے والا' اس نے فوراً "زینب کو روکا تھا۔

"ٹھہرو۔۔۔ اور جاکر دادا جان کو بتاؤ۔ وہ اپنے کمرے میں ہیں۔۔۔ وہ آکر دیکھ لیں ان کی بہو صاحبہ سے ملنے کون آیا ہے۔"

زینب نے اپنا رخ میرزکا کے کمرے کی جانب کرلیا تھا۔ سن کر انہیں بھی حیرانگی ہوئی اور زینب سے پوچھا بھی تھا۔ "تم نے دیکھا ہے کون ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اٹھے اور مہمان خانے میں چلے گئے تھے۔





آخری جنوری کی نرم دھوپ میں بھی سرد ہواؤں کا اتنا گزر تھا اگر دھوپ سینکنے کی غرض سے کوئی صحن میں بیٹھے تو اچھی طرح اپنے گرد گرم شال لپیٹ لے سوائے چمک کے اس میں کچھ بھی نہیں رہا تھا اور چمک بھی عصر کی نماز کے ساتھ ساتھ لپٹ جاتی' مغرب کے وقت ایسے لگتا تھا آسمان سیاہی اتار رہا ہو۔ کہنے کو صرف شام ڈھلی تھی اور دیکھنے کو تاریکیوں کا راج۔ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ آئمہ اس کے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کررہی تھیں۔ خیام اذلان اسلام آباد

جندب سے مل کر میرزکا کو خوش گوار سی حیرت ہوئی تھی۔ یوں اچانک بنا بتائے وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھے رہے۔ رضاحیات کے متعلق خیر خیریت دریافت کی وہ اس طرح بیٹھا تھا جیسے ابھی اٹھ کر چلا جائے گا۔ صوفے پر آگے کو ہوا سرسری سا انداز۔ میرزکا نے اسے کھانے پر زبردستی روکا اور پھر اندر لاؤنج میں لے گئے تھے۔ اتنا تو انہیں بھی معلوم تھا کہ اب یہ آیا ہے تو روائیبہ سے ضرور ملے گا۔

پھر اچھا بھی نہیں لگتا جس طرح سے ازمیر اور رضا

حیات کے درمیان تعلقات تھے۔ روائیہ نے جس طرح شادی میں شرکت کی تو اسے صرف مہمان خانے سے ٹرخا دیا جائے۔ حنبل کو پتا چلے گا تو یقیناً" وہ بھی غصہ ہی کرے گا اس کے مہمان کی قدر نہ کی۔

جندب کے منع کرنے کے باوجود اس کے لیے پر تکلف ڈنر کا انتظام کروایا تھا اور زینب سے کہہ کر روائیہ کو ادھر لاؤنج میں بلالیا تھا۔ وہ اسے یوں اچانک دیکھ کر جہاں حیران تھی وہاں خوش بھی تھی۔

"السلام علیکم!" اسے آتا دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا لمحہ بھر کے لیے نگاہ ملائی تھی اس کے سلام کا جواب دیا۔

"وعلیکم السلام!" سنتے ہی جیسے وہ بیٹھی وہ بھی بیٹھ گیا۔ سرسری سی خیر خیریت کے بعد دونوں بالکل چپ تھے۔ البتہ میرزا کا کوئی سوال کرلیتے۔

"آپ اب مستقل شفٹ ہوگئے یا واپسی کا ارادہ ہے۔۔۔؟"

"نہیں انکل، مستقل تو بہت مشکل ہے، میری وہاں جاب ہے، پھر اسٹڈی بھی چل رہی ہے، میں سسٹر کی شادی میں آیا تھا، خاصے دن ہی لگ گئے۔ فیصل آباد ایک کام سے آیا تھا سوچا واپسی پر آپ سے ملتا چلوں۔ آپ شادی پر نہیں آئے۔" اس کا جملہ "فیصل آباد ایک کام سے آیا تھا" روائیہ کو بری طرح چبھا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ اپنے سابقہ رویے پر نادم ہوگا اور یقیناً" اس سے ایکسکیوز کرنے آیا ہوگا، مگر وہ تو اپنے کسی کام سے آیا تھا۔

کھانے کی میز سجا کر زینب نے ان سب کو دعوت دی۔ کھانے میں آئمہ بھی ان کے ساتھ شامل تھیں۔ میرزا کا اس کی خوب آؤ بھگت کر رہے تھے اور وہ تکلف برتتا رہا۔ کھانے کے کچھ دیر بعد ہی انہوں نے چائے کا آرڈر دیا تو فوراً" جندب بولا تھا۔

"نہیں انکل مجھے دیر ہوجائے گی۔۔۔ نیکسٹ ٹائم سہی۔"

"کیا مطلب دیر ہوجائے گی۔ اتنی رات کو اب تم واپس جاؤ گے۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے انکل۔۔۔"

"نہیں نہیں۔۔۔" میرزا کا نے ٹھوس انداز میں کہا تھا۔ "موسم کتنا خراب ہے، موٹروے پر اچھی خاصی دھند ہوجاتی ہے اور ہوسکتا ہے اتھارٹی نے بند کر رکھی ہو۔۔۔ صبح پہلے ٹائم نکل جانا۔"

"ایکچوئلی میں گھر بتا کر نہیں آیا تھا، ڈیڈی پریشان ہوں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔" انہوں نے قطعیت سے کہا تھا۔ "تم رضا کو فون ملاؤ میں بات کرلیتا ہوں اس سے۔۔۔ اتنی دھند میں رات کا سفر خطرناک ہوتا ہے، میں نے خیام اور اذلان کو بھی منع کیا ہے، رات میں نا آئیں۔"

"وہ کہیں گئے ہوئے ہیں؟" اس کے استفسار پر میرزا کا نے سرسری انداز میں کہا تھا۔

"ایک کام کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ خیام نے بتایا ہے، وہاں بہت دھند ہے۔"

میرزا کا اسے آرام کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے تھے۔ روائیہ گاہے بگاہے اس پر اچٹتی نگاہ ڈالتی رہی تھی۔ شکل سے بہت بے چین، الجھا ہوا لگ رہا تھا، جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو اسے وہ سب یاد آیا جب وہ خود اس سے بات کرنا چاہ رہی تھی اور وہ ہاتھ جھٹک کر چلا گیا تھا۔ اس وقت وہ مصنوعی جماہی روکتی اٹھی۔

"جندب جب گھر جاؤ تو آنٹی انکل کو میرا سلام دینا، مجھے اس وقت نیند آرہی ہے، اوکے، اللہ حافظ۔۔۔"

آئمہ نے استفہامیہ نگاہ اٹھائی تھی روائیہ اپنے تئیں اسے خدا حافظ کہہ کر جا چکی تھی۔ پھر جندب کو دیکھا وہ اچھا خاصا خجل دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے اس سے باتیں کرنا شروع کردیں۔

"ممی کو لے آتے ان سے بھی ملاقات ہوجاتی۔"

"ایکچوئلی میرا خود کا پروگرام بہت اچانک بنا تھا۔ آپ آئیں نا کبھی اسلام آباد۔۔۔ شادی پر بھی نہیں آئیں۔"

"شادی پر میری طبیعت بہتر نہیں تھی۔ کبھی آؤں

گی ان شاء اللہ.... اور ماہم کا بتاؤ وہ کیسی ہے؟ خوش ہے سسرال میں۔"

"جی الحمدللہ...." وہ مدھم سا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ ذہن روائیبہ کے سرد رویے سے جکڑا گیا تھا۔ آئمہ نے زینب کو آواز دے کر مہمان خانے کو ٹھیک کرنے کا کہا تھا اور پھر اسے آرام کا کہہ کر خود بھی اٹھ گئیں۔

اس کے سامنے وہ بہت مضبوطی سے اٹھ کر آئی تھی، مگر کمرے تک آتے آتے اسے اپنا آپ بہت تھکا ہوا لگا تھا۔ اسے اللہ حافظ کہتے جب آخری نگاہ ڈالی تھی تو جندب کی بے بس نگاہ میں بہت سا شکوہ تیرتا دکھائی دیا تھا۔ ناراض وہ بھی اس سے تھی اس نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا جب وہ شادی پر گئی، مگر اب یوں اچانک اس کا آجانا اپنے سابقہ رویے پر نادم ہونے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"اگر اس نے سرد مہری دکھائی تو میں نے بھی کچھ کم نہیں کیا، حساب برابر ہو گیا روائیبہ۔" وہ بے کلی سے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔

"ہم اچھے دوست تھے، اگر دوستی میں سرد مہری آجائے، پھر خلوص تو جم جائے گا، برف کی طرح ٹھوس اور سرد.... میں نے غلط کیا، مجھے اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھا، ہو سکتا ہے وہ معافی مانگنے آیا ہو، مجھے اس کی معافی سننی چاہیے جو ہمارے درمیان خاموش رنجش ہے اسے دور کر لینا چاہیے۔"

اس نے سوچتے ہوئے اپنے سیل پر اس کا نمبر ڈائل کیا۔ ایک بار، دو بار، تین بار اور پھر بار بار اس کا نمبر ڈائل کرتی رابطے کی سلائیڈ پوری ہونے سے پہلے ہی منقطع کر دیتی اسے عجیب سا مزا آنے لگا تھا اس کا نمبر ملا کر کاٹنے میں۔ اسی ملانے اور کاٹنے کی بے دھیانی میں ایک دو بار حنبل کا نمبر بھی ڈائل ہوا پھر جانے اسے کیا سوجھی وہ اسی طرح نمبر ملاتے کاٹتے کمرے سے باہر نکل آئی اپنی شال کندھوں پر برابر کرتی لاؤنج پار کرنے لگی تو نظر آئمہ پر گئی وہ ٹی وی اسکرین آن کیے بیٹھی تھیں۔ خیام جب بھی گھر پر نہیں ہوتے تھے ا... بہت دیر سے سوتی تھیں آئمہ نے بھی اسے [illegible] دیکھا تھا۔

"خیریت....؟"

"آں.... ہاں...." وہ تھوڑا سنبھلی اس کے ہاتھوں کی پتلی مخروطی انگلیاں آپس میں الجھ کر ٹیڑھی میڑھی ہونے سے انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کچھ ہے جو وہ چھپا رہی ہے۔ وہ اپنے ازلی میٹھے انداز میں بولی تھیں۔

"کیا ہوا.... خیریت ہے نا.... آؤ بیٹھو یہاں...." وہ موبائل ٹیبل پر رکھتے ہوئے ان کے سامنے صوفے پر قدرے آگے کو ہو کر ٹک گئی۔

"وہ.... بھرجائی۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "مجھے جندب سے ملنا ہے۔" آئمہ نے یک لخت نگاہ اٹھائی تھی۔

"کیوں.... میرا مطلب ہے اس وقت ایسا کیا کام ہے۔"

"مجھے اس سے ایک بات کرنی ہے۔" اب وہ سنبھل سنبھل کر بول رہی تھی۔ "دراصل شادی پر میرے اور اس کے درمیان ایک جھگڑا ہو گیا تھا، میں خفا ہو کر ہی رات کو واپس آگئی تھی۔ شاید وہ ایکسکیوز کرنے آیا ہے، مجھے مس بی ہیو نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"صبح کر لینا۔" آئمہ نے اطمینان سے کہا تھا۔

"ہو سکتا ہے وہ صبح جلدی چلا جائے.... ایسا نہیں ہو سکتا آپ کچھ دیر کے لیے اسے یہاں بلا دیں۔"

"یہاں....!" پھر سوچ کر بولیں۔ "بلانے میں حرج تو کوئی نہیں.... لیکن یہاں تم جو بات کرو گی، کوئی بھی سن سکتا ہے، کوئی کیا سے کیا بات بنائے، زینب بھی آج ادھر ہے، خالہ گلزاری بھی یہیں رکی ہوئی ہے۔ اگر کوئی بہت ضروری بات ہے فون پر کر لو یا پھر تم مہمان خانے میں چلی جاؤ.... میں یہاں ہی بیٹھی ہوں جلدی سے آجانا۔" اسے الجھن میں دیکھ کر آئمہ نے [illegible]۔ "چائے، کافی کے بہانے چلی جاؤ.... مگر پلیز جلدی آجانا۔"

روائیبہ نے سوچنے میں زیادہ وقت نہیں لگایا تھا فوراً کچن میں جا کر کافی کھولی مگ لے کر مہمان خانے

طلب بڑھی۔ آئمہ نے پیچھے سے ہانک لگائی تھی۔
"اپنی چادر صحیح کرو۔۔۔ جلدی آنا۔۔۔"

وہ جب سے گیسٹ روم میں آیا تھا بے چین سا تھا نیند تو اس کے آس پاس بھی نہیں تھی۔ ہدایت اللہ کاکی سے اس کا تھوڑا سا سامان لا کر کمرے میں رکھ گیا تھا۔ اس سے کسی ضرورت کا پوچھ کر دروازہ بند کر گیا۔ وہ سامان بیڈ پر رکھے ویسے کا ویسے ہی بیٹھا تھا کہ دروازے پر ناک ہوئی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے پوچھا تھا۔

"کون۔۔۔؟" معمولی چرچراہٹ سے دروازہ کھلا اور وہ ...را کا پورا اسٹپٹا گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا وہ اس وقت یوں آسکتی ہے۔

"تم۔۔۔ اس وقت خیریت۔۔۔ تمہیں یوں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" وہ میکانکی انداز میں کھڑا ہوا تھا۔

"کیوں' کیوں نہیں آسکتی۔۔۔ یہ میرا گھر ہے' یہاں میں کہیں بھی' کسی وقت بھی آجاسکتی ہوں۔" اس کے اعتماد انداز پر وہ بے حد مسرور ہوا تھا اور گہرے انداز میں بولا تھا۔

"بہت خوشی ہوئی' تمہیں بااعتماد دیکھ کر۔۔۔"

"اچھا!" اس نے استہزائیہ کہا اور کافی کا مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"اب بتاؤ کیوں آئے ہو فیصل آباد۔۔۔"

"بتایا تو تھا' ویسے ہی ایک کام سے۔۔۔" اس نے اعتنائی۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"جب جانتی ہو' جھوٹ بول رہا ہوں' پوچھنا ضرور ہے۔۔۔"

"ہاں پوچھنا ہے۔۔۔ تمہارے منہ سے سننا ہے' کیوں کہ تمہاری شکل پر لکھا ہے تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

وہ استہزائیہ ہنسا۔ "اور کیا کیا لکھا ہے۔۔۔"

"پتا نہیں۔۔۔" اس نے پھیکی ہنسی ہنستے گردن جھٹکی اور گہری سانس لے کر کہنی صوفے کی ہتھی پر جمادی اور بند مٹھی پر اپنی ٹھوڑی ٹکا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی رہی۔

"تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا جندب۔۔۔ جانتے ہو شادی میں' میں کیوں آئی تھی' ماہم کی شادی سے کوئی لگاؤ تھا یا نہیں' میں صرف تم سے ملنے آئی تھی۔" وہ پوری توجہ سے اسے سن رہا تھا اس کی آواز آہستہ آہستہ زکام زدہ ہونے لگی۔

"تم تصور بھی نہیں کرسکتے اس وقت میں کتنی ذہنی اذیت میں تھی' بہت خوف زدہ' بہت تھکی ہوئی۔۔۔" اس نے گہرا سانس لیا بہت سا درد یک لخت اٹرا۔ "مجھے تم سے کچھ کہنا تھا' کچھ ایسا جو صرف اور صرف تم سے کہہ سکتی تھی' جندب ہم بہت بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں' بہت اچھی طرح ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔۔۔ ہم کس طرح ایک دوسرے کو سن اور سمجھ سکتے ہیں' ہم دونوں جانتے ہیں۔" اس کی گہری آنکھوں میں ہلکا ہلکا پانی ہلکورے لینے لگا وہ جامد بیٹھا اس کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ "لیکن تم نے میری بات نہیں سنی' بات تو کیا سننی' تم نے میرا حال تک نہیں پوچھا' ہم ایک عرصے کے بعد مل رہے تھے' یہ تک نہیں پوچھا حنبل کیسا ہے کہاں ہے' اکیلی کیوں آئی؟ اور بہت کچھ تھا پوچھنے کو' مگر تم نے نہیں پوچھا۔" وہ یک لخت بات کاٹ کر بولا۔

"کیا بات کرنا تھی۔۔۔؟"

"تھی کوئی بات۔۔۔ مگر اب نہیں کرنا۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"بات کرنے کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے۔۔۔ اب وقت نہیں رہا۔" وہ اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتا رہا' مگر کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ وہ لمبی سانس بھر کر بولا۔

"حنبل جرمنی میں ہے' تین ماہ سے بزنس کے سلسلے میں۔۔۔ میں جانتا ہوں۔ اگر تم کچھ نہیں بتاؤ گی تو کیا میں بھی معلوم نہیں رکھوں گا۔" اس کی اطلاع پر وہ زیادہ نہیں چونکی کیوں کہ رضا حیات کو پتا تھا اور یقیناً" اسے ان سے ہی پتا چلا ہوگا۔

"اور رہی بات میرے رویے کی۔۔۔ تو واقعی میں بے حد شرمندہ ہوں۔ میں نے نا چاہتے ہوئے تمہیں

ہرٹ کیا' جانے مجھے کیا ہو گیا تھا' تمہیں دیکھتے ہی تمہاری وہ آخری ٹیلی فونک باتیں دماغ میں گونجنے لگیں کہ خدا کے واسطے میں تمہیں کبھی فون تک نہ کروں' تمہیں میری باتوں سے اذیت ہو رہی ہے' میرے مشورے تمہیں پاگل کر دیں گے... مجھے دکھ ہوا تھا' ہماری دوستی اتنی کمزور نہیں تھی جو تمہارے لیے مشکلات پیدا کرتا... پھر میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا۔ تم تو پہلے ہی مجھ سے فاصلے پر رہی تھیں' یاد ہے میں نے ایک بار تمہیں للی دیا تھا' تم نے کوالہ پر اچھال دیا تھا' میرا لکھے پانی میں بہا دیا تھا' میرا ہاتھ گہرے پانی میں چھوڑ آئی تھیں' میرا کوٹ پہننے سے انکار کر دیا تھا۔"

"ہاں! کیا تھا یہ سب؟ تمہیں سمجھنا چاہیے تھا۔" وہ بات کاٹ کر بولی۔ "اس لیے نہیں کہ میں یہ سب سمجھتی نہیں تھی' بلکہ اس لیے کہ میں یہ سب تمہیں سمجھانا چاہتی تھی' مانتی ہوں میں بہت احمق ہوں اور آسانی سے بن بھی جاتی ہوں' مگر اتنی بھی نہیں... مجھے اتنا پتا ہے جندب وقت اور حالات کے ساتھ انسان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں' تب ایسی باتوں کا وقت نہیں تھا مجھے مس ٹریک نہیں ہونا تھا' فیوچر بنانا تھا' اپنا بھی تمہارا بھی... لیکن وقت کی گردش نے کیسے سب بدل دیا مجھے خود سمجھ نہیں لگی... اس وقت میرے دماغ نے بالکل کام چھوڑ دیا تھا' مجھے صرف اپنے ڈیڈی کی بات پوری کرنا تھی اور بس..."

"روائیہ اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔" اس نے گرم ہوتی بحث کو جلد لپیٹنا چاہا۔ "یہ سچ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا تھا۔" اس نے "کرتا تھا" پر اچھا خاصا دباؤ ڈالا۔ "اور جو کچھ بھی چاہتا تھا وہ سب ماضی تھا' اب صرف یہ خواہش ہے تم ہمیشہ خوش رہو' تمہیں کبھی کوئی دکھ نہ ملے... میں دل سے سوری کرتا ہوں جس رویے سے تم ہرٹ ہوئیں۔"

"تھینک یو..." اس نے تفاخر سے گردن اٹھائی۔ "میں یہ سوری سننے ہی آئی تھی... اور یہ کافی پی لو۔" اس نے کافی مگ کی جانب ایک نظر دیکھا تھا پھر اسے دیکھا۔

"وہ کیا بات تھی' جو کرنا تھی کہو..."

"کہا ناں' اب اس کا وقت نہیں ہے..." وہ ہونٹ بھینچتا گہری سانس لیتا رہ گیا۔ پھر استفہامیہ نگاہ اٹھائی تھی۔

"وہ حنبل... حنبل تمہارے ساتھ ٹھیک ہے' میرا مطلب ہے اس کا رویہ' عادتیں... تم خوش تو ہو اس کے ساتھ...؟"

"تم کبھی اس سے ملے نہیں ہو ناں... اس لیے پوچھ رہے ہو۔ شاید ہی کوئی اتنا اچھا انسان ہو' جتنا حنبل مجھے لگتا ہے میرا بس نہیں چلتا میں اڑ کر اس کے پاس چلی جاؤں' بہت مس کرتی ہوں میں اسے... بہت کیئرنگ ہے وہ..." اس وقت اس کی آنکھوں میں محبت سرسرا رہی تھی۔ جندب سے فیصلہ کرنا مشکل تھا اسے وہ محبت اچھی لگ رہی ہے یا چبھ رہی ہے۔ وہ بس اسے دیکھے گیا۔

"مجھے بہت خوشی ہوئی تمہیں خوش دیکھ کر... میری دعاؤں میں پہلے نمبر پر تم ہو۔"

"جانتی ہوں۔" اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"اچھا اب جاؤ تم... بہت دیر ہو گئی ہے' ایسا نہ ہو کوئی دیکھ لے تو تمہارے لیے مسئلہ بنے۔"

"خیر ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں بھرجائی کو بتا کر آئی تھی۔" سنتے ہوئے جندب کی پوری آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"روائیہ تم آج بھی پہلے جتنی ہی بے وقوف ہو' ہر رشتے پر ہر طرح کا اعتبار نہیں کیا کرتے اور اب جاؤ جلدی سے... احمق کہیں کی۔"

"تم پریشان مت ہو۔" وہ جانے کے لیے مڑی جندب نے آواز دی۔

"اور ہاں یہ..." اس نے گتے کا شاپنگ بیگ اس کی جانب بڑھایا۔ "اسمتھ اور میرڈین نے کچھ گفٹس بھیجے تھے تمہارے لیے۔"

"واؤ۔" وہ حیرانگی سے مسکرائی کھلا بیگ پکڑتے ہوئے

اوپر سے پیکٹ کھول کر دیکھے۔ "میری طرف سے انکل تھینکس کہنا۔" وہ مسکرایا اور کافی کی طرف اشارہ کرتے بولا۔

"اور یہ بھی لیتی جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے' اب سوؤں گا۔"

شاپنگ بیگ اور مگ اٹھا کر "اللہ حافظ" کہہ دروازہ بند کر باہر نکل آئی۔ کچھ دیر پہلے کی بے چینی کا اس وقت شائبہ بھی نہیں تھا۔ اندر کی خوشی مسکراہٹ بنی اس کے چہرے پر پھیلی تھی۔ برآمدے میں قدم رکھتے ہی اس کی مسکراہٹ یک دم سے سمٹ گئی تھی۔ رخساروں سے وحشت سرکتی کانوں کی لو تک اسے خود محسوس ہوئی تھی۔ داخلی دروازے پر میرزا تند نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ دانت جمے تھے اور آنکھیں غضب ناک حد تک پھیلی تھیں۔ وہ خوف زدہ سے آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ برآمدہ پار کر داخلی دروازے میں قدم رکھے۔

"کیا کام تھا ادھر۔۔۔ کیوں گئی تھیں۔" ان کی گرج دار آواز سے وہ تو ساری کانپی تھی ان کے برابر کھڑی آئمہ بھی لرز گئیں۔ اچانک تفتیش پر وضاحتیں نہیں بن پاتیں' اس سے بھی نہیں بنی تحیر سے منہ آنکھیں کھولے انہیں دیکھتی رہی پھر حمایت طلب نگاہ آئمہ پر گئی انہوں نے بے بسی کا اظہار کیا۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں' جواب دو۔۔۔" ان کی دھاڑ پر وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔

"یہ کافی۔۔۔ کافی دینے گئی تھی۔" آواز کے ساتھ لب بھی لرزہ تھا۔

"ملازم مر گئے تھے کیا۔۔۔؟" اس پر نگاہیں جمائے وہ مسلسل برس رہے تھے۔ زینب جانے کہاں سے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بھی وحشت جھانک رہی تھی۔ روائیبہ نے پہلی بار کسی کو اتنے شدید غصے میں دیکھا تھا۔ خوف اس پر کوڑوں کی طرح برسنے لگا۔ میرزا کا جانے کس ارادے سے دو قدم آگے بڑھے۔ روائیبہ کی ساری جان نکل گئی۔ ہاتھ بے جان ہوتے ہی بیگ پھسل کر الٹ گیا۔ اس میں سے پرفیوم' کاسمیٹکس کے ڈبے لڑھکے ایک سفید ٹی شرٹ بے ترتیب تہ ہوئی باہر جھانک رہی تھی جس پر سرخ پینٹ سے "آئی مس یو روائیبہ" لکھا تھا۔ اس نے کچھ دیر پہلے ہی شرٹ دیکھ کر بیگ میں واپس ڈالی تھی اور بے ترتیب تہ کی وجہ سے لفظ واضح نہیں' مگر پڑھے جا رہے تھے۔ جملے کے نیچے چھوٹے سے دائرے میں میرڈین کے سائن تھے جو سوائے روائیبہ کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ میرزا کی آنکھوں میں بڑھتی غضب ناکی پر آئمہ نے کچھ ہمت کی اور آگے بڑھیں۔

"یہ حنبل کا فون ہے' جا کر کمرے میں سنو۔"

شدید لو میں حنبل کا ذکر ٹھنڈی بوندوں جیسا لگا تھا۔ وہ تیزی سے آئمہ کی جانب بڑھی۔ اپنے طور پر آئمہ نے اسپیکر پر ہتھیلی رکھی ہوئی تھی مگر صحیح جگہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ سب سنتے ہوئے زور زور سے بول رہا تھا۔

"کیا بات ہے کوئی مجھے کچھ بتائے گا۔" اس کی آواز کی لہریں روائیبہ کو ہتھیلی پر محسوس ہوئیں۔ اسے فون تھماتے آئمہ نے آہستگی سے کہا۔

"اسے کچھ مت بتانا اور جاؤ۔" میرزا کی نگاہیں اس کی پشت کے ساتھ لابی تک گئیں۔ پھر جانے انہیں کیا ہوا ایک دم باہر کی جانب قدم اٹھایا یقیناً "مہمان خانے میں جانے کے لیے آئمہ نے ان کے بازوں پکڑ لیے۔

"خدا کے واسطے بابا جان۔۔۔ بات مت بڑھائیں۔ وہ بچی ہے' غلطی ہو گئی۔ میں سمجھاؤں گی اسے۔"

اتنے ہی کروفر سے انہوں نے آئمہ کو دیکھا پھر بازو زور سے جھٹک رک اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ آئمہ نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ روائیبہ کے جاتے ہی حنبل کا فون آجائے گا۔ جندب کا نمبر بار بار ملانے اور کاٹنے کے دوران بے دھیانی میں حنبل کا نمبر بھی ملاتی رہی اسی لیے اس نے کال بیک کی تھی۔ آئمہ نے فون بجنے دیا۔ میرزا کسی کام سے کمرے سے باہر نکلے تھے۔ مسلسل ہوتی بیل پر چونک کر پوچھا تھا۔

"کس کا فون ہے' اٹھا کیوں نہیں رہیں؟"

"حنبل کا ہے۔۔۔ شاید روائیبہ سے بات کرنی ہو۔"

آئمہ کی سوا ہوتی گھبراہٹ میرز کا سے چھپی نہیں تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر فون اٹینڈ کیا اور آئمہ سے روائیبہ کو بلانے کا کہا تھا۔ آئمہ کے پاؤں سے زمین نکل گئی تھی۔ میرز کا حنبل سے خیر خیریت پوچھتے رہے اتنے وہ خواہ مخواہ اس کے کمرے کا چکر لگا آئیں۔ ان کے آتے ہی بھنوؤں کے اشارے سے میرز کا نے پوچھا تھا۔ انہوں نے گھبراہٹ پر قابو پاتے کہا تھا۔

"کمرے میں تو نہیں ہے، آپ یہ مجھے دے دیں۔" انہوں نے فون کی جانب ہاتھ بڑھایا "ہوسکتا ہے پچھلے صحن میں ہو میں دے آتی ہوں۔" میرز کا کو حیرت ہوئی اس وقت پچھلے صحن میں! فون انہیں تھماتے بے ساختہ نگاہ کلاک پر گئی بارہ سے اوپر سوئی کانپتی بڑھ رہی تھی۔ وہ خود بھی اُن کے پیچھے پیچھے صحن کی جانب بڑھے پھر تو ایک ڈھنڈیا مچ گئی۔

"کہاں جاسکتی ہے۔" وہ اچھے خاصے بوکھلائے تھے۔ کھڑکا دھڑکا سن کر کچن کے ساتھ بنے اسٹور سے زینب بھی نکل آئی۔ آئمہ اندر تک ڈر رہی تھیں اجازت انہوں نے دی تھی۔ اوپر سے حنبل بار بار پوچھ رہا تھا۔

"ایسی کہاں چلی گئی وہ۔ لان میں دیکھیں آپ۔" تب ہی وہ اندر لاؤنج میں داخل ہوئی۔ لاؤنج کی گلاس ونڈو سے وہ مہمان خانے سے نکلتی واضح دکھائی دے رہی تھی۔ بھلے غصے میں، مگر میرز کا اپنے کمرے میں جاچکے تھے آئمہ نے روائیبہ کو صبح ساری بات سمجھا کر اپنی بے بسی ضرور بتانی تھی، لیکن فی الوقت شرمندگی سی شرمندگی تھی۔ اسی شرمندگی میں زینب کو ڈانٹ کر کہا تھا۔

"کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو، یہ سامان اٹھاؤ۔۔۔" زمین پر گرے شاپنگ بیگ کے سامان کی جانب اشارہ کرتے کہا "اور بی بی کو دے کر آؤ۔"

☼ ☼ ☼

کرب زدہ احساس جرم میں گھری وہ جس طرح اپنے بیڈ روم تک آئی تھی وہ ہی جانتی تھی فون کان سے لگا ہوا تھا پسلیوں سے کھنچ کر نکلتی سانسیں حنبل کو تکلیف دے رہی تھیں وہ ایک ہی بات بار بار پوچھ رہا تھا۔

"خدا کے لیے مجھے کچھ بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے، بابا غصہ کیوں کر رہے تھے۔" وہ بیڈ پر دھپ سے گری آنسو اس سے پہلے گرے تھے۔ سسکیوں کے درمیان آواز الجھ کر نکلی۔

"جندب آیا ہے۔"

"جندب آیا ہے؟" اسی کا فقرہ حنبل نے دہرایا۔ "کیا مطلب جندب آیا ہے۔" زکام زدہ آواز کو گھسیٹتے ہوئے پوری تفصیل بے ترتیب بتانے لگی تھی۔

"حنبل۔۔۔ میں ماہم کی شادی سے اچانک واپس آگئی تھی نا۔۔۔"

"ہوں۔۔۔" وہ دھیرے سے بولا اسے سننے سے دلچسپی تھی۔

"ایکچوئلی میرے اور جندب کے بیچ جھگڑا ہو گیا تھا۔"

"کیسا جھگڑا۔۔۔؟"

وہ اکتاہٹ سے بولی۔ "جب آؤ گے، بتادوں گی۔"

"اوکے۔ اس جھگڑے کا آج سے کیا تعلق۔"

بہت سے آنسو گرتے اس نے زور سے سسکیاں بھریں۔

"وہ آسٹریلیا واپس جارہا ہے، ایکسکیوز کرنے آیا تھا۔" آنسوؤں کے کچھ توقف میں پھر سے شروع ہوئی۔

"وہ رات ہی واپس جارہا تھا، بابا نے زبردستی روکا۔۔۔ حنبل میری اور اس کی بات نہیں ہوسکی تھی، میں صرف اس سے بات کلیئر کرنے گئی تھی۔" شدید آتے غصے کو جس طرح حنبل نے روکا وہی جانتا تھا وہ ایک طرف کا جبڑا دبا کر بولا۔

"ٹائم دیکھا ہے۔۔۔؟" وہ رونے کے دوران صرف اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ گہرے سانس لیتا وہ مدہم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"تمہارا کیا علاج کروں۔۔۔ میری سوچ سے بھی زیادہ بے وقوف نکلیں تم۔۔۔ تمہیں ذرا بھی عقل نہیں ہے

کمال کس وقت جانا چاہیے' کس وقت نہیں۔ ایک ایک بات نئے سرے سے بتاؤں... کیا کروں میں تمہارا... بتاؤ... کوئی پہرے دار بٹھا دوں جو بتائے کہاں جانا ہے' کس وقت جانا ہے۔" گلے میں اترتی نمی کو حلق سے اندر کرتی وہ ٹوٹ ٹوٹ کر کہہ رہی تھی۔

"مجھ سے اتنی غلطیاں کیوں ہوتی ہیں حنبل...؟"

"غلطی تم سے نہیں... مجھ سے ہوئی ہے۔" وہ جھنجلا کر بولا تھا۔ "مجھے لگتا ہے میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے' تمہیں وہاں چھوڑ کر آنا۔" توقف سے وہ چبا چبا کر بولتا رہا۔ "روائیبہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں چاہا تھا کہ میری بیوی احمق ہو اور تم صرف احمق نہیں ہو' ان سے کہیں آگے ہو۔" آنکھیں بہتی رہیں اور وہ سنتی رہی۔ "اور اسے شرم نہیں آئی' جب میں یہاں نہیں ہوں' کس حیثیت سے یہاں آیا... بابا کا تو ویسے ہی دماغ خراب ہے ہر کسی کو روک لیتے ہیں۔" حنبل کا مدہم لہجہ آہستہ آہستہ تیز ہو رہا تھا۔

"حنبل وہ میرا فرینڈ ہے' وہ ویسا نہیں ہے' جیسا تم سمجھ رہے ہو۔"

"کوئی فرشتہ نہیں ہوتا' روائیبہ۔" تقریباً وہ چلایا تھا۔ "بابا تو صرف خفا ہوئے ہیں۔ شکر کرو' میں وہاں نہیں ہوں۔" حنبل نے اسپیکر پر ہاتھ رکھ کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی تھی۔ گرے آنکھوں کا پانی چھلکنے رخسار دھوتا رہا۔ لمحوں کے توقف سے وہ قدرے نرمی سے بولا۔

"اب اٹھو' پانی پیو' منہ دھو... بابا جان سے میں صبح بات کرلوں گا۔" اب اس کی سسکیوں کی آواز نہیں جارہی تھی صرف آنسو گر رہے تھے۔ "سنا نہیں' میں نے کیا کہا ہے روائیبہ میں آل ریڈی اتنا ڈسٹرب ہوں' میرا نام E.C.L میں آچکا ہے' مسئلہ حل ہوئے بنا میں واپس نہیں آسکتا' کاروباری الجھنیں الگ ہیں' کم از کم تم تو مجھے ٹینشن مت دو' کچھ تو خیال کرو میرا' شوہر ہوں تمہارا... مگر نہیں روز کوئی کارنامہ کرکے بیٹھی ہوتی ہو۔" وہ چپ تھی۔ "بولو کیوں نہیں رہی ہو...؟"

"کیا بولوں...؟"

"اٹھا کر کوئی چیز میرا سر توڑ دو...." وہ اچھا خاصا جھلا چکا تھا۔ وہ پھیکا سا ہنسی۔

"تم خفا ہو...."

"نہیں خوشی میں بھنگڑے ڈال رہا ہوں۔"

"ایم سوری...."

"بس اوکے اور یہ لاسٹ سوری ہونی چاہیے۔ چلو اٹھو' اب پانی پیو۔" اس کی ڈانٹ اور محبت دونوں میں اتنا مان تھا۔ وہ حقیقتاً' اٹھی' پانی پی کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر اس سے ظہیر تقی والے معاملے کو ڈسکس کرتی رہی۔ کوئی خاطر خواہ امید نظر نہیں آرہی تھی۔ سو اپنے پرسنلز پھر سے پس پشت ڈالتے گئے۔

ہفتے جب مہینوں میں ڈھلنے لگے تو ایک دن کی صورت بن گئے' لمبے دن قیامت جیسے نا ختم ہونے والے دن کی شکل میں۔ وقت کا بے قرار موسم تھا' جو کسی آن ٹھہرتا نہ تھا۔ وہ موسم برف ریزوں میں پگھل کر گنگناتی بہاروں میں پھسلتا' چمکتا اک چاندی کی طرح چمچماتے دنوں کی ندی میں آگرا۔ سکون کی ندی بہہ رہی تھی۔ مگر اس کے اندر بہت گہرائی تھی۔ بحرالکاہل سے زیادہ گہرائی اور اس گہرائی میں جانے کہاں کہاں سے پتھر یکے بعد دیگرے آپڑے تھے۔ ہر نیا پتھر گرنے کے بعد چند دائرے بناتا۔ دائرے بنتے' پھر پھیلتے پھیلتے اتنے پھیل جاتے پانی کی شفاف سطح پر مٹتے محسوس ہوتے تھے یا شاید دائرے پانی میں رچ گئے تھے۔ رچی بسی چیزیں ذات کا حصہ بن جاتی ہیں اور اگر ذات کے حصے میں صرف پتھر آئیں' پتھر تو پتھر ہوتا ہے نا' جس کا کام ایک جگہ جم کر چبھنا ہوتا ہے' تکلیف دینا ہوتا ہے' تکلیف کا موسم وارد ہوتے بتاتا نہیں' آن واحد میں اتر آتا ہے' ایسا ہی موسم اترنے کو تھا۔

اکتوبر کے خوش گوار موسم میں حنبل جرمنی گیا تھا۔ پیچھے سے موسم جم کر پگھلا اور کیلنڈر پر جون چمکنے لگا۔ اتنے لمبے عرصے میں کتنے مواقع آئے' مگر وہ تنہا تھی۔ فروری میں اس کی سالگرہ تھی اور یہ پہلی سالگرہ

تھی۔ جس پر وہ خود کو مکمل تنہا محسوس کر رہی تھی۔ سال پہلے سالگرہ کا دن بہت یادگار تھا۔ حالانکہ حنبل نے اسے فون پر سب سے پہلے وش کیا تھا۔ لیکن آوازیں ہمیشہ وجود کی کمی کو پورا کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ سو ناکام رہی۔ اس دن کی تلخ کلامی کے بعد حنبل نے جان بوجھ کر کئی دن فون نہیں کیا تھا' کچھ اپنے مسائل میں اُلجھا رہا۔ جندوب بھی صبح کو اٹھ کر چلا گیا تھا۔ کیونکہ ملازم سے پتا چلا تھا' میرز کا کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جا چکے ہیں اور باقی افراد سوئے ہوئے ہیں۔ پھر اس نے کسی کو بھی اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ اپنے جانے کا پیغام دے کر روانہ ہوا۔ اس بات سے بے خبر رات گھر میں کیا ہوا اور حنبل نے جب چند دن بعد فون کیا تو اس واقعے کو ایسے نظر انداز کیا تھا جیسے وہ ہوا ہی نہیں' اپنی روٹین کی بات چیت حال احوال اور بات ختم۔ حنبل نے جو بات واضح محسوس کی تھی وہ روائیبہ کا سنجیدہ رویہ تھا۔ جس بات کی اسے کسی حد تک خوشی بھی تھی کہ "چلو بدلاؤ تو آیا۔"

پھر چند دن بعد ہی اس کے والدین کی برسی آگئی۔ آئمہ نے گھر میں میلاد' قرآن خوانی کا اہتمام کیا تھا۔ حنبل کی بہن اپنے میاں کی طبیعت ناسازی کے سبب نہ آسکی مگر خاندان کے کئی افراد آئے تھے۔ آئمہ کے میکے سے تقریباً" سب ہی تھے اور حیرت کی بات یہ تھی سرسری سا بلانے پر شہوز کمال سبوینہ سمیت آیا تھا۔

پچھلے سال کا ایک ایک لمحہ کسی اسکرین کی طرح روائیبہ کے سامنے چل پھر رہا تھا۔ کچھ گھر میں مہمانوں کی آمد اور ایک ہی موضوع مریم اور ازمیر پر گفتگو ہونے سے اس کی طبیعت اچھی خاصی خراب ہو گئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں ہی بیٹھی رہی۔ اکثر مہمان اسے کمرے میں آکر مل کر گئے۔ جن میں سبوینہ بھی شامل تھی۔

روائیبہ کے پاس حنبل کا فون آیا ہوا تھا۔ حالانکہ روائیبہ کی آنکھیں اچھی خاصی نم تھیں مگر سننے کے انداز سے لگتا تھا دوسری طرف سے یقیناً" دل جوئی کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ سبوینہ اور سلویٰ سامنے صوفے پر بیٹھیں آہستہ آواز میں اپنی کوئی بات کر رہی تھیں مگر سبوینہ کا تمام دھیان روائیبہ کے چہرے پر تھا۔ سبوینہ اور روائیبہ کی جسمانی حالت میں خاص فرق نہیں تھا۔ مگر اس کی قسمت پر وہ اس وقت رشک کر رہی تھی' بھلے میاں پاس نہیں ہے مگر اپنے لفظوں کا سکون تو پہنچا رہا ہے اور ایسی حالت میں عورت کو صرف میاں کے تسلی بھرے الفاظ چاہیے ہوتے ہیں۔ سبوینہ کی اس حالت کا سلویٰ کو یہاں آکر پتا چلا تھا۔ اس نے قرآن خوانی میں بطور خاص اس کے لیے اولاد نرینہ کی دعا کروائی تھی۔

وقت کے ساتھ روائیبہ کی طبیعت میں واضح اتار چڑھاؤ آرہا تھا۔ جندب والے واقعے کے بعد سے وہ میرز کا کے سامنے جانے سے گریز برتتی' کچھ وہ خود بھی اپنی سیاسی سرگرمیوں میں الجھے رہتے' اسے سلام کا جواب دے کر اپنی کسی کال پر مصروف ہو جاتے' کھانے پر کبھی قسمت سے ملاقات ہوتی تھی' وہ بھی سرسری طور پر۔۔۔



خیام کے جرمنی چلے جانے کے بعد سے ازلان میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ ڈیرے کے بہت سے کام اور چاولوں کی مل کی ذمہ داری اس نے لے لی۔ میرز کا کبھی چکر لگاتے یا صرف اس سے پوچھ پڑتال کر لیتے۔ اسی مصروفیت کی وجہ سے وہ اکثر گھر سے باہر رہتا۔ جس تھوڑے سے ٹائم میں وہ گھر ہوتا تھا' اس میں بھی اسے روائیبہ میں ہونے والی تبدیلی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس کی جسمانی ہیئت میں کوئی غیر معمولی تبدیلی بھی نہیں تھی۔ ایک دن اس نے خود آئمہ سے پوچھا تھا تو وہ چونک گئیں۔

"کیا مطلب۔۔۔ کیسی طبیعت؟"

"میرا مطلب ہے وہ دیکھنے میں کچھ چینج لگتی ہیں ٹھیک تو ہیں۔" ماں کی طائرانہ نگاہ پر وہ کچھ سٹپٹا گیا تھا۔

"آئی مین کوئی گڈ نیوز۔" آئمہ کا خاموشی سے اثبات میں ہلتا سر دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے وہ ساکت ہوا تھا

کا حساب کتاب، بہت سی باتیں ذہن میں ابھریں، سنبھل کر آہستگی سے پوچھا۔
"چاچو کو پتا ہے؟"
"کیا بتاؤں اسے۔" آئمہ کا پریشان لہجہ ان کے کی ترجمانی کررہا تھا۔
"تمہارے باپ کا فون آیا تھا جو کچھ وہ بتا رہے تھے دماغ سن سن کر کام چھوڑ رہا ہے۔ اذلان دعا کرو میرا وہاں سے صحیح سلامت واپس آجائے۔" روائبہ کمرے سے نکل کر پیچھے لابی کی جانب مڑتی سیڑھی پر تھی جب اس نے یہ آخری جملہ سنا۔ سیڑھی کی گرل سے یک لخت اس کا ہاتھ پھسلا اور وہ دھم سے زمین پر آبیٹھی۔ آواز پر آئمہ نے چونک کر پیچھے دیکھا تھا۔ اذلان بھی اٹھ کر تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔
اس قدر زور سے بیٹھنے پر وہ کراہی تک نہیں، پوری آنکھیں کھولے صرف آئمہ کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں بہت سے سوال تیر رہے تھے۔ جو دن بھر آئمہ اسے یقین دہانی کرواتی رہتی تھیں، وہ ایک دو ماہ میں آرہا ہے، مسئلہ حل ہوچکا ہے۔ یعنی کہ کچھ بھی حل نہیں ہوا، اذلان نے ہاتھ آگے بڑھا کر اسے اٹھنے کا سہارا دینا چاہا، مگر اس نے تنفر سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اپنی پتلی لمبی انگلیاں اسٹیپ کی سطح پر گاڑتے ہوئے اپنے ہی سہارے سے اٹھی تھی۔ گھٹی آواز اس کے حلق سے نکلی۔
"حنبل اریسٹ ہے۔" آئمہ چپ رہیں۔ "میں پوچھ رہی ہوں۔ حنبل اریسٹ ہے؟ ایک ہفتہ ہوگیا ہے اس کا فون نہیں آیا۔ میں کرتی ہوں، اس کا نمبر بند ہے۔ کہاں ہے وہ۔" آئمہ اپنی بازو اس کی کمر کے پیچھے ڈالے آگے کو بڑھی تھیں۔
"تم اپنا بالکل خیال نہیں رکھتیں۔ کیسے ایک دم سے گر گئی ہیں۔ کچھ ہوجاتا تو......؟"
"آپ بات مت بدلیں۔" اس کا لہجہ منت آمیز تھا۔ اذلان پیچھے ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ متنفر انداز میں اسے اس کا جھٹک جانا اس کی نظروں میں اس کی اہمیت بتا گیا تھا صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ بار بار اصرار کررہی تھی۔
تب آئمہ بے ثبات تاثر لیے ٹھہر ٹھہر کر بولیں۔
"میں مشکل میں پھنس گئی ہوں۔ تم سے حنبل کا سب چھپا رہی ہوں، کیونکہ تمہاری کنڈیشن ایسی نہیں، تمہیں شاک دیے جائیں۔ ادھر حنبل سے تمہاری کنڈیشن چھپا رکھی ہے۔ وہ آ نہیں سکتا، یہ سب سن کر خود کو کتنا بے بس سمجھے گا۔"

"آخر معاملہ کیا ہے۔ آپ کیوں چھپا رہی ہیں' بتائیں مجھے حنبل ٹھیک ہے۔"

"ہاں وہ ٹھیک ہے' وہ جان کر اپنا نمبر استعمال نہیں کررہا' اس کی ایک ایک چیز نگرانی میں ہے۔" گہرے آنکھیں سکیڑے وہ خاصی متوجہ لگ رہی تھی۔

"اپنے دل کو ذرا مضبوط کرکے سنو ظہیر تقی نے جو قتل کیا تھا' وہ کوئی عام بندہ نہیں تھا' جرمنی فورس سے تعلق تھا اس کا۔۔۔ اور آلہ قتل حنبل کی گاڑی سے برآمد ہوا ہے۔" روائیبہ کو لگا جیسے وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ ہر منظر اس کے سامنے جم گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی سانس تک۔ آہستہ آہستہ سانس پگھلی' ہر چیز حرارت سے جان پکڑنے لگی۔ اسے چھوٹے چھوٹے اٹک اٹک کر' مگر سانس آرہے تھے۔ آئمہ نے ہمدردانہ انداز میں اس کی پشت سہلائی۔

"وہ دو دن اریسٹ بھی رہا ہے۔ تمہارے بھائی اسی لیے وہاں گئے تھے۔ یہاں کی منسٹری سے بات کی' وہ وہاں ضمانت پر ہے' مسئلہ صرف ظہیر تقی کی برآمدگی تک ہے' کیونکہ آلہ قتل پر حنبل کے فنگر پرنٹس نہیں ہیں۔ صرف ایک ثبوت کے طور پر اسے روکا ہوا ہے۔ ویسے وہ ٹھیک ہے اور یہ ہی وجہ ہے' وہ تمہیں وہاں بلانے سے کترا رہا ہے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا' تم پریشان مت ہو۔ بابا جان بھی آج کل ان ہی چکروں میں مصروف ہیں۔" گہرے آنکھوں میں پانی پتھر کا ہوگیا تھا۔ وہ سراسیمگی سے کہہ رہی تھی۔

"کبھی کچھ ٹھیک ہوا ہے' میری قسمت میں کچھ ٹھیک ہونا نہیں لکھا۔ مجھے نہیں لگتا اب میں اور حنبل کبھی مل پائیں گے۔"

"اللہ نہ کرے کیسی باتیں کررہی ہو۔ تمہارے بھائی نے تقی کی فیملی کا پتا لگالیا ہے۔ سنگاپور میں ہیں وہ لوگ' یقیناً" اس کا پتا بھی چل جائے گا۔" وحشت بھری بلی جیسی روائیبہ کے چہرے کو دیکھ کر ازلان کے اندر بہت سی خفت اتر آئی تھی۔ اس کے ہاتھ کا جھٹک دینا' اس سے بات تک نہ کرنا' نظر ملنے پر حقارت' نفرت جیسے جذبات اسے اندر سے ندامت میں گرا رہے تھے۔ وہ فوراً" وہاں سے ہٹ کر باہر نکل گیا۔

دو دن سے اس کی طبیعت گم صم سی تھی' دن چڑھا' ڈوبا' اس پر سے کوئی خاص فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ بس ایک ہی فکر تھی۔ کسی طرح حنبل کی جان خلاصی ہوجائے۔ سوچتے سوچتے اس کا بی پی تیزی سے اپ ڈاؤن ہوتا۔ چیک اپ کو بھی کئی دن ہوچکے تھے۔ آئمہ چاہ رہی تھیں وہ ڈاکٹر کے ہاں ہو آئے' مگر وہ ٹالتی رہی۔ شام میں اس کی طبیعت خاصی خراب ہوئی تو آئمہ نے اگلے دن کا ڈاکٹر سے ٹائم لے لیا تھا۔ صبح سے آئمہ کی گردن میں کھنچاؤ تھا۔ شہر تک کا سفر کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ انہوں نے اسے ازلان کے ساتھ جانے کو کہا۔ روائیبہ نے صاف انکار کردیا۔

"میں بچی تھوڑا ہوں' میں زینب کے ساتھ چلی جاؤں گی' آپ ہدایت اللہ سے کہہ دیں ہمیں لے جائے۔" ازلان سے اس کی اچھی خاصی محسوس ہوتی دوری انہیں کھٹک رہی تھی' مگر وہ جان کر اس معاملے کو کریدنا نہیں چاہ رہی تھیں۔ "جانے کیا بات ہے' پریشانیوں میں مزید بدمزگی پیدا کرنا۔"

انہوں نے اسے زینب کے ساتھ بھیج ضرور دیا تھا' لیکن پھر فوراً" ہی احساس ہوا بابا جان کو اگر پتا چلا اچھے خاصے خفا ہوں گے۔ انہوں نے فوراً" سلویٰ کو فون کیا تھا۔ تقریباً" منتیں کرتے اسے اس اسپتال پہنچنے کا کہا تھا۔



سائلنٹ پر لگا موبائل اس کے پرس میں بہت دیر بے آواز دم توڑتا رہا۔ آخر تنگ آکر حنبل نے گھر فون کیا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی آئمہ سے پوچھا تھا۔

"روائیبہ کہاں ہے' میں بہت دیر سے اسے فون کررہا ہوں۔"

"ڈاکٹر کے ہاں گئی ہے۔ لیکن فون تو اس کے پاس تھا' شاید بند کر رکھا ہو۔"

"ڈاکٹر کے پاس۔۔۔ خیریت؟" اس کی بوکھلاہٹ پر انہوں نے سرسری انداز میں اسے بتادیا۔

"ہاں خیریت ہے' بی پی ٹھیک نہیں رہتا اس کا۔ ٹائم لے رکھا تھا تو چلی گئی۔"

"کس کے ساتھ گئی ہے اور آپ نے اسے میرے بارے میں نہیں بتانا تھا' خواہ مخواہ میں وہ پریشان ہوگی۔"

"کیسے نہ بتاتی' وہ اس گھر میں رہتی ہے' سنتی ہے' دیکھتی ہے' اچھی خاصی سمجھ دار ہے' ایک گھر میں سب کچھ کیسے چھپایا جا سکتا ہے؟" آئمہ کی رنجیدہ آواز اسے تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔

"بتایا نہیں کس کے ساتھ گئی ہے؟"

"اکیلی ہی گئی ہے' میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی' ویسے بھی حنبل میں اس پر روک ٹوک نہیں کرتی' کروں بھی تو کس زور پر' چند مہینے بعد ہی تو تم چلے گئے تھے' وہ بھی تو کہہ سکتی ہے۔ اسے کس لیے یہاں روکا ہوا ہے۔ اس نے کہا میں خود چلی جاؤں گی' میں نے زینب کو ساتھ بھیج دیا۔"

"میں اب اتنی دور بیٹھا کیا کہہ سکتا ہوں۔ کرتا ہوں ایک دو دن میں اس سے بات اور آپ بھی پریشان مت ہوا کریں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے بھی تسلی دیجیے گا۔" وہ سن کر اچھا خاصا ڈسٹرب ہوا تھا۔ مزید کچھ کہنے کو دل نہیں کیا۔ آئمہ نے بھی اسے تسلیاں دیتے فون بند کر دیا تھا۔

وہ اسپتال کا کوریڈور عبور کرتے ویٹنگ لاؤنج میں پہنچی تھی' جہاں اسے سبرینہ پہلے سے بیٹھی دکھائی دی۔ اسے دیکھ کر اسے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی تھی۔ دونوں کچھ دیر آپس میں باتیں کرتی رہیں۔ گھر والوں کو تو شاید خاص محسوس نہیں ہوتا تھا مگر سبرینہ کو اس کے انگلش لہجے میں اردو کی روانی مسکرانے پر مجبور کر رہی تھی۔

"پہلی بار آئی ہو ادھر۔"

"نہیں۔۔۔ دو' تین بار پہلے بھی آئی ہوں۔ بھر جائی کے ساتھ۔"

"گھبراہٹ تو نہیں ہوتی' میرا مطلب ہے حنبل یہاں نہیں ہے۔" اداس سا یہ اس کے چہرے سے گزرا تھا۔ نفی میں سر ہلاتے وہ پھیکا سا مسکرائی۔ سبرینہ نے اسے پیار سے تھپکی دی۔

"چلو کوئی بات نہیں' اللہ خیر کرے گا اور وہ وہاں جا کر بیٹھ ہی گیا ہے' آ کیوں نہیں رہا؟" اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی' سلویٰ سامنے سے آتی دکھائی دی۔ سبرینہ کو دیکھ کر اسے بھی حیرت ہوئی تھی۔ اسے سبرینہ کے چہرے پر وہی اداسی' بے کلی محسوس ہوئی تھی جو ہر بچے کی دفعہ اس کے چہرے پر پھیل جاتی تھی۔ ان دیکھا خوف روائیبہ کے سلام کا روکھے سے جواب دے کر وہ سبرینہ کا حال احوال پوچھتی رہی۔ اسے تسلی دیتے صاف کہا تھا۔

"بیٹا یا بیٹی جو کچھ بھی ہو' سبرینہ تم نے ڈرنا نہیں ہے' بلکہ میں تو سوچ رہی ہوں اب کہ تمہیں ہم اپنے گھر لے جائیں گے' کچھ بھی کہا نا شہوز بھائی نے انہیں ایسے جواب دیں گے' وہ ساری عمر یاد رکھیں گے۔"

"ہاں تمہاری تو وہ سن لے گا نا جیسے۔"

"اس کے اچھے اچھے بھی سنیں گے۔ اور اللہ کرے سننے سنانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اللہ مراد پوری کردے۔" تب ہی روائیبہ کا نمبر آ گیا تھا۔ وہ اٹھ کر جانے لگی تو سلویٰ بھی سبرینہ کو کہتے ہوئے اٹھی تھی۔

"میں ذرا اس کے ساتھ چلی جاؤں۔ ایک تو آپا کی سسرالی چاپلوسیاں مجھے بھی نبھانی پڑتی ہیں۔" وہ نخوت سے روائیبہ کو دیکھتی اس کے پیچھے پیچھے بڑھی تھی۔ روائیبہ کی اس حالت کا سن کر جتنی اسے تکلیف ہوئی تھی شاید کسی کو محسوس ہوئی ہو' کس دل سے وہ اس کے ساتھ بھی' یہ وہی جانتی تھی۔ ڈاکٹر سے مل لینے کے بعد بھی وہ اسے اپنی کٹیلی نگاہوں میں باہر لائی تھی' تب تک سبرینہ اپنی ڈاکٹر کے پاس جا چکی تھی۔



موسم گرمی میں داخل ہو چکا تھا' سارا دن بند کمرے اور اے سی کی خنکی سے روائیبہ کا دل بے طرح سے

اوب گیا۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے پیشہ ورانہ انداز میں اچھی خوراک لینے اور بھاری کام کاج سے پرہیز بتا دیا تھا۔ خوراک تو سارے گھر کی اعلا تھی۔ مگر بھاری کیا ہلکا پھلکا کام بھی کرنے کو نہیں تھا۔ کہاں تک کمرے میں بیٹھی ٹی وی اسکرین کو تکتی۔

سورج ڈھلتے ہی وہ لان میں نکل آتی۔ ڈرائیو وے پر چلتے چلتے پرندوں کے پنجروں کے پاس رک گئی تھی۔ حنبل کو ان پرندوں سے بہت پیار تھا۔ بہت دیکھ بھال کرتا تھا ان کی اس کی مہینوں کے حساب سے غیر موجودگی پر مالی اسی طریقے سے ان پرندوں کو دیکھتا تھا۔ خوراک' خیال سب ویسا ہی تھا' مگر پھر بھی اداس دکھائی دیتے تھے۔ روائیبہ کو تو ایسے بھی محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کی یاد میں چڑچڑے ہو گئے ہوں۔ اکثر ہی الجھتے پائے گئے۔ اس وقت بھی رنگین چڑیوں کے نچلے خانے میں موجود چار پانچ چڑیاں ایک معصوم سی چڑیا کو چونچوں سے زخمی کر رہی تھیں۔ روائیبہ نے "شش شش" کر کے انہیں ہٹایا اور جھک کر اس خانے کا دروازہ کھولا بے دم ہوئی چڑیا کو باہر نکال لیا۔

مالی بابا کیاریاں ٹھیک کر رہا تھا۔ اسے چڑیا نکالتے دیکھ کر اسی کی جانب آگیا۔ سفید نرم پروں میں دبی چڑیا اس کی ہتھیلی پر بیٹھی گہرے سانس لے رہی تھی۔ مالی بابا کو پاس کھڑا دیکھ کر اس نے اپنی چادر درست کی۔ چڑیا کا پر نرمی سے کھولتے ہوئے اسے دکھا رہی تھی۔

"بابا اسے دوا لگائیں' یہ زخمی ہو گئی ہے۔" مالی نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بلکہ اسے دیکھنے کے بجائے اس کے پیچھے دیکھا۔ اذلان نے انہیں وہاں سے ہٹ جانے کا خاموش اشارہ کیا تھا۔ وہ واپس کیاریوں کی جانب چل دیا۔ تب اذلان آہستگی سے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"زخمی تو آپ بھی ہیں' آپ کو بھی دوا کی ضرورت ہے۔" روائیبہ نے میکانکی انداز میں گردن پھیری' بہت سی نفرت اس کی آنکھوں میں اُمڈ آئی۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولی تھی۔ صرف آنکھوں میں آنکھیں گاڑھے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"ضروری نہیں تم جو کہنا چاہو' میں وہ سننا بھی چاہوں۔"

"بالکل درست۔" اس نے مستحکم انداز میں کہتے ہوئے اپنے ہاتھ پیچھے کو باندھ لیے۔ "نا چاہتے ہوئے سہی' لیکن مجھے یقین ہے' آپ سنیں گی۔"

وہ اسے ہتک آمیز انداز میں مسلسل دیکھ رہی تھی۔ سفید چڑیا پر اپنی گرفت چھوڑی' وہ پھر سے اڑ کر اپنے پنجرے کے جنگلے پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو سوراخوں سے دیکھ رہی تھی۔

"میں نے جو کچھ اس رات کیا' یا بعد میں اس پر بے حد نادم ہوں' اپنی ہی عزت پر نقب مجھے اندر سے توڑ رہی ہے۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔" وہ سن کر استہزائیہ ہنسی تھی۔

"تم شرمندہ ہو' معافی چاہتے ہو۔ جب میں یہ سمجھ جاؤں گی تو معاف کر دوں گی۔۔۔ اوکے۔" وہ کہہ کر جانے کو مڑی تھی۔ اس کی آتی آواز پر قدم رک گئے' مگر رخ نہیں پھیرا تھا۔

"میں آپ کو اکساتا رہا چاچو کو بتا دو' مگر آپ نے نہیں بتایا' یہ احسان ہے آپ کا مجھ پر' لیکن اب میں آپ کی منت کرتا ہوں' چاچو کو کبھی کچھ مت بتانا۔ وہ پہلے وہاں بہت پریشانی دیکھ چکے ہیں' پلیز۔" وہ آہستگی سے رخ پھیر کر اسے دیکھتے بولی۔

"تم کیا سمجھے' جو میں نے ابھی تک کسی کو نہیں بتایا' تم سے ڈر گئی تھی' ہونہہ۔۔۔" وہ توقف لے کر کہہ رہی تھی۔ "میں نہیں چاہتی تھی اپنا تماشا بنواؤں اور جب میں یہ چاہوں گی تو حنبل کیا سب کو پوری جزئیات کے ساتھ ایک ایک لمحہ بتاؤں گی' تم نے کیا' کیا اور کیا ارادہ تھا۔ تم سمجھتے ہو حنبل کبھی نہیں آئے گا' مجھ سے معافی مانگ کر میرے سامنے پاک صاف ہو جاؤ گے۔ تو ایسا کبھی نہیں ہو گا۔"

"میں ایسا کچھ نہیں سمجھتا۔ مجھے جب سے آپ کی طبیعت کا پتا چلا ہے' شرمساری سے مجھے خود سے گھن آنے لگی ہے' میں نہیں چاہتا آپ کا اور چاچا کا رشتہ

خراب ہو۔"

"تم ہو ہی گھن کے قابل۔" وہ چبا چبا کر بولی تھی۔ "میرا اور حنبل کا رشتہ اتنا کمزور نہیں جو ٹوٹنے کے لیے تمہارے چاہنے نہ چاہنے کا محتاج ہو۔ آئندہ میرے راستے میں مت آنا' ورنہ اچھا نہیں ہوگا' سمجھے۔" انگشت اٹھا کر اسے تنبیہی کرتی تیزی سے مڑ گئی تھی۔ وہ تاسف سے بہت دیر اسے دیکھتا رہا۔



مس پروسیسنگ یونٹ نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ مال تیاری کے بعد ترسیل کے مراحل میں داخل ہو چکا تھا اور یہ ہی وجہ تھی جرمنی میں کاروبار شروع کرنے پر حکومت نے اسے اتنی سہولت دے رکھی تھی' وہ پورے ملک میں کہیں بھی آ جا سکتا تھا۔ مگر فی الحال جرمنی سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی' کیس باقاعدہ عدالت میں چل رہا تھا۔ ہر پیشی پر وہ حاضر ہوتا۔ اس کے ہاتھ ہر طرح سے صاف تھے۔ یہ وہاں کی عدالت جانتی تھی' کچھ پاکستانی منسٹری کی ضمانت کے سبب اسے کاروبار کرنے کی بہت اچھی سہولت تھی' مگر وہ پھر بھی بے آرام تھا۔ باقاعدگی سے تو نہیں' البتہ دو چار روز بعد وہ گھر فون کرتا اکثر ہی روائیبہ کی جانب سے کوئی اچھی خبر نہیں مل رہی تھی۔ طبیعت خراب' بی پی لو' کبھی ڈاکٹر کا سن کر وہ اچھا خاصا جھنجلا گیا۔ رہ رہ کر ظہیر تقی پر غصہ آتا اگر وہ اس کے سامنے آ جاتا حنبل اسے نوچ کر پھینک دیتا۔ چھ مہینے ہونے کو آ گئے تھے۔ اس کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ اس پر مقدمہ دائر ہونے سے دو دن پہلے وہ جرمنی میں تھا اور حنبل کے ساتھ نا صرف ڈنر کیا بلکہ اسی کی گاڑی میں اپنے فلیٹ تک گیا۔ دو دن میں وہ کم از کم جرمنی سے نہیں نکل سکتا تھا جس طرح کا وہاں تیز قانون تھا۔ ہاں کہیں چھپ گیا وہ ایک الگ معاملہ تھا۔

پاکستانی نژاد ظہیر تقی پانچ سال پہلے لندن سے جرمنی آیا تھا۔ لندن میں کاروباری ناکامی کے اس کے پاس بہت سے ثبوت تھے۔ اپنے ان ہی ناکام تجربوں سے بہت کچھ سیکھ کر جرمنی میں کاروبار کا آغاز کیا۔ ہر ملک' ریاست' ایمپائر پاور کے کچھ سیاسی معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کو سامنے رکھ کر اپنی عوام یا باہر سے آنے والوں کے لیے بہترین پالیسیاں ترتیب دی جاتی ہیں بظاہر ان کے امن کا ڈنکا ہو' در پردہ مخالفین پر رعب کی چادر تنی رہے۔ دوسری عالمی جنگ میں بدترین ناکامی کے بعد جرمنز بہت حد تک خون خوار بن گئے تھے خاص طور پر تاج برطانیہ اور ان کے اتحادیوں کے خلاف۔ اس جنگ کو صدیاں گزر گئیں کتنی نسلیں آئیں' ٹھہریں گزر گئیں مگر نسل سے نسل یہ نفرت ضرب کھا کر کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ بوڑھی سوچ کی مالک نسل تو اس نفرت کے اشتعال کو اس حد تک پال کر جوان رکھتی ہے کہ بیشتر قوانین برطانیہ سے یکسر مختلف بنائے جائیں۔ یہاں تک کہ بجلی کا بلب' پنکھا چلانے کے لیے بورڈ سوئچ کو ساری دنیا نیچے کی طرف دبا کر آن کرتی ہے لیکن جرمنی ایک ایسا ملک ہے جہاں ہمیں بلب چلانے کے لیے اوپر کی جانب دبانا پڑتا ہے' ہے ناں مضحکہ خیزیات اور یہی کیا انگریزی زبان کے حروف دیکھ لیں پوری دنیا نے AV کو سیدھا لکھا سوائے جرمنی کے' جو VA الٹا لکھتے ہیں یہی حال باقی حروف کے لکھنے اور بولنے کا ہے۔ اس مضحکہ خیزیات کے پیچھے وہی دوسری جنگ عظیم کی یاد کا درد چھپا ہے' جرمنی کو دنیا کے کسی قاعدے قانون سے غرض نہیں بلکہ تاج برطانیہ کو ناپسند کرنے کا اظہار ہے۔ جواب ان کا کلچر بن چکا ہے۔ آپ کی مرضی۔

جس ریاست سے اتنی نفرت پائی جائے وہاں سے نا امید ہو کر آنے والے شخص کے لیے ایک خصوصی ہمدردی کے جذبات ابھرتے ہیں شخص بھی وہ جو پاکستانی نژاد ہو' پاکستان کے ہر قاعدے قانون پر برطانوی قوانین کی گہری چھاپ ہے صرف ایک لمبا عرصہ ان کے دست سایہ پلنے کی وجہ سے۔ اور ظہیر تقی کا تعلق پاکستان سے بھی تھا اسی لیے اسے وہاں کاروبار بہتر ریلیف پیکیج پر دیا گیا۔ اس کے کاروباری پارٹنر مارٹین سے ظہیر کی ملاقات ایک ریلوے ٹریک پر ہوئی

تھی۔ سلسلہ کلام جوڑتے جوڑتے ظہیر نے اسے اپنے پاکستانی کاروبار اور پھر لندن میں ناکامی کے قصے خوب بڑھا چڑھا کر سنائے۔ جرمنی میں آکر زیرو سے شروع ہونا بھی اسے نہایت معمولی امید لگ رہا تھا۔ مارٹین کا تعلق جرمنی فورسز سے تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھا جب ریٹائرمنٹ قریب تھی اسے ظہیر تقی سے خاصی ہمدردی ہوئی تھی جس کے پیچھے وہی چھپا سیاسی تعصب بھی تھا۔ اس نے اسے ہر طرح کی مدد کرنے کی یقین دہانی کروائی۔

مارٹین حکومتی پالیسیوں کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا اسے کاروبار کے لیے بہترین سہولیات دلوا سکتا تھا یہاں تک کہ آفس کنٹریکٹ میں اس کے ساتھ پارٹنر شپ کرلی۔ پانچ سالہ کنٹریکٹ کے ابھی دو سال گزرے تھے ظہیر تقی کو اس سے مختلف باتوں پر اختلاف ہونے لگا۔ فطری طور پر لالچی اور خود غرض ظہیر تقی کا ان ہی دنوں رابطہ اپنے پرانے دوست خیام ذکا سے ہوا۔ اس نے فون پر اسے یہاں کے کاروباری پرکشش حالات بتائے تھے۔ اس کا پہلا منصوبہ یہی تھا۔ وہ مارٹین سے الگ ہوجائے اور خیام ذکا کے سرمائے میں کسی طرح شمولیت کرے باقی اس کا اپنی ذہانت اور چرب زبانی کام کرتی تھی کس طرح کس کو متاثر کیا جاسکتا ہے۔ حنبل ذکا کے جرمنی آجانے کے بعد اس نے حنبل سے بہتر تعلق استوار کرلیا تھا۔ ان ہی دنوں اس کا اور مارٹین کا خاصا سیریس جھگڑا ہوا تھا۔ مارٹین اپنی پارٹنر شپ معمولی منافع پر چھوڑنے پر راضی نہیں تھا۔ بلکہ اس نے قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی۔

وہ ایک سرد رات تھی۔ ظہیر تقی نے اپنی طبیعت خرابی کا بہانہ کرکے مارٹین سے مدد مانگی کہ وہ آئے اور اسے اسپتال لے جائے۔ اور ایسا ہی ہوا جیسے ہی مارٹین اس کی طرف پہنچا ظہیر تقی نے اسے نشہ آور دوا کھلا کر اپنے اسٹور میں بند کردیا تھا۔ پارٹنر شپ کے وہ کاغذات جو مکمل تیار ہونے پر مارٹین کے دستخط نہ کرنے کی وجہ سے ادھورے تھے۔ منافع اس کی رضا کے مطابق نہیں تھا۔ ظہیر تقی نے اس سے زبردستی اپنے فلیٹ پر دستخط کروائے تھے۔ اور اسے کئی دن وہاں قید رکھا تھا۔ ان چند دنوں کے دوران ظہیر نے اصرار کر کے حنبل کو پھنسایا اور چرب زبانی سے ایگریمنٹ ٹرانسفر کردیا تھا۔ ایگریمنٹ ٹرانسفر ہونے تک حنبل کو اتنا پتا تھا مارٹین فرانس سے تعلق رکھتا ہے جب کہ کاروباری سلسلے میں یہاں کچھ عرصے سے رہ رہا تھا۔ فائل میں لگے اس کے کاغذات اس نے اچھی طرح پڑھے ضرور تھے لیکن وہی جرمنی کی پالیسی انگریزی کے بیشتر حروف الٹے لکھنا اسے سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی۔ پھر فورسز میں ہونے کی وجہ سے کئی نشنلٹیز اس کے ساتھ تھیں اور جو کاغذات میں استعمال ہوئی تھی وہ اس کا فرانس سے تعلق ظاہر کرتی تھی۔ اس سارے گھماؤ میں نقصان حنبل کا ہوا۔ کیوں کہ وہ ایک ثبوت تھا۔

ایگریمنٹ کے بعد جس رات ظہیر تقی نے حنبل کو ڈنر پر انوائٹ کیا تھا۔ اس رات مارٹین کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ رسیوں میں جکڑے اس کے بازو ظہیر تقی نے اسی خیال سے کھولے تھے کہ اب اس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اسے کچھ نقصان پہنچا سکے لیکن یہ اس کی غلط فہمی ثابت ہوئی۔ بھلے ڈھلتی عمر میں لیکن فورس سے تعلق تھا اور پھر جرمنی بوڑھا۔ جرمن کے بوڑھے ہمارے ہاں کے بوڑھوں کی طرح نہیں ہوتے کہ دنیا کی ہر رونق سے منہ موڑ کر خود کو مزید دس سال آگے دھکیل دیں۔ وہ اپنی زندگی کو پیچھے کی جانب دھکیلنے کا فن جانتے ہیں۔ اس لیے جرمنی میں بچوں اور جوانوں کی تعداد سے کہیں زیادہ فریش بوڑھے ملتے ہیں۔ مارٹین ایک فریش بوڑھا تھا اس نے آزاد ہوتے ہی جیسے ظہیر پر حملہ کیا۔ ظہیر تقی کے پاس اس وقت اور تو کچھ نہیں تھا اس کی جیکٹ میں ایک چھوٹی پستول تھی جو بنا سوچے سمجھے مارٹن پر کھول دی۔ اس کی تڑپتی کیفیت پر وہ خود بھی ڈگمگا گیا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے گھسیٹ کر واش روم میں بند کیا خود تیار ہو کر ڈنر کے لیے نکلا تھا۔ حنبل کو وہ اس دن معمول سے ہٹ کر لگا تھا ہو چھنے پر وہ پھیکا سا مسکرایا۔

"بس یار طبیعت ٹھیک نہیں تھی، لیکن تم سے ڈنر کا وعدہ تھا سو آگیا۔"

"اوہو... آپ بتادیتے' یہ اتنا ضروری نہیں تھا... آپ پہلے ڈاکٹر کے پاس جائیں۔" وہ رک کر بولا۔

"ہاں واپسی پر جاؤں گا... بلکہ ایسا ہے تم مجھے ڈراپ کردو..."

"شیور۔" اچھے ماحول میں کرسیاں چھوڑ کے وہ اٹھے۔ حنبل نے اسے پوٹسڈیم پلزروڈ پر ڈراپ کیا تھا۔ اس نے بہت چالاکی سے اپنا پستول سیٹ کور میں چھپادیا تھا۔ جو دو دن بعد فورسز کے بندوں نے حنبل کی تلاشی میں برآمد بھی کرلیا۔ لیکن مارٹین کی ڈیڈ باڈی ظہیر تقی کے فلیٹ سے برآمد ہوئی' پستول پر اسی کے فنگر پرنٹ تھے۔ سی سی ٹی وی کی رہنمائی سے حنبل کے آفس' گاڑی' یہاں تک کے اپارٹمنٹ کے فرازنک ٹیسٹ ہوئے تھے۔ جہاں جہاں سے فنگر پرنٹ اٹھائے گئے' ان سب میں حنبل بے گناہ تھا۔ اس لیے اسے سزا دینے کا تو تصور نہیں تھا۔ صرف آلہ قتل کی برآمدگی اور اس کے ساتھ ان ہی دنوں میں مستقل پایا جانا اسے مشکوک بنا چکا تھا ایک تو دونوں کا تعلق پاکستان سے تھا اور دوسرے کاغذی کارروائی میں کزن' جیسے ہی ظہیر تقی کا پتا چلنا تھا حنبل کا نام E.C.L سے خارج ہوجانا تھا۔ ظہیر تقی کو تو جانے زمین نگل گئی یا آسمان نے کھالیا۔ جہاں جہاں وہ ہوسکتا تھا سب جگہ چھان بین ہوچکی تھی۔ اس کی فیملی سنگاپور میں پائی گئی مگر وہ اپنی فیملی کے پاس بھی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ ٹی وی اسکرین آن کرکے مووی لگائی۔ اس کی پسندیدہ انگلش مووی چل رہی تھی لیکن اسے اس میں ذرا برابر دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ اذلان کے بدلتے رویے اور انداز نے اسے اچھا خاصا بے آرام کررکھا تھا۔ اس کا دماغ بار بار اسی بات پر الجھ رہا تھا۔ اب اسے معافی کیوں یاد آئی' کیا وہ شرمندہ ہے' یا وہ پھر سے میرا اعتماد جیتنے کے لیے جذباتی ٹریپ کررہا ہے۔

اس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی چہرے پر تضحیک کے تاثرات تھے۔ ذہن کو بار بار جھٹکنے پر بھی وہی اکتاہٹ۔ اس نے موبائل پر ایف بی آن کرلی۔ اسی وقت حنبل آن لائن ہوا۔ روائیبہ نے فوراً اسے میسج ٹائپ کیا۔

"حنبل اگر کوئی غلطی کرکے معافی مانگے تو کیا کرنا چاہیے۔"

"حوصلہ ہو تو معاف کردینا چاہیے۔" اس کا فوراً جواب آیا۔

"بے شک غلطی بہت بڑی ہو... تب بھی..."

"نہیں..." حنبل نے فوراً دو تین میسج ٹائپ کیے۔

"بڑی غلطیوں پر سزا بنتی ہے۔"

"اگر ہر غلطی کو معاف کردیا جائے گا تو وہ معافی مل جانے کی امید میں بار بار غلطی کیے جائے گا۔ سزا کا خوف غلطی روک دیتا ہے... اور تم کیوں پوچھ رہی ہو..."

"ویسے ہی..." اس نے ٹائپ کرکے اداس اسمیلی ڈالی "اور اگر اس سے آپ کا بہت قریبی تعلق ہو' پھر بھی اسے سزا دینی چاہیے۔" اس نے میسج پڑھتے ہی فوراً "کال ملائی تھی۔

"اب کیا کردیا ہے تم نے... روائیبہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اب میں تمہیں بالکل معاف نہیں کروں گا... کیا کیا ہے تم نے۔" وہ سنتے ہوئے بے تحاشا ہنستی رہی پھر رک کر پوچھا۔

"کیا جان سے ماردو گے...؟"

"اس سے بھی برا سلوک کروں گا... سمجھیں..."

"اچھا...!" وہ استہزائیہ ہنسی "میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ حنبل ذکا مجھ سے بہت محبت کرتا ہے' میری غلطیوں پر مجھ سے کچھ دیر خفا رہ سکتا ہے' مجھے مار نہیں سکتا... کیوں ٹھیک کہا ناں۔"

"تم انسان بن جاؤ..." اس نے آواز میں مصنوعی

غصہ بیدا کیا۔ "اب کیا کردیا ہے۔۔۔ بولو۔۔۔"

"کچھ نہیں ڈیئر۔۔۔" اس کی نظر مووی پر گئی وہاں لڑائی کے دوران ایک شخص معافی مانگنے لگا تھا اسے بات مل گئی "میں تو مووی دیکھ رہی تھی' ایک سین تھا سو تم سے رائے لی کہ رائٹر کو معاف کرنا چاہیے تھا یا نہیں۔"

"بہت فضول ہو تم یار۔۔۔" اس نے گہری سانس لی۔ وہ مزید ہنسنے لگی۔

"مجھے حیرت ہو رہی ہے اتنا لمبا چوڑا مرد' میرے ذرا سے مذاق سے ڈر گیا۔"

"بالکل ڈر گیا۔۔۔" اس نے اقرار کرتے ہوئے تفصیلاً" بتایا "کیوں کہ یہ لمبا چوڑا مرد اپنی بیوی سے محبت کرنے لگا ہے' اور نہیں چاہتا اس کی احمق بیوی اپنے احمق ہونے کا روزانہ ثبوت فراہم کرے۔"

"حنبل۔۔۔!!" وہ تقریباً" چلائی تھی اب قہقہہ لگا کر جلانے کی باری حنبل کی تھی۔



وہ بے تاثر چہرہ لیے جلتی لکڑیوں کے پاس بیٹھی تھی۔ اچھی بھلی لکڑی جل کر انگاروں میں تبدیل ہوتی۔ پھر پھٹ کر کچھ لمحے کو چمکتی' چٹختے چٹختے راکھ بن جاتی۔ گلزاری نے اسے کئی بار آوازیں دیں۔ رقیہ بھی ڈپٹ کر گئی۔

"اب اٹھ کر اندر آجا۔"

مگر وہ مٹی کی مادھوبنی لکڑیوں کو تکے جا رہی تھی۔ قمر الدین اپنی ماں اور باپ کے ساتھ دو دن سے آیا ہوا تھا۔ اور ان دو دنوں میں وہ بالکل بھی حویلی سے نہیں نکلی کہیں اماں اسے فارغ سمجھ کر بلا نالے' جب رحی خالہ نے واپس جانا تھا۔ تو اسلم سے کہہ کر اسے خاص طور پر بلایا۔ اپنی خاموشی سے وہ ناپسندیدگی کا اظہار کرتی رہی۔ پہلے صحن کے کونے میں رکھے سوکھے بالن (ایندھن) کی لکڑیوں سے الجھتی رہی پھر ہنڈیا بنانے بیٹھ گئی۔ کھانا تیار ہو چکا تھا لگانا باقی تھا۔ رقیہ تیزی کے ساتھ چیزیں اٹھا اٹھا کر چارپائیوں پر کھانا لگانے لگی۔

قمر الدین ہاتھ دھونے کے بہانے اٹھ کر آیا درخت کے نیچے لگے نل پر ہاتھ دھو کر آہستہ قدموں سے اس کے پاس آکھڑا ہوا۔

"تو خوش نہیں ہے' اندر ہمارے بیاہ کے دن رکھے جا رہے ہیں۔"

اس نے متنفر سانس پھینک کر اسے دیکھا اور اگلے دانت جما کر بولی۔ "اگر کہوں گی نہیں' تو کیا تو دن ختم کر جائے گا' لے جائے گا اپنی ماں کو خاموشی سے۔۔۔" اپنی قمیص کے دامن سے ہاتھ سکھاتے اس نے کڑواہٹ بھری آواز نکالی۔

"کس بات کا غرور ہے تجھے۔۔۔؟"

"غرور نہیں فتور ہے میرے مغز میں' شکل دیکھی ہے کبھی تو نے اپنی۔" جلتی لکڑیوں کی جانب سیاہ آنکھیں پھیر کر چباتے ہوئے بولی "ان لکڑیوں کی طرح جل رہی ہوں۔۔۔ تیرے ساتھ کے تصور سے بھی۔۔۔"

"ہونہہ۔۔۔" وہ استہزائیہ مسکرایا قمیص کا دامن جھٹک کر سیدھا کرتے اسے دیکھ رہا تھا۔

"جلنا تو تیری قسمت میں لکھا ہے' میں تجھے راکھ بنا کر پانی سے بجھاؤں گا۔" وہ کہہ کر رکا نہیں اندر کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا جہاں سب بڑے بیٹھے ان کی شادی کے لیے چاند کی تاریخوں پر غور کر رہے تھے۔ اسلم اور گلزاری کو نئے چاند کی تاریخ اچھی لگی جب کہ رقیہ کا منہ بن گیا۔

"رہنے دے اماں۔۔۔ چڑھتا چاند جیسے آہستہ آہستہ دکھتا ہے ناں' ایسے ہی ان دنوں میں کی شادی کا حال ہوتا ہے۔" اس کی شادی چاند کی دو تاریخ کو ہوئی تھی۔ آج تک اپنے میاں سے بن نہیں سکی تو یہ سب اس کے نزدیک چاند کا قصور تھا۔

"میرا ہی حال دیکھ لے' کس طرح سسک سسک کے زندگی کھینچ رہی ہوں۔ اور میری نند' چودہ تاریخ رکھی تھی اس کی' چودھویں کے چاند کی طرح چمکتی ہے۔"

اسلم اور گلزاری کو اس کا فلسفہ کسی مفکر سے بھی بڑا

لگا تھا۔ حالانکہ چاند کو گرہن ہمیشہ چودہ تاریخ کو لگتا ہے' پورے چاند پر سیاہ دھبا... آہ۔

ان کی شادی کی تاریخ اگلے مہینے کی چودہ رکھی جا چکی تھی جس کے آنے میں بھی ابھی پورا مہینہ تھا۔ گھر کے تمام افراد خوشی میں ایک دوسرے کو مٹھائی کھلاتے خوش ہو رہے تھے سوائے زینب کے... وہ آنکھیں موندے کوٹھری میں ٹوٹی چارپائی پر گرنے کے انداز میں لیٹی تھی۔



گرمی کا علامتی مہینہ جون کلینڈر اپنی حدت دیکھا کر آخری سانسیں لے رہا تھا۔ لمبے دن پل بھر جیسے 'راتیں اسے کاٹنی بے حد مشکل لگ رہی تھیں۔ اسے لگتا تھا اس کی زندگی میں صرف تنہائی لکھی ہے' وہ ہمیشہ تنہا رہے گی۔ گھٹتے بڑھتے دنوں کے درمیان گھڑیال کی سوئی کی طرح گھومتی۔ ہر موقع' ہر یاد پر تنہا۔ آج ان کی پہلی ویڈنگ انیورسری تھی۔ ایک طرف طبیعت کا بوجھل پن بے حد قنوطیت پھیلا رہا تھا دوسرا اس کی یاد اور تنہائی کسی آرے کی طرح اس کے جسم کے حصے چیرتی محسوس ہوتی۔ گلے میں پہنی چین کے یاقوت سے اسے جنون جیسی محبت ہو گئی تھی لیکن اس وقت اسے اس کے آنسو بھی محسوس ہو رہے تھے۔

"تم نے کہا تھا میں ہر سال آج کے دن اس میں موتی کا اضافہ کروں گا' لیکن مجھے تو ایسا لگتا ہے' یہ بھی چھین جائے گا مجھ سے... کیا کبھی تم لوٹ کر آؤ گے۔"

بید کی لکڑی سے بنے نئی طرز کے بینچ کی پشت پر سر ٹیکتے ہوئے آنکھیں موندھ لیں...

آج صبح سے ہی موسم خاصا خوش گوار تھا پاکستان کے بہت سے حصوں میں مون سون داخل ہو چکی تھیں ٹھنڈی ہواؤں کے گزرنے سارے آسمان پر سیاہ بادلوں کی موٹی سی تہ بچھا دی۔ بادلوں میں گڑگڑاہٹ بہت تھی مگر ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے ابھی بوندا باندی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دل کمرے میں بے طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ باہر نکل کر لان میں بیٹھ گئی۔ سال کے بہت سے دن ہوا کی طرح پوٹوں پر گزر رہے تھے لیکن جون کی اٹھائیس تاریخ گھرے بادل کی طرح ٹھہر سی گئی۔

سر بینچ کی پشت پر ٹکائے ٹکائے اس نے آنکھیں کھولیں سیاہ بادلوں کی تہوں میں بھی وہی دن تیر رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکے سے اس کے بھورے بال اڑتے چہرے پر آ گئے۔ دوپٹا ہوا کے دباؤ سے پیچھے کی جانب کھنچ رہا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھنے لگی۔ اذلان باہر نکلنے کی غرض سے برآمدے کے اسٹیپ اترتا دکھائی دیا۔ روائیبہ نے اندر جانے کا ارادہ بدل دیا رخ دوسری سمیت بدل کر دیکھنے لگی۔ وہ پاس سے گزرتا لمحہ بھر رکا تھا۔ جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو' مگر پھر تیزی سے گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ اس دن کی معذرت کے بعد سے اذلان نے حقیقتاً "اس کے راستے میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو اس سے فاصلہ رکھتی سو رکھتی تھی مگر اب وہ خاص طور پر احتراز برتنے لگا تھا۔ روائیبہ کی غیر ارادی نگاہ خود بخود سرکتی اس کی پشت پر گئی تھی۔ اس نگاہ میں اس کے لیے صرف تضحیک تھی وہ جیپ میں بیٹھ کر گیٹ پار کر گیا۔

تب وہ ہوا سے بے قابو ہوتی اپنی شال اور دوپٹا سمیٹتے اٹھی بینچ پر دھرا موبائل اٹھایا۔ برآمدے کے اسٹیپ پر قدم جمایا تھا ہاتھ میں پکڑے موبائل میں زندگی محسوس ہوئی۔ اس کی روشن اسکرین روائیبہ کے اندر کی زندگی کو بھی تراوٹ بخش گئی۔ اس نے جھٹ سے موبائل آن کر کے کان سے لگایا۔

"کیسے ہو...؟"

"بہت اداس' بہت مجبور' بہت بے بس...؟" اس کے اداس لہجے پر وہ وہاں اسٹیپ پر ہی بیٹھ گئی۔

"خیریت... کیا ہوا...؟"

"ہونا کیا ہے' اپنی پہلی ویڈنگ انیورسری پر بندہ اپنے گھر' فیملی' اپنی بیوی سے دور ہو' وہ اداس نہیں ہو گا تو کیا خوش ہو گا..."

وہ عجلت سے بولی۔ "تمہیں یاد ہے۔"

"کیوں میں انسان نہیں ہوں' یا میرے پاس دل نہیں ہے۔۔۔" وہ مسکرائی تھی۔

"مجھے اس دن کی ایک ایک بات یاد ہے' تم نے کیا پہنا ہوا تھا' کیسی لگ رہی تھیں' تمہاری مہندی کا ڈیزائن کیسا تھا۔"

"اچھا!" اس کی حیرانگی پر وہ ہنسا۔

"کہو تو ایک ایک بات تفصیل سے بتاؤں اور آج کیا پہنا ہوا ہے تم نے" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

اس کی نظر اپنے لباس پر پھسلی۔ اس نے معمول کی طرح عام لباس سیاہ کاٹن کی کھلے گھیر والی قمیص پہن رکھی تھی۔

جس کے دامن پر سبز ستاروں اور دھاگے کے چھوٹے چھوٹے پھول بنے تھے' ہوا کے جھونکے سے قمیص کا گھیر مزید پھول جاتا۔

"بلیک سوٹ۔۔۔"

"اسٹوپڈ لڑکی کالا کس سوگ میں پہن رکھا ہے' ملک سے گیا ہوں' دنیا سے نہیں۔۔۔ چلو تیار ہو' اور اچھی سی پکس بنا کر بھیجو مجھے۔۔۔" وہ سن کر بہت تحمل سے بولی تھی۔

"حنبل تم دل دکھانے کی باتیں کتنے آرام سے کر لیتے ہو۔۔۔ ذرا احساس نہیں ہوتا۔"

"احساس ہی ہو رہا تھا تمہارا' تب ہی اچھی اچھی باتیں کرنے کو فون کیا ہے' تمہارے لیے میرے پاس ایک زبردست سرپرائز ہے۔۔۔"

"اچھا۔۔۔" وہ کھلکھلا کر مسکرائی "اور میرے پاس بھی تمہارے لیے سرپرائز ہے' شاکنگ نیوز۔"

"تمہاری تو ہر نیوز ہی شاکنگ ہوتی ہے' خیر بتاؤ کیا کیا؟"

"پہلے تم بتاؤ۔۔۔"

"اگر نہ بتاؤں۔۔۔ تو۔۔۔"

"پھر میں بھی نہیں بتاتی۔۔۔ اور تمہیں تو بتانے کا فائدہ بھی نہیں ہے' تم صرف ڈانٹو گے' اب بتا رہی ہو چھپایا کیوں مجھ سے۔۔۔؟ تمہیں سوائے غصہ کرنے اور لڑنے کے کچھ آتا بھی تو نہیں۔۔۔"

"اب کیا نیا چاند چڑھا دیا ہے تم نے۔۔۔" وہ اکتا کر بولا۔

"آ کر دیکھ لینا۔۔۔ ویسے مجھے یقین ہے' اس بار تم معاف نہیں کرو گے' تم نے کہا تھا۔۔۔" اس کے زور زور سے ہنسنے پر وہ بھی ہنس دیا۔

"اچھا بھئی تنگ کر لو۔۔۔" اپنی ہلکی پھلکی باتوں سے اس کا موڈ بدل دینے پر وہ خوش ہو رہا تھا۔ باتوں کے دوران ہی اس نے روائیبہ کو بتایا تھا۔

"میں کل مارکیٹ گیا تھا' بہت پیارا یاقوت لایا ہوں۔۔۔ پہلے والے سے زیادہ اچھے کلرس ہیں اس میں۔۔۔"

"یہ سرپرائز تھا۔۔۔؟"

"نہیں میڈم۔۔۔ ایک اور نیوز ہے' اگر تم بتاؤ گی' تو میں بھی بتادوں گا۔۔۔"

"مجھے نہیں سننا۔۔۔" وہ زچ ہوئی اس نے قہقہہ لگایا۔

"مجھے بھی نہیں سننا۔" پچھلے بہت سے دنوں کی نسبت آج حنبل کی آواز بہت فریش اور جاندار لگ رہی تھی۔ ہر قہقہے پر شوخی چھلکتی روائیبہ کو واضح محسوس ہوئی تھی۔ فون بند ہونے پر اس نے اندازہ لگایا تھا کتنے دنوں بعد اس نے اتنی فرصت سے بات کی' وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔۔۔ یہ احساس آج کے دن کے لیے بہت تھا۔

✵ ✵ ✵

ان کی جیپ حویلی کی سڑک پر فراٹے بھرتی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ آئمہ نے ازلان کو تنبیہی آمیز ڈپٹا تھا۔

"تمہیں معلوم نہیں ہے' آہستہ چلاؤ۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ سوری۔۔۔" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں ویو مرر میں دیکھا فوراً" رفتار کم کی تھی۔ اگر آئمہ ساتھ نہ ہوتیں تو وہ ازلان کے ساتھ کسی صورت نہ جاتی۔ وہ دن پہلے معمول کے چیک اپ کے لیے وہ اپنی ڈاکٹر کے پاس گئی تھی اس دن آئمہ خاص طور پر اس

کے ساتھ گئی تھیں۔ اپنے ہر مسئلے میں آئمہ خود اسی ڈاکٹر کے پاس جاتی تھیں لیکن اس دن اس کی بات۔

"بس یہ آٹھ دس دن دیکھ لیتے ہیں' پھر آجائیے گا۔۔۔ زیادہ ٹائم مناسب نہیں ہوگا۔" آئمہ کو بہت غیر مناسب لگی۔

"اس کے کہنے کا کیا ہے' اگلی چیر پھاڑ کرکے ایک طرف پھینکے گی' اللہ کے حکم کا انتظار بھی کرنا چاہیے۔"

پھر وہی عام خواتین کی طرح اعشال اور اذلان کی پیدائش کے قصے سناتی رہیں' ان ہی دنوں سلویٰ' بہن کے پاس حویلی آئی ہوئی تھی۔ نکاح کے بعد سے سلویٰ میں واضح تبدیلی یہ آئی' وہ کچھ تحمل مزاج اور رحم دل ہوگئی تھی۔ مسکراتی ہی رہتی۔ اس کے اسکول کے وقتوں کی کسی سہیلی نے گاؤں سے شہر جانے والی مین روڈ پر بہت بڑا اسپتال بنالیا تھا۔ اور اس ایک سال میں وہ گاؤں بھر میں خوب مشہور ہوگئی تھی۔ سلویٰ نے سرسری انداز میں مشورہ دیا تھا۔

"لبنیٰ کو چیک کروالیں۔ وہ کیا کہتی ہے۔"

اسی کے مشورے پر آئمہ آج اسے ڈاکٹر لبنیٰ کے پاس لے گئیں۔ ڈاکٹر زیادہ عمر کی تو نہیں تھی البتہ باتوں سے بہت سمجھ دار لگ رہی تھی۔ خاص طور پر جب اس نے کہا۔

"نہیں ہفتہ دس دن کیوں' میرا خیال تو ایک ماہ بھی گزارا جاسکتا ہے' اگر کوئی سیریس مسئلہ نہیں ہوتا تو۔۔۔ آپ بے فکر رہیں' کوئی پریشانی والی بات نہیں ہے۔" قندیل کی غیر موجودگی میں ساری ذمہ داری آئمہ کی تھی شاید اسی لیے انہیں ڈاکٹر لبنیٰ کی بات زیادہ اچھی لگی تھی۔ سارے راستے ان کے چہرے پر اطمینان پھیلا تھا۔ روائیبہ سے انہوں نے مشورہ پوچھا تھا۔

"کیسی لگی ڈاکٹر لبنیٰ تمہیں۔۔۔؟"

وہ پھیکا سا مسکرائی۔

"ٹھیک ہے۔"

"نہیں میرا مطلب ہے ڈاکٹر اسما کی نسبت یہ کیسی لگی' ویسے مجھے تو بہت پسند آئی۔ اسپتال بھی نیا ہے' ساری مشینری باہر کی ہے' میں نے نرسری دیکھی تھی بہت جدید لگ رہی تھی' پھر آپریشن تھیٹر' لیبر روم۔۔۔ مجھے تو اچھا لگا سب سے بڑھ کر یہ ہمارے گھر سے بیس منٹ کا راستہ ہے' دن رات کسی وقت بھی ایمرجنسی میں آنا پڑے "فوراً" سے بندہ پہنچ جائے۔ ڈاکٹر اسما کا تو آخری کونے میں اسپتال ہے پہنچتے پہنچتے ہی دو گھنٹے لگ جائیں۔" اس سے پہلے کہ ان کی تفصیلی رائے پر وہ کچھ کہتی اذلان بول پڑا۔

"ڈاکٹر اسما بہت پرانی اور تجربہ کار ہے اور دو گھنٹے کیوں' ایک گھنٹے میں اس دن پہنچا نہیں دیا تھا۔۔۔ بندہ تیز ڈرائیو کرے جلدی بھی پہنچا جاسکتا ہے۔" اذلان کے وجود سے اسے جتنی نفرت ہوچکی تھی اس کا مشورہ انگارے کی طرح لگا۔ وہ جھٹ سے کہنے لگی تھی۔

"ڈاکٹر لبنیٰ مجھے بھی اچھی لگی ہے' بھرجائی۔"

اپنی بات کو اہمیت ملنے پر جہاں آئمہ کے چہرے پر مسکان ابھری وہاں اذلان نے استہزا میں گردن جھٹکی اور گاڑی کی اسپیڈ کچھ بڑھادی تھی۔ روائیبہ اپنی شال کو ماتھے کی جانب سے کھینچ کر درست کرتے ونڈو سے باہر دیکھنے لگی۔ لہلہاتے کھیت بھی اس وقت بے جان لگ رہے تھے۔ اس کی گہری آنکھوں میں صرف نفرت کا تاثر تھا اور نفرت ایسا آہنی جذبہ ہے' ایک بار خون میں شامل ہوکر دل کے رستے سے گزر جائے تو جڑ پکڑ لیتا ہے' بھلے جگہ جگہ سے بدن کاٹو وہ اپنی پہچان نہیں چھوڑتا اور اسے اذلان سے نفرت ہوگئی تھی۔



بچیوں کے ٹیوٹر کے جاتے ہی وہ لاؤنج میں آئی اور صوفے پر بیٹھ کر ان کی کتابیں بیگ میں ڈال کر انہیں کمرے میں پہنچانے کا کہہ رہی تھی حبہ اور عشا ماں کی بات کو سنی ان سنی میں ٹال کر صوفے پر چڑھی ٹی وی آن کرکے بیٹھ گئی تھیں' دعا ان سے ریموٹ چھیننے کی کوشش کے ساتھ "ٹام' ٹام" کارٹون کے لیے چلا رہی تھی۔ سوہا نے ماں کو ہمدردی سے دیکھتے بھاری بیگ

کھینچنے شروع کیے۔ سبرینہ نے پاس رکھا کشن حبہ کو متوجہ کرنے کے لیے مارا تھا۔

"چھوٹی بہن اٹھا رہی ہے' شرم نہیں آتی تمہیں۔۔۔ کل تمہارے ٹیوٹر سے شکایت لگاؤں گی۔"

وہ ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے دوسرے سے فون سنتا اندر داخل ہوا تھا۔ اس کا رخ زینے کی جانب تھا۔ سبرینہ کا جملہ سن کر پیچھے کی جانب پلٹ آیا سوہا بیگ جہاں کے تہاں چھوڑ کر جلدی سے ماں کے پاس بیٹھ گئی۔ حبہ نے ٹی وی بند کر دیا عشا اور دعا بھی خاموش ہو گئی تھیں۔ اس نے فون بند کر کے ٹیبل پر ڈالا اور سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"عشا مجھے پانی دو۔" وہی عشا جو ٹھس صوفے پر بیٹھی تھی میکانکی انداز میں اٹھی ٹیبل پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور ڈرتے ڈرتے باپ کو پکڑایا تھا۔

"حبہ تم ادھر آؤ۔"

اپنا نام سنتے ہی حبہ کا رنگ سفید کبوتری کی طرح پڑ گیا تھا۔ دعا کے آنسو آنکھوں میں ہی رک گئے۔ حبہ کے اٹھ کر باپ تک جاتے قدم دیکھ کر وہ صوفے کے ساتھ اپنی پشت لگا کر سرکتی سرکتی صوفے کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ سبرینہ چاروں کو دیکھ رہی تھی جو کچھ دیر پہلے اس کی بات سننے کی روادار نہیں تھیں اب ایسی تھیں جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ شہروز کمال نے حبہ کی کلائی پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

"تمہاری اسٹڈیز کیسی جا رہی ہے' ٹیوٹر صحیح پڑھا رہا ہے۔" اس کا وحشت بھرا سر اثبات میں ہلا تھا۔

"کوئی فالتو بات تو نہیں کرتا' میرا مطلب ہے فیملی کی' ادھر ادھر لوگوں کی' فلموں ڈراموں کی۔" اب اس کا سر نفی میں ہل رہا تھا۔ تب سبرینہ ذرا سختی سے بولی۔

"کس قسم کی باتیں پوچھ رہے ہو' بچی سے۔"

"میں نہیں پوچھوں گا تو اور کون پوچھے گا۔" اس نے پھر ان سب سے کہا تھا۔

"چلو بیگ اٹھاؤ' جاؤ اپنے کمرے میں۔" لمحہ لگا تھا انہیں بیگ اٹھا کر وہاں سے بھاگنے میں۔ چھوٹی سی دعا بھی صوفے کے پیچھے سے نکلی اور تیزی سے بہنوں کے ساتھ بھاگ گئی۔ شہروز کمال سبرینہ کو دیکھ رہا تھا۔

"حبہ اب بچی نہیں رہی' بڑی ہو رہی ہے' دھیان رکھا کرو اس کا۔۔۔"

"حد ہوتی ہے شہروز۔۔۔ حبہ ابھی صرف بارہ سال کی ہے اور تم کس قسم کی سوچ رکھتے ہو؟" شہروز نے شعلہ بار نگاہ اٹھائی۔

"بارہ سال کی کیا چھوٹی بچی ہوتی ہے۔۔۔ تمہارے جیسی مائیں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے باپ ذلیل ہو جاتے ہیں۔۔۔ بہرحال میں نے ایک فی میل ٹیوٹر کا بندوبست کیا ہے' شاید اگلے ہفتے سے آجائے' تم دیکھ لینا۔۔۔ تب شاید میں یہاں نہ ہوں' دس پندرہ دن کے لیے دبئی جا رہا ہوں۔"

"دس پندرہ دن کے لیے۔۔۔ کیوں؟" اس کے استفسار پر وہ چڑ کر بولا۔

"شادی کرنے۔۔۔ کیوں اعتراض ہے؟" اس نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے اپنا موبائل اٹھایا اور زینے کی جانب بڑھا تھا۔ وہ نگاہوں کا رخ پھیرتی اس کی پشت کو دیکھتے سوچتی رہی۔

"مجھے اتنی حیثیت نصیب کہاں ہوئی کہ اعتراض کر سکوں' لڑ سکوں' جھگڑ سکوں ہر بار امید پھر رسوائی۔" اس نے درد سے سانس کھینچی "اب ایک ڈیڑھ ماہ بعد جانے میرے نصیب میں کیا لکھا جائے گا۔ کس طرح وقت کی گردش کو روک دوں۔"

☆ ☆ ☆

میرزا کاٹی وی لاؤنج میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ آئمہ بھی ان کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ وہ کئی دنوں سے بہت پریشان تھیں۔ اتنی بڑی خبر ان سے اب تک چھپی ہوئی ہے' شاید انہوں نے یہ سب جان بوجھ کر نہیں کرنا چاہا تھا گھر کے حالات ہی اس طرح کے ہو گئے تھے۔ جب ملاقات ہوتی زیر بحث حنبل کا مسئلہ ہوتا اور اول تو وہ گھر پر ملتے ہی کم کم تھے آج کل وہ بڑے الیکشن کی تیاری میں لگے ہوئے تھے جس کی وجہ سے

زیادہ وقت تو باہر ہی گزر جاتا تھا۔ پھر خیام بھی یہاں نہیں تھے جنہیں بتا کر آسانی ہو جاتی۔ آج انہیں صحیح معنوں میں اپنی ساس یاد آئیں۔ وہ خود جیسے مرضی بتاتیں۔

آئمہ نے بہت ناپ تول کر لفظوں میں بتایا تو انہوں نے چونک کر دیکھا تھا۔ عینک اتار کر ہاتھ میں پکڑی 'منہ خوشگوار تحیر سے کھلا تھا۔

"اچھا!" کچھ دیر بعد منہ سے نکلا۔ "مجھے تو کسی نے نہیں بتایا کمال ہے حنبل نے بھی ذکر نہیں کیا۔"

"اسے خود نہیں پتا۔" سنتے ہی میرزا کے چہرے پر سراسیمگی کا عالم تھا۔

"کیا مطلب... اسے نہیں پتا... کیوں نہیں پتا اسے...؟" آئمہ نے سوچتے ہوئے بات شروع کی تھی۔

"باباجان مجھے خود ذرا دیر سے پتا چلا تھا۔ ساتھ ہی حنبل والا قصہ چھڑ گیا' پھر ازلان کے بابا بھی یہاں نہیں تھے کہ انہیں بتاتی' مسئلے کے حل ہونے کو ہی آج کل کرتے مہینے گزر گئے پتا ہی نہیں چلا۔"

"کمال ہے۔" انہیں اپنی لاپروائی پر حیرت تھی۔

"کہاں ہے روائیبہ بلاؤ اسے۔" آئمہ نے زینب کو آواز دے کر کہا تھا۔

"چھوٹی بی بی سے کہو بابا جان بلا رہے ہیں۔" وہ سر ہلا کر روائیبہ کے کمرے کی جانب بڑھی تھی۔ میرزا کا چہرے پر نرم مسکراہٹ پھیلائے کسی سوچ میں غرق تھے۔ انہیں حیرت سی حیرت تھی اپنے گھر کے معاملات سے وہ اس قدر لاتعلق ہیں' جندب والے واقعے کے بعد حقیقتاً" وہ کئی دن اس سے خفا رہے۔ وہ بھی کتراتی رہی پھر یہ روٹین ہی بن گئی۔ سرسری سی ملاقات ہوتی۔ باہر کے معاملات ہی اتنا الجھا دیتے تھے۔ گھر والوں پر اتنی باریکی سے دھیان ہی نہیں گیا' اتنی سی دیر میں انہوں نے یہ فیصلہ بھی کرلیا تھا۔ اگر تو بیٹا ہو' جو کہ ہو گا' کیوں ان کے اپنے ہاں پہلے بیٹا خیام ہوا تھا' خیام کے ہاں ازلان اور وہ خود بھی تو پلوٹھی کے تھے تو اتنا تو سو فیصد یقین تھا کہ بیٹا ہی ہو گا۔ اس کا نام وہ ازمیر رکھیں گے' اسی خواہش سے ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "اللہ مجھ سے ازمیر لے کر بہت جلد دوسرا ازمیر دینے والا ہے۔"

میرزا کی مسلسل خاموشی پر آئمہ خفت سے سرخ پڑ رہی تھیں ان کے نہ بتانے کو بابا جان جانے کن معنوں میں لے رہے ہیں۔ انہوں نے پھر سے بات شروع کی تھی۔

"بابا جان حنبل کو آپ خود ہی بتا دیں' میرے بتانے پر تو شاید غصہ ہی کرے دیر سے کیوں بتایا ہے۔" میرزا کھل کر مسکرائے تھے۔

"وہ اب اسے کیا بتانا' چند دن میں وہ خود آنے والا ہے' آکر دیکھ لے گا۔"

سنتے ہی آئمہ اچھی خاصی چونکی سوچونکی تھیں۔ لابی کراس کر کے ان کی سمت بڑھتی روائیبہ ساکت سی ہو گئی تھی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ خوشگوار حیرت سے آواز اندر ہی گھٹ گئی بہت سے آنسوؤں نے حلق جکڑ لیا تھا۔ اس وقت حنبل کی آمد تپتے خاردار جاڑوں میں کوئی نرم ٹھنڈے سائبان سی لگی۔ اپنی بے قرار کیفیت کو بمشکل قابو کرتے گھٹی آواز میں بولی تھی۔

"جا جا... حنبل' حنبل آرہا ہے!" میرزا کا نے گردن پھیر کر اس کی جانب دیکھا۔ ایک بار پھر شرمساری نے آگھیرا۔ کتنے مہینوں کے بعد آج اسے غور سے دیکھا تھا۔ اس میں اچھی خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ حنبل جاتے ہوئے خاص طور پر اس کا خیال رکھنے کو کہہ گیا تھا۔ خیال تو در کنار انہیں اس کی کیفیت تک کا اندازہ نہ ہو سکا۔ وہ صرف ان کی بہو تو نہیں تھی بیٹی کا رشتہ بھی تھا۔ بے یقین سی خوشی میں اس کا بھیگتا سرخ چہرہ مسلسل تصدیق چاہ رہا تھا۔

"آپ کہہ رہے تھے' حنبل آرہا ہے۔" میرزا کا نے اس کی طرف ہاتھ پھیلاتے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"ہاں... ادھر آؤ تم میرے پاس۔" اس کا سارا بدن اندر سے لرز رہا تھا۔ جیسے اسے بالکل یقین نہ ہو حنبل کبھی آسکتا ہے۔ سستی سے چلتی ان کے قریب بیٹھ

گئی انہوں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ پھیلاتے اسے تحفظ کا احساس دلایا۔

"تمہیں یقین نہیں آرہا کہ وہ آرہا ہے... اس طرح کے چھوٹے موٹے مسئلے ہوتے رہتے ہیں اور تمہیں پریشان ہونی کی کیا ضرورت ہے۔" روائیبہ نے ان کے کندھے پر سر ٹیک لیا پانی خود بخود پلکوں سے ٹوٹنے لگا۔

"اور تم نے اس گدھے کو بتایا نہیں، پہلے ہی میرا باپ بنا رہتا ہے، اب آکر جانے کتنا لڑے گا مجھ سے..." انہوں نے اس کا موڈ بدلنے کے لیے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی وہ آنسوؤں کے بیچ میں مسکرا دی۔ میرز کا اتنے خوش تھے ان کا بس نہیں چل رہا تھا پورے گاؤں میں آج ہی مٹھائی بانٹ دیں۔ آئمہ کے چہرے سے بھی خوشی جھانک رہی تھی۔ انہوں نے ظہیر تقی کا پوچھا تھا۔

"اور وہ منحوس مل گیا، جس کی وجہ سے ساری مشکل پڑی تھی۔"

"کیسے نا ملتا، اس کے باپ کو بھی اگلے ڈھونڈ نکالتے... فورس کا بندہ مارا تھا کوئی آسان بات تھی چھپنا، اگلے زمین کی تہوں سے اسے نکالنے کے لیے پھر رہے تھے۔"

روائیبہ کو ان کی بات سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ صرف گزرے دنوں کا حساب لگا رہی تھی۔ میرز کا نے کہا تھا۔ "حنبل سیٹ کنفرم کروا رہا ہے، چند دن تک پہنچ جائے گا۔" وہ چند دن کی بات کر رہے تھے اور روائیبہ کی کیفیت ایسے بدل رہی تھی اس سے چند پل کاٹنا دشوار ہو گئے۔ بس کسی طرح اسے اڑا کر لے آئے۔

وہ رات اور پھر اگلا دن اس نے بہت مشکل سے کاٹا تھا۔ اپنا دھیان بٹانے کو کبھی لان میں نکل کر بیٹھ جاتی، کبھی صحن میں واک شروع کر دیتی۔ نظر بار بار کلاک کی سوئیوں پر اٹھتی اور دل اس کی ٹک ٹک کے ساتھ دھڑکتا۔ اپنی زندگی کے بہت طویل لمحے لگے تھے اسے۔ جو قیامت کے لمبے دن کی طرح اڑ کر کھڑے ہو گئے ہوں۔ سرکنے کا نام نہ لیں۔

حنبل نے اپنے بیڈ پر چیزوں کا انبار لگا رکھا۔ ایک ایک چیز کی ترتیب لگاتا سوٹ کیس میں جما رہا تھا۔ چہرے پر طویل جدائی کے بعد محبت کا نرم تاثر پھیلا تھا۔ اپنا سامان رکھنے کے بعد جو چیزیں روائیبہ کے لیے رکھی تھیں وہ رکھنی شروع کیں پھر یاقوت کا دھیان آیا فوراً" الماری کا دراز کھول کر کرسٹل کی ڈبیا نکال لی۔ اسے رکھنے کے لیے سوٹ کیس کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اس کا موبائل روشن ہوتے ہی تھرکنے لگا۔ عام دنوں میں اس کی طرف سے آئی کال سے زیادہ آج کی کال دل کو کھینچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے کھل کر مسکراتے ہوئے فون اٹینڈ کیا تھا۔

"ہیلو..." حنبل کی گمبھیر آواز میں خمار اترا تھا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام! مائی ڈیر کیسی ہو... اور آج کہاں سے یاد آگیا؟"

"میں نے تو یاد کر بھی لیا، تمہیں اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی۔" بے ساختہ امڈ کر آتے قہقہے کو اس نے روکا اور معصوم آواز بنا کر بولا تھا۔

"میں روٹی روزی کمانے میں دربدر پھرتا مزدور آدمی، مجھے کہاں اتنی فرصت بیٹھ کر پرانی چیزوں کو یاد کروں۔"

"اچھا..." وہ مصنوعی خفگی سے پکاری۔ "میں اب پرانی چیز ہوں، جسے یاد نہیں کیا جا سکتا۔"

"بالکل..." وہ گرنے کے انداز میں بیڈ پر نیم دراز ہوا اس کا بکھرا سامان اس کے نیچے تھا۔ کرسٹل کی ڈبیا انگوٹھا پش کر کے کھول لی۔

"میں تو سوچ رہا ہوں، ان جرمنیوں نے میری جان تو چھوڑنی نہیں، کیوں نہ کوئی نئی ادھر ہی ڈھونڈ لوں... بازاری کھانوں سے تنگ آگیا ہوں۔ یار..." اس کی جانب سے کسی سخت سے جواب کی امید لیے اپنی ہنسی دباتا آہستہ آہستہ ٹانگیں ہلا رہا تھا۔

"پھر ملی کوئی...؟" روائیبہ نے بھی جان بوجھ کر حظ

اٹھایا تھا۔ حنبل کے ہونٹ خود بخود مسکراہٹ میں پھیلنے لگے۔

"ہاں بہت سی ملیں ' لیکن کیا کروں یار ' پرانی والی ہی اتنی خوب صورت ہے 'اب اس سے کم تر پر سمجھوتہ کیسے کروں۔" اس کی نگاہ چمکتے یاقوت پر تھی تصور کی آنکھ سے وہ اسے روائیبہ کی پتلی سفید گردن میں مسکراتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ روائیبہ اپنے بیڈ پر بیٹھی بے ڈھنگے بنے گلدان کی چمکتی افشاں پر نظریں جمائے تھی۔ کچھ دیر خاموش سانسوں کی آہٹ کو محسوس کرکے وقفے کے بعد روائیبہ نے استفسار کیا تھا۔

"تم آرہے ہونا۔۔۔؟"

"تمہیں کس نے کہا۔۔۔؟"

"دل نے۔۔۔"

"اور کیا کہہ رہا ہے دل۔۔۔" "اور یہ کہ تم جلدی سے آجاؤ' بہت تنہا ہوں میں' مجھے اس وقت تمہاری شدید ضرورت ہے۔ آنے والے لمحوں سے بے پناہ خوف آرہا ہے مجھے۔" تنہائی اور کرب کا خوف اس کے گلے میں رسنے لگا۔ "مجھے تم سے بہت باتیں کرنی ہیں ' بہت کچھ بتانا ہے تمہیں حنبل' جو جانتے ہو وہ بھی' جو نہیں جانتے وہ بھی۔۔۔" کسی نے گلے میں پھندا ڈال دیا آواز گھٹتے گھٹتے بند ہوگئی۔

"کیا ہوگیا یار۔۔۔ تم تو ایسے ہو رہی ہو جیسے محاذ پر چھوڑ گیا تھا تمہیں۔۔۔ فکر نہیں کرو۔۔۔ تین دن بعد میری فلائٹ ہے اور بے فکر رہو جب دوبارہ آؤں گا تو تمہیں اپنے ساتھ لے کر آؤں گا۔ بہت تنگ کیا ہے تم نے مجھے۔۔۔" اس کے آخری جملوں نے اسے اندر تک شانت کردیا تھا۔ بس یہ تین دن گزرنے کا انتظار تھا اور دل یہ کہہ رہا تھا تین دن تو جانے کب تین پل بھی گزرنے مشکل ہیں۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت دیر گم سم بیٹھی رہی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا اب کیا کرے ' شہوز کمال دبئی تھا اور تقریباً دس دن مزید رکنے کا ارادہ تھا۔ بچیاں گھر پر چھوڑنے کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ سب سے پہلا خیال انہیں میکے چھوڑنے کا آیا یا پھر وہاں سے کسی کو بلالیا جائے ' مگر سلویٰ نے یہ مشکل آسان کردی جب اسے صورت حال کا پتا چلا تو فوراً" کہا تھا۔

"میں ان کی کچھ نہیں لگتی؟ بے فکر ہو کر ہماری طرف چھوڑ دو۔"

نقاہت' قنوطیت اور خوف نے اس کی تکلیف میں کئی گنا اضافہ کردیا تھا۔ اپنے اور بچیوں کے لیے بیگ تیار کرکے دل بے طرح مٹھی میں جکڑا تھا۔ اس وقت اسے اپنی قسمت پر شدت سے رونا اور ترس دونوں بیک وقت آرہے تھے۔ ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی نکلوائی اور بچیوں کو لے کر نکلی تھی۔ پہلے بچیوں کو سلویٰ کی طرف چھوڑنا تھا پھر اسپتال جانا تھا' لیکن ایمرجنسی میں اسے سیدھا اسپتال جانا پڑا۔ سلویٰ سے مستقل رابطے میں تھی کہ وہ کسی طرح ان چاروں کو گھر لے جانے کا بندوبست کرے۔ اس نے بہت پیار سے اس کی تسلی کی تھی۔

"اس وقت تم صرف اپنا سوچو' کیوں خواہ مخواہ میں بچیوں کی طرف سے ہلکان ہو رہی ہو۔۔۔ انہیں میں گھر لے جاؤں گی۔"

اس نے ان چاروں کو اپنے ساتھ لگاتے اثبات میں سرہلایا تھا۔ ایک بار دل میں آیا شہوز کمال کو فون پر اطلاع دے دے ' لیکن اس کی طرف سے سنائی دیے جانے والے جملے اس وقت اس میں سننے کی بالکل تاب نہیں تھی۔ صرف بار بار نگاہ ونڈ اسکرین سے نظر آتے آسمان پر جاتی اور دل تکلیف کے ساتھ دھڑکن بڑھا دیتا۔

☆ ☆ ☆

اپنا سامان گھسیٹتا وہ ایرپورٹ میں داخل ہوگیا تھا۔ اناؤنسمنٹ گونجنے کے وقت اس نے پاکستان کال ملائی تھی۔ روائیبہ کا موبائل بند جا رہا تھا اور لینڈ لائن پر مسلسل بیل جاتی رہی۔ کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ خیام ذکا سے ملتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"آپ گھر اطلاع دے دینا۔" اللہ حافظ کہہ کر وہ ڈپارچر کی سمت بڑھتا گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆ ☆

شبانہ شوکت

بہار آنے تک

''جیو میری بیٹی'' فضا چائے کے ساتھ لوازمات کی ٹرے اندر لے کر آئی تو فہیم چاچو نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا تھا۔ اسے اپنے ساتھ لگا کر ماتھا چوما اور پاس بٹھالیا۔ ''یہاں میرے پاس بیٹھو اور اب بتاؤ آگے کیا ارادے ہیں؟''

''بس گھر کے کام چاچو اور کیا کرنا ہے۔'' وہ آہستہ سے منمنائی تھی۔ وہ اچھل پڑے تھے۔

''گھر کے کام' کیا مطلب' آگے نہیں پڑھنا' یہ جو اتنا اچھا میٹرک کا رزلٹ آیا ہے' اس کا کیا؟ لپیٹ کر رکھ دو گی سب پڑھے لکھے کو؟'' فضا نے سر جھکا لیا۔ کیا کہتی' اسے تو پہلے ہی پتا تھا کہ وہ میٹرک ہی کرلے تو بڑی بات ہے۔ اس سے آگے تو گاؤں میں پڑھائی کا تصور بھی نہیں تھا۔ سو وہ بھی امتحانوں کے بعد خاموشی سے گھر کے کاموں میں حصہ لینے لگ گئی تھی۔

''نا فہیم! اب بہت ہے' جتنا اس نے پڑھ لیا ہے' وہی کافی ہے' پھر یہاں کالج بھی نہیں ہے تو پڑھا بھی کہاں سکتے ہیں۔'' نصرت (فضا کی امی) نے کہا۔

''بالکل بھی کافی نہیں ہے اور یہاں نہیں ہے کالج تو کیا ہوا' شہر میں تو ہے نا' میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا' وہاں پڑھ لے گی' اتنے اچھے نمبر لائی ہے یہ میٹرک میں' اس سے اس کی پڑھائی میں لگن ظاہر ہوتی ہے' آپ کو تو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے نہ کہ گھر بٹھادیں۔'' فہیم نے جذباتی ہو کر کہا۔

''نہیں فہیم' پڑھ لکھ کر لڑکیوں کے دماغ بہت خراب ہو جاتے ہیں' ماں باپ کو تو اپنے آگے کچھ سمجھتی ہی نہیں ہیں' پھر خاندان' برادری میں لڑکے بھی اتنے پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ اس سے کل کو اس کی شادی کرنے میں بھی بڑا مسئلہ بنے گا۔ اس لیے بس یہی ٹھیک ہے۔'' وہ بھی ضد کی پکی تھیں' اپنی بات سے ہٹنے کو ہرگز تیار نہیں تھیں۔ فہیم زچ ہو گئے۔

''بھابھی جی' آپ خود ایک عورت ہو کر اس کی مخالفت کر رہی ہیں' اچھی سوچ رکھیں' بچی میں صلاحیت ہے تو اسے آگے پڑھنے دیں' آپ فی الحال اسے گیارہویں' بارہویں تو پڑھنے دیں نا' آگے کی بعد میں دیکھی جائے گی۔''

''چل فہیم کی بات ہی رکھ لے' اب اتنا کہہ رہا ہے وہ تو۔'' نعیم (فضا کے والد) دل میں بیٹی کی ذہانت کی قدر کرتے تھے مگر پھر برادری کا سوچ کر خاموش ہو گئے تھے اب فہیم کی حمایت پا کر وہ بھی بول ہی اٹھے تھے۔

''مگر آپ سوچیں تو سہی' ساری برادری کے لڑکے' لڑکیاں دس' دس پڑھ کر گھر بیٹھ گئے اور یہ آگے پڑھ پڑھ کر پتا نہیں کیا بنے گی' پھر رشتہ ملنا اور شادی کرنا مسئلہ ہی نہ بن جائے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہوگا بھابھی' میں ذمہ لیتا ہوں اس کا۔''

''مرضی ہے آپ کی' کل یہ نہ کہنا کہ ہاتھوں سے نکل گئی ہے' میں ذمے دار نہیں ہوں گی۔''

فہیم نے اٹھ کر بھابھی کے گھٹنے چھوئے۔

''بہت شکریہ بھابھی آپ نے میری بات مان کر مجھ پر احسان کر دیا ہے۔'' نصرت نے ان کے شانے پر

چھکی دی اور مسکرادیں اور فضا' اسے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ چاچو نے امی ابو کو راضی کرلیا ہے' وہ بھی آگے پڑھ سکتی ہے' وہ بھی کالج جاسکتی ہے دوسری بہت سی لڑکیوں کی طرح' جب وہ میٹرک میں تھی تو اپنے آپ کو خوابوں میں کالج میں پڑھتا ہوا دیکھتی تھی اور صبح اٹھ کر ایک حسرت سے سوچتی کہ کاش وہ اسی خواب میں رہ جاتی' خواب یوں بھی حقیقت بنتے ہیں' اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

✡ ✡ ✡

"وے سلمان' او تو نے کچھ کرنا بھی ہے یا یوں ہی گھومتے ہی رہنا ہے۔" سلمان دوستوں کے ساتھ کھیل کود کر تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ اماں شروع ہوگئیں' وہ جی بھر کر بدمزا ہوا تھا۔

"سانس تو لینے دیا کر اماں تو تو شروع ہی ہو جاتی ہے۔"

"نہ تو تیرا ابا جو مجھے دن رات اتنی باتیں سناتا ہے کہ تو ایک ویلا' نکما لڑکا ہے' تو نے کچھ وی نہیں کرنا تو میں



کیا جواب دیا کروں اس کو۔"

"کر لوں گا کچھ نہ کچھ جب ٹائم آئے گا' ابا سے تو بہتر ہی کوئی کام کروں گا۔" اس کے ابا سبزی منڈی میں آڑھتی تھے۔

"بلے بھئی بلے' سوچ تو بڑی اونچی ہے تیری میں تو خود دیکھنا چاہتا ہوں کہ تو کرتا کیا ہے' تو پہلے کچھ کر تو سہی' بہتر یا بدتر کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا۔"

کیا انسلٹ ماری تھی ابا نے' اور بات بھی وہی ان کے کانوں سے ٹکرائی جو ان کی حیثیت کو چیلنج کر رہی تھی' سلمان کے تو اوسان خطا ہو گئے تھے۔

"میں تو اصل میں یہ۔۔۔ یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں جو کام کروں گا' اچھا ہی کروں گا۔"

"ہاں ہاں وہی تو کہہ رہا ہوں' تو شروع تو کر اپنا اچھا کام' کچھ کرتا تو نظر آ مجھے۔" اس نے بڑے تحمل سے ان کا طنز ہضم کیا۔

"بغیر پیسوں کے تو کوئی کام شروع نہیں کیا جا سکتا۔" ابا تو بھڑک اٹھے تھے۔

"شاوا' اب میں پیسے بھی دوں اس نکمے ویلے کو' تاکہ اپنے یار دوستوں کے ساتھ اڑا آئے اور پھر سے ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ جائے' تو میرے ساتھ چل سیدھی طرح کام سیکھ' کچھ میرا بھی بوجھ ہلکا ہو۔"

"یہ کام تو میں کبھی نہیں کرنے والا۔"

"اور پیسے تو تجھے میں کبھی بھی نہیں دینے والا تو یہ کمی کمینوں والے کام نہیں کرے گا تو بغیر پڑھے لکھے' بغیر کسی ہنر کے لاٹ صاحب بن کے کرسی پر بیٹھے گا اور نوکر تیرے آگے پیچھے پھریں گے' باہر آ اپنے خوابوں سے شیخ چلی کی اولاد۔" اب تو ابا صحیح معنوں میں مشتعل ہوئے تھے' سلمان نے خاموشی سے اندر کھسک جانے میں ہی عافیت جانی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اللہ فضا تو شہر جا کر پڑھے گی' کتنی خوش نصیب ہے تو اور ایک ہم دونوں ہیں' میٹرک بھی منتیں کر کر کے کیا۔" فضا کی دونوں بڑی بہنیں جو پاس ہی کے گاؤں میں بیاہی ہوئی تھیں' آج میکے آئیں تو فضا کے کالج جانے کا سن کر مارے حیرت کے بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئیں' فضا ہنس پڑی۔

"بس دیکھ لو۔"

"تمہارے چاچو نے یہ سارا سیاپا ڈالا ہے ورنہ مجھے تو کڑی کو شہر بھیج کر پڑھانے والی بات ایک آنکھ نہیں بھائی۔" نصرت ابھی بھی ناخوش تھیں' فہیم کو شروع سے ہی زمین داری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ ہاسٹلز میں رہ رہ کر پڑھے اور وہیں جاب کر لی' پھر ایک دوست کے اشتراک سے بزنس شروع کیا تو اس میں کامیابی ملی تو انہوں نے نوکری چھوڑ کر سارا دھیان بزنس پر لگا دیا' اسی دوست کی بہن سے شادی بھی کر لی' اب ان کے دو ہی بیٹے تھے' جو ابھی اسکول میں پڑھ رہے تھے' انہیں وقتاً" فوقتاً" فضا کے بارے میں پتا چلتا رہتا تھا کہ اس کی تعلیمی پروگریس بہت اچھی ہے' اس لیے انہوں نے اس کی خاطر اسٹینڈ لیا تھا۔

"تمہارا دل لگ جائے گا' چاچو کے گھر میں؟"

"میں کون سا کسی کو تنگ کروں گی یا خواہ مخواہ کسی سے کوئی امید باندھوں گی' بس اپنی پڑھائی کروں گی اور بس۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"نہیں میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ رہنے کے لیے جاؤ گی تو اتنے دنوں میں تمہارا دل گھبرا نہیں جائے گا۔"

"کیا پتا' یہ تو جاؤں گی' رہوں گی تو ہی پتا چلے گا نا۔"

"ہاں یہ تو ہے' چلو اللہ کرے تم وہاں خوش رہ کر پڑھ لو' کوئی تو ہم میں بھی پڑھا لکھا ہو گا نا۔"

"ان شاء اللہ' رحیم اور عظیم بھی پڑھیں گے' ان کے لیے بھی دعا کرنا۔" فضا نے بہنوں کے خلوص سے متاثر ہو کر دعا کی درخواست کی تھی۔

"ہاں ضرور' اللہ ہمارے دونوں بھائیوں کے دلوں میں بھی تمہاری طرح علم کی طلب جگائے اور وہ کچھ بن جائیں۔"

☆ ☆ ☆

"[illegible] سلمان' میٹرک تو نے جیسے رو رو کر کیا ہے' وہ

میں جانتا ہوں اور اب سنیعہ کے ماں باپ اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں اور تو کچھ کرتا ہی نہیں ہے اور نہ ہی کرنے پر راضی ہے' پھر کس طرح ہم ان سے تاریخ مانگنے جائیں؟" ابا بڑے رسان سے بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سنیعہ اس کی پھپھی زاد اور بچپن کی منگ تھی اور ان کے یہاں بہت کم عمری میں شادی کرنے کا رواج تھا۔ اب وہ بھی بمشکل دس پاس کر کے فارغ تھی تو ماں باپ کی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنی ذمہ داری سے فارغ ہولیں انہوں نے اشاروں' اشاروں میں سلطان (سلمان کے ابا) کے کانوں میں یہ بات ڈال دی تھی کہ اب وعدہ پورا کرنے کا وقت آگیا ہے پر ابا کیا کرتے' سلمان کچھ کرتا تو وہ اس کی شادی کا سوچتے نا' اور سلمان کا کچھ کرنا ہی تو سب سے بڑا مسئلہ بنا ہوا تھا' وہ جانے کون سے خوابوں میں تھا' کیا کرنا چاہتا تھا' ابا کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

"ان کو کیا جلدی پڑی ہے' ہو جائے گی شادی بھی۔"

"ہاں ہو جائے گی' بالکل ہو جائے گی' جیسے تیرا کام ہو رہا ہے ایسے شادی بھی ہو جائے گی۔" ابا کے طنز پر اس کا موڈ اور خراب ہو گیا۔

"روپیہ' پیسا آپ نہیں دیتے' کوئی کام سیکھنے کے لیے بھی پیسا چاہیے اور نیا کاروبار کرنے کے لیے بھی' مگر آپ نہیں مانتے تو میں کروں تو کیا کروں۔"

"نہ تو سیکھنا کیا چاہتا ہے' پہلے یہ بتا۔" ابا کے رسان سے پوچھنے پر وہ کھل اٹھا تھا۔

"میں اپنے دوستوں سے مشورہ کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔"

"اچھا؟ تیرے "دانشور" دوست تجھے کیا مشورہ دیں گے' جو خود سارے گاؤں میں لور لور پھرتے ہیں' وہ تجھے مشورہ دیں گے' وہ یہی کہیں گے کہ کوئی کھانے پینے کی دکان کھول لے' جہاں وہ سارا دن دعوت اڑاتے رہیں۔" ابا تو پھٹ پڑے تھے' سلمان تو ابا کے اتنے صحیح اندازے پر دنگ رہ گیا تھا' کل ہی تو اسے ساجد' جمال اور تنویر نے کہا تھا کہ چھوٹا سا جنرل اسٹور کھول لے' ٹھنڈی بوتلیں اور آئس کریم بھی رکھ لینا' خوب بکری ہو گی اور ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔" جواب میں سلمان نے ان سے اجتماعی دعا کروائی تھی کہ بس ابا مان جائیں پھر سب دوست مل کر عیش کریں گے۔ اب اسے لگ رہا تھا کہ اس نے ابا مان جائیں نہیں بلکہ ابا جان جائیں کی دعا کروائی تھی۔

"اب یوں کیا ٹکر ٹکر دیکھ رہا ہے' صاف بات کر کیا ارادہ ہے' میں نے نجمہ کو جواب بھی دینا ہے۔"

"آپ مجھے جنرل اسٹور کھول دیں' صاف ستھرا کام ہے۔"

"دیکھا' دیکھا میں نے کہا تھا نا کہ کھانے پینے کی چیزوں کی دکان کھولے گا اور سارے آوارہ دوستوں کو ایک جگہ بیٹھنے کا ٹھکانا مل جائے گا' میں تجھے ایک روپیہ نہیں دینے والا' کان کھول کر سن لے اچھی طرح' ابا شدید اشتعال کی لپیٹ میں آگئے تھے۔

"تو دوسرا کوئی کام میں بھی نہیں کروں گا۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولا تو وہ مزید مشتعل ہوئے تھے۔

"تو اب تو فارغ بیٹھ کر روٹیاں بھی نہیں توڑے گا۔ نکل پھوٹ یہاں سے' میرے گھر میں تیرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے' خبردار جو تو نے اسے روکنے کی کوشش کی۔" توپوں کا رخ اماں کی طرف مڑ گیا جو تڑپ کر اٹھی تھیں اتنی دیر سے خاموش تماشائی بنی ہوئی تھیں پر اب بول پڑیں۔

"ہائے سلمان کے ابا' ایسے کہتے ہیں جوان اولاد کو' کچھ تو خیال کریں۔"

"بہت خیال کر لیا میں نے' اب اور نہیں' یہ ایسے نہیں سدھرنے والا' در' در دھکے کھائے گا تو ہی عقل آئے گی۔" ان کے منہ سے کف اڑنے لگا تھا۔ سلمان ہکا بکا ان کی شکل دیکھ رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو۔ ایک فیصلہ کرو' کل میرے ساتھ چلنا ہے یا نہیں' اگر چلنا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ جہاں سینگ سمائیں' چلے جاؤ۔" اس کا جوان خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا تھا۔

"مجھے آپ کا کام نہیں کرنا' نہ آج نہ آئندہ کبھی۔"

"تو بس پھر فیصلہ ہوگیا' تو یہاں نہیں رہ سکتا' نکل میرے گھر سے جہاں جانا ہے چلا جا۔" سلمان ایک دم مڑا اور باہر جانے کے لیے قدم اٹھائے کہ اس کی بہن سحر دوڑتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

"نہیں بھائی' نہیں' آپ نہیں جانا۔" اس کی ماں' اس کے ابا کی منتیں کر رہی تھی کہ وہ ایسا نہ کریں' وہ کہاں جائے گا پر ابا آج کسی کے سننے والے نہیں تھے انہوں نے طیش میں آکر اماں کو اندر کی طرف دھکیلا۔

"جاؤ اندر ورنہ میں تمہیں بھی اسی کے ساتھ روانہ کردوں گا۔" بس اس سے زیادہ سلمان نہیں سن سکتا تھا' وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ پیچھے سے اماں اور سحر بری طرح رو رہی تھیں' اس کے چھوٹے بھائی عمران اور نعمان سہمے ہوئے چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے' ابا انہیں یوں ہی روتا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔



"آجاؤ فضا بیٹا جلدی کرو' دیر ہو رہی ہے۔" فہیم چاچو کی آواز پر وہ تیزی سے باہر آئی تھی۔ گاڑی میں آ بیٹھی' میشم اور حیشم پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ چاچو تینوں کو اسکول' کالج ڈراپ کرکے اپنے آفس چلے جاتے تھے' واپس وہ وین میں آتی تھی۔ عنیزہ چچی بھی بہت اچھی عادت کی تھیں۔ چاچو نے ہی اس کے لیے کالج منتخب کیا تھا اور وین بھی لگوادی تھی۔ تاکہ اسے کہیں کوئی پرابلم نہ ہو۔ وہ بہت سکون سے کالج جانا شروع کرچکی تھی۔ اسے اکیڈمی جوائن کرنے کے لیے کہا تھا' تاکہ وہ مزید بہتر پڑھائی کرسکے۔ اکیڈمی میں ایڈمشن لینے سے یہ فائدہ ہوا کہ اسے اپنا مغز کھپانے کے بجائے سب آسانی سے سمجھ آنے لگا تھا۔ عنیزہ چاچی اسے اپنے ساتھ لے کر بازار گئیں اور کچھ ریڈی میڈ سوٹوں کے علاوہ' ان سلے کافی سارے کپڑے لے آئیں' جوتے' ہینڈ بیگز اور بہت سی دوسری اشیاء وہ شرمندہ ہوتی رہی' مگر انہوں نے پیار سے سمجھایا کہ کالج جانے کے لیے تو یونیفارم چل جائے گی' مگر اکیڈمی کے لیے اسے جدید لباس کی ضرورت پڑے گی۔ فضا تو گاؤں کے سلے ہوئے سیدھے سادے کپڑے لائی تھی' چاچی نے جتائے بغیر اسے بہت اچھے اور فیشن کے مطابق کپڑے لے دیے تھے۔



صبح کی سفیدی دیواروں پر اتر آئی تھی۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں' مرغیاں کٹ کٹ کرتی یہاں وہاں اڑتی پھر رہی تھیں۔ اس وقت اماں چاٹی میں لسی بلو رہی ہوتی تھیں اور سحر ناشتے کے لیے کوئلوں والی انگیٹھی جلا رہی تھی۔ ابا سبزی منڈی جانے کے لیے نماز پڑھ کر ناشتا کرتے اور چلے جاتے' مگر آج چاٹی میں دہی اسی طرح پڑا تھا اور انگیٹھی ٹھنڈی پڑی تھی' ماں' بیٹی ساری رات رو' رو کر نڈھال سی سامنے برآمدے میں پڑے تخت پر بیٹھی تھیں' سوجی آنکھوں اور بکھرے بالوں کے ساتھ۔

"کیا آج ناشتا نہیں ملے گا۔" ابا نے مسجد سے آکر انہیں یوں ہی بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔ سحر جلدی سے اٹھی۔

"بناتی ہوں ابا۔"

"رہنے دو' مجھے بہت دیر ہوجائے گی' وہیں کرلوں گا۔"

"سلمان کے ابا' وہ ساری رات نہیں آیا' پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ اسے ڈھونڈ کرلادیں' دیکھیں آپ کو اللہ کا واسطہ۔" اماں نے دونوں ہاتھ ان کے آگے جوڑ دیے' رکے ہوئے آنسو پھر سے بہنے لگے تھے۔

"کہیں نہیں جانے والا' ادھر ادھر دو چار دن دھکے کھائے گا تو خود ہی گھر واپس آجائے گا' ابھی پھرنے دے اسے' دکھانے دے نخرا۔" ابا تو اکھڑ لہجے میں کہہ کر گھر سے نکل گئے پر اماں کے آنسوؤں کی روانی میں اور تیزی آگئی تھی۔ دوپہر تک وہ رو' رو کر نڈھال ہوگئیں۔ عمران ہاتھ میں فون لیے اماں کو ڈھونڈتا ہوا

ان کے پاس پہنچا۔
"اماں دلاور ماموں کا فون ہے۔" اس نے فون ان کی طرف بڑھایا' اماں نے اس سے فون لے کر کان سے لگالیا۔
"ہیلو۔۔۔"
"السلام علیکم آپا' کیسی ہیں آپ؟"
"شکر ہے تم سناؤ۔" بمشکل بول پائی تھیں اماں۔
"ہاں اللہ کا کرم ہے' وہ آپا سلمان کل سے یہاں میرے پاس آیا ہوا ہے۔ میں نے کہا آپ کو بتادوں۔ آپ پریشان نہ ہورہی ہوں۔" اف ٹھنڈی پھوار میں بھگودیا تھا دلاور ماموں نے اماں کے جلتے دل و دماغ کو۔
"ابھی ذرا غصے میں ہے' ٹھنڈا ہو تو میں اسے سمجھا بجھا کر گھر بھجوادوں گا' آپ پریشان نہ ہوں۔"
"ہاں بس اس کا خیال رکھنا۔"
"آپ فکر ہی نہ کریں۔" اماں کے وجود میں پھرتی دوڑ گئی۔
"سحر۔۔۔ سحر اٹھ جلدی کر' کھانا بنائیں' بڑی دیر ہوگئی ہے۔" وہ چہکتی ہوئیں سحر کو پکارنے لگیں' جسے عمران ساری صورت حال بتا چکا تھا' وہ خوشی سے مسکراتی ہوئی۔ اماں سے لپٹ گئی' وہ خوف جس نے رات بھر سونے نہیں دیا تھا' وہ ہواؤں میں تحلیل ہوگیا تھا' سلمان کی خیریت کی خبر پاکر وہ سب کھلکھلا اٹھے تھے۔

☼ ☼ ☼

ماموں کے گھر سلمان کی بہت آؤ بھگت ہورہی تھی۔ اصل میں ماموں کو ڈر تھا کہ وہ ان سے بھی برگشتہ ہوکر کہیں اور نہ چلا جائے تو وہ اور ممانی ہی نہیں ان کے بچے بھی اس کا بہت زیادہ خیال رکھ رہے تھے۔ کچھ سلمان کا بھی دل لگ گیا تھا۔ ابا کی ڈانٹ پھٹکار اور طعن و تشنیع سے کچھ تو جان چھوٹی تھی' ماموں کی آٹو ورکشاپ تھی۔ جس میں گاڑیوں کے پرزے بنتے تھے' ان کی اچھی خاصی آمدنی تھی' بہت سے ملازم تھے۔ سلمان نے ان سے یہ کام سیکھنے کی اجازت مانگی تو ماموں خوش ہوگئے۔
"واہ جوان دل خوش کردیا ہے' مگر اس کے لیے ایک شرط ہوگی۔" سلمان نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔
"صبح تم اپنی پڑھائی کروگے اور شام کو کام سیکھو گے۔"
"نہیں ماموں' پڑھائی میرے بس کی نہیں ہے' آپ مجھے کام سیکھنے دیں' میں دراصل باہر جانا چاہتا ہوں۔"
"باہر؟" وہ چونک گئے۔ "باہر کس جگہ؟"
"مڈل ایسٹ کے کسی بھی ملک دبئی' کویت' قطر۔"
"پھر تمہارے لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ تم کسی اچھے انسٹی ٹیوٹ سے کورسز کرلو' ان کے سرٹیفکیٹ بھی ملیں گے اور ہنر بھی آجائے گا۔" اسے ماموں کی تجویز پسند تو آئی' مگر وہ پیسوں کی وجہ سے ہچکچا رہا تھا' لیکن ماموں نے اسے اپنے ایک دوست کے توسط سے ایک ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخل کروادیا۔ وہاں اس نے موٹر میکینک کا کورس کیا۔ چھ ماہ بعد یہ کورس ختم ہوا تو آٹو الیکٹریشن کا کورس کرلیا۔ ساتھ ہی شام میں وہ ماموں کی ورکشاپ پر بھی جارہا تھا۔ ماموں خود بھی اماں سے رابطے میں تھے اور اس کی بات بھی کروادیتے تھے۔ اماں تو اماں' ابا بھی مطمئن تھے کہ وہ کسی کام سے تو لگا تھا۔ ایک سال بعد وہ کویت چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

فضا نے انٹرمیڈیٹ بہت زیادہ مارکس کے ساتھ پاس کیا تھا۔ اتنے نمبر کہ وہ باآسانی میڈیکل میں جاسکتی تھی۔ لیکن مسئلہ وہی امی' ابو کو راضی کرنے والا' بہت مشکل تھا انہیں منانا' وہ ہرگز اتنے لمبے انتظار کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے' اس کے ساتھ کی تو ساری کڑیاں بیاہی گئی ہیں' مجھے تو ابھی اس کا کوئی جوڑ ملتا نہیں دکھائی دیتا' پانچ سال بعد تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' اب بس اس کا رشتہ ڈھونڈ کر اس کی شادی کردینی ہے ہم نے' اب اس کا آگے پڑھنا ممکن نہیں ہے۔

چاچو ہی اس بار بھی حمایت کے لیے میدان میں اترے تھے۔
"آپ ایک کام کریں بھابھی' اس کے لیے رشتہ ڈھونڈیں' جب تک یہ آگے پڑھتی رہے' جب کوئی اچھا رشتہ مل گیا۔ آپ اس کی شادی کردیجئے گا' یہ پڑھائی ختم کردے گی' مگر اب رشتہ ڈھونڈنے کے لیے اسے گھر بٹھا دینا تو زیادتی ہے۔" بڑی لمبی بحث کے بعد چاچو انہیں منا لینے میں کامیاب ہوئے تھے۔ فضا کا وہ خواب کہ سفید اوور آل پہنے' وہ بھی ہاسپٹلز میں ادھر ادھر آتی جاتی دکھائی دے' وہ ایسے سچ ثابت ہو رہا تھا کہ اسے نیند آنی مشکل ہوگئی۔ اف وہ اپنے اتنے اچھے چاچو کا شکریہ کیسے ادا کرپائے گی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔



دو سال بعد سلمان اپنے والدین سے ملنے گاؤں آیا تو وہ اس کا حلیہ دیکھ کر ہی حیران پریشان رہ گئے تھے' مہنگا سوٹ' مہنگے جوتے' مہنگی گھڑی اور تو اور گھر والوں کے لیے جو تحائف لایا تھا' وہ سب کی آنکھیں خیرہ کیے دے رہے تھے۔ وہ تو ایک ماہ رہ کر چلا گیا تھا۔ پر اس کے ماں' باپ کی گردن میں سریا فٹ ہوگیا تھا' ان کا وہ بیٹا جسے وہ نکما' ناکارہ کہتے تھے وہ آج ان کی پگ اونچی کرنے کا باعث بن گیا تھا' اردگرد بسنے والے انہیں کیڑے مکوڑے لگنے لگے تھے۔ سنیعہ کے ماں' باپ جنہوں نے سنیعہ کی شادی اس کے چچازاد سے کردی تھی۔ اب اپنی جلد بازی پر ہاتھ مل رہے تھے۔



فضا نے پانچ سال خوب محنت کی اور اپنا ایم بی بی ایس مکمل کرلیا تھا۔ اس دوران اس کے والدین کی جان توڑ کوششوں کے باوجود اس کا کہیں رشتہ طے نہ پاسکا تھا۔ شان دار کامیابی کے بعد وہ ایک اسپتال میں جاب کررہی تھی۔ ذاتی استعمال کے لیے گاڑی لے لی تھی۔ ڈرائیونگ سیکھ کر خود ہی گاڑی چلاتی تھی۔ ساتھ ہی وہ گائنی میں اسپیشلائزیشن بھی کررہی تھی۔ اس کے دونوں بھائی بتدریج' میٹرک اور انٹر میں تھے۔ انٹر کرنے کے لیے عظیم روز قریبی شہر جاتا اور واپس آتا تھا' بہن کی کامیاب زندگی ان کے لیے مشعل راہ بنی تھی۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ کچھ عرصہ کی مشکل ہے اور پھر آسانی ہی آسانی.....

اس دن فضا اسپتال سے گھر واپس آرہی تھی کہ ڈیش بورڈ کو دیکھا' جہاں ہیٹ کی سوئی آخری حد کو چھو رہی تھی۔ یعنی انجن گرم ہو رہا تھا۔ گاڑی میں پانی کی بوتل موجود تھی۔ فضا نے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالا اور گاڑی اسٹارٹ کرکے ایک بڑی ورکشاپ کے آگے کھڑی کردی۔ دو لڑکے بھاگتے ہوئے آئے۔ ایک لڑکے نے گاڑی کو چیک کیا اور بتایا کہ کچھ کام نکل آیا ہے' ٹھیک ہونے میں دیر لگ سکتی ہے۔

"اوکے' میں انتظار کرلیتی ہوں۔" دوسرا لڑکا اندر سے اسٹول لے آیا۔ فضا نے اس پر بیٹھ کر چچی کو فون کرکے گاڑی کی خرابی کا بتایا۔ اسے بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک خوش پوش' خوش شکل نوجوان وہاں آگیا' لڑکوں نے اسے گاڑی کی خرابی کا بتایا۔ یعنی وہ اس ورکشاپ کا مالک تھا۔ وہ مبہم سا سر ہلا کر فضا کے پاس آیا۔

"میم ابھی مزید وقت لگ سکتا ہے' آپ مناسب سمجھیں تو اندر چل کر بیٹھ جائیں' یہاں خاصی گرمی ہو رہی ہے۔" فضا کو بھی یہی بہتر لگا کہ وہ یہاں کھلی جگہ کے بجائے اندر بیٹھ جائے۔ ورکشاپ کے ساتھ ہی کاروں کا شوروم تھا' جس کا آفس بہت شان دار اور ایئر کنڈیشنڈ تھا۔

"آپ کیا لیں گی' چائے یا کولڈ ڈرنک؟" اس کے بیٹھنے کے بعد وہ نوجوان ریوالونگ چیئر پر بیٹھا اور پوچھا۔

"نہیں' نہیں' بہت شکریہ' کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

"یہ تو آپ بہت تکلف کررہی ہیں۔" اس نے فون پر کسی سے بات کرکے کولڈ ڈرنک اور سینڈوچز منگوا لیے۔

"یہ تو آپ نے زحمت کی ہے۔"

"اب ڈاکٹر فضا نعیم کے لیے اتنا کرنا تو بنتا ہے نا۔" وہ بڑی دلکشی سے مسکرایا' فضا پر تو حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

"جی آپ کو...؟"

"آپ کا نام ہی نہیں اور سب بھی پتا ہے مجھے۔ آپ بھی مجھے جانتی ہیں بہت اچھی طرح۔"

"نہیں میں تو بالکل نہیں جانتی' کون ہیں آپ؟"

"سلمان سعید' آپ ہی کے گاؤں کا نکما لڑکا۔"

"وہ جو مڈل ایسٹ چلا گیا تھا۔" بے ساختہ فضا کے منہ سے نکلا تھا۔

"جی' جی وہی۔" وہ پھر مسکرایا تھا۔ فضا کو تو بالکل یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ ان کے محلے میں ہی تو رہتا تھا۔ اس کی آوارہ گردی کے قصے سننے کو ملتے تھے۔ آتے جاتے بھی کئی بار دیکھا تھا' اب تو اسے دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین آنا مشکل ہو رہا تھا' اتنی اچھی ڈریسنگ' ایسی شفاف چمکتی جلد' اتنا شان دار آفس' وہ تو جتنی حیران ہوتی کم تھا' سلمان کے ہونٹوں پر ایک کھلتی ہوئی مسکراہٹ چپک سی گئی تھی۔ فضا گڑبڑا گئی۔

"وہ معلوم کیجیے کام بھی کتنی دیر ہے؟" وہ خود اٹھ کر باہر چلا گیا تھا اور کچھ ہی دیر میں گاڑی ریڈی تھی۔ سلمان نے اس کے چارجز لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

"اب اتنا تو آپ ہم پر حق ہے نا کہ ہم آپ سے کوئی پیسہ چارج نہ کریں اور آپ بھی ہماری روایتی مہمان نوازی پر پانی نہ ڈالیں۔" فضا کا اصرار بےکار گیا اور اس نے مرمت کا معاوضہ نہیں لیا' ہاں یہ ضرور کہا کہ جب بھی گاڑی کا کوئی مسئلہ ہو وہ اسے فون کر دیا کرے۔ وہ گاڑی منگوا کر اس کا نقص ٹھیک کر کے بھیج دیا کرے گا۔

"اف چاچو' آپ اسے دیکھیں تو سہی' آپ کو تو بالکل یقین نہیں آئے گا کہ وہ وہی سلمان ہے۔" اس نے چاچو کو ساری بات بتائی تھی۔ اتفاقاً چاچو کی گاڑی خراب ہوئی' فضا نے انہیں سلمان کی ورکشاپ کا ایڈریس بتایا' چاچو وہیں چلے گئے' وہاں تو ان کی ایسی دوستی بن گئی کہ پھر وہ اکثر اس سے ملنے کے لیے چلے جاتے اور سلمان بھی ان کے گھر آنے لگا تھا۔ چاچو کو وہ محنتی نوجوان بہت پسند آیا تھا جو اپنے بل بوتے پر یہاں اس مقام پر پہنچا تھا۔ وہ خود بھی بزنس مین تھے اور دوسرے کاروباری لوگوں کی بھی دل سے قدر کرتے تھے۔ سلمان تو تھا بھی ان ہی کے گاؤں کا' وہ تو جتنے خوش ہوتے کم تھا۔ سلمان نے صرف دس جماعتیں پڑھ رکھی تھیں' مگر اس کی معلومات شان دار تھیں۔ اس نے سچ مچ اپنے آپ کو بہت گروم کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اور کیسی ہیں آپ اور آپ کا اسپتال؟" سلمان نے خوش دلی سے فضا سے پوچھا۔ وہ ابھی ابھی گھر آئی تھی اور سلمان' چاچو کے ساتھ ہی وہاں آیا تھا۔

"سب کچھ فٹ فاٹ اور ٹھیک ٹھاک۔" وہ ہنسی تھی۔ "آپ سنائیں آپ کا کام دھندا کیسا چل رہا ہے۔"

"الحمدللہ' سب ٹھیک اور کیا مصروفیات ہیں۔"

"بس یہ پوسٹ گریجویشن اور جاب' یہی مصروفیات ہیں آج کل' آپ یہیں سیٹل ہو چکے ہیں؟"

"جی... میں تو اماں' ابا سے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہیں آجائیں' مگر وہ گاؤں چھوڑنے پر رضامند نہیں ہیں۔"

"ہاں ہمارے ماں' باپ اپنی جڑوں سے الگ نہیں ہو سکتے۔" وہ مسکراتے ہوئے چائے پینے لگی۔ چاچو کسی کام سے اٹھ کر باہر گئے تو سلمان ہلکا سا کھنکارا۔

"مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنی تھی۔"

"جی کہیں؟" وہ پوری طرح متوجہ ہوئی۔

"آپ کہیں انگیجڈ تو نہیں؟" سلمان کے سوال پر اس کی چھٹی حس نے گھنٹی بجائی۔

"نہیں۔"

"میرا اگلا سوال اسی سے متعلق ہے' مگر آپ کی ہاں یا ناں سے ہمارے اس دوستانہ تعلق پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" اس نے تمہید باندھی' فضا کا دل کچھ اور

طرح سے دھڑکا تھا۔ "جی؟؟"

"میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ ایک دم کہہ گیا۔ فضا کو اندازہ تو ہو ہی چکا تھا۔ پھر بھی سن کر اس کی کیفیت عجیب سی ہو گئی تھی۔ اسے اس کے دو کولیگز نے بھی پرپوز کیا تھا۔ کئی لڑکے اسے پسند کرتے تھے، مگر اس نے کبھی ریسپانڈ نہیں کیا، کیونکہ اسے اپنے ماں، باپ کی اس خواہش کا احترام تھا کہ وہ گاؤں کے ہی کسی فرد سے اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ فضا ان کے اعتماد پر پوری اترنا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا ایک غلط عمل گاؤں کی آئندہ بڑھتی ہوئی بچیوں کا آگے بڑھنے کا راستہ ہمیشہ کے لیے روک دے گا۔ وہ ان بچیوں کے لیے مشعل راہ بننا چاہتی تھی۔ ایسی مثال کہ وہ اپنے ماں، باپ کو اس کا حوالہ دے کر مزید پڑھنے کی اجازت لے سکیں۔ اس نے تعلیم حاصل کی، اسپتال میں جاب کی، اکیلی گاڑی چلا کر جاتی اور آتی تھی۔ سب دیکھتی تھی، سب سنتی تھی، مگر گونگی، بہری اور جذبات سے عاری ہو کر، اس کی ذرا سی لغزش کا خمیازہ اس کے گاؤں کی لڑکیوں کو نسل در نسل بھگتنا پڑے گا۔ اس نے بہت بچ بچ کر اور سنبھل کر یہ ساڑھے سات سال گزارے تھے اور وہ اپنے رب کی شکر گزار تھی کہ اس کے دامن پر کوئی داغ، کوئی تہمت نہیں تھی۔ اس وقت بھی اس نے سلمان کو جواب دینے کے بجائے اس سے وقت مانگا تھا۔

دوسرے دن اس نے بہت جھجکتے ہوئے چاچو سے اس کے پرپوزل کے متعلق بات کی، وہ ہلکا سا مسکرائے تھے۔

"ہاں مجھے علم ہے، اس نے پہلے مجھ سے تذکرہ کیا تھا۔" فضا نے محجوب ہو کر پلکیں جھکائی تھیں۔

"دیکھو بیٹا، سلمان بے شک ایک اچھا انسان ہے، مالی لحاظ سے بھی مضبوط پوزیشن ہے، مگر تعلیم اس کی بہت کم ہے، کسی بھی طرح تم سے کمپیئر نہیں کیا جا سکتا، اس لیے، اس سے پہلے کہ یہ پرپوزل بھائی بھابھی تک پہنچے، تم اس پر اچھی طرح غور کر لو، ہر پہلو سے، تم پر کوئی پریشر نہیں ہے، کسی بھی طرح کا، نہ یہ کوئی آخری پرپوزل ہے تم کھلے دل و دماغ سے اس پر غور کرو، اچھا لگے تو ہاں کرو، نہ لگے تو نہ کرو، پوری زندگی کا سوال ہے، کوئی آج کل کی تو بات نہیں، اس لیے اس کو سوچو اور جلد بازی کی بھی ضرورت نہیں، جتنا ٹائم چاہیے لے لو، تم ایک سمجھ دار اور پڑھی لکھی لڑکی ہو، صحیح کہہ رہا ہوں نا؟" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے تو وہ بھی مسکرا دی تھی۔ پھر اس نے بہت سوچا۔ ہر زاویے سے، ہر پہلو سے، سوائے تعلیم کی کمی کے اس میں خرابی تو کوئی نہیں تھی، پھر بھی اس نے چچی سے ذکر کیا تو وہ مسکرانے لگیں۔

"دیکھو فضا، یہ کمی بہرحال ایک کمی ہے اور کوئی معمولی کمی نہیں ہے، اس سے ذہنیت میں بہت فرق آجاتا ہے، میاں، بیوی میں ذہنی خلیج ہو تو دیگر معاملات میں بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ اب دو صورتیں ہیں یا تو وہ تمہاری بہت ریسپکٹ کرے گا، یا وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر تمہیں خواہ مخواہ ٹارچر کرے گا، شک کرے گا تو اس لیے یہ معاملہ سوچ سمجھ کر حل کرنے والا ہے۔" یعنی ہر بندہ مخمصے میں تھا، وہ بھی الجھ سی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

فضا اسپتال سے باہر آئی تو ٹھٹک گئی، سلمان سامنے ہی کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر خیر مقدمی انداز میں مسکرایا تھا۔ وہ بھی ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"السلام علیکم۔" قریب آنے پر سلمان نے پہل کی تھی۔

"وعلیکم السلام۔"

"مجھے کچھ باتیں کرنی تھیں آپ سے، تو میں یہاں چلا آیا، کہیں بیٹھ کر بات کریں؟" سلمان کے کہنے پر فضا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ پھر سے مسکرایا تھا۔

"گاڑی میں ہی بات کر لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" فضا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اور وہ سائیڈ سیٹ پر آبیٹھا فضا نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"جی کہئے؟"

"میں نے آپ سے ایک سوال پوچھا تھا' اس کا جواب نہیں آیا؟" فضا نے ایک لمبی سانس کھینچی' اسے توقع تھی کہ وہ کوئی ایسی ہی بات پوچھے گا۔

"آپ کو جلدی جواب چاہیے کیا؟"

"ہوں' بے چینی تو ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔ وہ کچھ دیر چپ رہی۔

"ایکچوئیلی میں ڈیسائڈ نہیں کر پا رہی کہ مجھے کیا فیصلہ لینا چاہیے' میں آپ کو کچھ دنوں تک بتا دوں گی۔"

"شاید آپ کو میں اچھا نہیں لگا یا میری تعلیم کا کم ہونا باعث رکاوٹ ہے' خیر جو آپ کی مرضی۔" پہلی بار اس کی مسکراہٹ ماند پڑی تھی۔ فضا کے دل کو کچھ ہوا۔

"نہیں' نہیں ایسی بات نہیں' بس زندگی بھر کا فیصلہ ہے تو ذرا سوچ سمجھ کر ہی کیا جائے گا۔"

"ضرور سوچیے' مگر اتنا نہیں کہ کوئی مایوس ہی ہو جائے۔" وہ پژمردگی سے مسکرایا۔ پھر ایک چوک پر گاڑی رکوا کر اتر گیا۔

"میں کل آؤں گا گھر پر' جواب لینے کے لیے۔"

فضا گھر آ کر بھی اسی کے متعلق سوچتی رہی۔ آج اسے محسوس ہوا کہ وہ اداس ہوا تو اس کے محسوسات بھی عجیب سے ہو گئے تھے۔ کیا وہ آہستہ آہستہ اس میں انوالو ہو رہی ہے' دل اتنی تیزی سے دھڑکا کہ وہ خود بھی حیران رہ گئی۔ پھر اس نے چاچو کو ہاں کہہ دی تھی۔ بشرط یہ کہ اس کے والدین کے پاس پروپوزل لے جایا جائے اور وہ بھی راضی ہوں' تب اس کی طرف سے بھی ہاں ہے۔

سلمان کے اماں' ابا اس کا رشتہ لے کر فضا کے امی' ابو کے پاس آئے' جنہیں چاچو' سلمان کے متعلق سب کچھ بتا چکے تھے۔ وہ بہت خوش ہو کر سلمان کے والدین سے ملے' ان کی دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی کہ فضا کا رشتہ ان کے گاؤں کے ایک ہونہار نوجوان سے ہی طے پا رہا تھا۔ رشتہ طے ہوتے ہی شادی کی تاریخ طے پا گئی اور تیاریاں شروع ہو گئیں' فضا نے

اسپتال سے چھٹیاں لے لی تھیں۔ گاؤں والوں نے بے پناہ خوشی کے ساتھ ان دونوں کی شادی میں شرکت کی تھی۔ شادی کے بعد وہ سلیمان کے ساتھ اس کے شہر والے گھر میں شفٹ ہوگئی تھی۔ سلمان اس کا بہت خیال رکھتا۔ ہر طرح سے' اس کی خوشی کے لیے وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کرتا' اس نے اسپتال پھر سے جوائن کرلیا تھا۔ اس دن اس کے پاس گاؤں سے رفیعہ نامی لڑکی کا کیس آیا' کیس بہت بگڑا ہوا تھا۔

"آپ لوگوں نے اس کا پراپر ٹرٹمنٹ ہی نہیں کروایا' تو ہی تو اس کا یہ حال ہوا ہے۔" وہ اس کے ساتھ آنے والیوں پر الٹ پڑی۔

"وہاں کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں ہے' شہر اتنی دور پڑتا ہے' اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی کہ ہم اسے یہاں لے کر آتے' دو گھنٹے کا تو سفر ہے۔" اس لڑکی کی نند نے افسردگی سے بتایا۔ فضا کچھ چپ سی ہوگئی تھی۔ اس کا ٹرٹمنٹ کرنے کے بعد اسے گھر بھجوایا کر وہ خود شام میں گھر آئی تو الجھی اور فکر مند تھی۔

"کیا بات ہے' آج اداس کیوں ہو؟" سلمان نے اس کے چہرے سے بھانپ لیا کہ کوئی بات ضرور ہے' فضا نے اسے ساری بات بتائی۔

"ہاں یہ تو ہے' وہاں کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں ہے تو عورتوں کو بہرحال ان معاملات میں مشکل تو ہوتی ہے۔"

"میں صبح سے یہی سوچ رہی ہوں کہ میں ڈاکٹر بن کر بھی اپنے گاؤں کی عورتوں کے کام نہ آسکی تو میرے ڈاکٹر بننے کا میرے گاؤں کو کیا فائدہ ہوا؟"

"نہیں۔" سلمان تو خوشی سے اچھل پڑا۔ "فضا یہ تم....."

"ہاں سلمان' میں اپنے گاؤں میں چھوٹا سا اسپتال بنانا چاہتی ہوں' میں اپنے گاؤں میں لیڈی ڈاکٹر کی کمی پوری کرنا چاہتی ہوں۔ یہاں تو لیڈی ڈاکٹرز کی کمی نہیں ہے' مگر وہاں بہت ضرورت ہے۔"

"میں تمہیں یہ اسپتال بنوا کر دوں گا' تم مجھے صرف بتاتی جاؤ کہ تمہیں کیا' کیا چاہیے' میں وہ سب مہیا کروں گا' اتنے بڑے مقصد کے لیے ہم دونوں مل کر کام کریں گے۔"

"ان شاء اللہ۔" وہ بھی عزم سے مسکرائی تھی۔

"مجھے تو لگتا تھا کہ ہماری ذہنی مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے مسائل جنم لیں گے' تم مجھ سے' میری تعلیم سے جیلس ہو کر مجھ سے خواہ مخواہ نہ لڑا کرو' میرے مرد ڈاکٹرز کے ساتھ کام کرنے پر ناراض نہ ہوا کرو' ایسے ہی بہت سے اندیشے مجھے ہاں نہیں کرنے دے رہے تھے۔"

"بہت غلط سوچتی تھیں تم۔" وہ محبت سے اسے دیکھ کر مسکرایا۔ "مجھے تو تعلیم سے بہت محبت ہے' مجھے تم سے بہت محبت ہے' اللہ تعالیٰ نے تمہاری صورت میں مجھے یہ دونوں چیزیں عطا کردیں' یہ تو اس کی ناشکری اور تمہاری ناقدری کرنے والی بات ہے اور میں ہرگز ناشکرا اور ناقدرا نہیں ہوں۔" فضا نے محبت سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

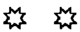
"بہت شکریہ سلمان بہت بہت شکریہ۔"

"کس چیز کے لیے۔"

"میری ہر خواہش کے احترام کے لیے' مجھ سے اتنی زیادہ محبت کرنے کے لیے۔"

"وہ کوئی میرے اختیار کی بات تھوڑی ہے جو تم شکریہ ادا کررہی ہو' یہ کم بخت تو خود بخود ہوجاتی ہے۔"

اس کے معصومیت سے کہنے پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی اور سلمان کو لگا کر ہر طرف پھول ہی پھول کھل اٹھے ہوں۔ چار سو چراغاں ہو رہا ہے۔ وہ بھی بڑے دل سے مسکرا دیا تھا۔



تنزیلہ ریاض

راپنزل

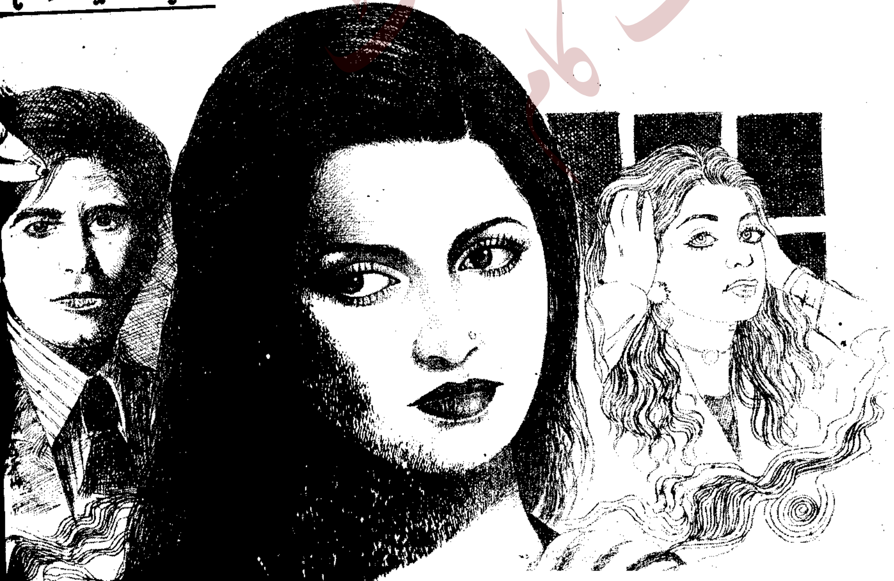
مہر کو کہانیاں سننے کا بے حد شوق ہے اسکول کے فینسی ڈریس شو میں وہ شہزادی راپنزل کا کردار ادا کر رہی ہے' اس لیے اس نے اپنے پاپا سے خاص طور پر شہزادی راپنزل کی کہانی سنانے کی فرمائش کی۔ کہانی سناتے ہوئے اسے کوئی یاد آجاتا ہے' جسے وہ راپنزل کہا کرتا تھا۔

نینا اپنے باپ سے ناراضی کی وجہ سے اپنے خرچ مختلف ٹیوشن پڑھا کر پورے کرتی ہے۔ اس کی بہن زری ٹیلی فون پر کسی لڑکے سے باتیں کرتی ہے۔ نینا کی سلیم سے بہت دوستی ہے۔ سلیم کی محلے میں چھوٹی سی دکان تھی۔ ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے وہ ایک ٹانگ سے معذور ہو جاتا ہے۔ سلیم نے پرائیویٹ انٹر کیا ہے اور اس کی غزل احمد علی کے نام سے ایک ادبی جریدے میں شائع ہوتی ہے۔

سمیع اور شہرین نے ضد کرکے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جاکر شادی کی ہے' لیکن شہرین اپنے والدین کی ناراضی کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ سمیع اور شہرین دونوں اپنی بیٹی ایمن کی طرف سے بہت لاپروا ہیں اور انہوں نے اس کی دیکھ بھال کے لیے دور کی رشتہ دار اماں رضیہ کو بلا لیا ہے۔

صوفیہ کا تعلق ایک متوسط گھر سے تھا' صوفیہ کی شادی کاشف نثار سے ہوتی ہے' جو وجاہت کا اعلا شاہکار بھی تھا۔ شادی کے بعد صوفیہ کو کاشف کا غیر عورتوں سے بے تکلفی سے ملنا پسند نہیں آتا اور وہ شک کا اظہار کرتی ہے' لیکن کاشف کاروبار کا تقاضا ہے کہہ کر اس کو مطمئن کر دیتا ہے۔ صوفیہ کو کاشف کے دوست مجید کی بیوی حبیبہ بہت بری لگتی ہے کیونکہ وہ کاشف سے بہت بے تکلف ہے۔ صوفیہ کی ایک بیٹی پیدا ہوتی ہے۔ زرمین۔

پچیسویں قسط



اس لیے
یاد آجاتا

ٹیلی فلم
ں۔ ایک
د علی کے

ناراضی
ں نے کم

شادی
کاشف
کیونکہ



"اچھا تو پھر راپنزل کے ساتھ کیا ہوا۔۔۔کیا اس نے واقعی قلعے سے چھلانگ لگادی تھی؟" مہر نے اچانک ہی سوال کر ڈالا تھا۔ وہ اپنا لیپ ٹاپ لیے بیڈ پر بیٹھا آفس کا کام کر رہا تھا۔ مہر کی اور اماں کی زیادہ تھی۔ وہ اسے ٹوکتی تو نہیں تھیں لیکن انہیں بچوں کو پیار محبت سے پالنے کا تجربہ نہیں تھا۔ ان کا بات کرنے سمجھانے کا اپنا ہی ایک مخصوص دبنگ سا انداز تھا جسے نا صرف مہر بلکہ خاور بھی سختی سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مہر دادی سے کہیں زیادہ اس کے ساتھ بے تکلفی تھی۔ اس کے سوال پر وہ چونکا۔

"تمہیں اب تک یہ کہانی یاد ہے؟" اس نے لیپ ٹاپ سے نگاہیں ہٹائے بنا سوال کیا تھا۔ اسے اس کہانی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس کہانی کا ذکر بھی اسے کسی اور کی یاد دلانے لگتا تھا۔

"جی۔۔۔مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ آپ نے یہ کہانی مکمل نہیں کی تھی۔۔۔آدھی ہی سنائی تھی اور میں پھر سو گئی تھی۔۔۔پلیز پاپا سنادیں نا راپنزل کی کہانی۔۔۔کیا اس نے واقعی قلعے سے چھلانگ لگادی تھی۔۔" مہر نے معصومیت سے جتانے والے انداز میں کہا تھا۔

"روز روز کہانیاں نہیں سنتے۔۔۔اور آج تو ویسے بھی بہت دیر ہوگئی ہے۔۔۔صبح اسکول جانا ہے یا نہیں" وہ دل ہی دل میں جھنجلانے کے باوجود بہت تحمل سے بولا تھا۔ مہر سے وہ کبھی سخت انداز میں بات نہیں کرتا تھا

"سنادیں نا پاپا۔۔کیا ہوا پھر۔۔۔راپنزل کے ساتھ کیا ہوا تھا۔۔۔کبڑی جادوگرنی نے کیا کیا تھا اس کے ساتھ۔۔؟" مہر کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ خاور نے لیپ ٹاپ سے نگاہیں ہٹا کر اس کی جانب دیکھا پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔

"کبڑی جادوگرنی کچھ نہیں کرتی کسی کے ساتھ۔۔سب کچھ انسان خود ہی کرتا ہے۔۔اور راپنزل نے بھی جو کیا خود ہی کیا تھا۔۔اپنے ہی پاؤں پر خود ہی کلہاڑی ماری تھی تمہاری راپنزل خالہ نے۔۔؟" اس کے لہجے میں بے پناہ اکتاہٹ تھی۔ مہر نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"راپنزل خالہ۔۔۔؟" وہ دہرا کر پوچھ رہی تھی۔ خاور نے اس کے سوال کو سنا تو اسے احساس ہوا کہ جھنجلاہٹ میں بچی کے سامنے کیا بول گیا ہے۔ وہ مزید جھنجلا گیا تھا۔

"سو جاؤ مہر۔۔پلیز سو جاؤ۔۔۔کچھ نہیں رکھا ان شہزادیوں کی کہانیوں میں۔۔۔میں کل آپ کو سندباد کی کہانی سناؤں گا۔۔۔ایک ایسے لڑکے کی کہانی جو بہت مشقت سے سمندر عبور کرتا ہوا مختلف جگہوں پر جاتا ہے اور بہت کچھ سیکھتا ہے۔۔۔" مہر اس کے لہجے سے خائف تو ہوئی تھی لیکن اپنی پسندیدہ کہانی میں اس کی دلچسپی ابھی بھی برقرار تھی

"لیکن راپنزل پاپا۔۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ خاور نے اسے گھور کر دیکھا

"اوہو۔۔مٹی ڈالو راپنزل پر۔۔بھول جاؤ اس کہانی کو۔۔۔" مہر اس کے انداز پر چپ سی ہوگئی پھر وہ بستر پر چت لیٹ گئی اور چند لمحوں بعد اس نے کروٹ بدل لی تھی۔ خاور کو افسوس سا ہوا۔ اس نے کبھی مہر سے اس انداز میں بات نا کی تھی لیکن وہ بے حد اضطرابی کیفیت میں تھا۔ جس دن سے نینا نے اس کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ وہ سمیع رندھاوا سے محبت کرنے لگی ہے اس دن سے اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبا رکھا تھا۔ ایسا تو اس کے ساتھ تب بھی نا ہوا تھا جب اچانک نینا نے اسے بتایا تھا کہ وہ [illegible] رندھاوا کے ساتھ شادی کر رہی ہے۔

"یہ کیسا احمقانہ فیصلہ ہے؟" فون پر اس کی یہ بات [illegible] کر خاور نے حیران ہو کر پوچھا تھا

"یہ میرا فیصلہ ہے۔۔کونین کاشف نثار کا۔۔۔میں [illegible] شادی کر رہی ہوں۔" اس نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔ ایسا انداز جو خاور کے دل میں گڑ [illegible] تھا اور آج تک جیسے گڑا ہوا ہی تھا حالانکہ اب تو نینا کی شادی کو بھی دو سال ہونے والے تھے۔ کونین کاشف نثار اب [illegible] بننے لگی تھی اس کے لیے۔۔۔

بدلے لیے تو وہ کچھ بول ہی نا پایا تھا۔ کتنے دن کے بعد بات ہو رہی تھی اس سے۔۔ گزشتہ بار جب اس نے کال کی تھی تو ان کے درمیان ذرا بدمزگی ہو گئی تھی اسی لیے خاور نے شدید خواہش کے باوجود اسے کئی دن فون نہیں کیا تھا۔ وہ تو سیل فون پر اس کا نمبر دیکھ کر یہی سمجھا تھا کہ اس نے اسے منانے کے لیے فون کیا ہو گا لیکن اس نے یہ خبر سنا دی تھی۔۔ خاور جانتا تھا وہ مذاق نہیں کر رہی۔۔ اسے ایسے مذاق کرنے کی عادت نا تھی۔ وہ جو کہہ رہی تھی یقیناً وہی کرنے والی تھی۔ اس کا دل چاہا تھا سیل فون بند کر کے دیوار میں دے مارے۔۔

"تم۔۔۔" اس نے کچھ کہنا چاہا پھر چپ کر گیا۔

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔۔؟" وہ پوچھ رہی تھی جیسے یہ واقعی خوشی کی بات ہو۔

"خوشی۔۔؟" خاور نے خالی خالی لہجے میں دہرایا پھر طنزیہ انداز میں بولا۔

"تمہیں میری محبت کا تو کبھی یقین نہیں آیا۔۔ مجھے تو تم ہمیشہ یہی کہتی رہی ہو کہ "میں محبت کرنے والا آئیڈیل نہیں ہوں" اور اب شادی ایسے شخص سے کر رہی ہو جس کی پہلی بیوی بستر مرگ پر پڑی ہے؟ اس کی محبت کا یقین آ گیا ہے تمہیں؟" وہ اپنی جھنجلاہٹ پر قابو نہیں پا سکتا تھا، اسے بولنے کا موقع دیے بغیر اس نے مزید کہا تھا۔

"تمہیں اس شخص پر یقین ہے جو اپنی پہلی بیوی کا نہیں ہو سکا۔۔ وہ تمہیں کیا محبت دے گا۔۔ جس کی پہلی بیوی ابھی بستر پر پڑی ہے اور اسے دوسری شادی کی پڑ گئی ہے۔۔ بیوی کے مرنے کا انتظار تو کر لیتے رنڈھاوا صاحب یا تم سے بہت محبت ہو گئی ہے انہیں۔۔۔ کیا کہتے ہیں وہ۔ تم نہیں ملیں تو مر جاؤں گا۔۔" وہ کھا جانے والے انداز میں بولا تھا اس سے اپنی جھنجلاہٹ چھپائی ہی نہیں جا رہی تھی۔

"تمہیں کس نے کہا کہ ہمارے درمیان محبت کا معاملہ ہے؟" وہ سادہ سے لہجے میں استفسار کر رہی تھی۔ اس کے انداز میں اتنا سکون، اتنا تحمل تھا کہ خاور کو مزید غصہ آ گیا

"اچھا تو پھر کیا معاملہ ہے۔۔ ہمدردی کا شوق اٹھا ہے تمہیں۔۔ یا پھر خدمت خلق کا جنون سوار ہے۔۔۔"

"اسے میری ضرورت ہے۔۔ اور اس سے کہیں زیادہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔۔۔ میں اپنے گھر میں نہیں رہنا چاہتی۔۔ مجھے کوئی ٹھکانا چاہیے۔۔ میں اس گھر میں رہی تو پاگل ہو جاؤں گی یا پھر سلیم کی طرح حرام موت مر جاؤں گی۔۔۔ نکاح ہو رہا ہے میرا۔۔۔ میں تمہیں انوائٹ نہیں کر رہی۔ صرف اپنی خوشی شیئر کر رہی ہوں۔۔ سنا ہے شادی لڑکیوں کے لیے بہت خوشی کا موقع ہوتا ہے۔۔ اس لیے تمہیں بتا رہی ہوں۔۔۔" وہ عام سے انداز میں بس بولتی چلی جا رہی تھی۔ خاور کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ اسے لگا جیسے نینا نشے میں ہے

"نینا۔۔۔ کیوں کر رہی ہو ایسا۔۔۔ مت کرو۔۔ ایسے مت کرو۔۔ ٹھکانا تو میں بھی تمہیں دے سکتا ہوں۔"

وہ تڑپ کر بولا تھا۔ اسے خود پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ وہ کیوں سنبھال نہیں پا رہا خود کو

"تم بہت اچھے انسان ہو خاور۔۔ لیکن ہر اچھے انسان کو ہر بات بھی نہیں بتائی جا سکتی۔۔۔۔ تمہیں دوست کہا ہے میں نے۔۔۔ اور ساری زندگی کہتی رہوں گی۔۔۔ تم بس اتنا سمجھ لو کہ میں تمہیں ڈیزرو نہیں کرتی۔۔۔ اللہ یقیناً تمہارے ساتھ بے حد اچھا معاملہ کریں گے۔۔ تم بہت جلد اپنی نئی زندگی شروع کر دو گے۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا" وہ اسے دعا دے رہی تھی۔

"اللہ یقیناً میرے ساتھ اچھا ہی معاملہ کریں گے۔۔۔ لیکن تم کیوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہی ہو۔۔ ایک شادی شدہ مرد سے شادی کیوں کر رہی ہو تم۔۔۔؟" وہ چڑ کر پوچھ رہا تھا

"شادی شدہ مرد سے شادی گناہ تو نہیں ہے۔۔۔ کس حدیث یا قرآن کی کس آیت میں لکھا ہے کہ ایک شادی شدہ مرد سے شادی نہیں کی جا سکتی۔۔۔ وہ ایک اچھا انسان ہے۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ خاور نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"یہ تو تم کہہ رہی ہونا۔۔۔اتنا ہی اچھا ہوتا تو بستر مرگ پر پڑی بیوی کو چھوڑ کسی معصوم لڑکی کو اپنی محبت کے چنگل میں نا پھنسا رہا ہوتا" خاور دانت پیس کر بولا تھا

"وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔۔۔اسے تو اپنی بیوی کے علاوہ کوئی نظر ہی نہیں آتا۔۔اور یہی وہ واحد بات ہے جو مجھے پسند ہے۔۔۔وہ اپنی بیوی کا اتنا وفادار ہے کہ اسے کوئی نظر نہیں آتا۔۔۔" خاور نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"تو پھر کیا تم محبت کرنے لگی ہو اس سے۔۔۔؟" خاور کا دل جانتا تھا اس نے یہ سوال کس قدر ہمت کے ساتھ کیا تھا۔

"میں محبت نہیں کرتی اس کے ساتھ۔۔میں کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتی۔۔۔بخدا محبت کا معاملہ نہیں ہے یہ۔۔۔مجھے تو وہ شخص ایک معمہ لگتا ہے۔۔۔ایک پہیلی۔۔۔ایک الجھن۔۔۔الجھنوں سے کون محبت کرتا ہے۔۔۔اس کی بیوی مر رہی ہے۔۔۔بستر پر کئی دنوں سے بے ہوش پڑی ہے۔۔۔اور یہاں یہ بھی جیسے پگھل پگھل کر ختم ہوا جا رہا ہے۔۔۔اسے اپنی فکر ہے نا ارد گرد کا ہوش ہے۔۔ایسا لگتا ہے اس کی دنیا ایک عورت کے ہونے سے آباد تھی۔۔اور ایک عورت کے نا ہونے کا خدشہ اسے برباد کیے جا رہا ہے۔۔۔ایسا لگتا ہے۔۔وہ عورت نہیں رہے گی۔۔تو یہ بھی نہیں رہے گا۔۔مجھے تو بس یہ بات حیران کرتی ہے خاور کہ اتنی وفاداری کسی عورت کے لیے کسی مرد کے دل میں کیسے آجاتی ہے۔۔اور اگر ایک مرد کے دل میں اپنی عورت کے لیے اتنی وفاداری آسکتی ہے تو باقی مردوں کو کس مٹی سے بنایا ہے اللہ نے۔۔۔اللہ کو چاہیے کہ وہ عورت کو اور کچھ دے نا دے مگر ایک وفادار مرد ضرور دے۔۔یا پھر کاش میری ماں کی زندگی میں بھی ایسا ایک مرد ہوتا۔۔۔تو میں مکمل ہوتی۔۔۔ایسی اُجڑی پجڑی کونج نا ہوتی۔۔۔اتنی مردہ دل نا ہوتی"۔

وہ بولتے بولتے یکدم چپ سی ہوئی تھی جیسے اسے بے خودی میں خود نا پتا چلا ہو کہ وہ کیا بول رہی ہے پھر اس نے مزید کچھ کہے بنا فون بند کر دیا تھا۔وہ رات خاور کی زندگی کی بہت مشکل رات تھی۔اس دن کے بعد خاور نے دوبارہ کبھی نینا کے نمبر پر کال نہیں کی تھی لیکن وہ اسے بھول نہیں پایا تھا۔اس کی شادی ہوگئی تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ وہ دوبارہ کبھی اس سے رابطہ نا کرے گی لیکن چند مہینے بعد ہی اس نے مہر کی خیریت دریافت کرنے کے لیے اسے کال کرنی شروع کر دی تھی۔

دل تو بے حال ہو چکا تھا لیکن روابط پھر بحال ہو گئے تھے۔

ایک ڈیڑھ ہفتہ بعد وہ مہر کے لیے فون کر لیا کرتی تھی۔وہ ایسے ظاہر کرتی تھی جیسے بہت خوش حال زندگی گزار رہی ہے لیکن خاور کو اس کے لہجے کی استقامت کبھی کبھی ڈھونگ لگتی تھی۔۔پھر ایسا ہونے لگا کہ وہ مہر اور ایمن کو پارک لے جانے لگے۔وہ ان دونوں بچیوں کے متعلق ہی باتیں کرتے رہتے تھے لیکن خاور محسوس کرنے لگا تھا کہ وقت کے ساتھ وہ سمجھ دار ہوتی جا رہی تھی۔اس کی شخصیت کا کھلنڈرا پن ختم ہونے لگا تھا۔وہ ایمن کے لیے اس کی سگی ماں سے بھی زیادہ بڑھ کر فکر مند رہتی تھی۔اس کا اسکول، کھانا پینا، کپڑا لتا ہر ذمہ داری جیسے اس نے بخوشی سنبھال رکھی تھی۔ان کے درمیان ایمن کے والدین کا ذکر بھی ہونے لگا تھا لیکن پھر بھی ایک اضطراب تھا جو اس کی شخصیت سے چھلکتا تھا۔۔جیسے خود اپنے آپ سے پریشان ہو، اپنے آپ سے نالاں ہو۔۔۔وہ خوش نظر آنے کی اداکاری کرتی تھی مگر ناکام ہو جاتی تھی۔تھکاوٹ اس کی آواز سے ہی نہیں اس کے انداز سے بھی ٹپکنے لگی تھی۔۔۔خاور کم ظرف نہیں تھا لیکن دل ہی دل میں اسے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوتی تھی کہ وہ ایک شادی شدہ مرد کے ساتھ اپنے شادی کے فیصلے کی وجہ سے اس درجہ خوار ہو رہی ہے۔۔۔وہ جانتا تھا وہ اپنی ازدواجی زندگی سے خوش نہیں ہے۔۔۔لیکن پھر وہ ایک دن جب اس نے اعتراف کر لیا تھا۔

"اب محبت ہوگئی ہے مجھے اُس سے۔۔۔بس ایک یہی ہونا باقی تھا میری زندگی میں۔۔۔یہ بھی ہوگیا۔۔۔میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں اس شخص سے کبھی محبت بھی کروں گی۔۔۔"

کونین کاشف نثار کہا کرتی تھی کہ وہ محبت کرنے والا میٹریل نہیں ہے۔۔۔وہ کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتی۔۔۔اور وہ یہ بھی کہا کرتی تھی کہ سمیع رندھاوا اسے ایک معمہ لگتا ہے۔۔۔ایک الجھن۔۔۔۔بھلا الجھنوں سے کون محبت کرتا ہے۔۔۔اسے معمے سے ہی محبت ہوگئی تھی۔۔۔۔ثابت ہوا تھا کہ انسان الجھنوں سے بھی محبت کرسکتا ہے۔

اس روز اس نے اعتراف کیا تھا کہ وہ محبت کرنے لگی تھی۔۔۔اس شخص سے جو اس کا شوہر تھا۔۔۔اس میں اللہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔۔خاور چاہتے ہوئے بھی اسے ٹوک نہیں پایا تھا لیکن اسے یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ رلپنزل اب پلٹ کر نہیں آئے گی۔۔۔اسی لیے اس نے اپنی اماں کو کہہ دیا تھا کہ وہ جس لڑکی سے چاہیں اس کی شادی کروادیں۔

☆☆☆

"نکاح۔۔؟" سمیع نے بے حد پریشان ہوکر دہرایا تھا۔کونین نے ایک نظر اسے دیکھا پھر اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کی جانب دیکھتے ہوئے بے پرواسے انداز میں بولی۔

"ہاں۔۔نکاح۔۔۔اتنا حیران کیوں ہو رہے ہیں آپ۔۔۔پہلے بھی تو کیا تھا آپ نے۔۔۔آپ کے لیے یہ کوئی نئی چیز تو نہیں ہے۔۔۔حیران تو مجھے ہونا چاہیے تھا۔۔۔میں نے تو پہلی بار ارادہ کیا ہے"

"اوہ۔۔شٹ اپ۔۔۔" سمیع غرایا۔۔۔وہ معصوم تھی یا بننے کی کوشش کرتی تھی۔سمیع نے ساری احتیاط بالائے طاق رکھ دی تھی۔

"پاگل ہوتم۔۔۔بالکل پاگل۔۔۔تمہیں ذرا سا بھی احساس نہیں ہے کہ تم ہم سب کے لیے کتنی پریشانیاں پیدا کر رہی ہو۔۔۔۔اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تمہارے فادر نے یہ سب بلاوجہ نہیں کیا ہوگا۔۔۔۔"اس نے اس کے چہرے کے گرد ہالہ بناتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔کونین کے چہرے کا رنگ لحہ بھر کے لیے بدلا تھا لیکن اس سے اس کے فیصلے پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

""بلاوجہ تو کوئی بھی کچھ نہیں کرتا سمیع صاحب۔۔۔ماں بھی بچے کو اپنے وجود سے اس لیے دودھ پلاتی ہے کہ یہ نعمت اللہ نے اس کے وجود کو ودیعت کی ہوتی ہے۔۔۔بلاوجہ تو بس خدا ہی کرتا ہے انسان کے ساتھ جو کرنا ہوتا ہے" باتوں میں اس سے جیتنا مشکل ہی تھا۔سمیع کو اس روز اندازہ ہوا تھا۔

"اسی لیے بھونک رہا ہوں کہ خدا بننے کی کوشش مت کرو۔۔۔"بلاوجہ" یہ جو نیکی کرنے کا جنون سوار ہوا ہے نا تمہارے خالی دماغ پر اسے ترک کر کے میرے اور اپنے اہل وعیال پر احسان فرماؤ۔۔۔۔"سمیع نے لفظ "بلاوجہ" پر سارا زور لگاتے ہوئے کہا تھا جبکہ اس پر حسب معمول کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"بلاوجہ نہیں کر رہی میں یہ سب۔۔۔ایمن سے محبت ہے مجھے۔۔۔آپ کو بتایا تو تھا میں نے کہ ایمن کی خاطر کر رہی ہوں یہ سب" وہ پرسکون لہجے میں بولی تھی پھر اسے بولنے کا موقع دیے بغیر مزید کہنے لگی۔

"ایمن کو نہیں چھوڑ سکتی میں۔۔۔جانتے ہیں کیوں۔۔۔۔۔وہ مجھے رلپنزل لگتی ہے۔۔۔اپنی ذات کے قلعہ میں قید ایک ایسی ننھی بچی جسے اس کے گھر والوں نے تنہا کر دیا ہوا ہو۔۔۔۔جو باقی انسانوں سے بالکل کٹ کر اپنی ہی ایک الگ دنیا بنا کر رہ رہی ہے۔۔۔آپ کو بس اپنی اور اپنی مسز کی پرواہ ہے۔۔۔آپ کو اس بات سے غرض نہیں ہے کہ اس عمر میں آپ کی بچی کو آپ کے جذباتی سہارے کی کتنی ضرورت ہے۔۔۔آپ نے اپنی مجبوریوں کو بہانہ بنا کر اسے خود سے دور گویا ایک تنہا قلعے میں قید کر دیا ہوا ہے۔۔۔آپ اسے کھلا پلا تو رہے

ہیں۔۔روپے تو خرچ رہے ہیں اس پر۔۔۔لیکن اس عمر میں کسی ننھی بچی کو روپے نہیں چاہیے ہوتے۔۔۔اسے محبت چاہیے۔۔آپ کی محبت، اپنی ماں کی محبت۔۔۔آپ کو تو یہ بھی نہیں پتا کہ وہ آپ کو بالکل پسند نہیں کرتی۔۔۔اسے آپ کے وجود میں کوئی کشش محسوس ہی نہیں ہوتی کیونکہ آپ تو اسے قلعے میں بند کر کے بھول ہی گئے ہیں۔۔۔وہ مجھے راپنزل لگتی ہے۔۔۔ایک معصوم بچی جو کھڑکی سے دنیا کو دیکھ رہی ہے اور بس اسی کے سہارے زندگی گزار رہی ہے۔۔۔اس کے لیے باقی انسان اجنبی ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔وہ انسانوں میں گھل مل نہیں سکتی کیونکہ ایک اونچے قلعے میں قید رہ کر وہ اب اس قابل نہیں رہی کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ عام زندگی گزار سکے۔۔۔اس کے لیے ساری دنیا بس ایک کھڑکی میں سما چکی ہے۔۔۔کھڑکی کی وجہ سے ہنستی ہے، کھڑکی کی وجہ سے خوش ہوتی ہے، کھڑکی کی وجہ سے مطمئن رہتی ہے۔۔۔میں ایمن کے لیے وہ کھڑکی ہوں سمیع صاحب۔۔۔بند قلعے کی ایک کھڑکی۔۔۔وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔۔۔اور میں اس کو دکھ کر۔۔۔میں نہیں چھوڑ سکتی اسے۔۔۔وہ بالکل راپنزل لگتی ہے مجھے۔۔۔راپنزل ہونا آسان نہیں ہوتا سمیع صاحب۔۔" وہ ایسے بول رہی تھی جیسے کوئی روبوٹ ہو۔ سمیع نے اس کے چہرے پر پھیلے درد کو محسوس کیا تھا۔

ایمن بالکل میرے جیسی ہے سمیع صاحب۔۔۔میں نے بھی تنہا قلعے میں ایسی ہی ایک کھڑکی کے پیچھے سے دنیا کو دیکھتے ہوئے زندگی گزاری ہے" اسے پروا نہیں تھی کہ سمیع سن رہا ہے یا نہیں۔۔۔وہ بس بول رہی تھی۔۔اپنے بارے میں کچھ بتانے جا رہی تھی۔

☆☆☆

اسی رات شہرین کو ہوش آ گیا تھا۔ وہ پورے تیرہ دن بعد دوبارہ سے شعور کی دنیا میں واپس آ تو گئی تھی لیکن اس کی یادداشت کا بڑا حصہ جیسے کہیں اس کے لاشعور میں دبا رہ گیا تھا۔ وہ ان سب کو پہچاننے سے ہی منکر ہو گئی تھی۔ اس کی بینائی بھی نا ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اسے یادیں تو اپنی ادھے۔۔گل مینے کو بھی پہچانتی تھی وہ لیکن اس کے کسی فعل میں استقامت نا رہی تھی۔ وہ چمچہ سیدھا پکڑ سکتی تھی نا سیدھا قدم بھر سکتی تھی۔۔۔وہ باتیں بھی اول فول کرتی تھی۔ اسے کبھی کچھ یاد آتا تھا اور کبھی وہ سب بھول جاتی تھی۔ سمیع نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ایک ہوش مند باشعور انسان کو، ایک ایسے انسان کو جسے آپ بے پناہ محبت کرتے ہوں اسے ایسے اپنے آپ سے بے گانہ ہوتے دیکھنا، لاتعلق ہوتے دیکھنا اس شخص کی موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔۔۔وہ تھی۔۔لیکن نہیں تھی۔۔۔سمیع سمیت اس کے سب پیارے اس کے لیے بے گانے ہو چکے تھے۔۔۔کیسا تکلیف دہ احساس تھا۔

"یہ ٹھیک ہیں بظاہر۔۔۔خود کھا پی سکتی ہیں۔۔۔اپنی حاجات کے لیے کسی پر منحصر نہیں ہیں۔۔لیکن کب کیا ہو جائے۔۔اس بات کا فیصلہ اب کوئی معالج نہیں کر سکتا۔۔۔۔چھ ماہ۔۔ایک سال۔۔۔دو سال۔۔۔جب تک یہ آپ کے ساتھ ہیں۔۔۔ان سے محبت کیجیے۔۔ان کا خیال رکھیے۔۔انہیں اہمیت دیجیے۔۔۔لیکن ان کی خاطر اپنے آپ کو خوار مت کیجیے۔۔یہ دماغی طور پر زمان و مکان کی سرحدوں سے بہت آگے نکل چکی ہیں اور آپ بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔۔۔آپ زندگی کی ریس میں جتنا بھی تیز دوڑ لیں۔۔ان کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔۔۔یہ اب کسی اور دیس کی باسی ہیں۔۔۔آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور اپنے ساتھ رہنے والوں کی قدر کریں۔۔اپنی بچی کے متعلق سوچیں۔۔۔۔موو آن [illegible] صاحب۔۔۔

ڈاکٹر رضی نے اس کی ابتر حالت دیکھ کر [illegible] اس نے "موو آن" کیا کرنا تھا۔ اس کے لیے تو زندگی اسی مقام پر ختم ہو گئی تھی جہاں شہرین نے [illegible] انتہائی لاتعلقی سے دیکھتے ہوئے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ اب مسئلہ ایمن کا تھا۔ [illegible] ایسے ہی انسان کی ضرورت تھی جو اسے بے

محبت اور توجہ دے سکتا سو یہ سب عوامل بھی تھے جنہوں نے سمیع کو مجبور کیا تھا کہ وہ کونین کا شف نثار کے پرپوزل کے بارے میں غور کرے۔ شہرین کے ہوش میں نا آنے سے پہلے جو امید باقی تھی کہ وہ اپنی بچی کو مزید کچھ عرصہ سنبھال سکے گی، وہ اس کے ہوش میں آجانے کے بعد بالکل ختم ہوگئی تھی۔ اس کے گھر کو اس کو یا اس کے خاندان کو نا سہی لیکن ایمن کو واقعی "ماں" کی ضرورت تھی سو اسے یہ کڑوا گھونٹ بھرنا پڑا تھا اور وہ نا چاہتے ہوئے بھی کونین کے متعلق سوچنے پر مجبور ہوا تھا۔

وہ اگرچہ کبھی یہ امر تسلیم نہیں کرتا تھا کہ اس نکاح کی ضرورت اسے بھی تھی لیکن وہ کونین کا مشکور تھا کہ اس نے سب کچھ سنبھال رکھا تھا لیکن نادانستگی میں ہی سہی مگر وہ اسے ہمیشہ احساس دلاتا رہتا تھا کہ اس نے یہ شادی اپنی منشا کے برخلاف کی تھی صرف اس کے مجبور کرنے پر کی تھی۔

☆☆☆

"زری کی فیملی تو مکمل ہوگئی لیکن نینا کب سنائے گی ہمیں کوئی خوش خبری۔۔؟" یہ ان کی کزن تھیں اور زری کی بیٹی کو دیکھنے آئی تھیں لیکن نینا کے متعلق سوال کیے بنا رہ نا سکی تھیں۔ صوفیہ نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ اپنے آپ میں گم ہر طرف سے لاتعلق ہو کر بیٹھی تھی جیسے کچھ سنا ہی نا ہو حالانکہ یہ ممکن نہیں تھا کہ اس نے سنا، نا ہو۔ ہاسپٹل کے اس چھوٹے سے کمرے میں تو ایک ہچکی نا چھپ سکتی تھی، یہ تو پھر پورا ایک جملہ تھا جو نا صرف طنزیہ بلکہ پُرتجسس انداز میں بھی ادا کیا گیا تھا۔ نینا پھر بھی چپ رہی تھی۔ اسے خاموش رہنا آگیا تھا بالآخر اس نے سیکھ لیا تھا کہ خاموشی میں بھی بڑی عافیت ہے ورنہ تو وہ ذرا سی بات کے جواب میں ہر شخص کو یوں کھری کھری سنا دیا کرتی تھی کہ صوفیہ عاجز آجاتی تھیں اور اب وہ بڑی بڑی باتیں بھی چپ چاپ برداشت کرنے لگی تھی۔

"اس کی فیملی تو ماشاءاللہ پہلے ہی مکمل ہے۔۔۔ ایک بیٹی ہے۔۔۔ رب کی منشا ہوگی تو اور بھاگ بھی لگائے گا ان شاءاللہ۔۔۔" انہوں نے اس کی جانب دیکھتے جواب دیا تھا۔

"بے شک بے شک۔۔۔ لیکن ہمیں بیٹی بھی کب دکھائی ہے اس نے۔۔۔ شوہر اور بیٹی کو تو چھپا چھپا کر رکھتی ہے نینا" ان کی کزن طنز کرنے میں ماہر تھیں۔ صوفیہ نے صرف چند لمحے سوچا تھا کہ آیا انہیں چپ رہنا چاہیے یا جواب دے دینا چاہیے۔ انہوں نے خود بھی ساری زندگی اپنے شوہر کے متعلق جانے کون کون سی باتیں سنی اور برداشت کی تھیں لیکن یہ ضرور سیکھ لیا تھا کہ اس کا فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔ سہنا تو اپنی ذات پر ہی پڑتا ہے اور ان کی بیٹی تو پہلے ہی بہت کچھ سہہ رہی تھی۔ وہ خاموش رہ کر مزید کون سا ثواب کما سکتی تھیں۔

"چھپا کر کیوں رکھے گی۔۔۔ ایسا اچھا شوہر تو سارے خاندان میں کسی کو نہیں ملا ہوگا جیسا نینا کو ملا ہے۔۔۔ رات بھر یہاں ہاسپٹل میں ہی رہا ہے ہمارے ساتھ۔۔۔ صبح کو گھر گیا ہے۔۔۔ اتنا تمیزدار مہذب اور خیال رکھنے والا بچہ ہے۔۔۔ اور بیٹی تو بہت ہی پیاری ہے۔۔۔ رات کو ہی آئے گی باپ کے ساتھ خالہ زری کے بے بی کو دیکھنے۔۔۔ آپ آج مل کر ہی جائیے گا دونوں سے۔۔۔"

نینا نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ اسے شاید اپنی ماں سے اس قسم کے جواب کی امید نہیں تھی۔ وہ تو خود بھی اسے طعنہ دینے سے چوکتی نہیں تھیں۔ انہوں نے اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں پرسکون رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ اولاد کے لیے اتنا تو کر ہی سکتی تھیں بالخصوص اس اولاد کے لیے جس نے ان سے کبھی کوئی توقع کی ہی نہیں تھی۔ خاندان والے ویسے بھی نینا کے متعلق مشکوک بھی زیادہ رہتے تھے۔

خاندان میں سب ہی جانتے تھے کہ نینا نے اپنے والدین کی مرضی کے برخلاف شادی کی تھی۔ ابتدا میں خوب چہ میگوئیاں ہوئی تھیں، طعنے چبھتے ہوئے فقرے، ٹوہ لینے والے سوالات۔۔۔ بہت کچھ سہا تھا انہوں نے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ سب بھول گئے تھے لیکن صوفیہ دیکھتی تھیں کہ نینا جب بھی کسی سے ملتی تھی، اسے اوپر

سے نیچے تک بغور دیکھا ضرور جاتا تھا کہ آیا وہ خوش ہے یا نہیں۔۔۔ سمیع کو خاندان میں کسی نے بھی دیکھا ہوا نہ تھا اور اس لیے اس کے متعلق تجسس بھی زیادہ رہتا تھا۔ تجسس تو خود صوفیہ بھی ہو جاتی تھیں کہ داماد اور بیٹی کا آپس میں رویہ کیسا ہے۔ واضح طور پر تو کچھ پوچھنے کی ہمت نا تھی ان کی لیکن کرید کر طنزیہ گفتگو کر کر اس سے کچھ نا کچھ اگلوانے کی کوشش ضرور کرتی تھیں جس میں عموماً انہیں نا کامی ہی ہوتی تھی۔ وہ سمیع کے متعلق زیادہ نا جانتی تھیں۔

"میں سمیع رندھاوا سے نکاح کر رہی ہوں" نینا نے انہیں اس کے علاوہ بتایا بھی تو کچھ نہیں تھا۔ وہ اس شام بس ہاتھ میں تسبیح لیے جائے نماز پر بیٹھی تھیں جب اس نے آ کر انہیں اطلاع دے دی تھی۔

"میں جانتی ہوں ابا نہیں مانیں گے۔۔۔ لیکن آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ مانوں گی اب میں بھی نہیں۔۔۔ ان ہی کی بیٹی ہوں۔۔۔ لیکن آپ فیصلہ کر لیں کہ آپ میری ماں ہیں یا صرف ان کی زوجہ۔۔۔ ایک دو دن میں بتا دیجیے گا مجھے"

اس نے یہ سب کہا بھی اس انداز میں تھا کہ ہمیشہ کی طرح انہیں غصہ آ گیا تھا۔ زندگی ان کے لیے کس قدر بے رحم رہی تھی۔ شوہر تھا تو اس کے طعنے بھی انہوں نے ہی سنے تھے اور بیٹیاں تھیں تو بھی نافرمان نکلی تھیں۔

"ایسے ہوتی ہیں بھلا بیٹیوں کی شادیاں۔۔۔ خاندان والوں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔۔۔ ان کے سوالوں کے جواب کون دے گا" انہوں نے جل کر سوچا تھا حالانکہ وہ اس معاملے میں نینا کی حمایت کو تیار تھیں لیکن یہ بھی کوئی طریقہ تو نا تھا۔ نینا ہمیشہ وہ کرتی تھی جس کی انہیں رتی برابر امید نا ہوتی تھی۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی جلتی کڑھتی یہی سوچتی رہیں۔ دماغ بالکل ہی ماؤف ہوا جا رہا تھا کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔ گھر میں ایک بہت بڑا ہنگامہ ہونے والا تھا اور ان کے اعصاب اتنے توانا نہیں رہے تھے کہ یہ سب برداشت کر سکتے۔

جائے نماز پر بیٹھے حالات پر رب سے شکوے کرتے، پھر انہی شکووں پر معافیاں مانگتے اور ان حالات کے سدھر جانے کی دعائیں کرتے جانے کتنی دیر لگ گئی تھیں انہیں لیکن جب وہ اپنی جگہ سے اٹھیں تو یہی سوچا تھا کہ جا کر بیٹی سے منت کرتی ہیں کہ انہیں کچھ تو بتائے۔ یہ سارا معاملہ ان کے لیے تو بس ایک معمہ ہی تھا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ وہ نینا کو سمجھائیں گی کہ وہ اس کے ساتھ ہیں اور یہ مسئلہ کسی اور طریقے سے بھی سلجھایا جا سکتا ہے لیکن وہ فون پر بات کرنے میں مصروف تھی۔ صوفیہ اندر داخل نہیں ہوئی تھیں بلکہ بیٹی کے الفاظ نے ان کے قدم ہی جکڑ لیے تھے۔ نینا کہہ رہی تھی۔

"مجھے تو بس یہ بات حیران کرتی ہے خاور کہ اتنی وفاداری کسی عورت کے لیے کسی مرد کے دل میں کیسے آ جاتی ہے۔۔۔ اور اگر ایک مرد کے دل میں اپنی عورت [illegible] اتنی وفاداری آ سکتی ہے تو باقی مردوں کو کس مٹی سے بنایا ہے اللہ نے۔۔۔ اللہ کو چاہیے کہ وہ عورت کو اور [illegible] مگر ایک وفادار مرد ضرور دے۔۔۔ یا پھر کاش میری ماں کی زندگی میں بھی ایسا ایک مرد [illegible] مکمل ہوتی۔۔۔ ایسی اُجڑی بجڑی کونج نا ہوتی۔۔۔ اتنی مردہ دل نا ہوتی"۔

صوفیہ کو لگا کسی نے ان کے [illegible] کر دیا تھا۔ یہ وہ بات تھی جو انہوں نے ساری زندگی دعاؤں میں اللہ سے مانگی تھی [illegible] ایک خواہش کے لیے تڑپی تھیں کہ وہ مرد جسے اللہ نے ان کی زندگی میں شامل [illegible] اس کی طبیعت میں جفا نا ہوتی۔۔۔ انہیں کبھی پتا نا چلا تھا کہ ان کی بیٹی کی بھی [illegible]

انہیں اس روز اندازہ ہوا تھا [illegible] اولاد پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ وہ وہیں سے پلٹ گئی تھیں۔۔۔ ان کے اندر [illegible] سکتیں۔۔۔ انہیں پتا تھا کہ نینا کے پاس ان کے ہر سوال کا جواب ہوگا۔ [illegible] کہ ان کا شوہر آوارہ مزاج ہے۔۔۔ وہ بھید

اپنے سینے میں انہوں نے ماں باپ بہن بھائیوں سے، دوستوں رشتہ داروں سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔۔۔ وہ اولاد سے چھپا نا پائی تھیں۔۔۔ لیکن اس بھید پر پڑا پردہ بار بار اٹھتا تھا تو ہتک بھی ان ہی کی ہوتی تھی۔ اسی ان کے لیے فیصلہ لینا بے حد آسان ہو گیا تھا۔

وہ ساری زندگی کاشف نثار کی زوجہ تو رہی تھیں۔۔۔ لیکن اب انہیں اُم کونین بن کر دکھانا تھا۔

اسی روز کی بات تھی کہ انہوں نے اپنے منہ سے کاشف نثار کو کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اس کی منشا کے سمیع رندھاوا سے کروا رہی ہیں۔۔۔

اس نکاح کی انتہائی سادہ تقریب میں چند لوگوں کے سوا کوئی بھی شامل نہیں ہوا تھا۔۔۔ اور کاشف نثار نے "ان چند" لوگوں میں شامل ہونے سے صاف انکار کر دیا تھا جس کی نینا کو پروا تھی اور نا صوفیہ کو۔۔۔ اور یوں یہ شادی انجام پا گئی تھی

☆☆☆

"میری بیٹی کیسی ہے؟" شہرین کی ادے نے پوچھا تھا۔ سمیع کو شہرین کے کچھ پرانے پیپرز چاہیے تھے جو اسے اپنے گھر میں نہیں مل رہے تھے۔ کونین بھی گھر موجود نہیں تھی کہ وہ اس سے پوچھتا۔ اس نے سوچا کہ شاید شہرین نے بھی وہ پیپرز اپنے میکے میں رکھوا دیے ہوں یا اس کی ادے کو کچھ اتا پتا ہو ان کاغذات کا سو اسی لیے اس نے ان سے رابطہ کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ انہیں شہرین سے ملنے کے لیے بھی بلوائے گا۔

شہرین آج کل بہت الجھی الجھی سی رہنے لگی تھی۔ سمیع نے سوچا شاید وہ اپنی ادے کو یاد کر رہی ہو لیکن بتا نا پا رہی ہو۔ شہرین کی یادداشت جب سے مکمل طور پر ختم ہوئی تھی۔ ادے اس سے ملنے نہیں آتی تھیں۔ وہ اسے دیکھتی تھیں تو انہیں رونا آنے لگتا تھا۔ ان کا مزاج بگڑنے لگتا تھا۔ ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا تھا اور ان کی طبیعت خراب ہونے لگتی تھی سو شہرین کے بھائی اور بابا انہیں لاہور آنے نہیں دیتے تھے۔ اپنی بیٹی کی اس حالت کا ذمہ دار وہ سمیع کو ٹھہراتی تھیں۔ شہرین کی خاطر وہ اس کے گھر آتی تو رہی تھیں، بظاہر ان کا رویہ ٹھیک رہتا تھا لیکن تعلقات بحال ہو جانے کے باوجود سمیع سے ان کا رشتہ کافی سرد مہر تھا۔ وہ اس کے فون کال پر زیادہ خوش نہیں تھیں۔

"ٹھیک ہے۔۔۔" سمیع نے اتنا ہی کہا تھا۔ وہ کیا بتاتا اب انہیں۔۔۔ سب ہی جانتے تھے کہ شہرین کی طبیعت اب کبھی مکمل ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹرز تو کہہ ہی چکے تھے کہ جتنا وقت ان کو اللہ نے دے رکھا ہے وہ تو یہ ضرور پورا کریں گی لیکن ان کی حالت میں مزید کوئی بہتری نہیں آسکتی۔

"تم نے میری بیٹی کو کس حال تک پہنچا دیا سمیع خاناں۔۔۔ میری پھول سی بیٹی کو گہنا دیا تم نے۔۔۔ اللہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا" وہ گلوگیر لہجے میں بولی تھیں۔ سمیع نے جواباً کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ پہلے بھی دُکھ کی انتہا پر اسے کوسنے کی عادی تھیں اور اب تو سمیع کو عادت سی ہو گئی تھی۔

"آپ آئیں نہیں بہت عرصے سے۔۔ آپ ملنے آجاتیں شہرین سے۔۔ وہ خوش ہو جاتی ہے آپ کو دیکھ کر" سمیع نے انہیں اکسایا تھا۔

"اس مسکین نے کیا خوش ہونا ہے۔۔۔ اسے کیا پتا خوشی کیا ہوتی ہے۔۔ میری بیٹی کو تو اس لفظ کا مطلب بھی اس روز بھول گیا تھا جس روز اس کی شادی تم سے ہوئی تھی۔" وہ جلی کٹی سنانے میں ماہر تھیں۔ سمیع پہلے ان کی باتوں پر بھڑک جاتا تھا اور ان سے زیادہ میل ملاقات نہیں رکھتا تھا لیکن شہرین کے بیمار ہو جانے کے بعد سب کچھ تبدیل ہو گیا تھا۔

"درست کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔ کاش میری شادی نا ہوئی ہوتی اس سے" سمیع نے ان کی ہاں میں ہاں لائی تھی۔

"اب باتیں کرنے کا کیا فائدہ ہے۔۔۔ یہ اداکاریاں ہمارے سامنے مت کیا کرو جیسے تمہیں بہت دکھ ہے میری بیٹی کی بیماری کا۔۔۔ تم نے تو اسے اِس حال تک پہنچایا ہے۔۔۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اللہ کے یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔۔۔ ایک دن آئے گا اور میں تمہارا گریبان پکڑ کر انصاف مانگوں گی اللہ کی عدالت میں۔۔۔ میری بیٹی کو اس حال تک پہنچانے والے تم ہو سمیع۔۔۔ تم اچھے انسان نہیں ہو۔۔۔ انسان کے روپ میں شیطان ہو تم"۔

وہ رو بھی رہی تھیں اور اسے کوس بھی رہی تھیں۔ سمیع کا دل بوجھل سا ہو گیا تھا۔ وہ ایک ماں کو کیا تسلی دیتا۔۔۔ وہ تو چپ چاپ ان کی گالیاں بھی سن لیا کرتا تھا اب

"میری بیٹی نے کیا کیا نہیں کیا تمہارے لیے۔۔۔ اپنے ماں باپ۔۔۔ بہن بھائی چھوڑ دیے۔۔۔ تمہارے ماں باپ کے طعنے سہے۔۔۔ تم نے جس حال میں اسے رکھا۔۔۔ اس نے "اُف" تک نا کی۔۔۔ تم جیسے دو ٹکے کے انسان کو ہمیشہ اپنے ماں باپ پر فوقیت دی اس نے۔۔۔ اس کا صلہ یہ دیا تم نے کہ اس کی زندگی میں ہی سوکن لے آئے۔۔۔ ارے تم سے تو اس کے مرنے کا انتظار بھی نا ہوا۔۔۔ اتنی بڑی زیادتی سمیع خاناں۔۔۔ تم نے سوچا ہے کبھی کہ اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔۔۔ وہ جب تمہیں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ دیکھتی ہوگی تو کیا سوچتی ہوگی۔۔۔ ظالم انسان ہو تم۔۔۔ بہت ظالم۔۔۔ خبیث آدمی تم نے ہماری بددعاؤں پر گھر بسایا ہے اپنا۔۔۔ لیکن تم دیکھنا ایک دن سب کا بدلہ دینا پڑے گا تمہیں۔۔۔ یہ سب تمہیں بھی سہنا پڑے گا۔۔۔ جس طرح ہم روتے ہیں نا اپنی بیٹی کے لیے۔۔۔ ایک دن تم بھی اپنی اولاد کے لیے۔۔۔ ان شاء اللہ۔۔۔ ایسے ہی رو ؤ گے۔۔۔ تمہیں بھی یہی تکلیف دے گا رب۔۔۔ ایک ماں کے دل سے نکلی دعا تو عرش تک جاتی ہے۔۔۔ اور میری دعا ہے کہ جس طرح میری بیٹی کو اتنی اذیت والی زندگی دی ہے نا تم نے۔۔۔ خدا تمہاری بیٹی کے آگے بھی یہی سب لائے۔۔۔ پھر تمہیں پتا چلے گا کہ بیٹی کا دکھ کیا ہوتا ہے۔۔۔ تمہارے سارے کرتوتوں کی سزا تمہاری بیٹی کو ملے گی۔۔۔ ایک دن۔۔۔ ان شاء اللہ۔۔۔ ان شاء اللہ"۔

وہ روتے ہوئے اب ایمن کو بھی بددعائیں دینے لگی تھیں۔ سمیع نے چپ چاپ فون بند کر دیا تھا۔ اس کا دل بے حد بوجھل ہو گیا تھا۔

"کتنی نفرت ہے آپ کے دل میں ادے۔۔۔ ایسا کیا بگاڑا ہے میں نے آپ کا۔۔۔ میں نے تو کبھی کسی کو دکھ دینا نہیں چاہا تھا۔ لیکن قدرت کو جانے کیا منظور ہے۔۔۔ میری تو ہر سیدھی تدبیر بھی الٹی ہو جاتی ہے۔۔۔ میں اپنا سینہ کھول کر کسے دکھاؤں؟ مجھ سے تو کوئی بھی خوش نہیں ہے۔۔۔ امی۔۔۔ ادے۔۔۔ شہرین۔۔۔ اور اب تو اس فہرست میں کونین بھی شامل ہو گئی ہے" اس نے تھکے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا تھا

"تمہارے سارے کرتوتوں کی سزا تمہاری بیٹی کو ملے گی" اس کے ذہن میں ادے کا فقرہ جھکڑ کی طرح چل رہا تھا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ پیاس کی وجہ سے کھلی تھی۔ رات اماں رضیہ نے کھانے میں قیمہ کریلے بنا رکھے تھے اگرچہ سر درد کی وجہ سے اس نے بہت پیٹ بھر کر تو نہیں کھایا تھا لیکن پھر بھی طبیعت بے چین سی ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ منہ کا ذائقہ عجیب سا ہو رہا تھا اور شدید پیاس بھی لگ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور سائڈ ٹیبل کی جانب پانی لینے کے لیے دیکھا تھا لیکن وہاں پانی کا گلاس موجود نہیں تھا۔ اسے بہت بے زاری محسوس ہوئی۔ اسے عام حالات میں بھی رات کو اٹھ کر ایک بار پانی پینے کی عادت تھی۔ کونین نے اس کی اس عادت کو بہت جلدی بھانپ لیا تھا سو وہ مانگتا یا نا مانگتا۔۔۔ پانی کا گلاس بھر اس کی سائڈ ٹیبل پر ضرور رکھ دیا کرتی تھی۔ آج وا

موجود نہیں تھی۔ اپنی بہن کی حالت کے باعث وہ مزید ایک روز ہاسپٹل میں ہی ٹھہر گئی تھی تو اماں رضیہ نے اس کے کمرے میں پانی بھی نا رکھا تھا۔ وہ سخت کوفت زدہ ہو کر اٹھا اور سلیپر گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر نکلا تھا۔ کچن نچلے پورشن میں تھا۔ وہ جماہیاں لیتا سیڑھیاں اتر کر کچن میں آ گیا۔ ابھی ڈسپنسر سے پانی کا گلاس بھرا ہی تھا کہ اسے احساس ہوا کہ ایمن کے کمرے سے اس کی رونے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اس نے گلاس میز پر رکھا اور لپک کر اس کے کمرے کی جانب بڑھا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ ایمن شاید خواب میں ڈر کر اٹھ گئی ہے۔ وہ اس کے بیڈ کے قریب پہنچا تو وہ اور خوف زدہ ہو کر رونے لگی تھی۔ اس نے بستر پر بیٹھتے ہوئے اسے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ بھی روتے ہوئے اس کی گود میں دبک گئی تھی۔

"ارے میرا بچہ۔۔ کیا ہو گیا۔۔۔ کیوں رو رہی ہو۔۔ خواب دیکھا ہے کوئی۔۔؟" عام حالات میں ایمن اس سے کبھی ایسے قریب نہیں ہوئی تھی۔ سمیع کو اسے گلے لگانے کا کبھی وقت ہی نا ملا تھا لیکن اب جیسے اس کے رونے کی آواز سن کر وہ بے چین ہوا اٹھا تھا۔

" کونین کیوں نہیں آتیں؟" سمیع نے دو دن پہلے اس سے کافی سخت لہجے میں بات کی تھی تب سے دوبارہ اس نے کونین کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن اب وہ کافی بلک رہی تھی اور کونین کا نام لے لے کر بلک رہی تھی۔ اسے اماں رضیہ پر سخت غصہ آیا جو ایمن کے ساتھ سونے کے بجائے اپنے کمرے میں سو گئی تھیں۔ شہرین ایمن کے ساتھ ہی سو رہی تھی لیکن وہ تو دماغی طور پر اس کی ہم عمر ہو چکی تھی۔ وہ اپنی مدد نہیں کر سکتی تھی تو ایمن کی کیا مدد کرتی اور ویسے بھی وہ کبھی بھی رات کو اٹھ کر کسی اور کمرے میں جا کر بھی سو جایا کرتی تھی۔

" کونین کو بلا دیں۔۔۔ وہ کیوں نہیں آ رہی ہیں۔۔ " ایمن کی ایک ہی ضد تھی حالانکہ وہ کسی قدر غنودگی میں لگتی تھی لیکن اسے یاد کونین کی ہی آ رہی تھی۔ سمیع کو کونین پر بھی غصہ آیا جو دو دن سے اپنی بہن کے پاس ہی تھی۔ وہ بے شک اسے کہہ آیا تھا کہ اپنی سہولت دیکھ کر واپس آ جانا لیکن دو دن میں ہی یہاں اس کا گھر الٹ پلٹ ہوا جا رہا تھا بالخصوص ایمن کسی سے بھی نہیں سنبھلتی تھی۔ بچی کو سینے سے لگائے وہ کافی دیر اس کی پشت سہلاتا رہا۔ وہ شاید کافی دیر سے اٹھی ہوئی تھی اور کافی زیادہ سہمی ہوئی تھی کیونکہ اس کی سانس بھی ہموار نہیں تھی۔ سمیع کافی دیر اسے پچکارتا رہا تھا۔ وہ دوبارہ سے اپنے بستر پر لیٹ گئی تھی لیکن کافی سہمی ہوئی تھی۔

" کونین واپس نہیں آئیں گی کیا۔۔۔ وہ کبھی واپس نہیں آئیں گی؟" اپنی جگہ پر لیٹ کر بھی وہ روہانسی ہی تھی۔ سمیع نے اس کے بالوں میں بہت نرمی سے انگلیاں چلائی تھیں۔

وہ ہاسپٹل میں ہے ایمن۔۔ کل آ جائیں گی۔۔۔ "اس نے تسلی دی تھی۔

" آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا۔ سمیع نے کل بھی اسے یہی کہہ دیا تھا کہ وہ آ جائے گی لیکن وہ نہیں آئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں چڑ رہا تھا لیکن بچی کے سامنے تحمل سے ہی بولا۔

"میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔۔۔ وہ واقعی کل آ جائیں گی۔" ایمن چند سیکنڈز کچھ نہیں بولی پھر بولی تو لہجہ پہلے سے زیادہ گلوگیر تھا

" مجھے پتا ہے ہاسپٹل سے کوئی بھی جلدی واپس نہیں آتا۔۔۔ جو بھی ہاسپٹل جاتا ہے۔۔۔ وہیں رہ جاتا ہے۔۔ یا پھر ٹھیک ہو کر واپس نہیں آتا۔۔۔ کیا کونین بھی ماما جیسی ہو جائیں گی" سمیع پہلے اس کی بات سمجھا نہیں لیکن جب سمجھا تو اس کا دل دہل گیا تھا۔ ایمن اس بات سے ڈری ہوئی تھی کہ کونین ہاسپٹل سے شہرین جیسی ہو کر نا واپس آ جائے۔ وہ ننھی بچی ماں کی حالت سے بس یہی سیکھ پائی تھی کہ اگر کوئی ہاسپٹل جاتا ہے تو واپسی پر اپنے آپ کا بھی نہیں رہتا ایمن کو ڈر تھا کہ کونین بھی اب شہرین کے جیسی ہو جائے گی یعنی وہ کونین کو کھو دینے سے ڈرتی تھی۔

۔۔۔سمیع چند لمحے بس بوجھل سا دل لیے اسے دیکھتا رہا پھر وہ ایمن کے ساتھ ہی اس کے سرہانے پر سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ اپنا ایک بازو اس نے اس کے گرد رکھ لیا تھا لیکن اس کے پاس کہنے کے لیے ایک بھی لفظ نا تھا۔ وہ ایک ننھی بچی کو زندگی کی اس ستم ظریفی کے بارے میں کیا لیکچر دیتا جسے وہ خود بھی ابھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ اس نے کاٹ پر سوئی ہوئی شہرین کی جانب دیکھا۔ شہرین کے لیے ایمن کے کمرے میں ایک الگ کاٹ موجود تھی۔ وہ اکثر کہیں بھی سونے کی ضد کرنے لگتی تھی۔ اسی لیے سمیع نے یہ فولڈنگ کاٹ اس کے لیے بنوائی تھی۔ ابھی بھی وہ اس پر پر سکون گہری نیند سو رہی تھی۔ ان سب سے لاپروا۔ بے نیاز وہ سو رہی تھی

"آپ مجھے کونین کے پاس چھوڑ آئیں۔۔۔" ایمن کی سسکتی ہوئی آواز آئی تھی۔

"آپ ابھی سو جاؤ۔۔ میں کونین کو کال کر دیتا ہوں۔۔ وہ آجائیں گی صبح" سمیع نے اسے تسلی دی تھی۔ وہ اس کی جانب مڑی اور پھر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں لیکن وہ سمیع سے بات کیے بنا سونا نہیں چاہ رہی تھی۔

"آپ کونین کو کال کریں گے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ سمیع نے سر ہلایا تھا

"آپ ان کو کہیں وہ واپس آجائیں۔۔ ہمیں بے بی نہیں چاہیے۔۔۔ میں دوبارہ بے بی نہیں مانگوں گی۔" وہ اپنی ہی دھن میں بولی شاید اس نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں لیکن اسے خدشہ تھا کہ اس کا باپ اسے جھوٹی تسلی دے رہا ہے۔

"آپ ان کو یہ بھی کہنا کہ میں کبھی بے بی کے لیے ضد نہیں کروں گی۔۔۔" وہ اب جیسے خود سے باتیں کر رہی تھی۔ سمیع کو اس کی بات سن کر حیرت سی ہوئی۔ وہ اس کی بات کا سرا پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا آپ بے بی کے لیے ضد کرتی ہو؟" اس نے غیر ارادی طور پر ہی ایمن سے سوال کر لیا تھا۔

"میں نے کونین سے کہا تھا کہ ہمارے پاس ایک بے بی کیوں نہیں ہے۔۔ ہمارے پاس بھی ہونا چاہیے۔۔۔ میری کلاس میں سب بچوں کے گھر میں چھوٹے بے بی ہیں۔۔۔ سب ان کی باتیں کرتے ہیں۔۔۔ میں نے کونین سے کہا تھا ہم بھی ایک بے بی لے آتے ہیں" وہ اپنی ہی دھن میں بول رہی تھی۔ سمیع کو اس کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

"کونین نے آپ کو سمجھایا نہیں کہ ہمیں بے بی نہیں چاہیے" اس نے پوچھا تھا اور ساتھ ہی ایمن کو دوبارہ سے لیٹ جانے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

"یہ ہمارا سیکرٹ ہے لیکن میں آپ کو بتا دیتی ہوں۔۔۔ کونین نے کہا تھا کہ وہ آپ سے بات کریں گی۔۔۔ اگر آپ نے پرمیشن دی تو ہم بھی بے بی لے آئیں گے۔۔۔۔ اس کا نام ہم مومن سمیع رکھیں گے۔۔۔ جیسے ایمن۔۔۔ ویسے مومن۔۔" وہ اب اپنی نیم وا آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں استفہامیہ انداز دیکھ رہی تھی۔ سمیع اس کی آنکھوں میں چھپے سوالوں سے سخت جھنجلا [illegible] بھی اس کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

"واٹ ربش۔۔۔۔ آپ تو خود بے بی ہو ابھی۔۔ [illegible] بے بی۔۔۔ آپ سو جاؤ اب۔" وہ اسے تھپکنے لگا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ ایمن نے دوبارہ [illegible] بند کر لی تھیں۔ وہ باپ کی ذرا سی اونچی آواز سے بھی خائف ہو جایا کرتی تھی۔ سمیع کو تاسف [illegible]

وہ ایمن کے ساتھ اس طرح سخت لہجے میں بات [illegible] وہ چاہتا تھا کہ اس کے اور اس کی بیٹی کے تعلقات نارمل ہی رہیں لیکن ایسا ہو نہیں پاتا تھا۔ [illegible] دے پاتا تھا۔ کونین ہی ایمن کے رزلٹس کارڈز اس کے بنائے چھوٹے چھوٹے آرٹ [illegible] لیے اس کے ارد گرد گھومتی رہتی تھی۔ وہ وقت ملنے پر بھی دیکھتا تھا، کبھی بنا دیکھے [illegible] کر دیا کرتا تھا۔ وہ کیا پڑھ رہی ہے

کیسے گریڈز لا رہی ہے۔۔ کیا سیکھ رہی ہے۔۔ اس نے سب کونین پر چھوڑ دیا ہوا تھا۔ اسی لیے اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ ایمن اور کونین کیا باتیں کرتی رہتی ہیں لیکن ایمن کی باتیں سن کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے درمیان کس نوعیت کی باتیں ہونے لگی تھیں۔ اسے کونین پر ایک بار پھر غصہ آیا۔ اسے اتنی چھوٹی بچی سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ وہ ایمن کو خود کچھ کہتا تو وہ مزید اس سے ناراض ہو جاتی یا بے سکون ہو جاتی جو کہ وہ چاہتا نہیں تھا۔

اس نے گہری سانس بھری تھی۔ اس کی اور اس کی اکلوتی اولاد کی زندگی میں سکون نام کی شے ہی نہیں تھی۔ اپنے اپنے محاذ پر وہ دونوں ہی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے لڑ رہے تھے۔ اب تو اسے اپنی حالت پر رونا بھی نہیں آتا تھا۔ ایمن اس کے بازوؤں کے حلقے میں تھی لیکن بے چین تھی سمیع نے اسے خود سے قریب کیا اور دھیرے دھیرے بنا کچھ بولے اس کی پشت تھپکنے لگا تھا۔ ایمن چند لمحوں بعد گہری نیند سو گئی تھی۔ سمیع وہیں اس کے ساتھ لیٹا رہا۔ اس کے ذہن میں ایک سوچ آ رہی تھی اور ایک جا رہی تھی۔ سامنے دیوار پر ایمن اور کونین کی تصویر تھی۔ یہ سارا کمرہ کونین نے کچھ عرصہ پہلے بالخصوص ایمن کی پسند کو مدِنظر رکھتے ہوئے سجایا تھا۔ اس کمرے میں ہر چیز پر اس نے اپنا پیسہ خرچ کیا تھا۔ رنگین کاغذوں سے بنائے ہوئے پھول بوٹے، کارٹون کی تصویریں، کپڑے اور ٹشو پیپرز کے پھول۔۔۔ ایک سوفٹ بورڈ پر ایمن کے اسکول سے بنا کر لائے گئے کتنے ہی کارڈز اور کرافٹس آئٹم سجا رکھے تھے۔

وہ اس کی بیٹی کے لیے کیا کچھ نہیں کرتی تھی۔

سمیع کے ذہن کے پردے پر کونین کا چہرہ جگمگایا۔۔۔ اس نے کبھی اس چہرے کو غور سے دیکھا نہیں تھا لیکن عجیب بات تھی کہ وہ اس کے ہر نقش سے واقف تھا۔ اس کی ناک کے قریب گال پر ایک تل تھا۔ وہ بہت کم کھل کر مسکراتی تھی لیکن جب مسکراتی تھی تو اس کے گال کچھ پھیل سے جاتے تھے اور وہ تل مزید نمایاں ہو جاتا تھا۔ جب ہاسپٹل میں وہ اس سے ہاتھ ملا رہا تھا تو اس نے دیکھا تھا، وہ تل کچھ پھیلا تھا۔۔۔ اور اس کی آنکھیں جن میں کوئی کشش اسے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن ان آنکھوں میں سمیع کی محبت کی طلب جگمگانے لگی تھی جو اس سے کبھی مخفی نا رہی تھی۔ کونین کی آنکھیں اسے دیکھ کر جگمگانے لگتی تھیں۔ وہ کوئی ٹین ایجر تو نہیں تھا جو ان رنگوں کو اور اس کے جذبات کو پہچان نا سکتا۔ وہ ایک شادی شدہ مرد تھا۔ زندگی کے کئی روپ دیکھ لیے تھے اس نے۔۔۔ بال اگرچہ ابھی سفید نہیں ہوئے تھے لیکن حادثات ایسے ایسے گزرے تھے زندگی کے سفر میں کہ تجربہ سفید بالوں والا ہی ہو چکا تھا۔ وہ اگر ایک جوان لڑکی کی آنکھوں کے رنگوں کو نہیں پہچان سکتا تھا تو پھر زندگی سے کیا سیکھا تھا اس نے۔۔۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ دل کی حالت جیسے یکدم بدلی تھی۔

"یہ ہمارا سیکرٹ ہے لیکن میں آپ کو بتا دیتی ہوں۔۔۔ کونین نے کہا تھا کہ وہ آپ سے بات کریں گی۔۔۔ اگر آپ نے پرمیشن دی تو ہم بھی بے بی لے آئیں گے۔۔۔ اس کا نام ہم مومن سمیع رکھیں گے۔۔۔ جیسے ایمن۔۔۔ ویسے مومن۔۔۔" ایمن کا کہا گیا جملہ جیسے سماعتوں میں گونج کر رہ گیا تھا۔ کونین نے ایمن سے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ "پرمیشن" لے گی۔۔۔ یہ تو کوئی اٹھارہ سال کا بچہ بھی سمجھ سکتا تھا۔۔۔ وہ تو پھر ایک مرد تھا۔

اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھاما تھا۔

"تمہارے سارے کرتوتوں کی سزا تمہاری بیٹی کو ملے گی" ادے نے کتنی تلخی سے بددعا دے دی تھی۔

"کونین کی بددعائیں جانے کہاں جمع ہو رہی ہوں گی" اس نے درد ہوتے سر کو انگلیوں سے دباتے ہوئے سوچا تھا۔ اب اس کے لیے سکون سے سو جانا کافی مشکل ہو گیا تھا

☆☆☆

"تم جا رہی ہو؟" اگلی صبح زری کی آنکھ کھلنے سے پہلے ہی نینا اپنی چیزیں سمیٹ کر بیٹھی ڈرائیور کا انتظار کر

رہی تھی۔ زری پہلے دن تو کافی تکلیف میں رہی تھی لیکن دوسرے دن اس کی حالت کافی بہتر ہوگئی تھی اور اب تیسرا دن تھا۔ اب تو وہ خود اٹھ کر باتھ روم تک گئی تھی۔ وہیل چیئر اور کسی کی مدد کے بغیر نرسری جا کر انکیوبیٹر میں موجود اپنی بچی کو بھی دیکھ آئی تھی۔ اس کی حالت کیسی بھی ہوتی، نینا نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ سمیع نے اسے صبح واٹس ایپ کیا تھا

"ایمن آپ کو مس کر رہی ہے" ایک ہی فقرہ لکھا ہوا تھا لیکن نینا نے فرض کرلیا تھا کہ سمیع نے میسیج کیا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ بھی اسے مس کر رہا تھا۔ اب وہ مزید نہیں رک سکتی تھی۔ سمیع بنا کچھ لکھے ایک بلینک ٹیکسٹ بھی کر دیتا تب بھی وہ فوراً واپس جانے کی کرتی لیکن اب تو پورا ایک جملہ تھا

"ہاں۔۔" نینا نے جواب دیا تھا۔ امی ابھی تک گھر سے آئی نہیں تھیں۔ وہ چاہ رہی تھی کہ اس کے ہاسپٹل سے نکلنے سے پہلے کم از کم وہ آجاتیں۔ زری اس کے انداز بغور دیکھتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی تھی جو نینا سمجھ نا سکی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ زری کو اس کا جانا خار میں مبتلا کر رہا ہوگا۔ اس نے اسے پہلے سے ہی کہہ رکھا تھا کہ میری ڈیلیوری کے وقت تم امی کے گھر رہنے آجانا۔ اس نے ہامی بھی بھرلی تھی؛ لیکن یہ اندازہ تو کسی کو بھی نا تھا کہ یہ سب وقت سے پہلے ہوجائے گا۔ ابھی تو ایمن کے اسکول کی چھٹیاں بھی نہیں ہوئی تھی سو وہ زیادہ دن کے لیے رک نہیں سکتی تھی جبکہ اسے اندازہ تھا کہ زری برا مان جائے گی اسی لیے مسکرا کر بولی تھی۔

"ہاں۔۔۔ تم اب بہتر ہونا۔۔۔ ویسے بھی کل تو ڈسچارج کر ہی دیں گے تمہیں" نینا اس کی جانب دیکھے بنا بات کر رہی تھی۔ وہ بلا ضرورت بار بار اپنے سیل فون کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ کل بھی ایمن کو فون کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے موبائل میں بیلینس ہی نہیں تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ وہ آتے ہوئے پیسے لا نہیں سکی تھی اور اب امی سے کہنا اسے اچھا نا لگ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سمیع خود اسے فون کر کے ایمن سے اس کی بات کروا دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا جس کا اسے شدید دکھ بھی تھا۔

"نینا ہاسپٹل والے ڈسچارج کر بھی دیں تب بھی امی اکیلے مجھے کیسے سنبھالیں گی۔۔۔ وہ میرا خیال نہیں رکھ سکتیں۔۔ اسی لیے میں نے تمہیں کہا تھا کہ کچھ دن امی کے گھر رہ لو" زری سخت برا مان کر بولی تھی

"تم ہاسپٹل سے نکل کر امی کے گھر پہنچو تو سہی۔۔۔ میں پھر آجاؤں گی" نینا پرسکون تھی

"پھر کب۔۔۔؟ جب مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نا رہے گی؟" وہ چوکر پوچھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ نینا کچھ کہتی۔ زری مزید بولی تھی

"نینا۔۔ میرا سیزرین ہوا ہے۔۔۔ اسٹیچز لگے ہیں مجھے۔۔۔ تکلیف سے مری جا رہی ہوں میں۔۔۔ اتنی بری حالت میں تم مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہو۔۔۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔۔۔ میں تو ابھی خود اٹھ کر پانی بھی نہیں پی سکتی یار" وہ کافی ناراض لگ رہی تھی

"اوہو۔۔ تم تو ایموشنل ہی ہوگئی ہو۔۔۔ میں کہہ تو رہی ہوں میں آجاؤں گی۔۔۔ ابھی ایمن اکیلی ہے نا۔۔۔ تین دن سے یہاں ہی ہوں اتنے دن گھر سے دور رہنا افورڈ نہیں کر سکتی میں۔۔۔ ایمن میرے بغیر نہیں رہتی۔۔۔ سمیع نے صبح ہی صبح واٹس ایپ کیا ہے کہ واپس آجاؤ اب" وہ اسے تسلی دے رہی تھی لیکن اس کا موڈ مزید خراب ہوا تھا

"مجھے جیسے پتا نہیں ہے تمہارے گھر کا۔۔۔ اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ کسی کو وہاں تمہاری پروا نہیں ہے۔۔۔ تم خود ہی مری جا رہی ہوتی ہو اس دو ٹکے کی لڑکی کے لیے جو تمہاری سگی اولاد بھی نہیں ہے۔۔۔ حقیقت یہ ہے نینا کہ تم اپنے گھر والوں کے کسی کام نہیں آنا چاہتیں۔ میں جانتی ہوں کہ میں مشکل میں ہوں۔۔۔ مجھے اور امی کو تمہاری ضرورت ہے لیکن تم ہمارا احساس کیوں کرو گی۔ میں جانتی ہوں تم ہر ویک اینڈ پر امی کے گھر آسکتی

ہو۔۔۔چار چار دن اپنے سو کالڈ "گھر" کی پروا کیے بغیر رہ سکتی ہو لیکن اب جب ہم چاہتے ہیں کہ تم رہو تو تم نہیں رہ سکتی"۔

وہ اٹھتے ساتھ ہی ناراض ہو گئی تھی۔اب کی بار نینا کو بھی بُرا لگا مگر وہ زری کو ڈیڑھ دن پہلے زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا دیکھ چکی تھی۔وہ جانتی تھی کہ زری فی الوقت واقعی بہت تکلیف میں ہے اس لیے اس نے اپنے لہجے کو بگڑنے نہیں دیا تھا۔

"گھر تو گھر ہی ہوتا ہے زری۔۔۔اور عورت کی ضرورت اس کے گھر کو ہمیشہ رہتی ہے۔۔۔میں آج چلی جاتی ہوں۔۔کل تمہیں ڈسچارج کر دیں گے۔۔۔پرسوں میں پھر آ جاؤں گی۔۔۔پرسوں ویک اینڈ ہے۔۔پھر ایمن کی دو چھٹیاں ہوں گی نا تو مجھے مسئلہ نہیں ہوگا" وہ بہت تحمل بھرے لہجے میں بولی تھی۔

"ایمن۔۔ایمن۔۔۔ایمن۔۔۔تمہیں وہ بچی عزیز ہے جس سے تمہارا کوئی رشتہ بھی نہیں۔۔۔لیکن تمہیں میری پروا نہیں ہے۔۔جس سے تمہارا خون کا رشتہ ہے۔"زری کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہی تھی

"زری وہ بچی میری بیٹی ہے۔۔"اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ زری نے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہی تو تمہاری بھول ہے نینا۔۔وہ تمہاری بیٹی نہیں ہے۔۔۔اور کبھی ہو گی بھی نہیں۔۔۔تم اس غلط فہمی سے نکل ہی آؤ تو بہتر ہے۔۔۔کیا ہم جانتے نہیں ہیں کہ اس کا باپ تمہیں منہ بھی نہیں لگاتا۔۔۔تم چاہے ہم سے چھپا کر رکھو۔جتنے مرضی پردے ڈالتی رہو لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ تم سمیع رندھاوا کے لیے صرف ایک کام والی سے بڑھ کر نہیں ہو۔۔۔اس خود غرض انسان نے تمہیں گھر کی نوکرانی کے طور پر قبول کیا ہوا ہے تاکہ تم اس کی پاگل بیوی اور بچی کے پوتڑے دھوتی رہو۔۔تم کس گمان ہو۔۔کیا سوچتی ہو تم کہ تمہاری خدمت سے متاثر ہو کر وہ تمہیں واقعی بیوی سمجھنے لگے گا۔۔۔ایسا نہیں ہوتا اور نا ہوگا۔۔۔نوکرانی کو بیوی کوئی نہیں بناتا۔۔۔بیوی کو نوکرانی بنا لیتے ہیں لوگ"۔

وہ انتہائی خشک لہجے میں بولی تھی۔نینا بالکل سُن ہو گئی۔اس نے کبھی بھی اپنے اور سمیع کے متعلق کوئی ایک چھوٹی سی بات بھی زری کو یا امی کو نہیں بتائی تھی۔وہ تو پہلے ہی اپنے متعلق بات کرنے کی عادی نا تھی اور شادی کے بعد تو اس نے ویسے ہی بن باس لے لیا تھا۔سمیع شہرین اور ایمن کے علاوہ اس کو کسی کی پروا تھی ہی نہیں۔وہ زری کو کوئی جواب دینا چاہتی تھی لیکن اسے زری کے انداز نے اتنا دکھ دیا تھا کہ وہ چپ سی رہ گئی تھی۔زری نے اس کی جانب بغور دیکھا پھر اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کراہ بھر کر ذرا تاسف بھرے انداز میں بولی تھی۔

"ہم منہ سے کچھ نہیں کہتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے نینا کہ ہمیں نظر نہیں آتا۔تمہاری اجڑی بکھری حالت سے عیاں ہے سب۔۔۔تمہاری بہن ہوں۔۔اس لیے سمجھا رہی ہوں۔۔۔یہ نہیں کہہ رہی کہ اس شخص کا احساس مت کرو یا اس بچی کو پیار نا کرو۔۔۔۔لیکن ان سب کے لیے خود کو ہلکان مت کرو۔۔ان کا اتنا ہی خیال رکھو جتنا وہ تمہارا رکھتے ہیں۔۔۔یہ فضول کی چاکری کرنا بند کر دو۔۔۔کل سے دیکھ رہی ہوں اور پہلے بھی محسوس کرتی رہی ہوں کہ وہ شخص کبھی ایک کال نہیں کرتا تمہیں۔۔۔۔۔آج جب بچی کے کاموں کے لیے اسے ضرورت پڑی تو میسج کر دیا اس نے تمہیں۔۔۔اور تم بھی سب چھوڑ چھاڑ تیار ہو گئیں۔۔۔۔صاف کہو انہیں کہ ابھی امی کی طرف ہی رہوں گی۔اپنی اہمیت کو سمجھو۔۔۔تم نے ایک شادی شدہ مرد سے شادی کی ہے۔۔۔وہ تو پہلے ہی آدھا ملا تھا تمہیں اور آدھا تم نے اسے اپنی حرکتوں سے گنوا دینا ہے۔۔۔ارے اسے راجا اِندر بنا کر رکھو گی تو وہ تمہیں کنیز ہی سمجھتا رہے گا ملکہ نہیں بنائے گا اپنی سلطنت کی۔۔۔شوہر کو شوہر سمجھو۔۔بادشاہ نہیں۔۔"

زری تکلیف کے باوجود اپنا گیان اسے منتقل کرنے میں پوری طاقت لگا رہی تھی۔نینا کے پاس الفاظ نہیں

تھے کہ وہ اسے کوئی جواب دیتی۔۔۔
زری نے اس کی زندگی کے اتنے پیچیدہ ڈھکے چھپے مسئلے کو ایک منٹ میں جیسے کھول کر اس کے منہ پر دے مارا تھا۔
اسی دوران اس کے موبائل پر ڈرائیور کی مسڈ کال آئی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ ہاسپٹل کے باہر آچکا ہے۔ وہ چپ چاپ اپنی جگہ سے اٹھی اور پھر اپنا بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا تھا۔ زری اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ بہت خفا ہے۔
زری نے بڑبڑا کر کچھ کہا جو نینا ایک بار پھر سمجھ نہیں سکی تھی۔ وہ جانے کے لیے چپ چاپ دروازے کی جانب بڑھی تھی۔
"میں کیا بکواس کر رہی ہوں اور تم کیا کر رہی ہو۔۔۔ تم پر کبھی میری بات کا اثر نہیں ہوتا۔۔۔" زری مزید ناراض ہوگئی تھی۔ نینا کو اس کی ضد سے چڑ ہونے لگی تھی۔ وہ پلٹ کر اس کے بستر کے قریب آئی۔
"اچھا۔۔۔ بتاؤ۔۔ کیا کروں۔۔۔ گھر برباد کرلوں اپنا۔۔۔" وہ اس کی جانب دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر بنا بولے ایک دوسری کی جانب دیکھتی رہیں پھر نینا دوبارہ دروازے کی جانب بڑھ گئی تھی" میں پرسوں آجاؤں گی۔۔۔ اپنا خیال رکھنا" نینا نے اس کی جانب دیکھے بنا کہا تھا۔
"گھر برباد کرلوں اپنا۔۔۔؟" زری نے طنزیہ انداز میں اس کا جملہ دہرایا تھا۔
"پہلے اس گھر کو آباد تو کرلو بی بی۔۔۔ وہ تو تم سے آباد ہی نہیں ہوا ابھی تک" وہ بہت ناراض ہوگئی تھی۔ نینا چپ رہی۔ وہ مزید کچھ نہیں بولنا چاہتی تھی۔ زری کا غصہ مگر ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا
"گھر وہ آباد ہوتے ہیں بلکہ سدا آباد رہتے ہیں جو ماں باپ کی مرضی سے بسائے جاتے ہیں۔۔۔ تم نے تو گھر بسایا ہی ماں باپ کی بددعاؤں پر ہے اور میری یہ بات یاد رکھنا نینا۔۔۔ تم جس مکان کو گھر بنانے میں ہلکان ہوئی جا رہی ہو نا۔۔۔ اس کی بنیادوں میں تمہارے ماں باپ کی بددعاؤں کے علاوہ ایک پاگل مرتی ہوئی عورت کی آہیں، اس مرتی ہوئی عورت کے ساتھ پل پل مرتے ہوئے تمہارے آدھے ادھورے شوہر کی نفرت اور بے زاری اور ان دونوں کی ایک نیم پاگل بچی کے چونچلوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔۔۔ کونین کاشف نثار وہ مکان ہے ہی نہیں۔۔۔ وہ قبرستان ہے۔۔۔ اور قبرستان زندہ لوگوں سے آباد نہیں ہوا کرتے" زری اس کے جانے کے عمل سے سخت خفا ہو کر غرا کر بولی تھی۔ نینا برف بزف وجود لیے چل پڑی تھی۔

☆☆☆

"ادے۔۔۔ میں روئی تھی" شہرین اس کے پاس بیٹھی سادہ سے انداز میں اسے کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے کہے گئے الفاظ کو سمجھنا اب بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بولتی تھی تو منہ سے لعاب زیادہ نکلتا تھا اور الفاظ کم۔۔۔ مگر پھر بھی نینا سمجھ گئی تھی کہ وہ اس کی گھر میں غیر موجودگی کو محسوس کر رہی تھی۔ ایسا پہلے بھی ہوتا تھا۔ وہ جب بھی امی کے گھر رہنے جاتی تھی تو واپسی پر اس کے رویے کی بے زاری کو محسوس کیے بغیر شہرین اسے بہت تپاک سے ملتی تھی لیکن اس بار اس کا انداز کچھ عجیب تھا۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی لگتی تھی۔ نینا صبح نو بجے کے قریب گھر پہنچ گئی تھی اور تب سے شہرین بس بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ بار بار کہنے پر بھی وہ بستر سے اٹھ کر باہر جانے کو تیار نہیں ہو رہی تھی۔
اماں رضیہ نے اسے کچھ دیر وہیل چیئر پر بٹھا کر باہر لے جانا چاہا تھا لیکن وہ نینا سے لپٹ گئی تھی۔ نینا اس کے اس طرح سے کہنے پر یہی سمجھی کہ وہ اس کے لیے اداس تھی۔ نینا نے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے گرد کی جلد کتنی سیاہ ہو چکی تھی اور چہرہ بھی آج ضرورت سے زیادہ زرد لگ رہا تھا۔ نینا ایمن کو سلا رہی

تھی۔ایمن سوئی نہیں تھی لیکن غنودگی میں تھی۔ نینا نے اس کا لحاف ٹھیک کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر شہرین کے پاس آگئی۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے۔۔۔ کچھ کھانے کا دل چاہ رہا ہے۔۔۔ میں باہر لے کر چلوں آپ کو۔۔۔ یا آپ کا فیورٹ چاکلیٹ شیک لاؤں۔۔ وہ جو ایمن کو بھی پسند ہے" نینا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شفقت بھرے انداز میں پوچھا تھا۔ یہ تو خدا کو ہی معلوم تھا وہ ان کی باتیں سمجھتی تھی یا نہیں لیکن ان سب کو شہرین سے اسی طرح بات کرنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ کو نین چاہ کر بھی اس عورت سے نفرت نہیں کر پائی تھی بلکہ اسے کبھی کبھی لگتا تھا کہ اس عورت پر ترس کھاتے کھاتے اب اس سے محبت سی ہوگئی تھی۔ سمیع کے سامنے اسے چڑانے کے لیے کبھی کبھی وہ شہرین سے سخت انداز میں بات کر تو لیتی تھی لیکن بعد میں اسے بہت پچھتاوا ہوتا تھا۔ شہرین نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا بلکہ وہ اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آج کچھ عجیب سی بے چینی تھی جو نینا سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ چند لمحے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی کہ شاید وہ کچھ بولے گی لیکن وہ بس بے چارگی و بے چینی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی جاتی تھی۔ نینا کا دل پگھل سا گیا تھا۔

"تم جس مکان کو گھر بنانے میں ہلکان ہوئی جا رہی ہونا۔۔۔ اس کی بنیادوں میں تمہارے ماں باپ کی بددعاؤں کے علاوہ ایک پاگل مرتی ہوئی عورت کی آہیں اور کوسنے، اس مرتی ہوئی عورت کے ساتھ پل پل مرتے ہوئے تمہارے آدھے ادھورے شوہر کی نفرت اور بے زاری اور ان دونوں کی ایک نیم پاگل بچی کے چونچلوں کے سوا کچھ نہیں" زری کے تلخ جملے جیسے اس کی سماعتوں میں گونجنے لگے تھے۔ اس نے مزید محبت کے ساتھ شہرین کے سر اور چہرے کو سہلایا تھا۔

"تم نے غلط کہا ہے زری۔۔۔ یہ کہاں اس قابل رہی ہیں کہ کسی کو کوسنے دیں۔۔۔ ان کی تو آہیں بھی ڈائریکٹ اللہ تک جاتی ہوں گی۔۔۔"

نینا نے اپنا ہاتھ مسلسل اس کے چہرے پر پھیرتے ہوئے سوچا تھا پھر وہ اس کے قریب سے اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ شہرین نے یکدم اپنا نحیف سا ہاتھ بلند کیا اور نینا کے ہاتھ کو تھام لیا۔ اس سے پہلے کہ نینا کچھ سمجھتی، شہرین نے اس کا ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے رکھ کر کروٹ لے لی تھی جیسے وہ چاہتی ہو کہ نینا اس کے پاس ہی رہے۔ نینا نے دیکھا اس کی آنکھوں سے پانی نکلنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اکثر انفیکشن رہتا تھا جس کی وجہ سے وہ بہتی رہتی تھیں لیکن آج اس کی آنکھوں سے نکلنے والا پانی کا رنگ آنسوؤں جیسا تھا۔ اس سے پہلے کہ نینا مزید دھیان دیتی۔ دروازہ دھیرے سے کھلا تھا۔ نینا نے مڑ کر دیکھا اور پھر دوبارہ سے شہرین کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ سمیع تھا۔ اس کی ہارٹ بیٹ مس ہوئی۔

"آ گئیں آپ۔۔؟" وہ اس سے مخاطب تھا۔ نینا کو سمجھ میں نا آئی کہ وہ کیا جواب دے۔ سمیع کو جواب سے دلچسپی بھی نا تھی اور یہ بات نینا اچھی طرح جانتی تھی۔

وہ چلتا ہوا شہرین کے بستر کے قریب آ گیا تھا۔ اس نے نینا کی جانب دوسری نگاہ تک نا ڈالی تھی

"شہرین۔۔ کیسی ہو میری جان۔۔۔ اماں رضیہ کہہ رہی ہیں تم نے کچھ نہیں کھایا آج سارا دن۔۔۔ کیوں نہیں کھایا۔۔۔ بھوک نہیں لگ رہی کیا؟" وہ شہرین کو مخاطب کرتے ہوئے ساری دنیا کو بھول جاتا تھا تو نینا کیا چیز تھی۔ نینا نے اپنا ہاتھ شہرین سے چھڑوایا اور پھر اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی تاکہ سمیع اس جگہ بیٹھ سکے پھر وہ باہر جانے کے لیے دروازے کی جانب مڑی تھی۔ جانے کیوں دل بالکل بجھ سا گیا تھا حالانکہ اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ والہانہ انداز میں اسے گلے لگا کر "ویلکم بیک" کہے گا لیکن امید ضرور تھی کہ شاید وہ اسے

"شکریہ" کہہ دے آخر وہ بھی تو ایک میسج کے احترام میں چپ چاپ واپس چلی آئی تھی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

"آپ کی بیٹی بہت خود غرض ہے امی۔۔۔" زری نے صبح سے لے کر اب تک کوئی پندرہویں بار کہا تھا۔ صوفیہ نے یخنی والا پیالہ اس کو پکڑایا اور پھر سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"اب کیا مجھے اس موضوع پر کتاب لکھ کر دو گی۔۔۔ پتا ہے مجھے کہ وہ خود غرض ہے" وہ چڑ کر بولی تھیں۔

"چکن کی یخنی۔۔۔ آپ نے مٹن نہیں منگوایا؟" وہ پیالے کی جانب دیکھ کر اسی انداز میں بولی۔ اس کے چہرے پر پہلے ہی بے زار کن تاثرات تھے لیکن مرغی کی یخنی دیکھ کر وہ مزید سیخ پا ہو گئی تھی۔ صوفیہ نے اس کے اتاولے پن پر اسے ٹوکنا چاہا لیکن پھر چپ ہو گئیں۔ شادی کے بعد وہ مزاجاً بہت زود رنج ہو گئی تھی اگرچہ پہلے بھی وہ اپنی پسند نا پسند کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے اور پہننے اوڑھنے میں بہت محتاط تھی لیکن اب تو اس کے نخرے بہت زیادہ بڑھ گئے تھے۔ ہر چیز میں مین میکھ نکال دیا کرتی تھی۔

"تمہارے ابا کو کہا تھا لیکن انہیں یاد نہیں رہا۔۔۔ اب صبح تازہ گوشت، قیمہ سب منگوالوں گی" انہوں نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے تسلی دی تھی۔

"آپ نے سرسری سے انداز میں کہا ہو گا نا۔۔۔ آپ کو تاکید کرنی چاہیے تھی۔۔۔ چکن کی یخنی میں کون سی طاقت ہوتی ہے۔۔۔ اظفر کی امی نے خاص طور پر فون کر کے کہا تھا کہ بکرے کے گوشت کی یخنی پینا پہلے سات دن۔۔۔ طاقت ملتی ہے اس سے۔۔۔ اور یہاں تیسرا دن ہو گیا ہے۔۔۔ چکن کی یخنی ہی مل رہی ہے" وہ بلاوجہ ناراض ہو رہی تھی۔ صوفیہ نے کچھ نہیں کہا تو وہ مزید چڑ گئی۔

"آپ بتا دیں اگر کوئی مسئلہ ہے تو میں اظفر سے کہہ دوں گی۔۔۔ وہ لا دے گا سب گوشت پھل وغیرہ۔۔۔ میں تو خود ہی اس سے نہیں کہتی۔۔۔ ایک دفعہ کہوں گی تو ڈھیر لگا دے گا لیکن میں نے کہہ رکھا ہے اسے کہ اگر تم کچھ لاؤ گے تو میرے ابا برا مان جائیں گے۔۔۔ بیٹیاں تو بس میکے کا مان قائم رکھنے کے جتن کرتی رہتی ہیں اور میکے والوں کو احساس ہی نہیں ہوتا"

زری ڈسچارج ہو کر ان کی طرف آ گئی تھی لیکن بچی ابھی بھی نرسری میں ہی تھی۔ اسے مزید کچھ دن وہیں رکھنے کا مشورہ دیا تھا ڈاکٹر نے، سو بچی تو وہیں تھی۔ نینا واپس چلی گئی تھی اور اب صوفیہ کے لیے کام بہت بڑھ سے گئے تھے۔ پری میچور ڈلیوری کی وجہ سے وہ کچھ تیاری ہی نا کر پائی تھیں۔ سو انہیں خدشہ تھا کہ ان کی نازک مزاج بیٹی اس بات پر بھی انہیں آنے والے دنوں میں پریشان کرتی رہے گی۔ وہ پہلے ایسی نہیں تھی لیکن شادی کے بعد اس کا مزاج کافی بدل گیا تھا۔ اب تو کھانے کے وقت اگر سلاد اچار جیسے لوازمات ناموجود ہوتے تھے تو وہ شکوہ کرنے لگتی تھی۔

"بیاہی بیٹیاں گھر آئیں تو مائیں کلیجہ نکال کر میز پر سجا دیتی ہیں اور آپ کھیرے نہیں منگوا سکیں" وہ انہیں ایسی باتیں سنانے لگتی تھی اور اب تو اس کی حالت ہی کچھ اور تھی۔ وہ بلاوجہ چڑچڑی ہو رہی تھی۔ صوفیہ اٹھیں اور اس کے بستر پر آ بیٹھیں۔

"تم کیوں فکر کر رہی ہو۔۔۔ سب ہو جائے گا۔۔۔ بکرے کا گوشت بھی آ جائے گا اور قیمہ بھی۔۔۔ پھل بھی منگوالوں گی اور پنجیری کے لیے خشک میوے بھی۔۔۔ تم بس اپنا خیال رکھو۔۔۔ اس وقت کو انجوائے کرو۔۔۔ اللہ کریم روز روز اولاد کی خوشی نہیں دکھاتے۔۔۔ یہ بڑا صبر آزما وقت ہوتا ہے۔۔۔ تم اب ایک ماں بھی ہو۔۔۔ صبر کرنا سیکھو" صوفیہ نے بہت محبت سے اسے سمجھانا چاہا تھا لیکن وہ راضی نہیں ہوئی تھی۔

"امی آپ نے ساری زندگی مجھے صرف نصیحتیں ہی کی ہیں۔۔۔ یہ سیکھو، وہ سیکھو۔۔۔ ایسے کرو، ویسے

کرو۔۔۔اپنی لاڈلی کو تو کچھ نہیں سکھایا آپ نے۔۔دو گر کی باتیں اسے بھی سکھا دیتیں نا آپ۔" وہ ابھی تک بہن سے ناراض تھی۔

"میں نے تو یہی کوشش کی تھی کہ تم دونوں کی تربیت میں کوئی کمی نا رہے۔۔جو تمہیں سکھایا، وہی اسے بھی سکھانے کی ہر ممکن کوشش بھی کی ہے۔۔اب اس نے نہیں سیکھا تو اس کا الزام مجھے تو نہیں دیا جا سکتا نا۔۔" صوفیہ زِچ ہوئی جا رہی تھیں لیکن پھر بھی تحمل کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

"مجھے اس سے مت ملائیں۔۔میں نے تو سب سیکھا ہے۔۔ہر بات آپ کی مرضی سے کی ہے۔۔اس کی طرح ماں باپ کو ناکوں چنے نہیں چبوائے"۔

"اچھا تو تم اب کیا چاہتی ہو۔۔اس احسان کے بدلے تمہیں گولڈ میڈل دیا جائے۔۔" صوفیہ نے طنزیہ انداز میں پوچھا تھا۔ زری نے انہیں دیکھا پھر خفگی بھرے انداز میں بولی

" آپ ہمیشہ اسی کی حمایت کرتی آئی ہیں امی۔۔۔آپ کی شہہ پر ہی یہ دن دیکھ رہی ہے وہ۔۔۔نوکروں کی طرح اس گھر میں پڑی ہے۔۔۔شکل دیکھی ہے آپ نے اس کی۔۔۔لگتی ہے بیاہی ہوئی کہیں سے۔۔۔پھٹکار برستی رہتی ہے ہر وقت اس کے چہرے پر۔۔۔پہلے ہی کوئی خاص رنگ روپ نہیں تھا۔۔۔اب تو بالکل ہی عجیب سی لگنے لگی ہے۔۔۔ایک دن اظفر کہنے لگا مجھے کہ زری یہ واقعی تمہاری سگی بہن ہے۔۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم لوگوں نے دبئی میں کسی بنگالی یا سری لنکن کی کالی کلوٹی بچی کو گود لے لیا ہو"۔

اظفر کا ذکر آتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ سی پھیل گئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس نے کتنی تلخ باتیں اپنی سگی بہن کے متعلق کر ڈالی تھیں۔ صوفیہ کو اس پر شدید غصہ آیا۔ وہ نینا کے متعلق بالکل اپنے ابا کے انداز میں باتیں کرنے لگی تھی۔ وہی رویہ، وہی حقارت، وہی تمسخر۔۔۔صوفیہ نے کچھ تلخ کہنا چاہا لیکن پھر چپ رہ گئیں۔۔کیونکہ وہ بھی ان کی بیٹی تھی اور جس کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ وہ بھی ان کی اپنی اولاد تھی۔

"اب کچھ نہیں بولیں گی آپ۔۔خاموش رہیں گی بس۔۔ساری باتیں بس میری بار یاد آتی ہیں آپ کو۔۔لیکن امی۔۔میں آپ کو ایک مشورہ ضرور دوں گی کہ ایسے حالات میں مائیں ہی بیٹیوں کو سمجھایا کرتی ہیں۔۔اسے کچھ عقل دیں آپ۔۔۔محترمہ خواہ مخواہ میں نوکرانی بنی پھرتی ہیں اس شخص کے گھر میں جس نے وقت پڑنے پر اسے ہی گھر سے نکال دینا ہے۔۔وہ بس اپنی بیوی کے مرنے کا انتظار کر رہا ہے۔۔۔وہ جب مر جائے گی تو اس نے آپ کی بیٹی کو بھی نکال باہر کرنا ہے۔۔۔وہ اچھا خاصا ہینڈسم آدمی ہے۔۔اور پیسہ بھی ہے اس کے پاس۔۔۔وہ کیوں رکھے گا نینا کو اپنے گھر۔۔۔وہ کسی اچھی خوش شکل لڑکی سے شادی کر لے گا اور یہ پھر آپ کے گھر آ بیٹھے گی" وہ انتہائی تلخ ہو رہی تھی۔ اب کی بار صوفیہ کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔

"او ہو بی بی۔۔۔تم بھی چپ ہی کر جاؤ۔۔اچھا نہیں سوچ سکتی بہن کے لیے تو برا بھی مت سوچو۔۔اناپ شناپ بکتی چلی جا رہی ہو۔۔۔بجائے اس کے کہ یہ دعا کرو کہ بہن کا گھر آباد رہے۔۔تم بد دعائیں دینے پر اتر آئی ہو۔۔اور یہ کیا عادت بنا لی ہے تم نے کہ ہر وقت اس کی شکل اور رنگ کا مذاق بناتی رہتی ہو۔۔۔کیا کمی ہے اس میں۔۔۔ماشاء اللہ ہاتھ پاؤں کی پوری ہے۔۔۔اونچی لمبی ہے۔۔۔اور پھر کیسے سارا گھر سنبھال رکھا ہے اس نے۔۔۔تم سے تو ایک کمرے کا فلیٹ نہیں سنبھالا جا رہا۔۔۔اور ہاں اظفر کو کہنا خبردار اب میری بیٹی کے متعلق کوئی الٹی سیدھی بات نا کرے۔۔۔اب وہ خود بھی بیٹی والا ہے۔۔۔اور بیٹیوں کے باپ سوچ سمجھ کر بولا کرتے ہیں" وہ ناراض لہجے میں بولی تھیں۔

زری نے ان کے سخت لہجے پر سیخ پا ہو کر یخنی کا پیالہ اٹھا لیا تھا۔

"نہیں تو نا سہی۔۔۔جب کسی کو اپنی بھلائی نہیں منظور تو کیا کیا جا سکتا ہے" وہ ناک چڑھاتے ہوئے بڑبڑا

کر سوپ پینے لگی تھی۔

☆☆☆

وہاں گھپ اندھیرا تھا اور اس کی آنکھیں بھی روشنی کی عادی نا تھیں۔ اس نے اطمینان سے آنکھیں موند کر پرسکون ہوتے ہوئے دوبارہ سو جانا چاہا تھا لیکن اسی لمحے جیسے کہیں زور سے بجلی کڑکی تھی اور زمین جانے کون سے دھماکے سے لرز اٹھی۔ اس کا پورا وجود جیسے اس دھماکے کی زد میں آ گیا تھا۔ اس کے سر میں گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ اس نے سر کو پکڑتے ہوئے ادے کو آواز دی تھی۔ اس کے سر میں ایسا ہی درد اٹھا کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ چکرانے لگتی تھی۔

"ادے میرے سر میں زور سے درد ہو رہا ہے۔۔ بہت زور سے" وہ چلائی تھی لیکن کسی نے اس کی آواز کا جواب نہیں دیا تھا۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ سب جانے کہاں چلے گئے تھے۔۔۔ سب لوگ ایسے ہی کہیں نا کہیں چلے جایا کرتے تھے۔ اسے کوئی کچھ نہیں بتاتا تھا۔ وہ سب سے خود ہی باتیں کرتی رہتی تھی۔ گھر میں بہت سے لوگ تھے لیکن اسے محسوس ہوتا تھا کہ بعض اوقات وہاں کسی کی غیر موجودگی اسے بے چین کرتی ہے۔۔ وہ کسی کو یاد کرتی تھی لیکن اسے یہ بھی یاد نا آتا تھا کہ وہ کس کو یاد کرتی ہے لیکن وہ خوش تھی۔۔۔ دکھ اسے تب ہوتا تھا جب اسے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔۔ یہ درد بہت بے چین کرنے والا ہوتا تھا۔ اس کے پورے سر میں دانتوں میں اور حتی کہ رگوں میں بھی جیسے تکلیف شروع ہو جاتی تھی۔۔ اس کا خون جیسے منجمد سا ہو جاتا تھا اور کندھوں سے اوپر کا حصہ انتہائی بھاری لگنے لگتا تھا۔۔ یہ تکلیف اس سے سہی نہیں جاتی تھی۔۔۔ یہ تکلیف اسے پاتال میں دھکیل دیتی تھی۔

ابھی بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس نے کراہتے ہوئے اپنے بھاری سر کو دونوں ہاتھوں سے دبوچا تھا۔ وہ تکلیف سے بلبلانے لگی تھی۔ وہ چلا رہی تھی۔ کسی کو مدد کے لیے بلا رہی تھی مگر الفاظ اس کے ہونٹوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلتے تھے تو اپنے مطالب بھی کھو دیتے تھے۔ اسے اس قدر تکلیف تھی کہ وہ جیسے نیچے ہی نیچے گرنا شروع ہو گئی تھی۔ زمین اس کے قدموں کے نیچے سے سرکنے لگی تھی۔۔۔ وہ ہوا سے ہلکی پھلکی ہو کر دھیمے قدموں سے اوپر کو اٹھی تھی اور پھر ایک جھٹکے سے نیچے گرنے لگی تھی۔ ایک ہی لمحے میں وہ جیسے نیچے بہت نیچے دھنستی جاتی تھی ۔۔ ادے۔۔۔ وہ پھر چلائی تھی۔

☆☆☆

نینا کی آنکھ ایک عجیب سی آواز سے کھلی تھی جیسے کوئی اسے پکار رہا ہو، اسے جگانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے آنکھیں پٹپٹا کر تاریکی کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی مگر اسے کچھ نظر آیا تھا نا ہی سمجھ میں آیا۔ اس نے چند مزید ساعتیں یہ سوچنے میں لگائی تھیں کہ آخر وہ کیا ہے جس نے اسے جگا دیا تھا پھر وہ جھٹکا کھا کر اٹھی تھی۔ پہلی نگاہ شہرین کی کاٹ پر پڑی تھی۔ وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ نینا نے بستر سے چھلانگ لگائی اور تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکلی تھی۔

شہرین بعض اوقات نیند سے اٹھ کر کہیں بھی جا کر لیٹ جاتی تھی یا کچن میں جا کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ نینا اسے ہی تلاش کرنے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اس کا دل عجیب سے خدشات میں گھرا تھا۔ وہ اسے کہیں نظر نا آئی۔ نینا نے قدموں کی رفتار بڑھائی تھی اور تقریباً بھاگتی ہوئی کچن کی جانب آئی تھی لیکن وہاں بھی تاریکی تھی۔ شہرین کو بہت ہی کم نظر آتا تھا لیکن وہ تاریکی اور روشنی میں فرق کر لیتی تھی اور جہاں روشنیاں گل ہوتی تھیں وہاں جانے سے وہ احتراز ہی برتتی تھی۔ نینا ایک لمحہ کچن کے دروازے پر ہی کھڑی رہی۔ اسے سمجھ میں نا آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

شہرین اپنے بیڈ روم میں بھی ہو سکتی تھی اور نینا بیڈ روم میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ واپس ایمن کے کمرے

کی طرف آئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کمرے میں داخل ہوتی اسے لاؤنج میں کسی کے موجود ہونے کا احساس ہوا۔ وہ مڑی تھی اور ذرا آگے ہو کر دیکھا۔ وہاں بھی تاریکی تھی۔ نینا نے ہاتھ بڑھا کر دیوار پر لگے سوئچ بورڈ سے ایک سوئچ آن کیا تھا۔ ایک سیکنڈ میں وہاں روشنی پھیل گئی تھی۔ شہرین اسے صوفے پر نیم درازسی نظر آئی۔

"شہرین۔۔" اس نے پکارا تھا لیکن کوئی جواب نا پا کر وہ آگے بڑھی پھر اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ شہرین کی آنکھیں ادھ کھلی سی تھیں۔ وہ لپک کر اس کے قریب آئی تھی۔

"شہرین۔۔ اٹھیں یہاں سے۔۔ صوفے پر سوتا ہے کوئی" اس نے اسے ہلا کر جگانا چاہا تھا لیکن وہ مزید نیچے کی طرف اس کی گود میں اس طرح لڑھک آئی تھی کہ اس کی ٹانگیں صوفے پر ہی تھیں لیکن اوپر والا دھڑ بالکل زمین کو چھونے لگا تھا۔ شہرین نے اس کے گالوں کو زور زور سے سہلایا تھا مگر وہ ٹس سے مس نا ہوئی تھی۔ نینا کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔

"اماں رضیہ۔۔ اماں رضیہ۔۔ جلدی اِدھر آئیں۔۔ شہرین کو دیکھیں کیا ہوا۔۔ اماں رضیہ۔۔" اس نے چلا کر اماں رضیہ کو پکارا تھا۔

☆☆☆

"امی اظفر آئے گا ابھی۔۔" صوفیہ کمرے میں مکمل طور پر داخل بھی نہیں ہوئی تھیں جب زری نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ صوفیہ نے سر ہلایا اور بچی کی کاٹ کے قریب آگئیں۔ اسے رات ہی گھر لانے کی اجازت ملی تھی۔ اس کے آنے سے گھر میں عجیب سی رونق ہوگئی تھی۔

"کیسی ہے ہماری گڑیا۔۔ آج تو آنکھیں بھی پوری کھولی ہوئی ہیں۔۔ تم نے دیکھا زری اس کی پلکیں نمایاں ہونے لگی ہیں اب ورنہ پہلے دن تو آنکھیں بالکل گنجی سی لگتی تھیں۔" صوفیہ نے اسے کاٹ نکال کر احتیاط سے ہاتھوں میں تھاما اور پھر زری کے بیڈ کے قریب آگئیں۔ انہوں نے بچی کو اس کی گود میں دے دیا تھا۔

"میں آپ کو بتا رہی تھی کہ اظفر آئے گا ابھی۔۔ ناشتے کے لیے کچھ اہتمام کرلیں" اس نے ذرا اونچی آواز میں کہا جیسے جتانا چاہ رہی ہو کہ پہلی دفعہ میں میری بات ان سنی کیوں کردی۔

"آفس نہیں جانا اسے آج۔۔" صوفیہ اس کے بستر پر بیٹھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"آفس تو جائے گا۔۔ لیکن پہلے یہاں آئے گا۔۔ پھر آفس جائے گا۔۔ کہہ رہا تھا کہ پری (بچی) سے مل کر جائے گا۔۔ چند دنوں میں ہی بہت پیار کرنے لگا ہے اس سے۔۔ کہتا ہے یہ تو تم سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ صوفیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا اور مسکراتے ہوئے بولیں۔

"اولاد ہے ہی ایسی پیاری چیز۔۔ اس سے زیادہ کوئی خوب صورت نہیں لگتا اور اس کے آگے کچھ اہم نہیں لگتا"۔

"آپ کی بات ٹھیک ہے۔۔ لیکن یہ تو ہے بھی خوب صورت۔۔ ویسے اللہ کا شکر ہے اس کے نین نقش تو خوب صورت ہیں ہی۔۔ رنگت بھی صاف ہی ہے۔ اظفر کو سانولی رنگت ذرا پسند نہیں" وہ ہر دو جملوں کے بعد اپنے شوہر کا ذکر کرنا عبادت سمجھتی تھی۔

"وہ خود بھی تو سانولا ہی ہے۔۔" صوفیہ نے سادہ سے انداز میں جتا کر کہا تھا۔ وہ روز روز کالے گورے کی یہ بحث سن سن کر اکتا جاتی تھیں۔ پہلے ایسی ہی باتیں کاشف کیا کرتے تھے۔ وہ سنتی تھیں اور چپ رہتی تھیں۔ اب بیٹی نے ایسی باتیں شروع کردی تھیں۔

"آئے ہائے امی۔۔ سانولا تو نہیں ہے۔۔ سانولا ہوتا تو میں کبھی اس سے شادی نا کرتی۔۔ رنگ تو بہت صاف ہے اس کا۔۔ بس گرمیوں میں ذرا سنولا جاتا ہے۔۔ ذرا موسم بدلے گا تو بالکل ٹھیک لگنے لگے

گا۔" وہ نخوت بھرے انداز میں بولی۔صوفیہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئیں۔وہ بالکل کاشف کے انداز میں باتیں کرتی تھی۔انسانوں کی ذات میں کیڑے نکالنے کی یہ عادت اسے اپنے باپ سے ملی تھی۔

"آپ بیٹھ ہی گئی ہیں۔۔۔میں آپ کو بتا رہی تھی کہ اظفر آرہا ہے۔۔ناشتے کے لیے کچھ بنالیں اچھا سا۔" زری کو ماں کے چہرے سے شاید اندازہ ہوگیا تھا کہ انہیں اس کی باتیں اچھی نہیں لگ رہیں سو اس نے موضوع تبدیل کیا تھا۔

"آنے تو دو اسے۔۔۔بنالوں گی کچھ نا کچھ۔آٹا گوندھا ہوا ہے۔۔رات والا قیمہ مٹر بھی پڑا ہے۔۔۔تازہ دہی بھی ہے۔۔۔انڈے بھی موجود ہیں۔۔وہ آئے گا تو تازہ پراٹھے کے ساتھ آملیٹ بنا دوں گی۔۔قیمہ بھی رکھ دوں گی ساتھ۔۔۔" انہوں نے تفصیل سے بتایا تھا کیونکہ اس کے بنا زری کی تسلی نا ہوتی تھی۔زری نے ان کی باتیں سن کر ناک چڑھائی۔

"قیمہ مٹر تو رات بھی سَرو کیا تھا آپ نے۔۔۔وہ مت رکھیں اب۔۔۔اچھا نہیں لگتا۔۔۔ابا کو بولیں حلوہ پوری لے آئیں۔۔یا نہاری اور نان لے آئیں۔" اس نے مشورہ دیا۔اظفر آج کل رات کا کھانا ان ہی کے یہاں کھاتا تھا اور ہر دوسرے تیسرے روز ناشتا بھی یہیں کر رہا تھا۔صوفیہ کو اس کی تجویز ذرا پسند نہیں آئی۔

"گھر والی بات ہے زری۔۔اپنا ہی بچہ ہے اظفر۔۔۔کل بھی ناشتا اس نے یہاں ہی کیا تھا۔۔اور تمہارے کہنے پر میں نے نان چنے منگوا لیے تھے۔۔اس سے پہلے پائے کھلائے تھے اسے۔۔۔اب ہر روز باہر سے ناشتا منگوانا اچھا لگتا ہے کیا۔۔۔گھر کی بنی چیز بھی کھلانے دو اسے ورنہ کیا فائدہ اس کے جم جانے کا اور ورزشیں کرنے کا" صوفیہ نے اسے پیار سے سمجھانا چاہا تھا لیکن وہ پھر عادت کے مطابق بُرا مان گئی تھی۔۔

"آپ کو کیا ہوگیا ہے امی۔۔۔وہ داماد ہے آپ کے گھر کا۔۔۔داماد وں کو کون کھلاتا ہے باسی سالن کے ساتھ پراٹھا۔۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔صوفیہ کے دل میں ناگواری کی لہر اٹھی جو انہوں نے بمشکل برداشت کی۔ان کی یہ بیٹی کچھ زیادہ ہی وہمی سی ہوتی جارہی تھی۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں زری پھر بولی

"آپ کو کیا پتا میں اظفر کے سامنے آپ لوگوں کی کیسی کیسی باتیں کرتی ہوں۔۔۔وہ ابا کو بہت رئیس آدمی سمجھتا ہے۔۔۔میں باسی قیمہ مٹر کھلا کر اس کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی۔۔آپ بس ابا کو کہیں کہ حلوہ پوری لے آئیں۔۔۔"

وہ سخت بُرا مان کر بولی تھی۔صوفیہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئیں اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتیں۔کاشف کمرے میں داخل ہوئے تھے

"کیا چاہیے۔۔؟" انہوں نے صوفیہ سے پوچھا پھر زری کی جانب محبت سے دیکھا

"کچھ کھانے کا دل ہے۔۔بتاؤ مجھے۔۔میں لے آتا ہوں۔۔" زری کی بات وہ پہلے بھی نہیں ٹالتے تھے اور اب تو جیسے اس کا کہا ان کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔

"ابا میں امی سے کہہ رہی تھی کہ حلوہ پوری منگوالیں ناشتے کے لیے۔۔۔۔" اس نے بس اتنا ہی کہا تھا۔کاشف نے فوراً اثبات میں سر ہلایا

"اچھی بات ہے۔۔میرا خود بھی دل چاہ رہا تھا کہ آج کچھ مختلف ناشتا ہو۔۔میں ابھی لے آتا ہوں" کاشف اس کی بات سے انکار نہیں کرتے تھے۔وہ باہر نکلے تو صوفیہ بھی باہر کچن کی طرف آگئیں۔ان کا دل جل کر خاک ہوگیا تھا۔وہ باہر سے کچھ منگوائے بنا بھی ناشتے پر اچھا خاصا اہتمام کرسکتی تھیں لیکن زری کی فرمائش کی وجہ سے چپ کر گئی تھیں۔زری انہیں کچھ زیادہ ہی دل میں ملال رہی تھی۔وہ تنگ دل نہیں تھیں لیکن بلاوجہ اصراف کو بھی سخت ناپسند کرتی تھیں۔زری کی باتیں اور حرکتیں دونوں ہی انہیں الجھن میں مبتلا کرنے لگی

تھیں۔انہوں نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے چائے کا پانی چولہے پر رکھا تھا۔اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی پھر آپا اندر داخل ہوئی تھیں۔ان کے ہاتھ میں پیالہ تھا۔

"ارے۔۔آپا۔۔آپ۔۔۔صبح صبح کیسے آگئیں؟"صوفیہ نے آگے ہو کر ان کا ہاتھ تھاما اور دوسرے ہاتھ سے پیالہ لیا تھا۔وہ کافی دنوں کے بعد ان کے گھر کی سیڑھیاں چڑھ کر اس طرح آئی تھیں ورنہ نینا کی شادی کے بعد سے انہوں نے آنا جانا کافی کم کر دیا تھا۔سلیم کی موت کے بعد سے وہ بہت بیمار رہنے لگی تھیں

"زری کو دیکھنے آئی تھی۔۔اب کیسی ہے بچی۔۔۔اسپتال میں تو بڑی کمزور سی لگتی تھی۔۔۔کچھ صحت بنی کہ نہیں۔۔۔اور زری کی طبیعت کیسی ہے"وہ اتنی سی دیر میں ہانپ گئی تھیں۔صوفیہ نے پیالہ میز پر رکھ کر انہیں لاؤنج میں ہی بٹھا لیا پھر فٹافٹ ان کے لیے پانی لے آئیں۔

"ٹھیک ہیں دونوں۔۔بس ابھی جگایا ہی تھا میں نے زری کو۔۔۔بچی بلکنے لگی تھی بھوک سے۔۔زری دودھ پلا رہی ہے اسے"انہوں نے تفصیل سے بتایا پھر ان کے لائے پیالے کی جانب دیکھتے ہوئے استفہامیہ انداز میں ان پر نظر ڈالی۔

"کیا لائی ہیں۔۔۔؟"

"سوجی اور انڈے کا حلوہ ہے۔۔۔علیم نے فرمائش کی تھی۔۔۔بہت تھوڑا سا گھی ڈال کر بنایا ہے میں نے۔۔۔خشک میوے بھی ڈالے ہیں۔۔اچھا بنا ہے۔۔۔میں نے علیم کو بولا تھا۔۔زری باجی کو دیتا جا۔۔۔مگر اسے یونیورسٹی جانے کی جلدی تھی۔۔۔بعد میں۔۔۔بعد میں کہتا ہوا باہر نکل گیا۔۔۔میں پوچھوں ہوں یہ"بعد" کس تاریخ کو آئے گی آخر۔۔۔ہر کام کل پر ٹال دیتے ہیں بس یہ لڑکے۔۔۔وہ بڑا والا ہے تو اس کو نوکری سے فرصت نہیں ہے۔۔۔رات رات جاگ کر اس موئے موبائل پر گیمز کھیلتے رہیں گے لیکن گھر کا کوئی کام بتا دو تو "بعد میں۔۔بعد میں" کی گردان سن لو۔۔۔تم اچھی ہو صوفیہ۔۔ماشاءاللہ بیٹیاں ہیں تمہاری۔۔۔کہنے کار (بات ماننے والی) ہوتی ہیں بیٹیاں۔۔۔"وہ سانس بحال کرتے ہوئے بات بھی مکمل کر رہی تھیں۔صوفیہ اٹھ کر کچن میں گئیں پھر چائے کے پانی میں دودھ ڈال کر آنچ دھیمی کی اور واپس ان کے پاس آ بیٹھیں

"بس آپا۔۔منہ نہ کھلوائیں میرا۔۔۔بیٹیاں جتنی کہنے کار ہوتی ہیں۔۔میرا دل ہی جانتا ہے۔۔۔دراصل وہ زمانے ہی نہیں رہے جب اولادیں ماں باپ کی بات کو اہمیت دیا کرتی تھیں۔۔۔اب تو بس اپنی مرضی کے مالک ہیں سب۔۔۔ماں باپ تو اتنے کے بھی مجاز نہیں کہ نان کی بجائے پراٹھا بنا کر کھلا دیں اولاد کو۔۔۔اتنی سی بات پر بھی اولاد بُرا مان جاتی ہے"صوفیہ سخت ناراض تھیں۔آپا نے ان کے انداز کو بغور دیکھا۔ایسا انداز تو صوفیہ تب اپناتی تھیں جب نینا کی کسی بات پر خفا ہوتی تھیں۔

"نینا آئی ہوئی ہے کیا۔۔؟"ان کی سمجھ میں یہی آیا تھا کہ شاید وہ اسی سے خفا ہیں سو پوچھ لیا۔

"ارے نہیں آپا۔۔۔وہ کہاں آسکتی ہے۔۔اس کی تو سو۔۔۔"وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئیں پھر لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔

"وہ ایمن کی ماں پھر ہاسپٹل میں ہے نا۔۔۔کوما میں چلی گئی ہے پھر۔۔۔بڑے دن سے ہاسپٹل اور گھر کے بیچ گھن چکر بنی پڑی ہے میری بیٹی"آپا نے گہری سانس بھرتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

"اللہ کریم آسانی دے۔۔۔بڑا تکلیف دہ مرض ہے یہ دماغ کا کینسر بھی۔۔۔اس دن نینا ہاسپٹل میں ملی تھی تو بتا رہی تھی کہ وہ ایمن کی ماں تو بالکل لاچار ہے ہر کام سے۔۔۔پہچانتی بھی نہیں ہے کسی کو"

وہ دونوں بہنیں ایمن سے تو بارہا مل چکی تھیں لیکن شہرین سے کسی کی میل ملاقات نہیں تھی۔نینا کے گھر تو ان میں سے کوئی بھی کبھی جاتا ہی نہیں تھا۔وہ خود ہی آتی تھی اور ان سب کا زبانی تعارف اور باتیں بتاتی رہتی تھی۔اسی

وجہ سے یہ دونوں بہنیں نینا کی "سوکن" سے واقف تھیں۔
"اللہ اس بچی کو بھی آسانی دے۔۔آمین۔۔۔صوفیہ کسی روز ہم چلیں نینا کی طرف۔۔۔عیادت تو بڑے ثواب کا کام ہے۔۔۔اللہ مریض کی خیریت دریافت کرنے والے سے خوش ہوتے ہیں۔۔۔یہ روزہ بھی کھول ہی لیتے ہیں صوفیہ۔۔۔ورنہ جب سے بچی دی ہے ان کے یہاں۔۔کبھی نہیں گئے ہم۔۔اچھا تو نہیں لگتا نا ایسے۔۔۔ہمیں جانا چاہیے" آپا نے اسے سمجھایا تھا۔صوفیہ کیا کہتیں، چپ سی ہو گئیں۔وہ تو خود جانا چاہتی تھیں لیکن ڈر لگتا تھا کہ کاشف ناراض ہوں گے سو کبھی منہ سے نہیں کہتی تھیں۔
"چلیں گے آپا کسی دن۔۔ابھی تو یہ زری آئی ہوئی ہے نا۔۔اس سے ذرا فراغت ملی تو پھر دیکھتے ہیں۔۔۔میں تو اس لڑکی سے بے زار ہوئی پڑی ہوں۔۔۔بچے تو سب ہی پیدا کرتے ہیں لیکن اس نے جیسے کوئی انوکھا ہی کام کرلیا ہے۔۔۔ہر وقت غصہ کرتی رہتی ہے۔۔کبھی کھانے پکانے میں مین میکھ نکالتی رہے گی۔۔کبھی کالے گورے رنگ پر تنقید کرتی رہے گی۔۔۔کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔۔۔پہلے تو ایسی نہیں تھی۔۔۔شادی کے بعد جو کسر رہ گئی تھی وہ ماں بن کر پوری کر دی ہے۔۔۔اب تو مزاج جیسے ساتویں آسمان پر پہنچ گیا ہے"۔
وہ بہن کے سامنے دُکھی دل سے بولی تھیں لیکن یہ بھی احساس تھا کہ زری تک آواز جائے گی تو وہ مزید بڑبڑائے گی سو آواز دھیمی ہی رکھی تھی۔آپا نے ان کی بات کو سنجیدگی سے سُنا لیکن پھر ٹالنے والے انداز میں بولیں
"صوفیہ۔۔سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔۔بچے کے بعد عورت ذرا دماغی طور پر کمزور پڑ جاتی ہے۔۔۔بلاوجہ کا چڑچڑا پن۔۔۔خفگی، غصہ۔۔۔بے کار میں رونا رلانا۔۔۔یہ سب ان چالیس دنوں میں چلتا ہی رہتا ہے۔۔۔یہ چالیس دن ایسے ہی گزریں گے پھر ٹھیک ہو جائے گی اپنی زری بھی" وہ پوسٹ نیٹل ڈپریشن کو اپنے انداز میں واضح کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔صوفیہ نے ناگواری سے سر جھٹکا تھا
"آپا۔۔یہ کوئی انوکھی ماں بنی ہیں کیا۔۔ہم نے بھی تو بچے پیدا کیے ہیں۔۔" انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ آپا نے ان کی بات کاٹ دی۔
"ہر عورت ایک جیسی تو نہیں ہوتی صوفیہ۔۔۔کچھ عورتیں زیادہ حساس ہوتی ہیں۔۔۔تم اپنا وقت بھول گئی ہو کیا۔۔نینا کی دفعہ یاد ہے نا کیسے ذرا ذرا سی بات پر کاٹ کھانے کو دوڑا کرتی تھی۔۔بھابھیوں سے لڑائی۔۔بھائیوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جانا۔۔۔تمہارے ساتھ بھی تو ہوتا تھا یہ سب۔۔۔بیٹیاں آخر ماں پر ہی تو جاتی ہیں" آپا اب کی بار مسکرائی تھیں۔
"آپا میرا حساب تو اور تھا۔۔حالات اور طرح تھے۔۔۔اور پھر۔۔۔" وہ کہنے والی تھیں کہ میرا مجازی خدا بھی تو اور مزاج کا تھا جو ان دنوں میری خفگی کی سب سے بڑی وجہ تھا لیکن وہ یکدم چپ کر گئیں۔ان پر جیسے اچانک ہی یہ عقدہ کھلا تھا کہ زری کے رویے کی وجہ بھی اس کا شوہر تو نہیں۔۔۔ان کی تو زبان کو تالا لگ گیا تھا۔۔وہ چپ کی چپ رہ گئی تھیں۔
"کہاں ہے زری۔۔میں ذرا مل کر آتی ہوں۔۔تم فکر نا کرو صوفیہ۔۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔بس یہ کچھ دن گزار لو۔۔وہ تکلیف میں ہے۔۔پھر بچی بھی ساری ساری رات جگاتی ہوگی۔۔۔یہ چڑچڑا پن عارضی ہے۔۔ٹھیک ہو جائے گی زری بھی۔۔۔" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھی تھیں۔
"ان شاء اللہ۔۔"صوفیہ نے صدقِ دل سے دعا کی تھی۔آپا نے تو ایک مختلف سوچ کے نئے دَر وا کر دیے تھے ان پر۔۔۔

☆☆☆

"ان سے باتیں کرو ایمن۔۔۔سلام کرو ماما کو۔۔؟" لوئین نے بہت پیار سے ایمن کی پُشت سہلاتے

ہوئے، اسے شہرین کے بستر کے قریب کیا تھا۔
"السلام علیکم ماما۔ آپ کیسی ہیں؟" ایمن نے مشینی سے انداز میں بولا اور پھر کونین کی جانب دیکھنے لگی کہ جیسے پوچھنا چاہ رہی ہو کہ میں نے ٹھیک "پرفارم" کیا یا نہیں؟۔ ایمن پہلی بار ہاسپٹل آئی تھی اور اس کے چہرے پر ہی لکھا تھا کہ اسے یہاں آنا اچھا نہیں لگ رہا۔ کونین اور سمیع دونوں ہی اس کے یہاں آنے کے حق میں نہیں تھے لیکن ادے کئی بار کہہ چکی تھیں کہ ایمن کو روز لایا جائے تاکہ وہ اپنی ماں کو دیکھ سکے۔
"وقت کا کیا بھروسا۔۔ وہ غریب اپنی ماں کے ساتھ کچھ وقت گزار لے تو اچھا ہے پھر موقع ملے نا ملے" وہ کئی بار یہ جملہ دہرا چکی تھیں۔ اسی لیے سمیع کے کہنے پر کونین اسے یہاں لائی تھی لیکن ایمن کو پریشان دیکھ کر وہ سب مزید دکھی ہو گئے تھے۔ وہ ماں کی جانب دیکھنے سے احتراز برت رہی تھی اور اس پر ہی کیا موقوف وہ سب بھی اس کی جانب دیکھنے سے ڈرتے تھے۔۔۔ ناک منہ پیشانی، سر، ہاتھ۔۔۔ سب کچھ تو مشینوں اور نالیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔۔۔ وہ انسان نہیں لگتی تھی بلکہ ایک ننھا سا روبوٹ لگتی تھی جسے مرمت کرنے کے لیے ورکشاپ میں رکھا ہوا ہو۔
سمیع نے گہری سانس بھری تھی۔۔۔ وہ اپنی ننھی سی بچی سے کیا توقع کرتا کہ وہ اپنی بیمار لاچار ماں سے کس طرح محبت کا اظہار کرے جبکہ وہ اسے دیکھتے ہوئے ڈر رہی تھی۔۔ وہاں تو سب کا یہی حال ہو رہا تھا۔۔۔ لوگ آ رہے تھے، شہرین کے وجود پر ترحم بھری نظریں ڈال رہے تھے۔۔۔ گہری لمبی ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہوئے بجھے ہوئے دل سے دعائیں دے رہے تھے۔۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ بنا کچھ بولے جاتے جا رہے تھے۔
ایک ہفتہ ہو گیا تھا شہرین کی حالت میں ذرا سا بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ دماغ تو پہلے ہی اس کا گل چکا تھا لیکن اب بقیہ اندرونی اعضاء بھی کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔۔۔ ڈاکٹرز نے سمیع کو بتایا تھا کہ اس کا جگر پھیپھڑے اور گردے کافی متاثر ہو چکے تھے۔۔ ایک دل تھا جس کی ٹِک ٹِک اسے "موجود" ثابت کرتی تھی ورنہ جس طرح وہ مشینوں کے سہارے بے سدھ پڑی تھی، اسے دیکھتے ہوئے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ گُھل گُھل کر اب "ختم" ہوئی جاتی ہے۔ وہ ریشہ ریشہ ہو کر دنیا چھوڑ رہی تھی۔
برف کی ڈلی۔۔۔ پگھل پگھل کر پانی تو بن ہی چکی تھی۔۔۔ اب چند لمحوں کی بات تھی۔۔ تند و تیز ہوا اس پانی کو خشک کر کے اس کا نام و نشان مٹا دینے والی تھی۔۔۔
سمیع کو جھرجھری سی آ گئی۔
وہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے بس دعائیں کر رہا تھا۔ ایک ہفتے سے وہ بس نہانے کے لیے ہاسپٹل سے گھر جاتا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا بس اس کے بستر کے کنارے بیٹھا اس کی منتیں کرتا رہے۔
"شہرین مت جاؤ۔۔ پلیز مت جاؤ۔۔۔ واپس آ جاؤ" اسے پتا بھی نہیں چلتا تھا وہ کب اس کے پاس بیٹھا التجائیں کرنے لگتا تھا۔ جب سے ڈاکٹر نے بتایا تھا۔
"سمیع صاحب۔۔ یہ ہیں۔۔ لیکن نہیں ہیں۔۔۔ خدا ان پر کرم کرے۔۔۔ ان کو سکون دے۔۔۔ بہت اذیت ہے ان کی جان پر۔۔۔ ان کے پھیپھڑے بالکل ختم ہو چکے ہیں۔۔ سانس کی نالی میں خون جم رہا ہے۔۔۔ دل چل نہیں رہا۔۔۔ بس بمشکل گھسیٹ رہا ہے ان کو۔۔ ان کا ہوش میں آنا اب ناممکنات میں سے ہے۔۔۔ آپ اب ان کی آسانی کے لیے دعا کریں"
سمیع کا اپنا دل ڈوب سا گیا تھا۔ اسے ڈاکٹر کی کسی بات کا یقین نہیں تھا۔ اپنی بیماری کے گزشتہ دو سالوں میں شہرین کئی بار اس حالت کو پہنچی تھی اور پھر ہوش میں آ کر گھر واپس آ گئی تھی۔ سمیع کو یقین تھا اب کی بار بھی یہی ہو گا۔ وہ مسلسل اس کی زندگی کی دعائیں کر رہا تھا۔ رات کو سب چلے جاتے تھے لیکن وہ ہاسپٹل میں ہی رُکتا

تھا۔ اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہوئے بس وہ رب سے ایک ہی دعا کرتا تھا۔
"یا اللہ۔۔۔ یہ مجھ سے بولتی نہیں ہے۔۔۔ یہ مجھے دیکھتی بھی نہیں ہے۔۔۔ مجھے پہچانتی نہیں ہے۔۔۔ لیکن اس کا "ہونا" ہی میرے لیے کافی ہے۔۔۔ اسی حالت میں اپنی آخری سانس تک سنبھال سکتا ہوں اسے۔۔ بس تو اس کی زندگی بخش دے مولا"
رب کو جانے کیا منظور تھا کیونکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ امید کم ہوتی رہی تھی۔ اس کی حالت میں ذرا بہتری نہیں آرہی تھی۔ ادے تو اتنی مایوس تھیں کہ وہ شہرین کے پاس بیٹھی روتی رہتی تھیں۔ سمیع کے علاوہ ایک وہی تھیں جو شہرین کے پاس سے لحہ بھر بھی ہٹنے کو تیار نا ہوتی تھیں۔ انہیں وہم تھا کہ وہ دور ہوں گی تو شہرین ہمیشہ کے لیے انہیں چھوڑ جائے گی۔ ابھی بھی ایمن کو ان ہی کے اصرار پر لایا گیا تھا۔
"ایمن۔۔ یہاں آؤ میرے پاس۔۔۔ دیکھو اپنی ماما کو۔۔۔ ان کے چہرے پر پیار کرو۔۔ ان کا ہاتھ چومو۔۔ انہیں آخری دفعہ دیکھ لو۔۔۔ ماں نہیں ملتی دوبارہ۔۔۔ ماں کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔۔۔ دنیا دکھاوے کے لیے پیار کرتی ہے مگر ماں کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا" وہ بھیگے لہجے میں ایمن کو سمجھا رہی تھیں لیکن ان کی نظریں کونین پر تھیں۔ ایمن نے کونین کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ادے کی باتیں سن کر گھبرا جاتی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی ایمن کے ساتھ ایسی باتیں نہیں کرتا تھا اور اس کا مقصد صرف ایمن کو کسی جذباتی دھچکے سے محفوظ رکھنا تھا۔
"کونین۔۔ مجھے پانی پینا ہے" اس نے ابھی بھی کونین کے پہلو میں منہ چھپاتے ہوئے کہا تھا۔
"آؤ۔۔ میں آپ کو پانی پلا کر لاتی ہوں" کونین نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ خود ادے کی باتیں سن کر ڈر سی جایا کرتی تھی۔
"تم ہمارے درمیان بولنے والی کون ہوتی ہو دو ٹکے کی گھٹیا عورت۔۔۔ تم سے تو خدا ہی نبٹے گا۔۔۔ ہنستے بستے گھر کو نظر لگا دی تم نے۔۔۔ میری بچی کی ہر چیز پر قبضہ کر لیا۔۔۔ اس کی بچی اور شوہر کو ہتھیا لیا۔۔۔ اپنی جھوٹی محبت کا لالی پاپ دے کر اسے ماں سے کتنا دور کر دیا ہے تم نے۔۔۔ لیکن اللہ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کریں گے۔۔۔ تم بھی خوش نہیں رہو گی۔۔۔ ایسے ہی خون تھوک تھوک کر مرو گی ایک دن" ادے یکدم ہی جذباتی ہو گئی تھیں۔ کونین نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا تھا۔
"آؤ ایمن۔۔۔ ہم باہر چلیں" اسے ابھی بھی ایمن کی فکر تھی۔
"باہر چلی جاؤ گی تو کیا خدا میری دعائیں سننا چھوڑ دے گا۔۔۔ یاد رکھنا میری بددعائیں ہمیشہ تمہارا پیچھا کریں گی۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔ بہت خوش ہو نا تم اس آدمی سے شادی کر کے۔۔۔ آگ لگے گی ایک دن ان خوشیوں کو۔۔۔ دیکھنا یہ کیا کرتا ہے تمہارے ساتھ۔۔۔ تمہیں بھی جلا جلا کر مار دے گا جیسے میری بیٹی کو مار دیا ہے۔۔۔ یہ آدمی ہی منحوس ہے" انہوں نے یکدم دروازے میں کھڑے سمیع کی جانب اشارہ کیا تھا۔
"اس کے دم سے سب کو غم ہی ملے ہیں ہمیشہ۔۔۔ اس کی ماں ہوئی یا اس کی بیوی۔۔۔ یا پھر اس کی بیٹی۔۔۔ کس کو خوش رکھ پایا ہے یہ۔۔۔ تم بھی ایک دن اسی فہرست میں شامل ہو جاؤ گی۔۔۔ کبھی خوش نہیں رہو گی۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ ان شاء اللہ" وہ اونچا اونچا بڑبڑا رہی تھیں۔ کونین کے چہرے پر تو ہوائیاں اڑی ہی تھیں، سمیع کا چہرہ بھی بجھ گیا تھا
"یہ آدمی ہی منحوس ہے۔۔۔ بالکل منحوس۔۔۔" ادے کا جملہ کسی زہریلی سوئی کی طرح چبھا تھا اسے۔۔۔ کونین ایمن کو لیے اس کے قریب سے ہوتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔

(اگلے ماہ آخری قسط)

☆☆

مکمل ناول

مریم جہانگیر



ڈر

"تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا؟"
"جیسے زندگی کو موت ڈھونڈتی ہے۔"
"تم کہنا چاہتے ہو کہ تم میری موت ہو؟"
"نہیں تم میری زندگی ہو۔"
"اگر میں تمہاری زندگی ہوں تو اس سے پہلے تم کیا کر رہے تھے؟"
"بھٹک رہا تھا تمہاری تلاش میں۔۔۔"
"اب بھی بھٹکتے رہو گے؟"
"نہیں اب بسوں گا۔"
"تم اب حدود پھلانگ رہے ہو۔"
"نہیں میں اپنی حدود میں ہوں۔۔۔ تم میرے دائرے سے باہر نکلنا چاہ رہی ہو۔"
"تمہارے دائرے سے نکل کر میں کہاں جاؤں گی؟"
"جہاں بھی جاؤ گی لوٹ کر یہیں آؤ گی۔"
"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"
"یہ میرا یقین ہے۔"
"اتنا یقین کیوں؟"
"محبت یقین کرنا سکھا دیتی ہے۔"
"لیکن میں تو تم سے محبت نہیں کرتی۔"
"میں تو کرتا ہوں نا۔۔۔ یہ تو صرف تمہاری زبان کہہ رہی ہے کہ تم محبت نہیں کرتی۔"
"بولتی تو زبان ہی ہے۔۔۔ زبان سے ہی اظہار ہوتا ہے۔"

"تمہاری آنکھوں سے زیادہ حسین گفتگو کوئی نہیں کر سکتا۔"
"تم سے بہتر باتیں کوئی نہیں بنا سکتا۔"
"مجھے لگا تھا شاید مجھے آج باتیں نہ بنانی پڑیں۔"
"تمہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ تم باتیں بناتے ہو؟"
"ہر شخص بناتا ہے۔"
"ہر شخص تسلیم نہیں کرتا۔"
"ہر شخص میرے مقام پہ نہیں ہے۔ آج مجھے کوئی ڈر نہیں ہے' میری زندگی میرے ہاتھ میں آگئی ہے۔"
"اور اگر زندگی ہاتھ سے نکل گئی؟"
"مجھے سجدوں پہ یقین ہے۔۔۔ میری دعائیں اس ایک کے سامنے ہوتی ہیں جو نیتوں سے واقف ہے۔ وہ میرے بہت کے بدلے مجھے کم از کم اس معاملے میں اب مزید نہیں آزمائے گا۔۔۔ اور اگر آزما بھی لیا تو بھی آخر میں نوازے گا۔"
"ہاں۔۔۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔"



وہ خالی ہاتھ تھی' کسی انگلی میں چاندی کا چھلا اور کلائی میں کانچ کی چوڑی بھی نہیں تھی۔ گود میں اس کی کل کائنات تھی۔ اس نے اپنے حلق پہ ہاتھ پھیرا۔ حلق بھی ہاتھ کی طرح خشک تھا۔ اوپر دیکھا تو سورج سوا نیزے پہ چڑھا ہوا چودہ طبق روشن کرنے پر تلا ہوا تھا۔



نیچے دیکھا تو زمین تندور کی طرح دہک رہی تھی۔ پلاسٹک کی چپل زمین کی گرمائش کو پیروں تک پہنچنے سے روکنے میں یکسر ناکام تھی۔

اللہ نے اسے کبھی اتنی بڑی آزمائش نہ دکھائی تھی' لیکن پھر بھی وہ مطمئن تھی۔ اسے بھروسا تھا کہ اللہ نے اسے اس دنیا میں تنہا ہونے کے باوجود ہمیشہ سہارا دیا۔ سہارے کے لیے مختلف وسیلے بھیجے۔ اس دفعہ آن پڑنے والی آزمائش نے اسے صحیح معنوں میں جھنجوڑ کر رکھ دیا' لیکن اللہ پر ایسا کامل یقین تھا کہ نہ کبھی ٹھوکر کھانے دیتا اور نہ کبھی گرنے دیتا۔ سامنے نظر اٹھا کر دیکھا تو ساری دنیا گرم لگی اور سنسان۔۔۔ دور' دور تک کوئی ذی روح نہ تھا۔ اسے پھر وسیلہ چاہیے تھا۔ اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ پھر اپنی زرد سی چادر کو مزید سختی سے اپنے گرد لپیٹ لیا۔ بعض اوقات تنہا ہونا بہت سے ڈر جگا دیتا ہے۔ گرمیوں کی دوپہریں ویسے بھی کسی خوف ناک دیو کی طرح گلی کوچوں کی ساری رونقیں نگل لیتی ہیں۔ پیاس سے اب اگلا قدم رکھنا محال تھا ہاتھ میں اٹھائے وجود میں جنبش ہوئی۔ اس نے چونک کر اپنی ننھی جان کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں نیم بے ہوشی کے رنگ لیے پلکوں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے ہلکان تھیں۔ چہرے پہ پیاس کی داستان رقم تھی۔ نظر دوبارہ اٹھی۔

اس نے ناتواں وجود کو سینے سے لگایا اور گڑ کھائی کہنیوں کا درد آنکھوں سے سیال کی مانند نکل آیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے مسجد تھی۔ کچھ عمارتوں اور کچھ لوگوں میں کتنی کشش ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ان کی گھنی چھاؤں جسم سے ساری تھکاوٹ کھینچ نکالے گی۔ وہ ہمت کر کے اٹھی اور مسجد کے سامنے چلی گئی۔

"بی بی کون ہو؟" وہ آدمی مسجد کی سیڑھیوں پر اسے دیکھ کر پہلی سیڑھی پہ ہی رک گیا۔ جواباً" اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس ایک نظر میں اتنی فریاد تھی کہ کھڑا ہوا شخص کانپ کر رہ گیا۔ "میرے ساتھ چلو!" وہ بھی کسی ٹرانس میں گرفتار ہوئی۔ انسانوں کے تعلق کا ان لہوں سے بہت تعلق ہے جو نظر نہیں آتیں۔ جو آنکھوں سے بولتی ہیں اور آنکھوں کی سمجھتی ہیں۔ اس کی آنکھوں نے ان آنکھوں کی کپکپی پڑھ لی' وہ بادل ناخواستہ اٹھی اور اس جھکی نظر والے شخص کے پیچھے چلتی مسجد سے ملحقہ گھر میں داخل ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"زارا اٹھ جاؤ!" ثمینہ کی ایک آواز لگانے کی دیر تھی' زارا بستر سے ایسے اٹھی جیسے سوئی ہی نہیں تھی۔ منہ' ہاتھ دھویا اور ناشتے کے نام پر بچا ہوا پراٹھا ایسے کھانے لگی جیسے دنیا میں اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ آدھا پراٹھا اور دو نوالے الگ سے تھے۔ اس نے خاموشی سے نگل لیے۔

"پھر کیا سوچا ہے؟ اسکول جاؤ گی؟" ثمینہ نے آس بھری نظروں سے دیکھا۔

"آپ کو مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت کیوں رہتی ہے؟ آپ جانتی ہیں کہ جیسا آپ نے کہہ دیا ہے میں نے ویسا ہی کرنا ہے۔ میرا دائرہ بھی آپ اور میرا محور بھی آپ ہی ہیں۔ آپ کے کہے سے روگردانی کر سکتی ہوں' نہ آپ کی قائم شدہ حدود سے تجاوز کر سکتی ہوں۔" زارا نے برتن میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ثمینہ کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

زارا نے دیوار پر لگی اکلوتی آرائش اور ضرورت کی طرف دیکھا۔ سات بج رہے تھے۔ ماں کی کالی چادر اٹھائی اور اپنی متاع کل سے باہر نکل آئی۔ ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں سے اتری تو ماربل کا فرش منتظر تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے زمانہ قدیم سے عصر حاضر میں آ گئی ہو۔ اس نے ایک پل کو فرق جانچا۔ اوپر کے اکلوتے کمرے میں کیا تھا؟ زندگی گزارنے کا سامان۔ نیچے کے پورشن میں کیا تھا؟ زندگی جینے کے لیے آسائشیں۔۔۔۔ دھیمے دھیمے قدم بڑھاتے اسے ڈر تھا کہ اگر کوئی اٹھ گیا تو اس کی ماں کی خواہش کو اپنے پیروں تلے روند دے گا۔ تمام تر احتیاط [illegible]۔۔۔۔ آواز آئی۔

"اری او لڑکی... کام لے کر آنا... ہم کب تک تمہارا بوجھ اٹھائیں گے۔" اس آواز کو وہ ہزاروں میں پہچانتی تھی اور کبھی سننا نہ چاہتی تھی۔ لیکن اتنا کم از کم واضح ہو گیا کہ اس کے گھر سے نکلنے میں شاہوں کی مرضی شامل ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کا دل نہ تھا اور اگر آگے چلی جاتی تو شاہوں کے سامنے گستاخ بنتی۔ اس نے منہ موڑے موڑے ہی سر اثبات میں ہلایا اور دہلیز عبور کر گئی۔

گھر سے نکلتے ہی ایک سانس جسم کے پنجرے سے آزاد ہوا۔ اس گھر میں ایک ایک سانس بھاری تھی۔ ہر ایک نوالہ بوجھ تھا اور زندگی سہمی ہوئی تھی۔ زارا کا دل چاہتا کہ اللہ سے شکوہ کرے کہ اللہ! تو نے اتنے لوگوں کو نارمل زندگی دی' نارمل اٹھنا' بیٹھنا' چلنا پھرنا دیا ہے۔ اے اللہ مجھے بھی دے دیتا ایک چھوٹا سا گھر... جس میں میرا باپ ہوتا' زندہ ہوتا' میرے ساتھ ہوتا' چپڑی روٹی نہ کھلاتا' بھوکا سلا دیتا' لیکن میں اس سے حق سے مانگتی... چاہے سخت مزاج ہوتا' میری ماں پہ مار پیٹ کر لیتا' لیکن کبھی سال میں ایک دفعہ مسکرا کر دیکھ لیتا تو اس کی تھکاوٹ دور ہو جاتی... اتنے لوگوں کے سر پر باپ کا سایہ ہے... اگر ایک میرے سر پر بھی باقی رہتا تو کیا تھا؟ تیرے خزانے پہ تو کوئی اثر نہ پڑتا۔" یہ سارے شکوے اس کے اندر اٹھتے اور لبوں پر آنے سے پہلے دم توڑ دیتے۔ وجہ ڈر تھا۔

اس کی زندگی کی واحد وجہ اس کی ماں تھی۔ ماں جو پیار کرتی تھی۔ جو پوری دنیا میں واحد ہستی تھی کہ اس کے ان کہے درد جان لیتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے اللہ سے شکوہ کیا تو اللہ خفا ہو جائے گا اور اس کی ماں کو بھی چھین لے گا۔ اسی ڈر کی وجہ سے وہ خاموش تھی۔ اسے کیا پتا وہ ذات ان کہے ڈر بھی پہچان جاتی ہے۔



زارا نے برائٹ فیوچر اسکول سے ہی میٹرک کیا تھا اور آج پورے ساڑھے چار سال بعد یہاں واپس آئی تھی۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں بالیاں بے فکری کے دن جی رہی تھیں۔ جون کا مہینہ تھا۔ بی ایس سی کے امتحانات ختم ہوئے یہی کوئی تین دن گزرے تھے اور ماں نے اٹھا بھیجا تھا۔

"سونے کے بجائے اپنے ہی اسکول جا کر پڑھا لو۔ جو وقت گھر میں گزرے گا اس میں نیچے سے کوسنے تو ملتے رہیں گے۔ پیسے نہیں ملیں گے۔ پیسے گھر کے باہر سے ہی مل سکتے ہیں۔ دکان کی ٹوٹی ہوئی چھت کی مرمت کے لیے پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔" وہ دکان زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے کتنی ضروری تھی۔ زارا جانتی تھی! اسی لیے اسکول میں تو آ گئی تھی' لیکن انگلیاں مروڑنے پہ قابو پانا مشکل تھا۔ اس کی ناتجربہ کاری اس کے چہرے کی معصومیت سے ٹپک رہی تھی۔ اسما نے اضطراب کی شعاعوں کو اس کے وجود سے نکل کر کمرے میں رقص کرتے دیکھا تو گول چہرے اور گہری آنکھوں والی لڑکی کو اپنے کمرے میں لے گئی۔

اسما اس چھوٹے سے اسکول کے مالک کی بیٹی تھی اور شادی کے بعد بھی اس ادارے کو سنبھالے ہوئے

تھیں۔ ثمینہ کو ان کا ہمیشہ ہی بڑا آسرا رہا۔ دو چار جوڑے سی دیتی تو زارا کی فیس نہ دینی پڑتی۔ جب پانچ چھ سوٹ سیتی تو اسما بند مٹھی میں کچھ پیسے تھما دیتیں۔ گھر کا تھوڑا بہت خرچ تو چل ہی جاتا۔

زارا نے بہت نیچی آواز میں اپنا مدعا سامنے رکھا۔ پیسا انسان کو دنیا میں کتنے رنگ دکھاتا ہے۔ انسان کو نیچے لے جاتا ہے۔ اتنا نیچے کہ انسان جتنا بھی چیخ کر بولے اس کی آواز اندر گھٹ جاتی ہے۔ جو بھی تھا اور جیسے بھی تھا۔ اس نے کبھی مدد نہیں مانگی تھی۔ کبھی فیس معافی کی درخواست نہیں دی تھی۔ معاشی حالات کمزور ہونے کے باوجود کبھی فیس جمع کروانے میں تاخیر نہیں کی تھی۔ اسما مسکرائیں۔

"آج کل کے دور میں مانگنے والے ہیں۔ شکر ہے آپ نے مدد نہیں مانگی۔ آپ نے موقع مانگا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے آپ کو محنت کرنے کا راستہ دکھایا ہے۔ اگر آپ محنت کرنے کے بجائے مدد مانگنے آتیں تو شاید یہ پہلی اور آخری مدد ہوتی۔" زارا نے ممنون نظروں سے اسما کو دیکھا۔ اس اسکول میں اس نے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ وہ اس اسکول میں کبھی پڑھانے جائے گی یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اسما نے اگلے دن سے زارا کو اسکول پڑھانے کی نوید دی اور وہ یہ جان فزا خبر اپنے پلو سے باندھ کر گھر لوٹ آئی۔



اس شخص نے اسے نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ بیک وقت ڈری ہوئی تھی اور مطمئن بھی تھی۔ اسے خود سے زیادہ یقین اللہ کی ذات پہ تھا۔ وہ ڈرتی جھجکتی اس کے پیچھے چلتی آئی۔

"یہاں بیٹھ جائیں!" اس شخص نے امرود کے درخت کے سائے میں بچھے تخت کی طرف اشارہ کیا اور سامنے ایک ادھ کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ وہ وہاں پہ ساکت بیٹھی رہی۔ بان کی چارپائی پہ پتوں سے چھن کر آتی دھوپ ٹھنڈی سی لگی۔ اب سورج سے براہ راست مقابلہ نہیں تھا۔ سامنے مٹی کا گھڑا پڑا تھا۔ دل چاہا اٹھ کر اپنی بیٹی کی پیاس بجھالے لیکن اس کے پاس اجازت لے کر پانی پینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ شخص واپس آیا۔ اس عاجز سے بندے کا نام رحیم تھا اور یہ نام اپنے پورے معانی اور مطالب کے ساتھ اس کی شخصیت پہ حاوی تھا۔ اس کی آدھی سیاہ، آدھی سفید داڑھی میں انکساری اور متانت جھلک رہی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والے مرد اور عورت کے حال حلیے سے لگ رہا تھا کہ آرام میں خلل ڈالا گیا ہے۔

"بھابھی پانی پلائیں ان کو!" اس شریف النفس نے ان کہی پیاس بھانپ لی۔ پانی کا گلاس تھما کر وہ عورت واپس رحیم کی طرف مڑی۔

"یہ ہیں کون رحیم؟" وہ عورت جائزہ لینے پر مصر رہی۔ اس کی آنکھیں اندر تک جھانکنے کو بے تاب لگیں۔ آدھے گھنٹے میں ثمینہ نے اپنی ساری داستان سنائی۔ کہتے کہتے وہ رونے لگتی تو لفظوں کا راستہ آنسو روک لیتے۔ وہ ہچکی لیتی اور پھر سناتی۔ لفظ کچھ باہر نکل رہے تھے اور کچھ اندر ہی کہیں تھے۔ سننے والوں نے جو سنا اس کا لب لباب یہ تھا کہ شوہر فوت ہو گیا اور سسرال والوں نے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔ سسرال دو شہر دور ہے۔ وہ بیٹی سمیت بس پہ سوار کر کے چلتے بنے۔ یہ بھی غنیمت کہ جان بخش دی۔

"ہائے ایسے کیسے نکال سکتے ہیں سسرال والے؟ تمہارا کوئی بڑا تو ہوگا اسے ساتھ لے جاؤ اور ان لوگوں سے بات کرو۔" وہ عورت جو رحیم کی بھابھی تھی ہاتھ نچا کر بولی۔ انسان کی جسمانی حرکات اس کے باطن کا آئینہ ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ ہاتھ اٹھا کر اپنی بات کی وقعت بڑھاتے ہیں اور کچھ لوگ ہاتھ اٹھا کر اپنی ہی وقعت گھٹا دیتے ہیں۔

"میرا کوئی اپنا نہیں ہے۔ صرف ایک تایا تھے۔ والدین کی وفات بچپن میں ہو گئی تھی۔ تایا بے اولاد تھے اور کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔ تائی کی وفات چند برس پہلے ہوئی۔ ابھی پچھلی سردیوں میں تایا بھی

فوت ہوگئے۔ کوئی عزیز رشتہ دار نہیں، جس سے سایہ مانگ سکوں۔ ملنے والے والے بھی ایسے موقع پہ صاف جان چھڑاتے ہیں، آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ پہ بھی بوجھ نہیں بنوں گی۔ یہاں سے چلی جاؤں گی۔" ثمینہ نے آنکھ کے کونے صاف صاف کرتے ہوئے اپنا خاندانی پس منظر بتایا اور اپنے سر پہ کھڑے لوگوں کی نظر میں تماشا نہ بننے کی سعی کی۔

"یعنی تمہارا کوئی نہیں؟ کوئی بھی نہیں؟ اب تم کہاں جاؤ گی؟ سنا ہے بڑے بازار میں خواتین کو پناہ دینے والا ادارہ ہے۔ اتنی اچھی ساکھ نہیں ہے، لیکن اب تمہیں کوئی نہ کوئی چار دیواری اور چھت تو چاہیے۔ ابھی دو گھڑی سکون لو، پھر میں کشور بیگم خود تمہیں چھوڑ کر آتی ہوں۔" اس عورت نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے دبے لفظوں میں باہر کا راستہ دکھایا۔ ثمینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ کہیں نہیں جائیں گی۔ یہ یہیں رہیں گی۔" رحیم نے قطعی انداز میں کہا۔

"بھائی پاگل ہوگئے ہو.... یہ پتا نہیں کون ہے اور کون نہیں اور تم اسے اپنے گھر میں کیوں رکھنا چاہ رہے ہو؟" خاموش کھڑے مرد کی زبان کلبلائی۔

"یہ یہاں رہے گی کہاں؟ دو کمرے ہیں.... ایک ہمارا اور ایک تمہارا!" کشور بیگم نے اپنے شوہر کے منہ سے نکلی بات کو آگے بڑھایا۔

"سلیم میں نے کہہ دیا، یہیں رہیں گی تو یہیں رہیں گی۔" اب رحیم کا انداز حتمی ہوا۔ وہ دونوں کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ یہ گھر رحیم کا تھا اور اس کا اندازہ رحیم کے قطعی اور حتمی انداز سے ہو رہا تھا۔ وہ اپنی بات کہہ کر گھر سے باہر چلا گیا۔

ثمینہ نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ بے بس تھی۔ آسمان والے نے زمین والوں کے حوالے کیا تھا اور زمین والے اسے تھوڑی سی زمین دینے کے روادار نہ تھے۔ پانچ منٹ بعد جب مسجد سے "اللہ اکبر اللہ اکبر" کی صدا سنائی دی تو ڈھیروں سکون ثمینہ کے اندر اتر گیا۔ وہ وضو کے لیے اٹھی۔ اس کے لیے اسے

کسی کی اجازت درکار نہ تھی۔ فلک پہ پرندے اذان سن کر اپنے رزق کو سمیٹنے کے لیے جلدی کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

گھر میں داخل ہوئی تو خوشی اس کے ہر قدم سے جھلک رہی تھی۔ وہی بھاگ جانے کا دل' وہی ڈر جانے والی طبیعت اور وہی چھپ جانے کی خواہش۔ اس نے تیز تیز قدم سیڑھیوں کی طرف بڑھائے' لیکن وہی قسمت۔۔۔۔ آواز آئی۔

"رک جاؤ!" اور وہ رک گئی۔

"کام مل گیا؟" مردانہ آواز نے سختی سے پوچھا۔

"جی!" اس نے مختصر جواب دیا۔ "اس گھر سے باہر جاتو رہی ہو' لیکن یاد رکھنا اگر اس گھر کی طرف کوئی بھی انگلی اٹھی یا کوئی بھی پتھر صحن میں آیا تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" کہنے والا قطعیت سے کہہ کر برآمدے سے غائب ہوگیا۔ زارا کے لیے پہلی سیڑھی پر پیر رکھنا مشکل ہوگیا۔ پھر سے وہی ذمہ داریوں کا بوجھ' پھر سے وہی شک کی کڑی نگاہیں اور کینہ توز لہجے۔۔۔۔

سرکاری اسکول اتنے فاصلے پر تھا کہ وین میں آنا جانا پڑتا۔ ثمینہ وین کا خرچا کیسے برداشت کرتی۔ جتنا خرچا وین کا بنتا اس خرچے سے کم میں دو گلیاں چھوڑ کر برائٹ فیوچر میں کام بن گیا۔ وہ برائٹ فیوچر میں پہلی بار بھی اماں کے ساتھ گئی تھی۔ اول اماں کو لوگوں سے تعریف سن کر دفتر کے پردے اور نمونے کا یونیفارم سلائی کرنے کے لیے بلایا۔ بعد ازاں اسما کی خدا ترسی نے اماں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ گھر کی چھوٹی بڑی بات سن لیتی' لیکن زارا کو میٹرک وہیں سے کروایا۔ یہ اور بات کہ کوایجوکیشن کی وجہ سے زارا کا اپنا سانس اٹکا رہتا۔ تراشنے والے نے اسے خوب تراشا تھا۔

سنہری سی رنگت جیسے صحرا کے دمکتے ذروں پہ سورج کی روشنی چمک رہی ہو۔ تیکھے سے نقش اور بہت گہری آنکھیں' ایک دفعہ نظر پڑجائے تو پھر ہٹانے میں بھی دقت ہوتی۔ کچھ تو تھا اس میں یا اس کی مسکراہٹ میں کہ دل مزید دیکھنے کی خواہش کرتا۔

کالے گھنے بالوں کی صدائیں اور سیاہ آنکھیں صدیوں کی مسافتیں' ڈری سہمی بھی کمال لگتی۔ سب سے کمال اس کی چھوٹی سی ناک میں چمکتی لونگ تھی' اس کی روشنی کالی آنکھوں سے منعکس ہو کر دیکھنے والے کو دیوانہ کردیتی۔ ایسا تب ہوتا جب وہ گھنی پلکیں اٹھاکر کسی کو دیکھتی۔ زیادہ تر وہ نظریں جھکا کر رکھتی اور عام سی ہی محسوس ہوتی۔ عام سی بھی اس لیے کہ اس کی معصومیت کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے فن سے ناواقف تھی۔ اپنی طلسمانہ کشش سے انجان اپنی محرومیوں کی بکل میں دنیا کی وسعتوں سے انجان وہ ڈرتی رہتی کہ کہیں کوئی بغیر موقع کے ہی موقع نکالنے کی کوشش نہ کرے اور اسے زندگی کے رنگ دکھاتا یہ واحد روزن بند نہ ہوجائے۔

احتیاط کرتے کرتے دس برس گزر گئے۔ پہلے پانچ سال ثمینہ نے خود احتیاط کی ہر کاپی۔ ہر کتاب کے آخری صفحے پہ نظر رکھی اور پھر یہی سبق گھول کر زارا کو پلا دیا۔ زارا کے طور اطوار خود بخود ماں کے بڑھائے سبق میں ڈھل گئے۔ دسویں کے بعد لڑکیوں کے کالج میں داخلہ لیا تو سکھ کا سانس لیا۔ اب پہلے جتنا ڈر نہیں رہا تھا۔۔۔۔ وہ عمل اور رد عمل سے واقف ہوچکی تھی۔ بالکل خاموش بت بن کر زندگی میں سکون آگیا۔ لہجوں کا ڈر ابھی بھی تازہ تھا اور یہ ڈر ابھی قطرہ قطرہ پھر اس کے اندر اتار گیا تھا وہ تھکے تھکے قدم اٹھاکر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ آخری سیڑھی پر قدم رکھا تو اماں کی آواز آئی۔

"آگئی ہو؟ کوئی خیر کی خبر؟" ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جیسے اس چھو کر گزر گیا اور وہ مسکرا دی۔ ماں کو اولاد کی کچی پکی سیڑھی پر رکھے دبے قدموں کا بھی پتا چل جاتا ہے۔ ماں سے زیادہ کوئی منتظر نہیں۔

"آپ کی دعائیں جب تک میرے ساتھ ہیں' میں خیر کی خبر ہی لاؤں گی۔" زارا نے مسکرا کر ماں کو دیکھا اور کالی چادر اتار کر مسہری پر رکھی۔ ثمینہ کو لگا کہ جیسے خوشیاں دور کہیں سے اس کا پتا پوچھتی آرہی ہوں۔

☼ ☼ ☼

یہ گھر ثمینہ کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ صبح اٹھتی تو صحن میں رحیم کو دانہ دنکا پرندوں کو ڈالتے دیکھتی۔ کچھ ہی دنوں میں اس نے سیڑھیوں سے اوپر ایک کمرہ بنا کر ثمینہ کو اس میں منتقل کر دیا تھا۔ ثمینہ کے لیے وہ مسیحا ثابت ہوا۔ اس اللہ کے بندے نے رہنے کو زمین دے دی تھی۔ سارا دن گھر کے کام کرتے گزر جاتا۔ کشور اور سلیم نے بھی اس صورت حال سے اتفاق کر لیا۔ انہیں مفت کی ملازمہ مل گئی تھی، پھر اعتراض کاہے کا۔ دن پر لگا کر اڑتے گئے۔ ثمینہ نے ایک دوبار رحیم سے بات کرنے کی کوشش کی کہ وہ کہیں اس کے لیے کوئی کام ڈھونڈ دے، لیکن رحیم نے کوئی مثبت عندیہ نہ دیا۔ ہمیشہ آدھی ادھوری بات چھوڑ کر اٹھ جاتا۔ یوں جیسے اسے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔

ثمینہ کی عدت پوری ہوئے دوسرا روز تھا۔ کشور اور سلیم شادی پر گئے ہوئے تھے۔ ثمینہ اپنی بیٹی کو کمرے میں لٹا کر صحن دھو رہی تھی۔ دروازہ چرر کی آواز سے کھلا۔ لکڑی ایک فطری شے ہے اور فطری چیزوں کا شور کبھی کانوں کو برا نہیں لگتا۔ رحیم کے آنے کا وقت تھا۔ ثمینہ نے فوراً "پائنتی پہ رکھی اوڑھنی سے سر اور جسم ڈھانپا۔ رحیم کے قدموں میں اضطراب نمایاں تھا۔ وہ اس کے قریب یوں آیا جیسے برسوں سے مسافر ہی ہو۔ وقت بھی بے لگام گھوڑا ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ اس پہ سواری کر رہا ہے۔ اسے اپنی مرضی سے دوڑا رہا ہے۔ اپنی مرضی کی سمتوں میں لے جا رہا ہے۔ لیکن پھر یوں ہوتا ہے کہ یہ گھوڑا بدک جاتا ہے۔ سارے منصوبے، تمام سمتیں کہیں پیچھے رہ جاتی ہیں اور یہ بے لگام گھوڑا اپنی مرضی کے فیصلے کروا لیتا ہے۔ تب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمارے فیصلے تو ریت کے گھر تھے۔ سچ تو یہ بے لگام گھوڑا ہے۔

"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" رحیم نے ہتھیلیوں پہ آئے پسینے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "جی کہیں!" ثمینہ اپنے محسن کے سامنے مؤدب ہوئی۔

"میں آپ سے شادی کا خواہاں ہوں۔ مجھ سے شادی کریں گی؟" اس نے بغیر نظر ڈالے سوال کیا۔

ساری عمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ وقت کے ہاتھوں میں بساط آنے پہ منہ چڑاتا نظر آیا۔

"اسی لیے روکا تھا آپ نے؟" ثمینہ طیش کھا گئی۔ اس کے الفاظ سادہ لیکن لہجہ بے حد کڑوا لگا۔

"نہیں۔۔۔" مکمل یقین سے یہ ایک لفظ ادا کر کے اس کے لب مزید ملے۔ "اس دن میرے دل کو عجیب سی بے چینی تھی۔ سمجھ میں نہ آنے والی کیفیت تھی۔ میں اپنے کمرے میں دبکا رہا۔ باہر آیا تو مسجد کی سیڑھی پہ آپ کو بیٹھا دیکھا۔ آپ کی گود میں ننھی سی گڑیا دیکھی۔ اگر وہ آپ کی گود میں نہ ہوتی تو شاید کبھی آپ کو اندر آنے کا بھی نہ کہہ پاتا۔ جونہی گھر کی چار دیواری میں آپ داخل ہوئی، اس بچی پہ درخت کا سایہ پڑا تو مجھے سکون مل گیا۔ دل کی بے چینی کو قرار آ گیا۔ اب نہ جانے کیوں مجھے اس بچی سے انسیت ہو گئی ہے۔ کچھ ایسا ہے اس میں کہ میرا دل کرتا ہے میں اس کے سر پر ہاتھ رکھوں۔ اگر آپ کو ذرہ برابر بھی میری نیت میں کھوٹ لگتا ہے تو انکار کا حق محفوظ رکھتی ہیں۔ اس صورت میں میری خواہش یہ بھی ہے کہ آپ ہاں کریں یا نہ کریں۔ یہ بچی میرے پاس ہی رہے۔" رحیم نے ساری بات لرزتے ہونٹوں کی طرف نظر رکھتے ہوئے کی۔

ثمینہ اس سارے دورانیے میں کبھی رحیم کی شکل دیکھتی اور کبھی کمرے میں لیٹی زارا کی طرف دھیان کرتی۔ خاموشی سے سر جھکایا۔ اس جھکے سر میں نیم رضامندی تھی۔ رحیم دبے قدموں سے بغیر کچھ کہے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اذان کی آواز آئی تو ثمینہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

اس معاشرے میں عورت امیر ہو یا غریب ہو، کنواری ہو یا بیوہ ہو، تنہا نہیں رہ سکتی۔ اسے ایک نام حوالے کے لیے ہر جگہ دینا پڑتا ہے۔ رحیم کی آواز کا سوز اسے اللہ کی رحمتوں اور نعمتوں سے آشنا کروا کر نیم رضامندی کو مکمل رضامندی میں تبدیل کرنے کے لیے کافی ثابت ہوا۔

"حی الفلاح۔۔۔ حی الصلوۃ۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر!"

میں تو خود پر بھی کفایت سے اسے خرچ کروں وہ ہے مہنگائی میں مشکل سے کمایا ہوا شخص

✡ ✡ ✡

زارا کا اپنے ہی اسکول میں بحیثیت استاد آج تیسرا دن تھا۔ گلا خشک ہو چکا تھا اور محنت نے کھلتے ہوئے سنہرے رنگ میں ہلکی سی تپش شامل کردی تھی۔ کل تو اماں بھی گھر میں کہہ رہی تھی کہ آہستہ بولو۔ اسکول میں اونچا بول بول کر اسے آہستہ بولنے سے دشواری ہو رہی تھی۔ چھٹا پیریڈ لے کر وہ اسٹاف روم میں آئی تو آگے فریحہ اور شہناز بیٹھی ہوئی تھیں۔ شہناز اس زمانے میں بھی اسی اسکول میں پڑھاتی تھیں جب زارا پانچویں کلاس میں تھی اور فریحہ کا اس اسکول میں پہلا سال تھا۔ زارا کا ٹائم ٹیبل ان دونوں ٹیچرز سے میل کھاتا، فری پیریڈ ایک ساتھ ہی آتے۔

"کیسی جا رہی ہے نئی نئی نوکری؟" شہناز نے زارا سے پوچھا۔

"الحمدللہ..... اچھی جا رہی ہے، بس اونچا بولنا پڑتا ہے۔ گلا دکھنے لگتا ہے۔" زارا نے ہلکا سا مسکرا کر جواب دیا۔

"ہاں یہ تو ہے اچھا استاد وہی ہوتا ہے جس کا موثر طریقہ تدریس ہو اور آواز کمرہ جماعت کے آخر میں بیٹھے طالب علم تک بخوبی پہنچتی ہو۔" شہناز نے گویا اپنے تجربے کی پوٹلی سے تھوڑا سا ذائقہ پیش کیا۔

"ایسا ہی ہے۔" تھکی ہوئی زارا کے پاس چکھ لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

"مجھے ایک سال ہو گیا ہے، لیکن ابھی تک میرا گلا ہر دوسرے دن خراب ہو جاتا ہے۔" فریحہ نے بھی باتوں میں حصہ لینے کی کوشش کی۔

"ارے لڑکیو! تم تو ابھی بالکل تازہ دم ہو اور یہ حال ہے۔ میں اس بھٹی میں اتنے سال جل کر بھی اپنے گلے کو پکا نہیں کر سکی۔ خاص طور پر نہم بی میں جا کر اسلامیات پڑھاتے ہوئے مجھے ان کا نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے پورا زور لگانا پڑتا ہے۔" شہناز نے خود کو ان کی فہرست میں داخل کرنے کی کوشش کی۔

بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے کرتی زارا چونک گئی۔

"نہم بی جو سیڑھیاں چڑھ کر دائیں جانب ہے؟ میں وہاں فزکس پڑھاتی ہوں، مجھے تو وہ کلاس سب سے اچھی لگی ہے۔" زارا بولی۔

"تم مذاق کر رہی ہو؟" فریحہ نے حیرت سے زارا کی طرف دیکھا اور سوالیہ نظروں سے سوال داغا، لیکن زارا کی سنجیدگی دیکھ کر اسے زبان ہلانا پڑی۔

"اتنی بدتمیز کلاس ہے کسی صورت قابو میں نہیں آتے۔ آخری دو قطاروں میں بیٹھے ہوئے لڑکوں کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ وہ ایسی ایسی آوازیں نکالتے ہیں، لگتا ہے جیسے میں کسی چڑیا گھر میں آگئی ہوں۔"

"اچھا واقعی..... میری کلاس میں تو سب ہی خاموش ہوتے ہیں اور بڑا اچھا رسپانس بھی دیتے ہیں۔ میں تو سوچ رہی ہوں کہ اگر اسی کلاس میں مجھے کچھ اور پیریڈ مل جاتے تو بہتر تھا۔" زارا نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ہاں اس کلاس میں پیریڈ تمہیں آسانی سے مل سکتے ہیں، کیونکہ مس صائمہ نے پچھلے ہفتے اچانک شادی طے پانے کی وجہ سے اسکول چھوڑا ہے۔ وہ اس کلاس کی کلاس ٹیچر بھی تھی اور چار مضمون پڑھاتی تھی۔ اسی وجہ سے تو تمہیں فوراً" رکھ لیا گیا۔ تمہیں بورڈ کی کلاس بھی اس لیے دے دی گئی کہ تمہارا شمار اس اسکول کے سابقہ ہونہار طالب علموں میں ہوتا تھا، ورنہ اتنی ینگ ٹیچر کو بڑی کلاسز نہیں دی جاتیں۔" شہناز نے زارا کو اس کی تعیناتی کا پس منظر بتایا۔ زارا نے اثبات میں سر ہلایا۔

✡ ✡ ✡

اگلے مہینے رحیم نے ثمینہ سے نکاح کر لیا۔ کشور اور سلیم کے لیے یہ اتنا بڑا دھچکا تھا کہ انہوں نے اس پر یقین کرنے کے لیے ولیمہ کے کھانے کو فریز کر کے بار بار کھایا۔ سیڑھیوں کے اوپر نیا کمرہ خالی ہو چکا تھا۔ کشور کو لگتا اب ثمینہ اپنے رنگ ڈھنگ دکھائے گی، کھل کر سامنے آئے گی۔ چست کپڑے پہنے اٹکھیلیاں کرتی

گھر آئے گی، لیکن ثمینہ میں رتی بھر بھی فرق نہ آیا۔ وہ ویسی ہی سادہ اور ملازمہ سی رہی۔ البتہ رحیم کے کام اب ذوق شوق سے کرتی۔ رحیم پہلے زارا کو دور سے دیکھا کرتا تھا، مگر اب اٹھا کر باہر لے جاتا، پیار دلار کرتا۔ واپس آتا تو کوئی نہ کوئی کھلونا زارا کے ہاتھوں میں ہوتا۔ کشور کے دل پر سانپ لوٹ جاتے، لیکن وہ زہر کسی مخصوص وقت کے لیے محفوظ کرتی رہی۔ سلیم اس کا شوہر تھا اور رحیم جیٹھ۔۔۔ لیکن اس کے کپڑے لتے سے لے کر گھر کے راشن تک ساری ذمہ داری رحیم نے اپنے سر اٹھائی ہوئی تھی۔

سلیم چھوٹا ہونے کی وجہ سے ذمہ داریوں سے آزاد تھا۔ گھر کے ساتھ بنی یہ مسجد رحیم اور سلیم کے والد نے بنائی تھی۔ اس سے رحیم کی قلبی وابستگی بھی تھی اور یہی روزی روٹی کا ذریعہ بھی۔ وہ اس مسجد کا موذن بھی تھا اور خادم بھی۔ سلیم اس ذمہ داری سے مکمل طور پر بری الذمہ تھا۔ گھر سے کچھ دور پانچ دکانیں بھی تھیں۔ جن میں سے چار کا کرایہ رحیم لے رہا تھا اور ایک کا سلیم۔ محنت رحیم کی ہی تھی، لیکن وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا، مگر اب سکون کے سمندر میں پہلا کنکر گر چکا تھا۔ زارا پاؤں پاؤں چلنے لگی تو ثمینہ کی زندگی میں نجات دہندہ بن کر آنے والا بڑی خاموشی سے چلا گیا۔ عصر کی اذان دیتے دیتے موت کے فرشتے نے رحیم کی روح یوں قبض کی جیسے کلیاں چٹختی ہیں۔ ایک سکون بھری ہچکی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے ابھری اور محلے کے ہر گھر میں سنی گئی۔ کچھ چھن سے ثمینہ کے اندر ٹوٹا۔ صحن کے اندر کھیلتی زارا کو اسی وقت ٹھوکر لگی تھی۔ کچھ اتفاق کتنے برے لگتے ہیں، ان کا اتفاقیہ ہونا زندگی کی بہت سی کڑیوں کو اس طرح جوڑ دیتا ہے کہ انسان کی نگاہ رحم کی طلب میں آسمان پر فریاد کے پرندے بھیجنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

کشور کو اپنا زہر استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ رحیم خاموشی سے چلا گیا تھا۔ ثمینہ شاید اگلے دن سڑک پر ہوتی، لیکن رحیم کی جیب سے نکلی وصیت نے اس گھر میں قدم جما دیے۔ وہ وصیت محلے کے بزرگ نے پڑھی۔ جس کے مطابق مکان ثمینہ اور اس کی بیٹی کے نام کر دیا گیا تھا۔ یعنی وہ کم گو سا شخص کم عقل نہیں تھا۔ ثمینہ ویسے ہی بے ضرر تھی، لیکن کشور نے ثمینہ کو اوپر والے کمرے میں منتقل کر دیا اور شام میں سیپارہ پڑھنے کے لیے آنے والیوں کو پڑھانے کی ذمہ داری خود لے لی۔ یہ وہ صدقہ جاریہ تھا جو ثمینہ نے رحیم کی اجازت سے شروع کیا تھا، لیکن اس کی موت سے وہ اچھوت، سلیم شاہ اور کشور شاہ کی مالکن بن گئی۔

سلیم مسجد میں خادم اور گھر میں شاہ بن گیا۔ بھلا ہوا کہ دونوں کو اللہ نے اگلے ہی سال ایک بیٹی سے نوازا تھا۔ اب نہ جانے یہ بیٹی کے پیدا ہونے پر دل نرم ہوا تھا یا شکرانے کا طریقہ تھا کہ سال سے ضبط کیا جانے والا رحیم کی دکانوں کے کرائے کا کچھ حصہ ثمینہ کو ملنے لگا۔

☆ ☆ ☆

زارا کی بہت کم خواہشیں تھیں جو پوری نہ ہوئی ہوں۔ وہ پر آسائش زندگی نہیں گزار رہی تھی، لیکن

اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی پوری ہوتیں کہ اس کے آس پاس رہنے والوں کو لگتا جیسے کچھ غیبی قوتیں صرف زارا کی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنی ساری طاقت صرف کرتی ہیں۔ جیسے دانہ چگنے پرندوں کا آجانا تو کری مل جانا "اماں کو سلائی کے پیسے زارا کی دعا کے فوراً" بعد مل جانا اور ابھی بھی اسے نہم بی میں تین پیریڈ مل گئے۔ ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے پورا ہوجانے کو کچھ نہیں سمجھتے' کیونکہ ہم ان کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ بالکل ہوتی ہے' بلکہ بے حد ہوتی ہے۔ مگر ان کے بعد زندگی کا تصور نہیں ہوسکتا' اس لیے یہ بہت اہم اور چھوٹی خواہشات پوری ہونے پہ' ہمارے سر کو شکر میں نہیں جھکا سکتیں۔

وہ نہم بی کا حاضری رجسٹر لے کر بیٹھی تھی۔ رجسٹر سے ایک صفحہ نکلا اس صفحے پر بہت خوب صورتی سے یہ غزل لکھی ملی۔ اس نے یہ صفحہ اٹھا کر اپنے بیگ میں ڈال لیا اور کلاس میں جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

"بیٹا پانی لادو!" اس نے سب سے پہلی رو میں بیٹھے لڑکے کو مخاطب کیا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ گھر میں بھی اگر کبھی کوئی ٹیوشن پڑھنے آتا تو وہ اسے بھی بیٹا کہہ کر بلاتی' اگرچہ اسکول کے نویں کلاس کے بچوں اور اس کی اپنی عمر میں اتنا زیادہ فرق نہیں تھا لیکن پھر بھی زارا کو ایسے بلانا اچھا لگتا تھا۔ اگر یہ کلاس اتنی فرماں بردار نہ ہوتی تو زارا اپنے طرز تخاطب پر ضرور سوچتی۔ جس لڑکے کو زارا نے بلایا تھا اس نے سب سے آخری قطار میں بیٹھے ہوئے لڑکے کی طرف دیکھا۔ زارا اس کی نظروں کا پیچھا کررہی تھی۔

"کیا ہوا؟" اسے پوچھنا ہی پڑا۔

"مس اس کی ڈیوٹی ہے پانی پلانے کی۔" اگلی قطار والے صائم نے کہا۔ زارا نے پھر سے پچھلی قطار والے زین کو دیکھا۔

"زین بیٹا۔ آپ لے آؤ پانی!" زین کا چہرہ سرخ ہوا اور کلاس میں موجود بچوں نے صاف صاف اپنی مسکراہٹ دبائی۔ زارا کو کچھ عجیب سا لگا' مگر دو منٹ بعد زین پانی لے کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ دوپٹے کے نیچے اپنے گھنے بالوں کو ایک پن سے سمیٹا ہوا تھا۔ اسی لمحے پن کھلی۔ زارا نے زین کے ہاتھ سے گلاس تھاما اور ساتھ ہی اس کے سر سے دوپٹا سرکا۔ ایک ہاتھ سے گلاس تھامے اور دوسرے ہاتھ سے دوپٹا سنبھالتے زارا واقعتاً ہچکچائی۔ لڑکے لڑکے ہی ہوتے ہیں' وہ چھوٹے یا بڑے نہیں ہوتے' ان کی آنکھوں کی جگہ دوربین فٹ ہوتی ہے۔ زارا سخت مضطرب ہوئی۔ اسی لمحے زین اس کے عین سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور گلاس واپس پکڑ لیا۔ زارا نے تشکر آمیز نگاہیں اٹھا کر زین کو دیکھا اور فوراً" سے بال سمیٹ کر دوپٹا سیٹ کرلیا۔ پانی پی کر زارا کا اعتماد بحال ہوچکا تھا۔ اس نے آرام وسکون سے اپنا لیکچر دیا اور پھر کلاس سے باہر نکل آئی۔

"بات سنیں!" پیچھے سے آواز آئی۔ زارا نے رخ موڑ کر دیکھا۔ یہ زین تھا۔

"جی بیٹا!" زارا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"آپ مجھے بیٹا نہ کہا کریں۔" نظریں جھکا کر اپنی بات کہہ کر وہ جاچکا تھا۔ زارا حیرت سے کھلا منہ لیے اکیلی کھڑی رہی۔ کٹوریوں میں پڑا باجرہ پرندوں کا منتظر تھا اور وہ رزق کے تلاش میں یہاں وہاں پرواز کررہے تھے۔

☆ ☆ ☆

کمرے کے درودیوار میں مشین کی گھر گھر گونج رہی تھی اور نفوس کے لیے معمول کی بات تھی۔

"اماں آپ کیوں محبت' محبت کرتی رہتی ہیں؟" زارا حیرت سے سلائی مشین پر جھکی ماں سے پوچھ رہی تھی۔

"تم کیوں اماں اماں کرتی ہو؟" ثمینہ نے سلائی مشین پر جھکے جھکے ہی پوچھا۔ "کیونکہ میری اماں میری زبان سمجھتی ہے۔ آپ جن کے سامنے محبت کا راگ الاپ رہی ہیں اور جن کی خدمت میں اپنی ہڈیاں گلا رہی ہیں' ان کو آپ کی بالکل ضرورت نہیں۔ کل کو

انہیں یہ کام آپ کے ذریعے سے پورے ہوتے نہ ملیں تو یہ کوئی نوکرانی رکھ لیں گے۔" زارا نے کشور بیگم کی قمیص کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا' جسے ثمینہ بڑی ہی نفاست سے سی رہی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے' محبت کی کوئی زبان ہوتی ہے؟" ثمینہ نے سلائی چھوڑ کر اپنی معصوم بیٹی کو دیکھا۔

"اور کیا نہیں ہوتی زبان؟" زارا نے جواب میں سوال ہی پوچھا۔

"نہیں' محبت کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ جیسے روشنی زمین تک کا سفر طے کرتی ہے اور پتا بھی نہیں لگتا۔ اسے کسی سواری کی بھی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ جیسے بارش برستی ہے اور پلک جھپکتے ہی موسم بدل جاتا ہے۔ اسی طرح محبت لمس ہے محبت احساس ہے' یہ پتھر پر پڑنے والی مسلسل دستک ہے جو جونک لگا ہی دیتی ہے محبت اپنا آپ منوا ہی لیتی ہے۔ محبت کی اگر کوئی مخصوص زبان ہوتی تو جانوروں کو کہاں سمجھ آ پاتی؟ کتا کاٹ لے تو چودہ ٹیکے لگتے ہیں۔ اسی کتے کو محبت کا یقین ہوجائے تو آپ کے تلوے چاٹ لیتا ہے۔ آپ پر آنے والی مصیبت پر اتنا بھونکتا ہے کہ مصیبت کو لگتا ہے کہ وہ خود مصیبت میں آگئی ہے۔ اگر جانور محبت کو محسوس کرلیتے ہیں تو کیا انسان نہیں کرسکتے؟ مجھے دستک دینے دو! دروازہ کھولنا ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ دروازہ اوپر کھولے گا اور وہاں سے کھولے گا جہاں سے امید بھی نہیں ہوگی۔" ثمینہ نے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بیٹی کو سمجھایا۔

"آپ کی فلاسفی کا جواب ہی نہیں ہے۔ یہ بتائیں اب کون سا دروازہ کھلوانا ہے؟" زارا نے شرارت سے کہا۔

"ہنستی رہا کرو۔۔۔ اللہ تمہیں ہنستا رکھے!" ثمینہ نے صاف صاف جواب ٹالا۔

"یعنی اب آپ نے جواب نہیں دینا۔" زارا بھی اس ٹال مٹول کی عادی تھی' لیکن پھر بھی پوچھے بنا نہیں رہ سکی۔ ثمینہ کی خاموش مسکراہٹ دیکھ کر باہر چھت پر آگئی۔ کھونٹی پر ٹنگے لفافے سے باجرہ نکالا اور مٹی کی کٹوریوں میں ڈال دیا جو منڈیر پر دھری تھیں۔ اب اس کے دوستوں نے پر پھیلا کر آنا تھا اور زارا کی موجودگی کی پروا کیے بغیر دانا چگنا تھا۔ زارا نے منتظر آنکھیں آسمان پر ٹکادیں۔



فری پیریڈ تھا۔ زارا جونہی اسٹاف روم میں داخل ہوئی فریحہ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔ انسان ایک چیز جب کسی دوسرے کے پاس دیکھتا ہے تو اس کے حصول کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کے یہ چیز اس کے لیے اچھی ہے بھی یا نہیں۔ اگر وہ چیز آپ کے حق میں بہتر ہوتی تو آپ کو ہی ملتی۔ کسی اور کو کیوں ملتی؟ کیا اللہ بہترین فیصلہ کرنے والا نہیں ہے؟ جو ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر چیزوں کو مان لینا' سر جھکا دینا انسان کو اور خوشی دیتا ہے۔

"تمہیں پتا ہے؟" فریحہ نے بہت عام سے لہجے میں زارا سے پوچھا "ہم کلاس کا زین کہتا ہے کہ اسے مس زارا بہت پسند ہیں اور وہ ان سے شادی کرے گا۔"

فریحہ کے انداز میں حسرت' طنز اور حسد بیک وقت منہ کھولے نظر آئے۔ ان جذبات نے اس کے لفظوں کو اور بھی تلخ کردیا۔ جیسے زہر میں ڈوبا ہوا تیر۔۔۔ زارا ایسے حال میں تھی کہ وہ اس اچانک حملے کے رد عمل کو چھپا نہ سکی۔ نہ جائے رفتن نہ پائے رفتن۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ پارسائی اس کا واحد ہتھیار ہے۔ لیکن وہ کچھ نہ بول سکی' اس کی نظروں کے سامنے زین کا چہرہ آگیا۔ آپ مجھے بیٹا نہ کہا کریں۔ اس نے کہا تھا اور اس کے ایک جملے کی وجہ سے زارا کے پاس کہنے کو ایک لفظ بھی نہیں تھا۔

"اب کم از کم یہ ظاہر تو نہ کرو کہ تمہیں پتا ہی نہیں ہے۔" اسے خاموش دیکھ کر فریحہ پھر گویا ہوئی۔

"مجھے واقعی نہیں پتا۔" زارا نے شاک کی کیفیت پہ بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہی سچ ہے۔" فریحہ نے اطمینان سے ٹانگ

ہلاتے ہوئے بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے اڑس کر کہا جیسے اس وقت اس سے اہم کام کوئی نہ ہو۔

"آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟" زارا ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگی۔

"بھئی ایک تم ہی ہر دل عزیز نہیں ہو۔ کچھ وقت میں نے بھی اسکول کو دیا ہے۔ بچے مجھ سے بھی پیار کرتے ہیں۔ وہ والا نہیں جو زین تم سے کرتا ہے۔" لوہا گرم تھا اور فریحہ مسلسل ضرب لگا رہی تھی۔

"آپ کو ایسی بات کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے... آپ خود ایک لڑکی ہیں... آپ کو چاہیے تھا کہ ایسی بات بتانے والے کے بھی کان کھینچتیں اور یہ بات وہیں ختم کر آتیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اب یہ بات میرے سامنے یا کسی کے سامنے نہ دہرایئے گا۔" زارا نے کڑوے کسیلے لہجے میں فریحہ کو کہا۔ فریحہ بھول گئی تھی کہ ضرب کی آواز اگر گونجے تو بہت گونجتی ہے۔ گونج سن کر وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئی' اسے زارا جیسی عاجز اور ملنسار لڑکی سے ایسے سخت اور روکھے جواب کی توقع نہیں تھی۔ کہنے والے چاہتے ہیں کہ سننے والے بے زبان ہو جائیں۔ زارا نے کرسی کے ساتھ پڑی پانی کی بوتل اٹھائی اور کھول کر منہ سے لگالی۔ ایک ایک گھونٹ ایسے اندر اترا جیسے پشت میں کوئی خنجر اتار رہا ہو۔

"اماں کو پتا چل گیا تو؟ سلیم چچا کو علم ہوا تو؟ کشور چچی کو بھنک پڑ گئی تو؟" ہزاروں اندیشوں کے وسوسے اس کے دامن سے ناگ بن کر لپٹنے لگے۔

"زارا!" مسز شہناز نے زارا کو آواز دی۔ زارا تو بھول ہی گئی تھی کہ وہ بھی اسی کمرے میں بیٹھی تھیں۔

"جی..." اس نے بمشکل جواب دیا تھا۔ بات یہاں تک رہے گی یا کہاں تک جائے گی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔

"ادھر آؤ میرے پاس!" مسز شہناز نے زارا کو بلایا۔ اس وقت واقعی حرف تسلی کی حاجت تھی۔ وہ میکانکی انداز میں چلتی ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

"پریشان نہ ہو۔" انہوں نے زارا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر حوصلہ دیا۔

"کسی کو پتا چل گیا تو؟" ڈر لبوں پر آ گیا۔

"کون بتائے گا؟" مسز شہناز کو لگا کہ وہ ان کے حوالے سے بھی اس راز کو غیر محفوظ محسوس کر رہی ہے۔

"فریحہ!" زارا نے ہچکچاتے ہوئے نام لیا۔

"تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے۔ ساری بھابیاں خاندان سے آئی ہیں اور اس کے ماموں کے سگے بیٹے نے اس سے منگنی ختم کروالی ہے۔ اب وہ غیروں کے سامنے روز بن سنور کر جاتی ہے۔ اتنی تلخ ہو سکتی ہے' لیکن جتنا تم سمجھ رہی ہو اتنی بری نہیں... بے فکر رہو۔" مسز شہناز نے بہت تسلی آمیز لہجے میں زارا کو سمجھایا تو زارا کو اپنی کڑواہٹ کا احساس ہوا۔ اچھے لوگوں کو برا کرنے پر ضمیر کی مار فوراً" پڑتی ہے۔

"اور زین؟ مجھے اس بات کے سر پیر کی سمجھ نہیں آ رہی۔ اگر اس نے یہ بات کسی کے سامنے کی تو مجھے اسکول چھوڑنا پڑے گا۔" زارا کا مسئلہ ابھی بھی وہیں تھا۔

"زین والی بات پر تو میں بہر حال خود پریشان ہوں... وہ اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ تھوڑا اکھڑ ضرور ہے' لیکن ایسی بات اس کے حوالے سے کبھی نہیں سنی گئی۔ پتا نہیں' یہ افواہ کس نے اڑائی ہے' تم پریشان نہ ہو... وہ میرے گھر کے پاس رہتا ہے' میں کل تک دیکھ سمجھ کر بتاتی ہوں... تم پریشان نہ ہو۔" مسز شہناز نے اس کے بجھے بجھے چہرے کو تھپتھپایا۔ یہ اور بات کہ زارا کا سارا دن پریشانی میں اور پریشانی چھپانے میں گزرا۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت چھوٹا تھا جب اسے ایک سائیکل پسند آ گئی۔ ایسی پسند آئی کہ سب خواہشوں پہ بھاری ہو گئی۔ اس نے واقعتاً" اوپر کی مٹی نیچے اور نیچے کی مٹی اوپر کر دی۔ اس کی ماں سلطانہ کو لگا کہ بچہ ہے۔ ابھی سنبھل جائے گا۔ لیکن اس نے ایسی ضد پکڑی کہ شام اعلان سے پہلے ماں کو سائیکل گھر لانی پڑی۔ سائیکل

آئی تو یوں لگا جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ اس نے اپنے تین کمروں کے گھر میں سائیکل کو یوں گھمایا جیسے چپا چپا دکھا رہا ہو۔ کوئی اپنی ایسی شے نہ چھوڑی جسے سائیکل کے ساتھ لگایا جاسکتا ہو۔ سائیکل نمائش اور ستائش کے قابل لگنے لگی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ کمرے حبس سے گھٹن گھٹن پکارنے لگے۔ سلطانہ نے اپنی اور بیٹے کی چارپائی باہر صحن میں بچھادی۔ بیٹا بھی سائیکل کو چارپائی کے ساتھ رکھ کر ہی سویا۔ ہوائیں کبھی ٹھنڈی ہوتیں اور کبھی جامد۔ سلطانہ کی آنکھ پیاس سے کھلی تو وہ سائیکل بھول چکی تھیں۔ سائیکل، لیکن وہیں موجود تھی۔ سلطانہ نے ٹھوکر کھائی۔۔۔ اور گرگئیں۔ رات کی خاموشی کو نگلنے والی آواز نے نیند کے دیوی کو بھی اپنے شکنجے میں لے لیا۔ بیٹا اٹھ بیٹھا۔ ماں کی چوٹ دیکھی تو مندی آنکھوں سے ہی سائیکل گھسیٹ کر باہر لے جانے لگا۔ وہ سارے تمغے، وہ سب سوغاتیں، جو اعزاز کی طرح ساتھ ٹانگی گئیں، اندر صحن میں ہی رہ گئیں۔ ماں کے بہتیرا سمجھانے کے باوجود سائیکل گلی میں بیچ دی گئی۔ اس کے بعد گھر کی مٹی نے ضد کو سر اٹھاتے نہ دیکھا۔

وہ ایسا ہی تھا ناقابل یقین سا! جو سوچ لیتا، کر کے دکھاتا۔ جو ٹھان لیتا، اس سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹتا۔ کھڑا ہوجاتا تو کوئی بٹھانے والا نہ تھا اور اگر بیٹھ جاتا تو کوئی اٹھانے والا نہ تھا۔ شہد رنگ آنکھوں سے ذہانت اور شرارت ایک ساتھ چمکتی۔ یقین لانے والے ایک سیکنڈ میں یقین لاتے اور پیچھے چلتے رہتے۔ بدکنے والے بدک کے ہی رہتے۔ ان کے لیے بھروسا کرنا مشکل ہوتا۔ ایک بات طے تھی کہ وہ یقین لانے والوں اور بدکنے والوں کے درمیان خود حد فاصل طے کرتا۔۔۔

مضبوط ہاتھوں اور لمبی بھنوؤں میں وہ سب کچھ تھا جو مقابل کو خاموش کرواسکے۔ وہ بہت بڑا نہیں تھا، لیکن وہ چھوٹا بھی نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ دنیا میں ایک چہرے کے ہزاروں لوگ ہیں، لیکن اپنے چہرے اور دل کے ساتھ وہ اس دنیا کا واحد عجوبہ تھا۔ خاموش ہوتا تو خاموشی بولنے لگتی۔ ضد کرتا تو التجائیں آنکھوں میں سما جاتیں۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا اس کی آنکھوں میں کسی نے نمی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے گھر کا واحد مرد تھا اور مرد کی تعریف پہ پورا اترنے کی پوری کوشش کررہا تھا۔ اس میں وہ اتنا کامیاب ہوچکا تھا کہ سلطانہ اب خود کو اس کی غیر موجودگی میں بھی اکیلا نہ سمجھتیں۔

کچھ عجیب سے بال جن کو نہ تو گھنگھریالا کہا جاسکتا تھا اور نہ ہی سلکی۔۔۔ اس سے بھی عجیب مسکراہٹ جس کے تمسخر اور خلوص میں فرق کرنا مشکل ہوتا۔۔۔ تھوڑی بھاری سی آواز۔۔۔ اور سینے پہ ہاتھ لپیٹ کر بات کرنے کا انداز۔۔۔ اس کی ہر حرکت مختلف تھی۔ نہ وہ ممی، ڈیڈی قسم کا لڑکا تھا کہ لٹک لٹک کر چلتا اور نہ ہی بہت مدبر کہ نگاہیں جھکا کر رکھتا۔ وہ متوازن اور معتدل تھا۔ اپنی ذات میں مکمل تھا۔ نپے تلے قدم اٹھاتا اور مسکراتی آنکھوں کے ساتھ اگلا قدم دل کی نگری میں رکھتا۔ اسے دیکھ کر لاڈ آتا۔ سلطانہ کو لگتا کہ ماں ہونے کی وجہ سے صرف اس کا دل نرم پڑتا ہے، لیکن پھر زین نے جہاں جہاں قدم رکھے، چاہے سیپارہ پڑھنے گیا ہو یا آٹا لینے گیا ہو۔ لاڈ اضافی لایا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ وہ زین عباسی تھا۔



"الم ذرا زور سے بول۔۔۔ بولو الم۔۔۔ جذب سے پڑھو۔۔۔ لام اور میم کو اور کھینچو!" نشا کالا دوپٹا لپیٹے قرآن پڑھنے آئے ہوئے بچوں کو سمجھا رہی تھی۔ زارا نے اوپر سے نشا کو دیکھا۔ اگر کوئی خوب صورت ہو تو یہ اتنی بڑی بات نہیں، لیکن اگر کسی کو علم ہوجائے کہ وہ خوب صورت ہے تو بات خود ہی بری ہوجاتی ہے۔ نشا سلیم چچا اور کشور چچی کی بیٹی تھی۔ گورے رنگ پر سیاہ دوپٹا اوڑھ لیتی تو نظر اس سے ہٹنے سے انکاری ہوجاتی۔ زارا سے دو سال چھوٹی نشا میں تھوڑا نخرا تھا اور بہت سی ادائیں، لیکن سب سے بڑھ کر اس کا دل تھا جو بہت جلدی پسیج جاتا۔ زارا کو یاد تھا بچپن میں جب دکان کا کرایہ چھ ماہ تک دکان خالی ہونے کی وجہ سے نہیں آیا تو یہ نشا ہی تھی جو پلیٹ میں بچی روٹی منڈیر پر رکھ کر چلی

جاتی۔ گڑیا پرانی ہو جاتی تو اسے سیڑھیوں پر پھینک آتی۔ کبھی بھولے سے دوبارہ اس کھلونے کا تذکرہ نہ کرتی جو سیڑھیوں پر چھوڑ کر آتی۔ کوئی چیز چاہیے ہوتی تو زارا منڈیر سے چپکی رہتی کہ نشا اکیلی صحن میں نظر آئے اور وہ اس سے مانگ سکے اور مانگنے کی کبھی نوبت نہ آتی۔ نشا آنکھ بچا کر اوپر دیکھ لیتی اور سمجھ جاتی کہ کاپی ختم ہوگئی ہے اور خالی صفحات درکار ہیں۔

کبھی کشور بیگم کی نظر زارا پر پڑ جاتی تو وہ صلواتیں سناتی کہ زارا کے پاؤں اس کا وزن برداشت کرنے کے قابل نہ رہتے اور وہ ڈھے جاتی۔ ثمینہ مشورہ دیتی چیز کے بغیر گزارہ کرلو۔ عزت کا سودا نہ کرو۔ اس لمحے نڈھال ہوتے وجود کو یہ مشورہ ادرک کے سواد جیسا لگتا۔ وقت نے موسموں کی رفتار سے شرط لگائی اور سالوں بعد نشا بھی اپنے والدین کے رنگ میں رنگی گئی۔

زارا کو یقین تھا کہ اگر وہ زارا کی کالی آنکھوں میں جھانک کر دیکھ لے تو بچپن کی شناسائی پرواز کر کے لہجے میں اتر آئے گی' لیکن آنکھوں میں جھانکنے کا وہ جو ایک لمحہ تھا.... وہی نہیں ملتا تھا۔

آج اسکول سے بھی ایسی پریشانی ہاتھ لگی تھی کہ ماں کے سامنے بیٹھتی تو پھٹ پڑتی اور پھر ماں کے شق کلیجے کو کیسے مرہم لگاتی؟ ماں الزامات سے ہی تو ڈرتی تھی۔ بچوں کو قرآن پڑھانے کا رواج ثمینہ نے ہی ڈالا تھا لیکن رحیم کی بے وقت موت پر محلے والوں کا ثمینہ کو عزت دینا کشور بیگم کو ایک آنکھ نہ بھایا۔ وہ جانتی تھی' اگر ثمینہ استانی بنی رہی تو عزت کمالے گی اور گھر کی باتیں باہر نکل جائیں گی۔ اس سوچ نے کشور بیگم سے وہی کروایا جو وہ کر سکتی تھی۔ انہوں نے بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور ثمینہ کو کنارے لگا دیا۔

"مجھے جو بھنور لگ رہا ہے کہیں وہ کنارہ تو نہیں۔"

کہیں اندر سے کوئی زارا سے ہمکلام ہوا۔

"اف یہ دھیان کیوں بار بار اس طرف جارہا ہے۔ جہاں نہیں جانا چاہیے۔" زارا کے دماغ نے اس کے دل سے ہم کلامی کی۔ نشا نیچے صحن میں بیٹھی بائیں ہاتھ سے اپنی پشت دبا رہی تھی۔ دفعتاً" نظر زارا پر پڑی۔

"اگر تمہاری طبیعت نہیں ٹھیک تو آج میں بچوں کو پڑھا دوں؟" زارا نے لمحے کو قید کرنے کی سعی کی۔

"نہیں میں پڑھالوں گی شکریہ!" وقت کے پروں نے لمحے کی قید سے رہائی کرلی۔ نشا نے گردن نیچے کی اور بچوں سے کہنے لگی۔

"ذرا زور سے پڑھو الم...."



اسکول آنا پہلے بھی کوئی نعمت مترقبہ نہیں تھا' اب تو سوہان روح لگنے لگا۔ پہلا پیریڈ ہی نہم جماعت میں ہے۔ میں کیسے جاؤں گی۔ سوچ کے گرداب میں گرد اڑاتے ہوئے ہلکے نیلے رنگ کے کپڑے نکالے اور ان کا دوپٹا ڈھونڈنے لگی۔

"یہ گلابی دوپٹا پہن جاؤ!" ثمینہ نے کنٹراسٹ میچنگ کروانے کی کوشش کی۔

"گلابی رنگ سوٹ کرتا ہے' میں یہ نہیں پہنوں گی!" زارا نے دل میں سوچا اور بولی۔ "اس کے ساتھ کا سفید ہی پہنوں گی۔ مل جائے گا اماں۔" چھوٹی سی الماری میں دوپٹا کہاں کھونا تھا' سو مل ہی گیا۔ اس نے دوپٹا پہنا اور چہرے پر اسکارف کی طرح لپیٹ لیا۔ بے سکون سی نیند نے آنکھوں کے ڈورے نمایاں کر دیے تھے اور رات بھر کمرے میں مچھر بتی کے جلنے سے جلد بھی حساس ہو کر سرخ ہو رہی تھی۔ حسن بھی خوشبو اور عشق کی مانند ہے' چھپائے نہیں چھپتا۔ سفید رنگ میں بھی اس کی معصومیت کلیوں کی طرح چٹخنے لگی۔ اپنی طرف سے وہ ساری احتیاطی تدابیر کر کے اسکول پہنچی۔ آج اس کی اور مسز شہناز کی گراؤنڈ میں ڈیوٹی تھی۔

"السلام علیکم میم! کیسی ہیں آپ؟" زارا بڑے تعظیمی انداز میں بولی۔ اسے ان کا کل کا حسن سلوک یاد آیا۔

"الحمدللہ میں ٹھیک' تم سناؤ۔" مسز شہناز نے ہشاش بشاش لہجے میں جواب دیا۔

"میں پریشان...." زارا نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ مسز شہناز نے اس کی بات پکڑ لی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل میں نے بات کی تھی زین سے.... جو گڑ سے مرتا ہو اسے زہر دینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں!" زارا واقعی نہیں سمجھی۔

"دیکھو اس عمر میں لڑکے اکثر اپنی استانی یا کسی بڑی عمر کی لڑکی کو پسند کرنے لگتے ہیں.... میں نے زین سے اس بارے میں بات کی تو اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اس بات کی تائید کی.... میں اسے عرصہ دراز سے جانتی ہوں' وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے ذرا سا بھی شرمندہ نہیں ہوا۔ بس شاید میرا لحاظ کر گیا' ورنہ تمہاری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا' لیکن میں سمجھتی ہوں یہ وقتی جوش ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ نو عمر لڑکوں کو جس طرف جانے سے روکو وہ وہیں سے سر نکالتے ہیں.... لہٰذا تم بے فکر ہو جاؤ۔ چار چھ ماہ کی بات ہے' اس کے سر سے بھوت اتر جائے گا۔ کسی دن ڈانٹ پڑ گئی تم سے یا تم نے تھپڑ لگا دیا تو بالکل ہی تم سے متنفر ہو جائے گا۔ یہ بات مجھے' تمہیں اور فریحہ کو پتا ہے۔ تم کسی کو بتاؤ گی نہیں۔ فریحہ نے کسی کو بتانا نہیں ہے اور میرے بارے میں بے فکر رہو۔ زین بھی چاہتا ہے کہ یہ بات فی الحال اس کے گھر تک نہ پہنچے۔ شاید اسے خود بھی اندازہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر نادانی کر بیٹھا ہے۔" مسز شہناز نے اسے وضاحت دینے کی کوشش کی۔

"لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہی' اس سب میں میرا کیا کردار ہے اور مجھے کیا کرنا چاہیے' زارا کو ابھی بھی آگے کیا ہوگا۔" کھانے لگا۔

"تم اسے نظرانداز کرو۔ وہ اگر کہتا ہے تم اسے بیٹا کہہ کر نہ بلاؤ تو نہ بلاؤ۔ اس کے ساتھ میٹھی بھی نہ بنو کہ وہ تمہیں تھام لینے کی سوچنے لگے۔ فاصلہ رکھو اور اس کو مت چھیڑو۔ ضد پر نہ لے کر آؤ۔ زبردستی کوئی بھی کام نہ کرواؤ۔ وہ سبق سناتا ہے یا نہیں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ آگ ہے اسے چھیڑو گی تو جل جاؤ گی۔ مجھے پتا ہے تمہیں اسے چھیڑنے کا شوق نہیں ہے' لیکن احتیاطاً کہہ رہی ہوں تم اس کی مصلح بن کر اسے راہ راست پر لانے کی کوشش بھی نہ کرو۔ بس خاموشی اختیار کرو۔" مسز شہناز نے بردباری سے سمجھایا اور گراؤنڈ کے دوسری طرف چلی گئیں۔ زارا نے بس اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور مرکزی دروازے کی طرف چلی گئی۔

زین اسکول میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر زارا کو دیکھا اور معصومیت نے دل موہ لیا۔ وہ مسکرایا۔ زارا نے منہ موڑ لیا' اس کے پاس اس کھلنڈرے سے لڑکے کی مسکراہٹ کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسکول سے نکل کر زارا کو محسوس ہوا کہ کوئی پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ تپتی دوپہر میں کسی کو کیا تکلیف ہے یہ سوچ کر زارا کو سخت کوفت ہوئی۔ اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کون ہو سکتا ہے' لیکن پھر سوچا اندازہ لگانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ ضرور زین ہوگا۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ زین نہیں تھا وہ تیز قدموں سے گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

زین کا رویہ نارمل ہی تھا۔ کچھ عجیب تھیں تو اس کی آنکھیں' یا شاید اس کی ساری شخصیت ہی.... اس کے اٹھنے بیٹھنے میں ایک خاموش سا رعب بولتا۔ نظروں کے جھکنے' اٹھنے میں عجیب خود اعتمادی بولتی۔ وہ کھلنڈرا بھی لگتا اور حساس بھی۔ لبوں کے اوپر آیا' بالوں کا رواں اس کے جوان ہونے کی چغلی کھاتا۔ کہنیوں تک مڑی ہوئی آستینیں دیکھنے والے کو پورے زور سے کھینچتی۔ زارا اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی' لیکن بدنامی اور رسوائی کا ڈر مجبور کر دیتا تھا کہ وہ زین کا بغور جائزہ لیتی رہے۔

ابھی نہم کلاس سے لیکچر دے کر نکلی۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی اور سورج کی تپش نے اپنے معنی کھو دیے۔ یوں لگا جیسے شام تک تیز آندھی ضرور آئے گی۔ گھر

میں اکیلے کمرے پر تپتا سورج کمرے کو کچھ اور بھی گرم کر دیتا تھا۔ زارا نے خوشی سے بڑے لمبے سانس لیے اور اسٹاف روم کی طرف آگئی۔ وہ نیچے اتر رہی تھی۔ سامنے وہی لڑکا کھڑا تھا جو کل پیچھا کرتے گھر تک آگیا تھا۔ زارا اندر سے کانپ اٹھی۔ وہ زارا کی طرف پشت کر کے اور ٹانگیں کھول کر یوں کھڑا ہو گیا کہ اس کے گزرنے کا راستہ مسدود ہو گیا۔ اس حرکت کا مقصد صاف واضح تھا کہ زارا اسے بلائے اور اس سے راستہ مانگے۔ زارا کا حلق خشک ہو گیا۔ ابھی جو بارش رحمت لگ رہی تھی وہی زحمت لگنے لگی۔ دکان کی ٹپکتی چھت یاد آگئی۔ نہ دکان کی چھت ٹپکتی اور نہ اسے پڑھانے آنا پڑتا۔ نہ ان عجیب رنگوں والے لوگوں کے منہ لگنا پڑتا۔ ''کاش کوئی سہارا ہوتا تو مجھے گھر سے باہر نکل کر ایسے گھٹیا لوگوں کے منہ ہی نہ لگنا پڑتا۔'' اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھر گئیں' مگر وہ لب سیے گم صم کھڑی رہی۔

''بات سنیں!'' آواز پیچھے سے آئی۔ زارا نے مڑ کر دیکھا تو زین تھا۔ زارا نے بے چارگی سے دیکھا۔ آگے کنواں تھا اور پیچھے کھائی۔ زین نے ایک نظر اس کی آنکھوں میں اور دوسری نظر ناک کے چمکتی لونگ پر ڈالی اور اگلے ہی لمحے وہ اس لڑکے کے سر پر تھا۔

''اندھے ہو گیا؟ دکھائی نہیں دیتا؟''

''اوہو... میں نے تو دیکھا ہی نہیں۔'' وہ لڑکا مسکرایا اور جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کی۔

''اب نکلو یہاں سے... نہیں تو میں تمہیں دیکھ لوں گا۔'' زین نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر دبایا تو وہ لڑکا سٹپٹا گیا اور راستے سے ہٹ گیا۔ اب سیڑھیوں پہ صرف زین اور زارا تھے۔

''اس لڑکے کا نام عاقب ہے۔ تم اس کی شکایت کردو۔'' زین نے نظریں جھکا کر کہا۔ پہلے تو زارا کو عجیب سی طمانیت سی محسوس ہوئی' لیکن پھر دماغ نے انتہائی غصے میں رد عمل دینے کا سگنل دیا۔

''بڑی ہوں میں تم سے... آپ کہو! تمہاری [illegible] ہوں۔ جی چاہتا ہے اس کی شکایت کرنے سے پہلے تمہاری شکایت کردوں' لیکن پرائیوٹ گلی محلے کا اسکول ہے۔ تم جیسے لڑکوں کی خبر لینے کے بجائے وہ میری جگہ کسی عمر رسیدہ ٹیچر کو رکھنے کو ترجیح دیں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ نوکری میری ضرورت ہے۔'' زین نے اسے ہاتھ کو مسلتے ہوئے بغور دیکھا۔ وہ خود کو بڑا کہنے والی شدید گھبراہٹ کا شکار تھی۔

''سب کے سامنے تو آپ ہی کہتا ہوں نا... اور بڑی تو ہو نہیں... جتنے سال میں تم نے انٹرمیڈیٹ کیا ہے' میں نے اتنا عرصہ قرآن پاک حفظ کرنے میں لگایا ہے۔'' اس نے زارا کے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے بہت اعتماد سے کہا۔ زین راستہ چھوڑ کر کھڑا تھا۔ وہ چاہتی تو بڑی آسانی سے جا سکتی تھی' لیکن پتا نہیں کیوں وہ وہاں رکی ہوئی تھی۔

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بھی حافظ قرآن ہوں۔'' زین نے ایک لحظے کے لیے پھر اس کے ناک میں چمکتے لونگ کو دیکھا اور نیچے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اسی لیے تمہاری ناک کی لونگ اتنی زیادہ چمکتی ہے۔'' زارا کے پاؤں سے لگی اور سر پر بجھی۔

''اچھے خاصے شریف گھرانے سے تعلق رکھتے ہو اور تمیز چھو کر نہیں گزری... کیا مجھے تم... تم کہہ کر بلا رہے ہو... حافظ قرآن ہونے اور لونگ چمکنے میں کیا ربط ہے... جاؤ پہلے سیکھ کر آؤ کہ کیسے احترام کرتے ہیں' اساتذہ کا رتبہ کیا ہے' پھر مجھ سے آکر بات کرنا۔''

''ہیلو مس! اگر عزت اور تمیز کا تعین آپ اور تم جیسے الفاظ سے کیا جا سکتا تو وہ ناپی جانے والی کوئی شے ہوتی... میں آپ کی کتنی عزت کرتا ہوں' یہ میں جانتا ہوں اور میرا اللہ! میں نے آج تک کسی دوست کو بھی تم [illegible] نہیں ہا ایا۔ یا دشمن کو کہتا ہوں یا پھر اسے جسے [illegible] جان [illegible] بن جاتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر واقعی جان پہ بن جاتی ہے۔'' زین نے بات سختی سے شروع کی' لیکن [illegible] کرتے کرتے اس کا لہجہ نرم پڑ گیا اور [illegible] تم ہوا۔ زارا نے دیکھا' اس کے بائیں گال [illegible] مچل پڑا۔ اس نے نظریں چرائیں۔ وہ

پتھر کی مورت نہیں بننا چاہتی تھی۔

"تمہیں معلوم ہے، تم کیا کر رہے ہو؟" اس سے میری عزت پر کتنی انگلیاں اٹھ سکتی ہیں؟ میں گھر سے ایک مقصد لے کر نکلی ہوں اور وہ مقصد یقیناً" کسی لڑکے کو پھانسنا نہیں ہے۔ تم جسے عزت کہہ رہے ہو وہ ہوس ہے۔ صرف چار دن کی کشش! آج میں تمہیں اچھی لگ رہی ہوں، کل کو کوئی اور لگ جائے گی۔ تمہارے لیے یہ تماشا ہے اور میرے لیے عزت کا سودا! جان سے جاؤں گی، مگر عزت نہیں گنواؤں گی؟ زارا نے اس کے ساتھ خود کو بھی باور کروایا۔

"یہ کام آپ کی عزت پہ حرف لانے کے لیے نہیں کیا، بلکہ آپ کو مس سے مسز بنانے کے لیے کیا ہے... وقت شاہد ہے کہ میں اپنا ارادہ باندھ چکا ہوں... مجھے اپنی نیت پر اعتماد ہے اور جہاں تک بات رہی ہوس کی آئندہ میرے سامنے اس گندے لفظ کو استعمال نہیں کرنا۔" زین کا ردعمل انتہائی سخت تھا۔ اسے واقعی غصہ آگیا تھا اور یہ غصہ اس کے چہرے کے تاثرات پر پڑھا جاسکتا تھا۔ وہ کہہ کر رکا نہیں اور کلاس میں چلا گیا۔

"عمر دیکھو اور کرتوت دیکھو... ہر پندرہ سال کا لڑکا عاشق بنا پھر رہا ہے۔ چلو سترہ سال کا ہوگا۔ اسی وجہ سے مائیں گھروں میں راہ تکتی رہ جاتی ہیں اور یہ مجنوں سڑکیں ناپتے رہتے ہیں۔ یہی عمر اگر پڑھائی میں صرف کریں تو کل کو اچھا مستقبل اور ایک سے ایک حسین لڑکی ان کے پیچھے چلتی نظر آئے۔ میرا لفظ گندا ہے اور اس کا کام صحیح ہے۔ واہ! بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت گلے پڑ گئی ہے؟ شکل مومناں کرتوت کافراں!" زارا خود کلامی کرتے اور بے دھیانی میں اپنی لونگ کو انگلیوں سے گھماتی اسٹاف روم کی طرف بڑھ گئی۔

کہیں دور پرندوں نے آپس میں چونچیں لڑائیں اور فضا ان کی چہچہاہٹ سے نغمگیں ہوگئی۔



کمرے کے اندھیرے میں خاموشی رقص کر رہی تھی اور اندھیرے سے لڑنے کو ایک اکلوتا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ وہ ہار نہیں ماننا چاہتا تھا۔ دونوں ماں بیٹی اپنے اپنے بستر میں لیٹی ایک دوسرے کو سوتا ہوا سمجھ رہی تھیں۔ دفعتاً" ثمینہ کو کھانسی ہوئی۔ زارا جو ٹمٹماتی روشنی میں ہاتھ کے سائے سے مختلف شکلیں بنا رہی تھی۔ فوراً" اٹھ بیٹھی۔

"اماں پانی دوں؟"

"نہیں، ضرورت نہیں ہے۔ آدھی رات کو پانی پی کر واش روم ہی بھاگتی رہوں گی۔ خود ہی ٹھیک ہوجائے گی کھانسی!" ثمینہ نے بہت سکون سے کہا۔

"اماں، ابا کیسے تھے؟" زارا کو اپنے والدین کے بارے میں ہر بات پتا تھی۔ ثمینہ نے اس سے کبھی کچھ نہ چھپایا۔ شاید غربت خود اتنا بڑا دکھ ہوتی ہے کہ کوئی اور دکھ، دکھ ہی نہیں لگتا۔ غربت کے سامنے سارے دکھ خود ہی ننگے ہوجاتے ہیں۔ زارا بڑے آرام سے اعجاز کو ابا کہتی اور رحیم کو بابا کہہ کر پکارتی۔

"تمہارے ابا ویسے تھے جیسا ہونے کی لوگ خواہش لوگ کرتے ہیں۔ بے غرض، بے لوث بہت پیار کرنے والے اللہ تعالیٰ کے سچے بندے!" ثمینہ کی آنکھوں کی روشنی کمرے میں موجود روشنی سے کچھ زیادہ بڑھی۔

"ابا آسانی سے مر گئے ہوں گے؟ انہیں تو بہت تکلیف ہوئی ہوگی کہ وہ آپ کو اور مجھے اکیلا چھوڑ کر جارہے ہیں۔" زارا نے ماں کی آنکھوں کی جوت کو دیکھتے تجسس سے پوچھا۔

"اللہ نہ کرے پاگل وہ بھلا کیوں اذیت سے مرنے لگے؟ اور کس نے کہا ہے کہ وہ ہمیں اکیلا چھوڑ گئے ہیں؟" ثمینہ نے سر اٹھا کر نیچے ہاتھ رکھا اور اٹھتے ہوئے سر کے ساتھ زارا کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"یعنی ابا کے گھر والے پہلے اچھے تھے؟ ابا کی موت کے بعد انہوں نے رنگ بدلے۔" زارا نے اپنی سوچ کی تائید چاہی۔

"ان کے گھر میں تھا ہی کون... ایک سوتیلی ماں اور دو سوتیلے بھائی۔ وہ شروع سے اس شادی کے حق میں

ہی نہیں تھے اور تمہاری پیدائش پر بھی بہت شور و غل کیا، لیکن اعجاز کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ وہ تمہیں دیکھ کر جیتے تھے۔" ثمینہ نے اس کی سوچ کو جھٹلایا، پھر سنہری یادوں میں کھو گئی۔ فرار کتنا بہترین راستہ ہے۔

"ابھی تو آپ نے کہا کہ انہوں نے ہمیں اکیلا نہیں چھوڑا" زارا تقریباً اٹھ کر بیٹھ گئی تھی، "پھر کس کے سہارے چھوڑ گئے ہمیں؟"

"اللہ کے سہارے۔۔۔ ہم کہاں اکیلے ہیں؟ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" ثمینہ نے بڑے یقین سے جواب دیا۔

"اماں اللہ کہاں ساتھ ہے؟" اس نے اس بھیڑ چال کی دنیا میں ہمیں دھکیل دیا ہے اور اب دیکھ رہا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں کہاں ٹھوکر کھاتے ہیں کہاں سے سبق سیکھتے ہیں۔" زارا نے مایوسی سے جواب دیا۔

"ارے نعوذ باللہ۔۔۔ کیسی باتیں کرتی ہو، یہ دنیا بھی اللہ کی اجازت سے چل رہا ہے۔ اگر نہ چلے تو کہاں جاؤ گی؟ لاکھ برے سہی لیکن پیچھے رہنے والے ہمارے اپنے ہیں۔ اگر یہ بھی نہ ہوں تو بھری دنیا میں کہاں جاؤ گی؟" وہ چاہتا تو تمہیں نوکری نہ دیتا؟ تمہاری سانس روک دیتا۔ تمہیں مرض لاعلاج میں مبتلا کر دیتا ہم کھانا کھالیتیں، لیکن وہ کھانے کا ہضم ہونے کی اجازت نہ دیتا، تم سونا چاہتیں، لیکن وہ آنکھ کے پپوٹے بند ہونے سے روک لیتا، بے شک ہمیں لگتا ہے دنیا میں کچھ لوگ ہمارے ساتھ ہیں، ہمارے اپنے ہیں، لیکن وہ فقط وسیلہ ہیں اور وسیلہ بھیجنے والی ذات اللہ کی ہے۔ اب سو جاؤ، ورنہ صبح اسکول کے لیے آنکھ نہیں کھلے گی۔" ثمینہ نے بات سمیٹی۔

✡ ✡ ✡

وہ دن عام دنوں جیسا تھا، لیکن شاید اللہ کی طرف سے بدگمانیوں کے بادلوں کو چھٹنے کا حکم ملا تھا۔ تب ہی فریحہ خود زارا کے پاس آئی اور اپنے رویے کی معافی مانگی۔

"احساس تو مجھے اسی دن گھر جا کر ہو گیا تھا، لیکن معافی مانگنا کافی مشکل لگا۔ معافی مانگنا مجھے ہی نہیں سب کو ہی مشکل لگتا ہے۔ سچ کہوں تو ہمیشہ اسی فکر میں لوگوں کو غلط کرتے اور اس پر جمے رہتے دیکھا ہے کہ معافی کیسے مانگیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمارے اسلامیات کے ٹیچرز عقیدہ آخرت کی اتنی اچھی تشریح نہیں کرتے۔ میری اسلامیات کی ٹیچر بہت اچھی تھیں۔ میم ارجمند ہمیں کہتی تھیں کہ یہ دنیا صرف عمل کا میدان ہے، رد عمل تو ہمیں یوم آخرت ملے گا۔۔۔ جو ادھر کر رہے ہو وہ حرف آخر نہیں ہے، وہ تو صرف ہوا کے دوش پر بھیجی جانے والی آواز ہے جو روز قیامت گونجے گی تو تم اپنے ہی لفظوں کے چناؤ پر پریشان ہو جاؤ گے۔۔۔ اس دنیا میں زارا سب تمہارے سامنے ہے۔ دیکھو لوگ کتنا برا کرتے ہیں، پھر اسی دنیا میں دندناتے پھرتے ہیں۔ ان کے قدموں کا تکبر دیکھ کر دل دنیا سے اٹھ جاتا ہے۔ یہ عقیدہ آخرت ہی ہے جو تسلی ہے، اطمینان ہے کہ پریشان نہ ہو۔ وہ سب حساب لے گا۔ یہ عقیدت آخرت ہی ہے جو کہتا ہے جا کر بندوں سے معافی مانگ لو، ورنہ بندوں پہ ہوئے ظلم کا اللہ خود بدلہ لے گا۔ تمہارے پاس معافی مانگنے آنے کا جب سوچتی ایک عجیب سی شرمندگی سے دوچار ہو جاتی۔ پھر سوچا کہ تم نے تو کبھی کچھ برا بھی نہیں کہا کہ میں بدلے والی کیٹگری میں ڈال کر بری الذمہ ہو جاتی۔ اس لیے تمہارے پاس آ گئی ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے روز قیامت سے ڈر لگتا ہے۔"

وہ باتونی سی لڑکی بولنے پہ آئی تو بے حد معصوم لگ رہی تھی۔ زارا نے اس کے آگے بڑھے ہاتھوں کو تھام لیا اور گلے سے لگا لیا۔ اندر کہیں ڈر نے بھی پوری شدت سے سر اٹھایا تھا۔ اماں کہتی ہیں وسیلے اللہ بناتا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ عاقب کے سلسلے میں زین اس کا وسیلہ بن سکتا ہے۔ زارا، فریحہ کو گلے لگائے بھی یہی سوچ رہی تھی۔ وجہ واضح تھی کہ ساتواں پیریڈ چل رہا تھا۔ آٹھویں کے بعد چھٹی ہوتی

اور پھر وہی سنسان گلیوں میں پیچھے آتے قدموں کی چاپ۔۔۔ آٹھواں پیریڈ زارا کا ہم کلاس میں ہی تھا۔ لیکچر دے کر بچوں کو مصروف کیا اور زین کو بلایا۔
"زین بات سنو بچے!" زین کی آنکھوں میں حیرت اور ناگواری ایک ساتھ در آئی۔ وہ کلاس کے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ زین ساتھ سے گزر کر باہر کی طرف کھڑا ہو گیا۔ ساتھ سے گزرتے ہوئے وہ ناک کی لونگ کو ایک نظر دیکھنا نہ بھولا۔
"آپ کو کہا ہے مجھے بیٹا یا بچے نہ کہا کریں۔" زین نے اس کے بولنے کا انتظار نہیں کیا۔
"ہو تو چھوٹے ہی نا اب کیا کر سکتی ہوں۔" زارا کو اپنی سوچ پر شک ہوا۔ اس کو بلانا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔
"مرد چھوٹے بھی ہوں تو بڑے ہی ہوا کرتے ہیں۔" وہ ہلکا سا ہنسا۔ زارا نے اس کی گردن کے ابھار کو انجانے میں دیکھا اور سٹپٹا کر نظر ہٹالی۔
"زین میں بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ ہمارے گھر میں عزت کے علاوہ کوئی دوسری قیمتی شے نہیں۔ میری بہت لاچار سی ماں نے صرف میری پڑھائی کے لیے اپنے آپ کو ناقابل تسخیر ظاہر کیا ہے۔ یہ نوکری میری مجبوری ہے۔" وہ سر جھکائے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں کلائی کو کھینچے چلی جا رہی تھی۔
"اس طرح کی ڈھکی چھپی باتیں آپ مجھے بتا چکی ہیں اور باقی میں نے خود جان لی ہیں۔ آپ کو دوبارہ ایک بھی بات دہرانے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے آپ کو کسی قسم کی شکایت دوبارہ نہیں ہوگی، لیکن میں اپنی خواہش سے دست بردار نہ ہوا ہوں اور نہ ہی ہو سکتا ہوں۔ اردگرد کے لوگوں کو بھنک بھی نہیں پڑے گی اور پروانہ جلتا رہے گا۔" زین لفظ آپ پر زور ڈالتا ہوا شوخ ہوا۔ زارا کو پھر سے کوفت ہوئی۔ زین اب اندر جانے لگا۔ زارا نے دل پر حوصلے کا ہاتھ رکھا اور بولی۔
"سنو۔۔۔"
"جی سنائیں، سن رہا ہوں۔" زین، زارا کے کمر تک آتے بالوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔
"عاقب واپسی پہ روز مجھے گھر چھوڑتا ہے۔" شاید اس سے بہتر لفظ زارا کو نہیں ملے۔
"واٹ ڈو یو مین؟ آر یو سیریس؟" زین کا چہرہ لمحے میں سرخ ہوا۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچیں۔
"نہیں مذاق کر رہی ہوں۔" زارا نے جل بھن کر کہا اور کمرے کی طرف مڑ گئی۔
"آج سے میں آپ کو چھوڑنے جاؤں گا۔ بے فکر رہیں، کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔" زارا کو پیچھے سے آواز آئی۔ وہ انہی پاؤں پر مڑی تھی کہ شاید نادیدہ کلہاڑی اپنے ہاتھوں، اپنے پاؤں پر ماری ہے۔ ایک کی جگہ دو چھوڑنے جائیں گے۔
"تم ثابت کرنا چاہتے ہو کہ میں نے غلطی کی ہے؟" وہ بولتے ہوئی براہ راست شہد رنگ آنکھوں میں جھانکنے لگی۔
"میں نے کہا کسی کو پتا نہیں چلے گا اور یہ تمہاری غلطی نہیں۔ یہ تمہارا تیسرا احسان ہے مجھ پر۔" وہ آہستہ سے کہہ کر بہت قریب سے گزرا۔ زارا اب کچھ مطمئن اور کچھ پریشان ہو گئی۔ احسانات کی فہرست جان کر وہ اپنے آپ کو اس کے قریب نہیں لے جانا چاہتی تھی۔ پتا نہیں زندگی کون سا موسم لیے، میری منتظر ہے۔ کب دکان کی چھت تعمیر ہوگی، کب میں اس قفس سے آزاد ہوں گی، یہ نوکری اب اس کے لیے امتحان بنتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

چھٹی کے وقت زارا سود و زیاں کا حساب لگانے میں مگن تھی کہ اس کا لنچ باکس کلاس میں ہی رہ گیا گو کہ وہ چھوٹی بچی نہیں تھی، لیکن امی کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں کا صبح صبح انکار کیسے کرتی؟ چپ چاپ ساتھ لے آتی، کھا لیتی، واپس گھر جا کر دن کا کھانا ویسے بھی تھکاوٹ کے باعث یا تو نہ کھاتی یا بہت کم کھاتی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی گھر جا رہی تھی۔ اپنی گلی میں داخل ہوئی تو پیچھے سے آواز آئی۔

"میم!" وہ پورے جی جان سے کانپی۔ زین کا یوں آجانا اس کے لیے کوئی مسئلہ بنا سکتا تھا۔

"یہ آپ کا لنچ باکس رہ گیا تھا' میں نے سوچا پکڑا دوں۔" زین کہہ رہا تھا اور وہ اس کی عقل پہ ماتم کر رہی تھی کوئی دیکھ لے تو... اس نے فوراً" سے پیچ باکس پکڑا اور گھر کے اندر گھس آئی۔ اس کے خیال میں اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ یہی اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ دن کو وہ تو سو گئی' لیکن شام کو بدنصیبی جاگ گئی۔ شام سے نیچے شور برپا تھا۔

"ثمینہ او ثمینہ... نیچے آ۔" کشور بیگم یوں دھاڑ رہی تھی جیسے آج پہلا اور آخری موقع ملا ہو۔ "یہ آئی تو میں نے کہا تھا یہ بیج ہے۔ آج اس کی تربیت نے رنگ دکھا دیا۔ آج اس نے اپنا آپ دکھا دیا۔" کشور بیگم ہاتھ اٹھا اٹھا کر چلا رہی تھی۔ ثمینہ تقریباً" بھاگتی ہوئی نیچے اتری تھی۔ زارا نے ساتھ جانا چاہا تو ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"زارا سے پوچھو آج ساتھ کون آیا تھا۔" سلیم نے ثمینہ کی طرف نگاہ کیے بغیر پوچھا۔ اسے کشور بیگم جتنا اشتعال نہیں تھا اسی بات کا غصہ کشور بیگم کو آیا۔

"آپ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا میں دیکھتی' آپ کیسے اتنے آرام سے یہ سوال پوچھتے ہیں۔ ارے وہ اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا' پھر اس کو روکا' کچھ دیا اور چلا گیا۔ میرے گھٹنوں میں درد نہ تو اماں اصغری کے گھر سے بھاگ کر نکلتی اور رنگے ہاتھوں پکڑ لیتی' جب تک میں گھر آئی وہ اپنے ڈربے میں چلی گئی تھی۔" کشور بیگم کا غصہ سانپ کی طرح پھنکار تا رہا۔

"میری زارا ایسا ویسا کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں اس سے پوچھتی ہوں ضرور کوئی اور بات ہوگی۔" ثمینہ آخری سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ کشور بیگم کے تیور کھڑا ہونے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

"کوئی اور بات کیا بات ہوگی؟ اتنا اونچا لمبا لڑکا تھا۔ میں نے کہا تھا سلیم یہ ماں' بیٹیاں ضرور کوئی گل کھلائیں گی۔ انہیں اسی دن گھر سے نکال دیتے۔ رحیم خود تو چلا گیا' ہمارے سر پر یہ عذاب مسلط کر گیا۔ تم لوگوں کی باتوں سے ڈرتے تھے۔ اب جو لوگ باتیں بنائیں گے' وہ کیسے سنو گے؟" کشور بیگم' سلیم کے گلے پڑیں۔

"کشور خدا کا خوف کرو... میری بیٹی پہ بہتان نہ باندھو۔ اللہ کے غضب سے بچو۔" ثمینہ کا دل بیٹھنے لگا۔ اسے لگا وہ مر رہی ہے۔

"میں اللہ کے خوف سے بچوں۔ تم نہ بچنا' تمہاری بیٹی نہ بچے۔ پتا نہیں کس کی اولاد ہے۔ کہاں سے اٹھا کر لائی ہو۔ جائز بھی ہے یا نہیں؟ ایسے کرتوت جائز اولاد کے تو نہیں ہو سکتے۔ بلاؤ اپنی بیٹی کو' ہے اس کے پاس کوئی جواب؟" کشور گلا پھاڑ کر الزام لگانے لگی۔

زارا دوڑتی ہوئی اوپر سے نیچے آئی۔

"میں بتاتی ہوں۔ وہ کون تھا آپ جو سمجھ رہی ہیں۔" وہ بتانا چاہتی تھی' لیکن یہ اس کی ماں تھی جو سامنے آگئی۔

"زارا تو کچھ نہیں بولے گی... واپس اوپر جا۔"

"اماں وہ الزام لگا رہی ہیں مجھے بتانے دیں' مجھے بولنے دیں۔" زارا نے آگے بڑھنا چاہا۔

"ہاں اپنے منہ سے اپنی آوارگی کی داستان سنا۔ تیری ماں نے تو کبھی نہیں سنائی۔ تو سنا دے۔" کشور بیگم چیخ چیخ کر زارا کو للکارتی رہی۔ زارا حیران تھی' پریشان تھی۔ اسے اتنی تکلیف کشور کے لفظوں سے نہیں ہوئی تھی' جتنی ماں کے عمل سے ہو رہی تھی۔ ماں اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

"تو نے ایک لفظ نہیں بولنا۔ تو نے کچھ نہیں بتانا۔ یہ عورت اس وقت گندگی پھیلانے پہ آئی ہے۔ اس کا منہ بند کروانے کے لیے تو اپنا منہ کھولے گی تو گندی ہو جائے گی۔" ثمینہ کے لفظوں اور آنکھوں میں التجا تھی۔ زارا اپنی ماں کے منہ سے پہلی دفعہ ایسے سخت الفاظ سن کر حیران ہو گئی۔

"ہم گندے ہیں' ہم گندگی ہیں۔ ارے ہم جدی پشتی سید ہیں' تمہاری طرح نہیں۔ باہر جو راہ گیر ملے اس کے ساتھ چل پڑیں... تو ہے کون؟ تیرے جیسی

منحوس عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ ایک شوہر کو مار کر آئی۔ دوسرے کے گھر قدم رکھا' ناگن اسے بھی کھا گئی۔" کشور کے اندر کا زہر ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

"آپ میری اماں کو کچھ مت کہیں۔" ثمینہ صرف کھانس رہی تھی۔ مسلسل کھانسی کا دورہ اور الزامات اسے پاؤں پر کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دے رہے تھے' لیکن زارا کے کہنے کی دیر تھی۔ ثمینہ نے کھینچ کر زارا کے منہ پر تھپڑ مارا۔

"میں نے تجھے کیا کہا ہے۔ تو چپ رہ۔ پھر کیوں بول رہی ہے۔" کھانسی کے ساتھ بس وہ یہی کہہ سکی۔

"لو جی اماں' بیٹی کا اپنا ڈراما شروع ہو گیا۔ سلیم تو کچھ نہ کر۔۔۔ تو نے ساری زندگی کچھ نہیں کیا۔" کشور اپنے شوہر کے ساتھ بھی وہی زبان بول رہی تھی جو اس سے پہلے ثمینہ سے بول رہی تھی۔ زارا کچھ بولنے کو بے چین تھی' لیکن ثمینہ کی بگڑتی حالت دیکھ کر چپ کھڑی تھی۔ زمانے کی ساری سختیاں ایک طرف اور ماں کا غصے سے مارا گیا تھپڑ ایک طرف۔

"اب بس کرو تماشا۔۔۔ زارا کل سے اسکول نہیں جائے گی۔" سلیم کو اپنی مردانگی دکھانے کو ثمینہ اور زارا ہی ملی تھیں۔ زارا اور ثمینہ روتی ہوئی کمرے میں آگئیں۔ ثمینہ نے فوراً "دوا لی۔ زارا اماں سے خفا تھی۔ وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی اور ثمینہ اپنے بستر پر۔

"میری کیا غلطی ہے؟"

میں عورت ہوں۔

میرا عورت ہونا جرم ہے۔

عاقب میرا پیچھا کر سکتا ہے' وہ مرد ہے۔

میرا چچا مجھ پر پابندی لگا سکتا ہے' وہ مرد ہے۔

زین مجھ سے اپنی نام نہاد محبت کا اظہار کر سکتا ہے' وہ مرد ہے۔

لیکن مجھے ہر جگہ خاموش رہنا ہے۔

کیونکہ میں عورت ہوں اور پھر زارا زندگی کے دیئے اسباق سسکیوں سے دہراتے دہراتے سو گئی۔

✡ ✡ ✡

رات کا ہی کوئی پہر تھا زارا کو ایک سایہ خود پہ جھکا محسوس ہوا۔ وہ چونک کر اٹھی۔ زیرو بلب کی روشنی میں ماں کا وجود اسے سایہ ہی لگا۔ ثمینہ کی کھانسی مسلسل جاری تھی جیسے کوئی عذاب ہو۔

"اماں ہٹو۔ میں کسی کو دیکھتی ہوں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" شام کا سارا واقعہ دماغ سے محو ہو گیا۔ نیند بھی کیا شے ہے۔ یہ نرا نشہ ہے۔ غم بھلا دیتی ہے۔

"نہیں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں' تو میری بات سن لے' جو تیرے لیے سننا ضروری ہے۔" تکلیف کے آثار ثمینہ کے چہرے پر تھے۔ زارا نے اسے خاموش کروانا چاہا' لیکن وہ زارا کے کندھے پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔ "تیرے ابا کہا کرتے تھے' میری بیٹی جب تک سر جھکائے گی' امان پائے گی۔ جب سر اٹھائے گی' پریشان ہو جائے گی۔ اللہ کے کام ہم انسانوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔ ہم جسے اچھا سمجھتے ہیں' اسی میں برائی ہوتی ہے اور جسے برا سمجھتے ہیں اسی میں اچھائی ہوتی ہے۔ اللہ کے نزدیک سب بندے ایک جیسے ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں۔ وجہ ان کے اعمال ہیں۔ کوئی مقرب ہے تو کوئی خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہوا۔ کچھ کو اللہ سر جھکانے پہ دیتا ہے اور کچھ کو اللہ غلطیوں پہ بھی نوازا کر واپس اپنے رستے پر بلاتا ہے۔ تم ایک کام کرنا کہ میری زارا کو سر جھکانا سکھانا' سر اُٹھانا آسان ہے' جھکانا مشکل ہے۔ جو سر جھکانا سیکھ جاتا ہے وہی سربلند ہوتا ہے۔ تم اپنے سر کو جھکا لو۔ اللہ کی رضا میں راضی ہو جاؤ۔" ثمینہ نے بمشکل اپنی بات تمام کی اور پھر کھانسی کا دورہ آیا۔ زارا جیسے کسی خواب سے چونکی' ثمینہ کے منہ سے کھانستے کھانستے خون بہنے لگا۔ زارا کے ہاتھ پہ ایک لکیر سی ٹھہر گئی۔

"اماں۔۔۔ اماں۔۔۔" وہ ماں کو پکار رہی تھی۔ ایک انجانے سے ڈر نے اس کے دل کو جیسے مٹھی میں لے لیا۔ بالکل نا آشنا سی آہیں بلند ہونے لگیں۔

"مجھے چھوڑ دو زارا۔۔۔ آب زم زم پلا دو۔" ثمینہ نے الماری میں پڑی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔

”اماں۔۔۔ اماں۔۔۔ سیدھی بیٹھیں‘ میں ابھی بلقیس آنٹی کے گھر سے کسی کو بلا کر لاتی ہوں۔“ زارا آب زم زم پلا کر دوڑتی ہوئی گئی۔

مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اللہ ہو۔۔۔ اللہ ہو۔۔۔ کی آوازیں آنے لگی۔ ایسی طلسمی آوازیں کے پنچے زمین پہ ٹکنے سے انکاری تھے۔ کسی کے پاؤں یخ ہوئے اور پھر پنڈلیاں۔۔۔ فجر کا وقت ہو چلا تھا۔ پرندے تسبیح کرنے جاگ گئے تھے۔ اب انہیں رزق تلاشنا تھا۔ کون سا پرندہ واپس لوٹے گا اور کون سا نہیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب زارا بلقیس آنٹی کو لے کر گھر آئی تو ماں کا اس دنیا میں رزق ختم دیکھ کر بے ہوش ہو گئی۔

زارا نے مارے صدمے کے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ابھی تو سب کچھ ٹھیک تھا‘ زندگی مشکل ضرور تھی لیکن ماں ساتھ تھی‘ ہنستی بولتی تھی۔ اس کے پاس کیا تھا؟ اس زندگی نے کیا دیا تھا؟ صرف ایک ماں۔۔۔ لیکن آج محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک ماں ہر دکھ کے سامنے ڈھال تھی۔ ہر مرض کی دوا تھی۔ اگر اسے ایک ماں ملی تھی تو ایسی ملی تھی کہ زندگی سے جڑی باقی حسرتیں طمانیت کے خول میں لپٹی رہتی تھی۔ اس نے بکھرے بالوں کے ساتھ اپنے صدمے میں ڈوبے چہرے کو آسمان کی جانب اٹھایا۔ وہ شکوہ کرنا چاہتی تھی‘ لیکن اللہ سے ڈر لگتا تھا۔ سارا صدمہ اور سارا افسوس اس کے اندر بیٹھ گیا۔ ڈر سب جذبوں پہ کنڈلی مار کر بیٹھا رہا۔ بلقیس آنٹی اسے رلانے کی کوشش کرنے لگی۔

”بیٹا رو لو۔ جانے والے کے ساتھ جایا نہیں جا سکتا۔“ لیکن وہ خاموش تھی۔ اس کے رونے سے کون سا ماں نے اٹھ جانا ہے۔ ایسے کیسے چھوڑ گئی مجھے؟ کس کے سہارے پر چھوڑ کر گئی ہے۔ سوالات کی برچھیاں تھیں جو سینہ چھلنی کر رہی تھیں‘ لیکن ایک لفظ حلق سے بھی نہیں نکل رہا تھا۔ چارپائی کب پہنچے صحن میں لا کر رکھی گئی۔ کب اسے کسی نے ماں کے پاس بٹھایا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ ساتھ والی مسجد میں جنازے کا اعلان ہو تا رہا۔ اسکول کا سارا عملہ آیا اور زارا سے افسوس کر کے چلا گیا۔ زارا کے پاس رونے کو ایک قطرہ بھی آنسو کا نہ تھا۔ چارپائی اٹھانے کچھ لوگ اندر آئے‘ ان میں وہ بھی تھا۔ زارا اٹھی اور اس پر جھپٹ پڑی۔

”کیوں آئے ہو تم یہاں۔۔۔ میری ماں کو مار کر چین نہیں ملا جو اسے دفنانے بھی آ گئے ہو۔“ اس کے خیال میں وہی مجرم تھا۔ زین ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

”میم آپ۔۔۔“

”بند کرو یہ تماشا۔۔۔ وہی الفاظ استعمال کرو جو اکیلے میں کرتے ہو۔ ایک تمہاری ہی وجہ سے کشور چچی نے میری ماں کے کردار پر انگلی اٹھائی اور میری ماں سہہ نہ سکی۔ تمہارے جذبات نے کیا دیا مجھے؟ میری ماں کی موت؟ تم آئے ہی کیوں میری زندگی میں؟ میں نے بلایا تھا تمہیں؟ میرے کس عمل نے تمہیں شہہ دی کہ تم میری زندگی برباد کرنے آ گئے۔ کیوں آئے ہو تم زین یہاں میرا تماشا بنانے۔“ وہ زخمی شیرنی کی طرح ڈھارتے ہوئے سسکنے لگی۔

”اگر میں یہاں تماشا بنانے آیا ہوں تو واللہ لوگ دیکھیں گے کہ ایک دن میرا بھی تماشا بنے گا۔۔۔ اور اگر میں یہاں آپ کی عزت پر انگلیاں اٹھوانے آیا ہوں تو واللہ لوگ دیکھیں گے کہ ایک روز میں بھی ذلیل ہوں گا۔۔۔ لیکن زارا اگر مجھے تمہارا ساتھ دینے کی خواہش یہاں گھسیٹ کے لائی ہے تو تم بھی ایک روز ضرور میرا ساتھ مانگو گی۔ اگر میرے دل میں تمہیں عزت دینے کی خواہش ہے تو یاد رکھنا زارا کا نام زین کے ساتھ کے لیے تڑپے گا۔ اقرار سننا چاہتی ہو؟ میں سب کے سامنے اقرار کرتا ہوں ہاں! میں زین عباس زارا رحیم سے پیار کرتا ہوں۔ ہاں! میں زین عباس زارا رحیم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور میں سب کے سامنے وعدہ کرتا ہوں‘ اگر زندگی نے وفا کی تو میں اپنے لفظوں کی لاج ضرور رکھوں گا۔“ اتنا کہہ کر اس نے بلند آواز میں کلمہ پڑھا۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی لوگوں نے ساتھ مل کر چارپائی اٹھائی۔

”بڑے کرتوت تھے اس کے۔۔۔ اسی لیے ماں مر گئی!“ اس نے ماں کی میت کو بھی نہ دیکھا اور پھر چار لوگوں

میں تماشا بنالیا۔ اس کے گلے ہی پڑ گئی!" کشور بیگم ایک دفعہ پھر جلال میں آئی۔ محلے کی عورتوں نے اسے گھسیٹا اور کمرے میں لے گئیں۔ بلقیس بیگم نے ٹھنڈی زارا کو سینے سے لگالیا۔ اس کا اٹھا ہوا سر کاتب تقدیر نے بہت غور سے دیکھا۔
شاید کہیں سے کوئی آزمائش راستے کی رکاوٹیں عبور کرتی آرہی تھی۔



محبت

فرض کرو ہم اہل وفا ہوں' فرض کرو دیوانے ہوں
فرض کرو یہ دونوں باتیں' جھوٹی ہوں افسانے ہوں

فرض کرو یہ جی کی بپتا' جی سے جوڑ سنائی ہو
فرض کرو ابھی اور ہو اتنی' آدھی ہم نے چھپائی ہو

فرض کرو تمہیں خوش کرنے کے ڈھونڈے ہم نے بہانے ہوں
فرض کرو یہ نین تمہارے سچ مچ کے میخانے ہوں

فرض کرو یہ روگ ہو جھوٹا' جھوٹی پیت ہماری ہو
فرض کرو اس پیت کے روگ میں سانس بھی ہم پہ بھاری ہو

فرض کرو یہ جوگ بجوگ ہم نے ڈھونگ رچایا ہو
فرض کرو بس یہی حقیقت باقی سب کچھ مایا ہو

دیکھ مری جاں کہہ گئے باہو' کون دلوں کی جانے' ہو
بستی بستی صحرا صحرا' لاکھوں کریں دوانے ہو

جوگی بھی جو نگر نگر میں مارے مارے پھرتے ہیں
کاسہ لیے بھبوت رمائے سب کے دوارے پھرتے ہیں

شاعر بھی جو میٹھی بانی بول کہ من کو ہرتے ہیں
بنجارے جو اونچے داموں جی کے سودے کرتے ہیں

ان میں سچے موتی بھی ہیں ان میں کنکر پتھر بھی
ان میں اتھلے پانی بھی ہیں ان میں گہرے ساگر بھی

گوری دیکھ کے آگے بڑھنا سب کا جھوٹا سچا ہو
ڈوبنے والی ڈوب گئی وہ گھڑا تھا جس کا کچا ہو

تیرے رنگوں سے توبہ! زندگی کے بھی کیا رنگ ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوتا ہے' رواں دواں ہوتا ہے لیکن اچانک یوں کایا پلٹتی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ افتاد پڑتی ہے اور سانس لینا بھی یاد نہیں رہتا۔ یہ زندگی ہی تو ہے۔ جو انسان کو تخت و تختہ ایک ہی انچ کے فاصلے سے دکھاتی ہے۔ شاہ کو گدا بنادیتی ہے۔ جینے والوں کو پلک جھپکتے میں قبر میں پہنچادیتی ہے۔
ابھی سب ٹھیک تھا۔ ایک دکان کی چھت کا ہی مسئلہ تھا۔ ماں تو زندہ تھی' لیکن وہ چھت یہیں رہ گئی اور ماں چلی گئی۔ اللہ کو یہ امتحانات لینا کیوں مقصود تھا؟ تو رب کائنات ہے! ہماری صلاحیت کو جانتے ہوئے کیوں نتیجہ اخذ نہیں کرلیتا؟ اس خاردار میدان میں کیوں ہمیں چھلنی ہونے کو بھیجا ہے؟ وہ سوال کرنا چاہتی تھی' لیکن ڈر کی تمام جڑیں اس کے اندر تک پیوست تھیں۔
"تمہیں کیا واقعی نہیں پتا تھا؟" بلقیس زارا کو ٹٹولنے لگیں۔
"کیا؟" زارا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"یہی کہ تمہاری ماں کو ٹی بی تھی۔" بلقیس آنٹی نے انکشاف کیا۔ زارا کی بڑی بڑی آنکھیں مارے حیرت کے کچھ اور کھل گئی۔ "اس نے کہا تھا کہ تمہیں پتا ہے اور علاج بھی ہو رہا ہے۔"
"نہیں ایسا تو نہیں ہے امی صرف کھانسی کی دوائی لیتی تھیں۔" زارا نے بتایا اور بتاتے ہوئے اسے اپنے ہی لفظوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اپنا آپ کتنا تہی دامن لگنے لگتا ہے جب آپ کا کوئی بہت اپنا آپ سے کوئی بات چھپالے۔ جب آپ کو وہی بات کسی اور

سے پتا لگے اور ایسے وقت میں پتا لگے کہ آپ اس اپنے سے شکوہ بھی نہ کر سکتے ہو۔

"امی مجھے بتا دیتیں' میں آپ کو جی بھر کر دیکھ تو لیتی۔۔۔ آپ کو ایک دفعہ بھینچ لیتی۔ آپ کو اتنا پیار کرتی کہ آپ اس دنیا سے نہ جاتیں۔" وہ باآواز بلند خود کلامی کرتی رہی۔

"دیکھو ثمینہ کو تمہارے گلے شکووں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمہاری دعاؤں کی ضروری ہے اور تمہارا پیار بھی اسے اس دنیا میں روک نہیں سکتا تھا' تاوقتیکہ اللہ کا حکم نہ ہوتا۔" بلقیس آنٹی زارا کو سمجھانے لگی۔

ڈر نے پوری قوت سے سر اٹھایا۔

"تم وضو کرو اور ثمینہ کے ایصال ثواب کے لیے قرآن پاک پڑھو۔"

"بلقیس آنٹی ابھی مجھ سے کچھ پڑھا نہیں جائے گا اور اللہ جی کو اچھا نہیں لگے گا۔۔۔ کوئی غلطی ہو گئی تو ثواب کے بجائے الٹا گناہ ہو گا۔۔۔ مجھے اللہ سے آج زندگی میں سب سے زیادہ ڈر لگا ہے۔ وہ چھیننے پر قادر ہے۔" زارا فق چہرہ لیے بڑبڑاتی رہی۔

"ہیں۔۔۔ ہیں؟ پاگل ہو گئی ہو؟ اللہ سے ڈرتی ہو؟ وہ سوہنا تو محبت کرنے کے لیے ہے۔ اللہ سے محبت کرو۔" بلقیس کو اس کا فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا۔

"اللہ سے محبت؟ وہ کیسے کرتے ہیں؟ اللہ سے تو ڈرنا چاہیے' جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے' تاکہ اس کے احکامات کی تعمیل کی جاسکے۔" زارا حیران ہوئی۔

"اللہ سے محبت بالکل ویسے ہی جیسے اپنے والدین سے کرتے ہیں اپنے دوستوں سے کرتے ہیں' ان کو وقت دیتے ہیں' ان سے راز و نیاز کرتے ہیں' اپنی کہتے ہیں ان کی سنتے ہیں' لیکن بس تھوڑا سا فرق ہے۔" بلقیس سمجھاتے ہوئے رکی۔

"ہاں جی وہ فرق اس طرح کہ اللہ جی جیسے ستر ماؤں سے زیادہ چاہتے ہیں' اس طرح ان کا عذاب بھی ستر ماؤں کے غضب سے زیادہ ہو سکتا ہے۔" زارا نے دماغ کے نہاں خانوں میں گڑی ہوئی ڈر کی زنگ آلود کیل پیش کی۔

"ارے لڑکی باؤلی ہو گئی ہو کیا؟ اگر وہ اتنا غضب ناک ہوتا تو ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کیوں کرتا؟ ہمارے گناہوں کا صلہ ہمارے منہ پر کالک کی طرح نہ مل دیتا؟ ہمیں اس دنیا میں مہلت ہی کیوں دیتا' ہماری توبہ کا منتظر ہی کیوں رہتا؟ کیوں خود تک آنے کے لیے نماز' روزے' تسبیح و نوافل جیسے راستے چھوڑتا؟ کیوں اتنی چھوٹی چھوٹی تسبیحات پہ اتنا زیادہ ثواب دیتا؟ کیوں حج کے بدلے میں انسان کو سب صغیرہ گناہوں سے پاک کر دیتا؟ بھلا وہ جو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے وہ بھلا کیسے ستر ماؤں کی ناراضی سے بڑھ کر ناراض ہو سکتا ہے۔" بلقیس نے بچپن میں زارا کو قرآن پڑھایا تھا' آج اس کے جدید افکار سن کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"تو کیا اللہ سے ڈرنا نہیں چاہیے؟" زارا حیران ہوئی۔

"کیوں نہیں ڈرنا چاہیے؟ ڈر ہی تو تقویٰ ہے اور متقی اللہ کو بہت پسند ہیں' لیکن اس ڈر کے تین مقام ہیں۔

اول ڈرنا۔۔۔ اس ڈر سے مراد صرف یہ ہے کہ انسان یہ احساس پیدا کرے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔۔۔ جانتی ہو زارا۔۔۔ دنیا بہت رنگین ہے۔ یہ بار بار اپنی طرف بلاتی ہے اور ہم اتنے پکے مومن تو ہیں نہیں کہ یہ یاد رکھیں کہ اللہ واقعی دیکھ رہا ہے۔ اس کے لیے ایک آسان سا حل ہے۔ ایک کاغذ پہ خوشخط سا لکھو کہ اللہ دیکھ رہا ہے اور اپنے کمرے' اپنے گھر میں کسی دیوار پہ چسپاں کر لو۔۔۔ کچھ بھی غلط کام کر رہی ہو گی تو سو میں سے پندرہ فیصد یقینی طور پر چھوڑ دو گی۔

دوسرا مقام ہے بچنا۔ بچنا یعنی اگر اللہ کا ڈر ہے اس کے دیکھنے کا احساس ہے تو پھر ہمیں ہر اس کام سے بچنا ہے جو اللہ تعالیٰ کو نہیں پسند۔ یہ ڈر یہ بچنا اللہ کے رعب سے نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ یہ اللہ سے محبت کی وجہ سے ہونا چاہیے۔ ڈر جب تابع کرتا ہے تو دماغ تاویلیں ڈھونڈتا ہے محبت جب تابعدار بناتی ہے تو دل بھی [illegible] میں بھٹک جاتا ہے۔ درحقیقت محبت جب

تابعدار کرتی ہے تو محبت' تابعداری اور تابعدار بہترین شکل میں ہوتے ہیں۔

بچنے کے بعد تیسرا مقام آتا ہے پرہیزگاری کا' جو تقویٰ کا حاصل ہے اور مقصود بھی۔۔۔ پہلے اللہ سے ڈرو پھر اس کے نزدیک ناپسندیدہ افعال سے بچنے کی کوشش کرو اور اگر کامیاب ہو گئے تو تم پرہیزگار ہو۔ ایک دفعہ پرہیزگاروں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا لیا تو بیڑا پار۔"

بلقیس آنٹی زارا کا سر گود میں لے کر سہلانے لگی۔

"ہم اللہ کی زیادہ محبت' زیادہ توجہ کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟" زارا کے دل میں کسی انہونی کشش نے مدوجذر کی لہروں سا جوش مارا۔ کوئی وعدہ جاگا۔

"میں پچھلے وقتوں کی کچھ جماعتیں پاس ہوں۔ میری عقل سمجھ صفر ہے' لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اللہ کے بندوں سے اللہ کی خاطر محبت کرنے والے اللہ کو سب سے زیادہ عزیز ہوں گے۔" بلقیس آنٹی نے اسے سمجھایا۔

کوئی تھا جو بلا رہا تھا! کوئی تھا جو پکار رہا تھا۔ کوئی ابھی بھی ہے جو صدا دے رہا ہے۔ کوئی آخر تک صدائیں دیتا رہے گا۔۔۔ بلاتا رہے گا۔ زمین پر مست پیروں کی دھمک اور گھنگھروں کی آواز سے بے گانہ وہ فقیر اونچی آواز میں' اللہ ہو۔۔۔ اللہ ہو' کا راگ الاپ رہا تھا! ڈر سے محبت تک کا سفر کتنا آسان ہے۔ اللہ ہو۔۔۔ اللہ ہو۔۔۔ صرف پہلا قدم اٹھانا ہے۔ اللہ ہو۔۔۔ اللہ ہو۔۔۔



زارا کو اپنی اسناد لینے اسکول جانا تھا اور وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھی کہ جائے یا نہ جائے۔ زین کا سامنا کرنے کی اس میں چنداں ہمت نہیں تھی۔ جو بھی تھا اس نے واقعی بلاوجہ شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا اور کیوں کیا تھا' یہ وہ خود بھی سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر اپنی ساری قوتیں جمع کر کے وہ اسکول چلی ہی گئی۔ اسما نے پہلے تو افسوس کیا' پھر اسناد اس کے حوالے کیں جو اسکول کے قواعد و ضوابط کے مطابق انتظامیہ کے پاس اس کی نوکری کے تقرر کے وقت رکھی گئی تھیں۔ ساتھ ہی کچھ یاد آیا تو بولیں۔

"فزکس کے اسٹور روم میں جو نیا سامان تھا' وہ آپ ہی کے حوالے کیا تھا؟" زارا نے سر اثبات میں ہلایا۔

"میں آپ کو کہنا تو نہیں چاہتی۔ ابھی آپ صدمے میں ہیں' لیکن میں یہ بھی سمجھتی ہوں زندگی نہیں رکتی۔ اگر آپ ایک گھنٹہ میں سامان کی فہرست بنا کر مس فریحہ کے ہینڈ اوور کر جائیں تو اچھا ہو گا۔" مس اسما نے دنیا کی بات کی اور ان کو یہی کرنی تھی۔ ماں صرف زارا کی فوت ہوئی تھی۔ نقصان صرف اس کا ہوا تھا۔ زارا سر اثبات میں ہلا کر اندر جانے لگی تو اسما نے پھر بٹھا لیا۔ "بیٹا میں تو چاہوں گی آپ اپنی نوکری جاری رکھو۔ گھر میں بیٹھنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ آپ اپنے دماغ کو استعمال کرو۔ خالی بیٹھو گی تو فضول باتیں سوچو گی۔ اچھا ہے کہ خود کو مصروف کر لو۔"

"میم مسئلہ میرا نہیں ہے۔ میری فیملی کا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں نوکری کروں۔ پہلے امی مجھے سہارا دیتی تھیں۔ سب کے سامنے میری پڑھائی سے لے کر باہر نکلنے کے لیے کوئی نہ کوئی جواز تلاش کر لیتی تھیں لیکن اب میں جہاں رہتی ہوں' ان کی سننی ہے۔ جو بھی ہے وہ میرا گھر ہے اور اس میں رہنے والے میری فیملی ہے۔" بولتے ہوئے زارا کو خود بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ یہ سب بول رہی ہے کہ کشور بیگم اور سلیم انکل اس کی فیملی ہیں۔ نشا اس کی فیملی کا حصہ ہے جس نے ماں کے مرنے پہ بمشکل ایک دفعہ اسے گلے لگایا۔ کچھ حقائق دل مانے یا نہ مانے۔۔۔ کبھی جھٹلائے نہیں جا سکتے۔

اپنی ذات میں اٹھنے والی تبدیلیوں پہ تحیر آمیز تاثرات لیے وہ اسکول کے اندرونی حصے میں داخل ہوئی۔ شاید محبت کے بیج نے انجانے میں نمو پائی تھی۔ اسٹور روم کا راستہ اسے آتا تھا۔ ایک دل چاہا کہ کچھ پڑاؤ اسٹاف روم میں بھی ڈالے' لیکن پھر راستہ پڑاؤ پر حاوی ہو گیا۔ اس نے اسٹور روم میں قدم رکھا۔ کمرے کو قمقموں سے روشن کرنا چاہا' لیکن شاید بجلی نہیں تھی۔ عجیب ملگجا سا اندھیرا تھا۔ زارا کونے والی الماری

کے پاس گئی۔ ویسے عام دنوں میں ساتھ کوئی شاگرد ہوتا
جو تھوڑا سا پاؤں اوپر اٹھا کر الماری پر پڑی الماری کے
تالے کی چابی اتار دیا کرتا لیکن آج وہ اکیلی تھی۔ اس
نے اوپر ہونے کی کوشش کی، لیکن الماری کے اوپر
تک رسائی ممکن نہیں لگی۔ کھٹاک کی آواز پر اس نے
مڑ کر دیکھا اسٹور روم کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

"تم؟" زارا حیران ہوئی۔

"تم نے کسی اور کو ایکسپیکٹ کر لیا تھا؟ کیسی ہو؟
طبیعت کیسی ہے؟" زین نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"چاہتے کیا ہو؟ میری رسوائی؟" زین کا منہ زارا
کے سوال پر کھلا، لیکن کوئی لفظ نہ نکلا۔ "بولتے کیوں
نہیں؟ اس دن بھی اماں کے جنازے پر ساری اصلیت
سب کے سامنے لے آئے، آج پھر وہی کام کروانا چاہتے
ہو؟" زین مسکرایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر بولا۔

"تم بھی جانتی ہو اور میں بھی جانتا ہوں کہ وہ غصہ
میرے آنے کا نہیں تھا۔ وہ صرف انتظار کے بعد کا
غصہ تھا۔ اس صحن میں تمہارے رشتے دار تو تھے، لیکن
تمہارا اپنا کوئی نہیں تھا۔ تمہیں کسی اپنے کا انتظار تھا
اور مجھے دیکھتے ہی تم پھٹ پڑیں۔ اناپ شناپ بول کر
تمہارے اندر کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ تمہارا سارا غم
میرے اوپر چیخ کر ہلکا ہو گیا تھا۔ تمہارے وہ آنسو جو اندر
گر رہے تھے باہر نکل آئے۔ یہ گول گول کالی کالی
آنکھیں کھول کر مجھے کیا دیکھ رہی ہو..... پوچھو نا.....
کس بات کا انتظار؟ اس بات کا انتظار کہ میں اسی وقت
کیوں نہ آگیا جب تم اکیلی تھیں۔" زارا نے آنکھیں
چرا کر بائیں طرف چہرہ موڑ لیا۔ زین اس کے بائیں
جانب آگیا۔ زارا نے آنکھیں اٹھائیں اور گھور کر
بولی۔

"کہاں سے بنا لیتے ہو کہانیاں؟ اس من گھڑت
کہانی سے تمہاری وہ عزت واپس آجائے گی جس کے
اندر کی بدبو میں نے اس دن ساری دنیا کو سونگھا دی؟"
زین کھل کر ہنسا۔

"اچھا تو وہ بدبو تھی، فزکس پڑھاتے پڑھاتے کہاں
اپنا دماغ لفظوں پر لگاتی ہو۔ کسی افسانے یا ناول کی
ہیروئن نہیں ہو۔ میری زندگی کا مقصد ہو۔ آسان
لفظوں میں بھی کہو گی تو سمجھ جاؤں گا۔ جہاں تک بات
رہی تمہارے اس دن کے چیخنے کی۔ حقیقت صرف
اور صرف اتنی تھی کہ تمہیں ڈر تھا کہ میں مکر نہ
جاؤں۔ میں محبت کے دعوے سے دستبردار نہ
ہو جاؤں۔ کاش تم خود کو اس وقت دیکھ سکتیں، میرے
جواب پر تمہاری آنکھوں میں کتنے سکون کے پنچھی آ
بیٹھے تھے، تمہیں پتا ہے مجھے تم سے اتنی محبت ہے کہ
میں ہر حال میں تمہیں پانا چاہتا ہوں اور تمہیں مجھ سے
اتنی محبت ہو گئی ہے کہ تم میرے بغیر زندگی کا تصور
نہیں کر سکتیں۔" زین پھر شوق سے نظر ڈالنے لگا۔

"اپنی من گھڑت کہانیاں اپنے پاس رکھو۔ تمہیں
پتا ہے زین..... میں نے کل محبت کے اصول سیکھے،
محبت کے اصولوں میں سب سے اول اصول ڈرنا ہے،
دوسرا بچنا ہے اور تیسرا پھر ممتاز ہو جانا ہے۔ تم کہتے ہو
تم محبت کرتے ہو۔ تم کہاں ڈرتے ہو؟ تم کہاں مجھے
رسوائی سے بچاتے ہو؟ تمہیں اندازہ بھی ہے کہ تمہارا
میرا رشتہ اگر استوار ہو بھی گیا تو دنیا کبھی ہمیں عزت
نہیں دے گی۔ تم کہاں مجھ سے محبت کرتے ہو؟" یہ
عجیب سوال تھا جو زارا کے لبوں سے نکلا۔

"تمہارے خیال میں ڈر کی صرف ایک ہی شکل
ہے؟ بندہ بچے؟ بندہ تعلق ظاہر نہ کرے؟ میں نے میم
شہناز سے کہا تھا کہ اس بات کو ابھی کسی کو پتا نہ چلنے
دیں، تاکہ تمہارے لیے مسئلہ نہ ہو۔ لیکن اب کل
اس بات کا سامنے آنا بہتر تھا۔ میں بھی ڈرتا ہوں، لیکن
اپنی محبت کے اظہار سے نہیں بلکہ تمہیں کھو دینے
سے۔ میرے سامنے سطحی باتیں نہ کیا کرو۔ تم بھی
جانتی ہو اور میں بھی جانتا ہوں، یہ دنیا کسی حال میں جینے
نہیں دیتی۔ محبت کی دولت جب دامن میں ہو تو دنیا کی
طرف سے پھینکے جانے والے پتھر بھی پھول لگتے ہیں۔
تمہیں اتنا تو یقین ہونا چاہیے کہ میں تم پہ کبھی کوئی
انگلی اٹھنے نہیں دوں گا۔ مجھے لفظوں سے باندھ کر تم
اپنے راستے پر نہیں لے جا سکتیں جو چاہتی ہو سیدھی

طرح کہو۔" زین سمجھ رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔

"میں چاہتی ہوں تم میری زندگی سے نکل جاؤ۔" زارا نے پہلی بار کچھ مانگا۔

"افسوس جو تم نے مانگا ہے وہ میں تمہیں دے ہی نہیں سکتا۔" زین نے صاف انکار کیا اور زارا سے دو قدم دور ہوا۔ "پہلا انکار کیا ہے' تمہارے سامنے اس کی کچھ سزا تو ملنی چاہیے۔ زین نے پلک جھپکتے اپنے ہاتھ میں بیکر پکڑ کر داہنی کلائی پہ توڑا۔" زارا جتنی دیر تک اس کے پاس پہنچی۔ خون کے قطرے زمین چومنے لگے۔

"بے وقوف انسان یہ محبت نہیں جذباتیت ہے' جنونیت ہے۔" زارا کو اس پہ غصہ آیا۔

"جذبوں کو پاکیزگی سے۔ جنونیت کی انتہا تک تمہیں چاہا ہے۔ میرے اپنے اختیار میں بھی نہیں ہے۔ لیکن میں تمہارے لیے ایسا ہی ہوں' دیوانہ سا۔" زین اپنے گلے سے ٹائی کھول کر بازو پہ لپیٹنے لگا۔

"اپنے اور میرے ساتھ یہ مذاق نہ کرو۔" زارا نے خون کے قطروں پہ نظر جما کر مٹھیاں بھینچے ہوئے کہا۔ زین اس کے پاس آیا اور اس کا چہرہ انگلی سے اٹھا کر بولا۔

"یہ مذاق نہیں ہے زارا' میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"اگر تمہیں محبت ہے تو پھر ثابت کرو۔" زارا نے چیلنج کیا۔

"یہ چوتھا احسان ہے تمہارا!" زین حقیقتاً "خوش ہوا وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جان بھی دے سکتا تھا۔

"پہلے تین احسان ہی بتا دو آج!" زارا میں تجسس نے سر اٹھایا۔

"پہلا مجھے نظر آنا۔۔۔ تمہیں دیکھ کر میں نے زندگی کے نئے معنی خود پہ آشکار ہوتے ہوئے دیکھے۔ اتنے رنگ کہ مجھے لگا' میں ان میں ڈوب جاؤں گا' بالکل ویسے ہی جیسے تمہاری آنکھوں میں جھانکنے سے ڈوبنے کی خواہش انگڑائی لیتی ہے۔ دوسرا احسان مجھے بچہ یا بیٹا نہ کہنا۔۔۔ یہ احسان کر کے تم نے مجھے باور کروایا کہ کم از کم میری محبت تمہاری نظر میں تو آئی۔ تیسرا احسان مجھ پہ بھروسا کرنا۔۔۔ مجھ سے عاقب کے معاملے میں مدد لینا۔ وہ صرف مدد نہیں تھی' ذمہ داری تھی اور تم نے ذمہ داری ڈال کر میرے شانے چوڑے کر دیے اور چوتھا احسان میرا ہو جانے کی خواہش کرنا۔۔۔ محبت ثابت کروانا چاہتی ہو' یعنی میری ہونا چاہتی ہو؟" زین ہنس کر اسے انگلیوں پہ گن کر بتانے لگا۔

"تم پاگل تو نہیں؟ اتنے ہی عاشق ہو تو پہلے ثابت کر کے دکھاؤ۔" زارا مسلسل چیلنج کرنے پر تلی رہی۔

"صد شکر کہ تم نے مجھے عاشق کہا۔ تمہیں اتنا اندازہ تو ہے کہ میں محبت سے ایک درجہ آگے جا چکا ہوں۔" زین ہر بات پر احسان لینے پر تلا رہا۔

"تم اپنی عمر دیکھو اور اپنی باتیں دیکھو۔" زارا نے نخوت سے ناک چڑھائی۔

"بار بار عمر کی باتیں نہ کیا کرو۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوئی۔ ان دونوں میں عمر کا کتنا فرق تھا۔ پچیس سال۔۔۔ سمجھتی ہو پچیس سال کتنے زیادہ ہوتے ہیں؟ میرے اور تمہارے درمیان عمر کا فرق کتنا ہو گا؟ صرف چار یا پانچ سال۔۔۔ میں جب تم سے محبت کا بھی دعوا کر رہا ہوں تو تم کیوں یہ بڑے چھوٹے کی گردان دہراتی چلی جا رہی ہو؟" زین اپنی شہد رنگ آنکھوں میں اپنی محبت سموتے ہوئے بولا۔

"ویسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات کی پیروی نہیں کرنی' لیکن اگر عمر میں بڑی لڑکی پسند آ جائے تو فوراً" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اور خدیجہؓ کی مثال دینا یاد آ جاتی ہے۔ کیا وہ صرف مثال دینے کے لیے ہیں؟" زارا نے اس کی آنکھوں سے عیاں محبت کا جذبہ نظر انداز کرنا چاہا۔

"نہیں۔۔۔ میں صرف مثالیں دینے والوں میں سے نہیں ہوں' میں حتی الامکان کوشش کرتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کروں' لیکن تمہارے معاملے میں بالکل بے بس ہوں۔ میں تمہاری بہت

عزت کرتا ہوں۔ مجھے محبت کا کوئی اصول نہیں پتا' معاشرے کی حدود و قیود کا بھی نہیں اندازہ' لیکن یہ جو تمہیں دیکھ کر میری دھڑکن تیز ہو جاتی ہے تو یہ محبت ہی ہے۔ میری ذات کی تکمیل کے لیے تمہارا ملنا ضروری ہے۔" زین ابھی بھی بضد ہوا۔

"مجھ سے آنے والی ہر شعاع ہر چیز جذب کر سکتے ہو؟" زارا نے سوال پوچھا۔

"ہاں۔۔۔" ایک لفظی جواب ملا۔ وہ بھی کسی ٹریک پر لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"محبت ثابت کر سکتے ہو؟" گھنی پلکوں والی آنکھیں دوبارہ اٹھیں۔

"مجھے تمہیں جیت کر خوشی ہوگی۔" اعتماد مسکرایا۔ ان آنکھوں میں دیکھ کر وہ چاند توڑ لانے کا دعوا بھی کر سکتا تھا۔

"مجھے دیکھے بغیر' مجھے پانے کی کوشش کرو۔ ثابت کرو کہ تمہاری محبت عام محبت نہیں ہے۔ عادت کی غلام نہیں ہے۔ دیکھنے چھونے کی حاجت سے ماورا ہے۔ ثابت کرو کہ میری عزت کے خواہاں ہو۔ مجھے آنچل پہنانا چاہتے ہو۔ ثابت کرو کہ مجھے دیکھے بغیر بھی مجھے پانے کو اتنا ہی مچلو گے۔ مجھے اپنا نام دو گے۔ مجھے اپنی پہچان دو گے۔ مجھے دیکھے بغیر مجھ سے بات کیے بغیر مجھے اپناؤ گے۔" زارا نے زمانے کے حساب سے بہت بڑی بات کی۔ آج کل کون کاٹتا ہے یہ مشکلیں۔۔۔

"منزل کا سایہ بھی نظر آتا رہے تو سفر میں آسانی ہوتی ہے۔ صعوبتیں آسانی سے جھیل لی جاتی ہیں۔" وہ بدکا۔

"بس اتنی سی محبت تھی؟" اس نے طنز کیا۔

"ایسے نہ کرو۔" وہ التجائیہ انداز میں گویا ہوا۔

"بس اپنی سو کالڈ محبت کا پنڈورا بکس اٹھاؤ اور چلتے نظر آؤ۔" زارا نے نظروں میں فاصلے بھر لیے۔ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ وہ قریب آ کر دور ہوئی۔ خوشبو کا جھونکا جیسے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ سفر کر رہا ہو۔ زین کو احساس ہوا وہ اس کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا۔

"سوچ لو!" وہ پورے یقین سے بولا۔

"سوچ لیا ہے۔" زارا نے مسکرا کر کہا۔

"پتا چلے کہ مجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہو۔ گلیوں میں بغیر جوتوں کے میرا نام لیے دوڑ رہی ہو۔ میری تلاش میں باؤلی ہو گئی ہو۔ مجھے دیکھنے کو ترس گئی ہو اور اگر نوبت یہاں تک آ گئی تو دیکھنا پھر میں۔۔۔" زین نے انگلی اٹھا کر بات ادھوری چھوڑی تھی' زارا کا دل کسی انجانے خوف سے کپکپایا۔ اس نے دل کی گستاخی پہ خود کو ڈپٹا۔

"نوبت لاؤ' پھر بات کرنا۔" اتنا کہہ کر چہرہ موڑ لیا۔ وہ زارا تھی۔ زین گھوم کر اس کے سامنے آ گیا۔

"آخری دفعہ دیکھنے دو۔۔۔ پھر ملیں گے جب اللہ نے ملایا۔" زین نے بھرپور نگاہ ڈالی اور ہلکے سے زارا کا ہاتھ چھوا اور ہلکا سا چھو کر تھام لیا۔ زارا کی دھڑکنوں نے بے ایمانی کی۔ اسے لگا کہ کسی نے روح تھام لی ہے۔

"انسان ہوں' فرشتہ نہیں۔ تھوڑا سا بہک تو سکتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ۔" اسی لمحے اس نے ہاتھ چھوڑا اور چلا گیا۔ زارا وہیں کھڑی رہی۔ دل یکبارگی دھڑکنوں سے جنگ کرنے لگا' کچھ انہونا تھا' کچھ مختلف۔۔۔

اس فقیر نے پنجرے کا دروازہ کھول کر دو کبوتر باہر نکالے۔ دونوں وہیں پنجرے کے پاس رکھے۔ فقیر نے ایک کبوتر کو ہاتھوں میں پکڑا اور مشرق کی جانب آزاد کرتے ہوئے بولا "پھر ملیں گے جب اللہ نے ملایا۔۔۔ اللہ ہو۔" پھر دوسرے کبوتر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسے مغرب کی طرف پرواز کے لیے چھوڑا۔ "اللہ ہو۔۔۔ پھر ملیں گے جب اللہ نے ملایا۔ اللہ ہو۔۔۔ اللہ ہو۔" دونوں کبوتر آسمان پر مختلف سمتوں میں پرواز کرنے لگے۔



زارا کا اب اکثر وقت نیچے ہی گزرتا۔ آج چہلم تھا اور مغرب کے بعد عورتوں کی آمد میں اضافہ ہو گیا۔ لوگ دعا کرتے اور چلے جاتے۔ عشا کا وقت ہوا' سب اپنے اپنے گھروں میں واپس پہنچ گئے۔ سلیم انکل مسجد

سے نماز پڑھ کر لوٹے تو ساتھ کوئی آنٹی تھیں۔ انہیں زارا نے آج پہلی دفعہ دیکھا۔ وہ اٹھ کر پانی لینے چلی گئی کہ نشا تو یوں بھی اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتی۔ کشور بیگم ذرا ٹھٹک کر اس عورت کو دیکھنے لگی۔ سلیم صاحب کے انداز بتا رہے تھے کہ بات کچھ خاص ہے۔

زارا نے میٹھا پانی ٹرے میں رکھے گلاس میں پیش کیا۔ خاتون نے پانی پیا۔ حسب رسم دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اس کے بعد سب کو امید تھی کہ واپسی کے لیے روانہ ہوں گی۔ سلیم انکل نے اب تعارف کروانا مناسب سمجھا۔

"ٹینکی والی گلی میں رہتی ہیں۔ ہر جمعرات ان کے گھر سے پھل آتا ہے اور ایک رشتہ لے کر آئی ہیں!" سلیم کی بات پہ کشور چونکی ہو گئی۔

"بھائی صاحب شرمندہ نہ کریں۔ وہ پھل بھی کیا پھل ہوتا ہے ایک پلیٹ پھل سے زیادہ ہماری بھی اوقات نہیں ہے۔" وہ سادہ لوح سی خاتون کھری بات کرنے والی لگیں۔ ایک دفعہ پھر خاموشی رینگنے لگی!

"بات کچھ یوں ہے..... میں اپنے بیٹے کے لیے آپ کی بیٹی کا رشتہ مانگنے آئی ہوں!" خاتون نے پھر آواز نکالی۔

"کیا کرتا ہے آپ کا بیٹا؟" کشور بیگم کی خوشی چہرے سے ایک دم ٹپکی۔

"ابھی تو پڑھ رہا ہے!" آگے سے سادہ سا جواب ملا۔

"کیا پڑھ رہا ہے؟" سوال پھر ابھرا۔

"دسویں کا امتحان دے گا اس سال!" جواب سب کو حیران کرنے کے لیے کافی ثابت ہوا۔

"بی بی کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میری بیٹی نشا تو ابھی بارہویں جماعت میں ہے۔ تمہارے بچے کی عمر کی میری کوئی بیٹی نہیں!" کشور بیگم نے تنک کر جواب دیا۔ بیٹی کا رشتہ آجائے چاہے کسی قابل ہو یا نہ ہو خوشی بہت ہوتی ہے وہی خوشی لہجے میں جھلکنے لگی۔

"بہن میں نشا کا نہیں زارا کا رشتہ مانگنے آئی ہوں۔ میرے بیٹے کا نام زین ہے۔ سنا ہے شاید اس دن آپ کے گھر میں بھی کوئی بدمزگی ہوئی۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ وہ بچہ ہے نا سمجھ ہے۔ اسے جنازے میں شریک ہونا تھا تو گھر سے باہر سے شریک ہو جاتا!" خاتون اب کھل کر سامنے آئیں۔

زارا کی ٹانگوں سے جان نکل گئی۔ سلیم صاحب اس وقت قبرستان سے قبر کشائی کے بعد گھر آرہے تھے اور لین دین میں مصروف ہونے کی وجہ سے وہیں سے جنازہ اٹھانے کا عندیہ دے دیا تھا۔ اس لیے حیران پریشان رہے۔ کشور بیگم کی ساری خوشی پچھلے لمحے کا اژدھا نگل گیا۔

"بی بی پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟ خود کہہ رہی ہو نا سمجھ ہے، پاگل ہے تو ایسے میں اس کا رشتہ طے کرنا یا مانگنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ اس سے کہیں بہتر ہے اسے پڑھاؤ لکھاؤ۔ بچے کی باتوں میں آکر رشتہ لے کر آگئیں کل کو وہی بیٹا اپنی پسند کے آگے چوں نہیں کرے گا اور لگی لپٹی میں آکر تمہیں گھر سے چلتا کر دے گا۔" کشور بیگم کو جیسے کسی شے نے کاٹ لیا۔ زارا کو اپنا حلق کڑوا محسوس ہوا لیکن وہ زہر پی گئی۔ کچھ اور بھی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن کسی دوسرے کی زبان آپ کے اختیار میں نہیں ہوتی۔

"بہن جی آپ کو میرے آنے پر اعتراض ہے یا رشتے پر اعتراض ہے؟" خاتون بھی اب تھوڑی جز بز ہوئیں۔

"مجھے آپ کی مغربیت پر اعتراض ہے۔ یہ کوئی آدھی آستینوں کی قمیص نہیں جسے آپ خود پہن لیں گی اور کسی کو اعتراض نہ ہو گا۔ یہ ہمارے اور آپ کے خاندان کی بات ہے۔ اس ماڈرنزم کو اپنے گھر میں رکھیں۔ ہم نہ تو اپنے بچوں کے کہنے پر چلتے ہیں اور نہ ہی اتنی چھوٹی عمر میں رشتے طے کرتے ہیں!" کشور بیگم نے سیدھی چوٹ خاتون کے فولڈ ہوئے بازوؤں پر کی۔

"ارے ارے ماڈرنزم کیا اور کہاں کا؟ یہ تو اسلام ہے۔ کیا اسلام نہیں کہتا کہ جب بیٹی جوان ہو جائے تو اسے اس کے گھر کا کردو؟ یہ تو ہم تم دنیا کے رنگ میں رنگے گئے ہیں۔ کہتے ہیں ذرا بچوں کو پاؤں پر کھڑا ہونے

دیں۔ اپنے رزق کا بندوبست کرنے کے قابل ہو جائیں تو پھر بیاہ رچائیں۔ میرا یقین میرے اللہ سوہنے پہ ہے۔ جو اللہ سوہنا مجھے رزق دے رہا ہے وہ میرے بیٹے میری بہو کا بھی رزق دے گا.... جہاں تک بات رہی کہ میں بیٹے کے کہنے پر رشتہ لے آئی ہوں تو کیا غلط کیا؟ اسلام بھی پسند کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ مجھے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ میرے بیٹے نے کوئی برا راستہ اختیار کرنے کے بجائے مجھے صاف صاف بتادیا ہے۔ اب یہ میرے ہاتھ میں ہے کہ اسے جائز راستہ دوں یا پھر ناجائز پہ جانے دوں۔ آج کل بے راہ روی کی بڑی وجہ دیر سے شادی ہے۔ عمر پچاس برس رہ گئی ہے اور شادی پچیس میں ہوتی ہے۔ شریک حیات شریک حیات نہیں رہتی۔ آدھی حیات میں شریک ہوگئی ہے۔ ہم اپنے بنائے قاعدے اور قوانین لاگو کرکے اسی دنیا کو خود اپنے لیے تنگ کررہے ہیں!" خاتون اب مدھم سی آواز میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

"اپنے لیکچر کی بوری اٹھاؤ اور یہاں سے جاؤ۔ ہماری طرف سے تمہارے لیے صاف انکار ہے۔ کھانے کو بندہ اچار بھی کھالیتا ہے لیکن کمائی تو ہونی ہی چاہیے۔ بھلا بیٹیاں بندہ اندھا ہوکر کسی بھی ایرے غیرے نتھو خیرے کو پکڑا دے۔ بیٹیاں نہ ہوگئی بھیڑ بکریاں ہوگئیں۔ بیٹے کو اتنا ہی شوق ہے تو اسے کہو جائے اور کمائے پھر رشتہ لے کر آئے!" کشور بیگم نے انتہائی خفگی سے اس عورت کو چلتا کیا۔

سلیم صاحب تو میدان گرم ہوتے ہی باہر نکل گئے۔ زارا دروازے کے باہر دیوار سے چپکی کھڑی رہی۔

خاتون باہر نکلی تو زارا کے پاس رک گئی۔ زارا کا معصوم.... روشن چہرہ، چھریرہ سا بدن، بدن پہ رینگتی جھجک اور انگلیوں کے مروڑنے کا انداز زین کے کھینچے نقشے پہ پورا اتر رہا تھا۔

"میں سلطانہ ہوں.... زین کی ماں.... تم زارا ہو نا؟" زارا نے پلکیں جھکا کر اشارہ ہاں میں کیا۔ اس کی کالی آنکھوں میں سچائی کی شمعیں روشن تھیں۔

"تمہارا کیا جواب ہے؟" اس عورت کے لہجے میں امید کے دیے جل بجھ رہے تھے۔

زارا نے ایک لمحے کو سوچا۔ دل چاہا کہ محبتوں کی زنبیل اٹھا کر دہلیز پار کر جائے۔ اسے محبت ہی کرنی تھی۔ اب۔ چاہے اس گھر میں کرتی یا باہر رہ کر۔ اس نے ایک اسی صفت کے لیے اپنے دامن کو گداز پایا تھا۔ پھر اول خویش بعد درویش دماغ میں سماگیا۔

اس نے نظریں جھکائی اور صاف آواز میں بولی۔

"میرا بھی یہی جواب ہے۔ اسے کہیں کمائے اور پھر رشتہ لائے!"

اوکھے پینڈے لمبیاں راہواں عشق دیاں
درد جگر سخت سزاواں عشق دیاں



زارا نے دل میں پکا ارادہ کرلیا کہ اسے اللہ کی محبت حاصل کرنی ہے۔ کہیں روشنی کی رمق کی طرح وہ ایک بار زندگی میں شامل ہوجائے تو پھر اندھیرے ہر جنگ ہار جائیں گے۔ اس نے اپنے دل کے برتن میں جھانک کر دیکھا۔ اس نمانے برتن سے باسی جذبوں کی منافقانہ سی بو آئی۔ وضو کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر دل صاف کیا۔

نیچے سے عجیب سی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ فجر سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ وہ پریشان ہوئی۔ ایک دل کیا نیچے جائے پھر خوف آیا۔ وہ اس کا یوں آنا برداشت بھی کریں گے یا نہیں؟

"مجھے اگر کسی سے محبت کرنی ہے تو صلے کی تمنا کیے بغیر کرنی ہوگی۔" اس نے خود کو سمجھایا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی۔

کشور بیگم کے رونے کی آواز تھی اور مسلسل آرہی تھی۔ کبھی اس عورت کو روتے ہوئے نہیں سنا تھا شاید اسی لیے آواز عجیب لگی۔ اس نے اپنے قدم دھیرے دھیرے ان کے کمرے کی طرف بڑھائے۔ سلیم انکل دروازے کے پاس فرش پر گرے ہوئے تھے اور کشور بیگم ان کے پاس بیٹھی زارو قطار روئے چلی جارہی تھی۔ زارا نے جھک کر سلیم انکل کی نبض دیکھی۔ وہ نہیں رہے

تھے۔ اسے شاک لگا!
یہ کچھ ہی دنوں میں اس گھر سے اٹھنے والا دوسرا جنازہ تھا۔
جس نے یوں جنازے نہ دیکھے ہوں اس کے لیے اچنبھے کی بات ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دکھ یونہی ایک لڑی میں بندھے آتے ہیں پھر اللہ کے پیارے بھی پکار اٹھتے ہیں۔۔۔ عام الحزن! عام الحزن!
زارا بالکل بھول گئی کہ ابھی کل ہی اس نے صحن میں کھڑے ہو کر اس مرے ہوئے شخص کو اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار گردانا تھا۔ اسے یاد تھا تو فقط یہ کہ یہ اس گھر سے اٹھنے والا دوسرا جنازہ تھا۔
شادیاں بھلائی جا سکتی ہیں' جنازے نہیں بھولتے! زارا کو اپنا آپ بے بس محسوس ہوا۔
"میں نشا کو بلا کر لاتی ہوں!" وہ اپنے آپ کو اس خاندان کا حصہ سمجھ رہی تھی۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ اس جنازے کا بوجھ صرف اپنے کندھوں پر لادنا مشکل لگا۔
"مر گئی ہے نشا۔ وہ ہی مار گئی ہے اپنے باپ کو۔ نام مت لو اس کا۔۔۔ مر گئی وہ!" کشور بیگم ہذیانی انداز میں چلائی۔ زارا نا سمجھی کی کیفیت میں کشور آنٹی کی شکل دیکھنے لگی۔ یہ چہرہ اسے کبھی شناسا نہیں لگا تھا۔ ہمیشہ رعب جھاڑنے والا چہرہ۔ آج نجانے کیوں کچھ اپنا لگنے لگا۔ غم چہروں کی ہیئت بدل دیتے ہیں۔ دکھ انسانوں کو قریب لے آتے ہیں۔ ان کے چہرے کی بے بسی میں اپنی ماں کی بے بسی کی شبیہ نظر آئی۔ کوئی انجانا سا خوف ۔۔۔ کوئی انجانا سا ڈر۔۔۔ اس نے ڈر کو پڑھنا چاہا تو کشور چچی کے ہاتھ میں پکڑا کاغذ نظر آ گیا۔ وقت کبھی بھی رشتے بنانے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ یہ لمحوں کا وجدان ہوتا ہے جو کسی اجنبی کو شناسا بنا دیتا ہے۔ زارا نے کاغذ اپنے ہاتھ میں پکڑا۔
"ابا! میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے ایک خط کے ذریعے آپ سے مخاطب ہونا پڑے گا۔ میں آپ کا سوچتی ہوں تو یہاں سے جانا نہیں چاہتی کیونکہ یہ واحد ضد ہے جو میں نے آپ کے سامنے نہیں کی۔

اماں مجھے اس معاملے میں اتنا ڈرا چکی ہیں کہ آپ سے بات کرنے سے بہتر ہے کہ میں بغاوت کر لوں۔ میں نے اماں کو بہت سمجھایا کہ کاشف کو ایک دفعہ گھر رشتہ لے آنے دیں لیکن انہیں لگتا تھا کہ سیدوں کی لڑکی کسی اور ذات میں نہیں بیاہی جا سکتی۔ آپ کو اپنی ذات پیاری ہے اور مجھے محبت پیاری ہے۔ اگر کاشف پیسے والا ہوتا تو شاید اماں کا دل نرم پڑ جاتا لیکن آسانیاں شاید میرے مقدر میں لکھی ہی نہیں گئی۔ اس گھٹن زدہ ماحول میں زندگی گزارنے سے بہتر ہے میں کاشف کے ساتھ کھلی ہوا میں روکھی سوکھی کھا کر زندگی جی لوں۔
نکلتے وقت میں نے بارہا سوچا آپ کو کس چیز کی سزا دے رہی ہوں پھر دل میں اوپر والے کمرے میں لیٹی زارا کا خیال آیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے دل سے لگتا ہے کہ یہ آپ کے اعمال کی سزا ہے۔ میں شاہد ہوں کہ آپ نے کبھی ثمینہ تائی اور زارا کا برا نہیں چاہا لیکن آپ نے کبھی اماں کو بھی ان کا برا چاہنے سے نہیں روکا۔ کاش آپ اپنے اندر کی اچھائی کو اماں پہ حاوی کر لیتے۔ میرا دل کہتا ہے کہ آپ کا جینا آسان ہو گا اور اماں کا مشکل۔ پتا نہیں اس کے پیچھے کیا وجہ ہے۔۔۔ شاید میری محبت۔۔۔ ظالم سماج کا کردار نبھانے والی اماں کو کوئی رعایت نہیں دینا چاہتی۔ پتا نہیں کیوں میرا یہ خط ختم کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔
آپ کو میرے اور اپنے درمیان اتنے فاصلے نہیں پیدا کرنے چاہیے تھے۔ بیٹی کو تن کے لیے کپڑے اور روٹی کے علاوہ بھی کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ تھوڑا سا وقت۔۔۔ کچھ لمحے۔۔۔ وہ کل آپ کے پاس نہیں تھے' آج میرے پاس نہیں ہیں۔ وہ فاصلہ جو آپ نے میرے اور اپنے درمیان انجانے میں پیدا کیا تھا۔ آج اسی فاصلے کو میں مزید بڑھا رہی ہوں۔ اس گھر سے کچھ نہیں لے کر جا رہی بس اپنے گزارے کچھ سال مشکل سے پلو سے باندھے ہیں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔
"آپ کی بیٹی نشا۔"
جس گھر سے بیٹی بھاگ جاتی ہے وہاں رات کیسے کٹتی ہے۔ زارا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایک

بیٹی کے جانے سے..... جو زندگی کے رواں دواں ہونے میں کوئی کردار ادا نہیں کرتی..... اس ایک بیٹی کے جانے سے..... باپ کیسے مرتے ہیں۔ یہ سلیم کی لاش چیخ چیخ کر بتا رہی تھی۔ وہ جس نے کسی کی بیٹی کو احتیاط کرنے کا کہا تھا اور نہ کرنے کی صورت میں زندہ نہ چھوڑنے کی دھمکی دی تھی اپنی بیٹی کے انتہائی قدم پہ اتنا ٹوٹا کہ خود زندہ نہ رہ سکا۔ زارا نے کاغذ کو ہاتھوں میں رکھے رکھے مٹھی کو بھینچ لیا۔ اسے واقعی ان لوگوں سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ محبت ہو رہی تھی۔ اگر اوپر کے کمرے آسائشیں نہیں تھیں تو کیا ہوا۔ روحیں واقعی زندہ تھیں! نیچے سب ہی آسائشوں میں ہوتے ہوئے بھی اپنے اپنے جسموں میں سرمار رہے تھے۔

اپنی اپنی مردہ لاشوں کو جسم پہ گھسیٹتے ہوئے جیسے جا رہے تھے!

ان لاشوں کی بو نے زارا کو ماں یاد دلائی۔

ماں محبت کا راگ ٹھیک الاپتی تھی۔

محبت جسم کی غذا نہیں بن سکتی لیکن روح کی غذا محبت ہی ہے!

پاکیزہ محبت!

✡ ✡ ✡

اگلے دن کے سورج نے ایک بدلی ہوئی زارا کو دیکھا۔ وہ حیران تھا۔ وہ لڑکی جو کل تک مکمل ٹوٹ گئی تھی۔ آج سورج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے سے بھی اس کی آنکھیں نہیں چندھیا رہی۔ وہ راضی برضا ہو گئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ محبت کی چادر میں سمٹ کر وہ جتنی مطیع ہوئی اتنی ہی مضبوط بھی بنی۔ وہ اس بھرے میں صحن میں تنہا ذمے دار تھی۔ کشور چچی کو رونے سے ہی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ اس عورت کے غم کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا جس کی اولاد کی وجہ سے اس کا سہاگ ہی اجڑ جائے۔

عورتوں نے پوچھا کہ نشا کہاں ہے؟

اس سے پہلے کشور بیگم واویلا کرتی۔ زارا نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"سندھ..... کل شام ہی اپنی خالہ کے گھر گئی ہے!"

اس لمحے کشور بیگم کے سارے لگائے گئے الزامات ان کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برسے۔ جب جنازہ اٹھا تو لوگوں نے دیکھا کہ زارا میت کو کندھا دینے کے علاوہ ہر کام کر رہی ہے۔ کشور چچی کی نظریں یہ منظر نہ دیکھ سکیں۔ وہ وہیں گریں اور ان کے ہاتھ پاؤں مڑ گئے۔ زارا نے بلقیس آنٹی کا ہاتھ دبا کر کہا۔ "گھر کا خیال رکھنا۔"

دو عورتوں کے ساتھ ٹیکسی میں ہسپتال نکل پڑی۔

یہ زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔ اس میں وہ لمحات آتے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا ہوتا اور وہ لمحات کبھی نہیں آتے جن کے انتظار میں رتجگے کاٹے ہوں۔ پاکستان کی ٹریفک کی طرح غیر متوقع سی زندگی..... جہاں پہیے کی کون سی طرف کب اوپر اور کب نیچے کرنے پڑ جائے..... گاڑی کو خود بھی پتا نہیں لگتا!

کشور بیگم کو فالج ہوا تھا۔ ان کی زبان سے ایک حرف بھی نہیں نکل رہا تھا۔ یہ صرف آنکھیں تھیں جو بول رہی تھیں۔ اور آنکھیں بھی کیا خوب بولتی ہیں۔ ساری ندامت رواں تھی۔ اس روانی میں شدت آگئی جب زارا نے اپنی ماں کی آخری نشانی اپنے کانوں کی بالیاں ڈاکٹر کے سامنے فیس کے متبادل کے طور پر پیش کیں!

✡ ✡ ✡

"میں گئی تھی اس کے پاس..... کیا سن کر آئی ہوں بتا چکی ہوں۔ اب تم بتاؤ کیا ارادہ ہے؟" سلطانہ اپنے بیٹے کا سکون دیکھ کر پریشان ہوئیں۔

"اماں ارادہ بھی وہی ہے اور منزل بھی وہی!" زین سکون سے بولا۔

"تجھے شرم نہیں آتی ماں سے ایسی باتیں کرتے ہوئے؟" سلطانہ نے پیار سے ڈپٹا۔

"میری ماں ہے ہی اتنی اچھی کہ مجھے اس سے جھوٹ نہیں بولنا پڑتا۔ شاید ہی دنیا کا کوئی بیٹا اپنی ماں کو

اپنے پسند کے بارے میں اتنی آسانی سے بتا سکتا ہو جس طرح میں نے بتایا!" زین نے ماں کے ہاتھ آنکھوں سے لگائے۔

"اب کیا کرے گا؟" سلطانہ تاحال پریشان تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے بیٹے کی شہد شہد آنکھوں میں ملاوٹ ہو۔

"حکم کی تعمیل!" زین نے آنکھیں موند کر جواب دیا۔

"میرے یا اس کے!" ماں کی ممتا تھوڑی بے چین ہوئی۔ وہ آزمانے لگیں۔

"کبھی آپ کا اور اس کا کہنا متضاد ہوا تو بے فکر رہیں۔ بیٹا جیت جائے گا!" زین نے سچ بولا۔ جو بھی تھا وہ واقعی فرماں بردار تھا۔

"اللہ تجھے اس سے ملوائے۔ اللہ تجھے خوش رکھے۔ تیری خوشی میں میری خوشی!" سلطانہ نے فوراً یقین کر لیا۔

"ماں دعا کرنا کہ اللہ مجھے اس سے ملوائے!" زین بے چین ہوا اور اٹھ کر باہر چل دیا۔

گھر کی منڈیر پہ پڑے مٹی کے برتن سے پرندے اپنے حصے کا دانہ چگتے رہے!

"ہم سب کا ایک مقرر کردہ دائرہ ہے۔ ہم لاکھ سوچیں کہ ہم نے بڑی لمبی چھلانگ ماری ہے اور دائرے سے باہر نکل آئے ہیں۔ کسی بھی انسان کو اللہ نے وہ ٹانگیں دی ہی نہیں جو اسے اللہ کے مقرر کردہ دائرے سے باہر نکال سکیں۔ ہم جو کچھ کر رہے ہوتے ہیں وہ ہم نہیں کرتے۔ وہ اللہ کرواتا ہے۔ اور جو ہمارے ساتھ ہوتا ہے وہ بھی خود نہیں ہوتا۔ اسے بھی اللہ ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ ہماری زندگی کی شطرنج میں ہم ہی گھوڑے ہیں۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلتا کہ ہم کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ لیکن یہ بساط بچھانے والا خوب جانتا ہے!

تمہاری ٹانگ کے ٹوٹنے میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔ تمہاری ٹانگ نہ ٹوٹتی تو شاید کبھی تم یہاں بھی نہ آتے۔

تمہارا یہاں آنا کسی نہ کسی کے لیے تو ضروری ہو گا۔ تب ہی زندگی تمہیں کھینچ کر یہاں لائی ہے۔ حق بولو۔ حق! حق اللہ ہو۔۔۔ حق اللہ ہو۔۔۔"

مزار کے احاطے میں بیٹھا فقیر ایک معذور کو سمجھاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اللہ ہو۔۔۔ اللہ ہو۔"



زین نے اپنے باپ کا سایہ بھی نہ دیکھا تھا۔ اس کی زندگی میں کچھ تھا تو صرف ماں تھی!

اور ماں بھی ایسی جیسے تھر میں پانی کا قطرہ ہو، جیسے خوشبو میں رچا کوئی نشہ ہو، جیسے کسی نظم کے ردھم میں چھپا ہوا مزا ہو، جیسے گدگدی کے احساس تلے دبا ہوا سرور ہو، جیسے تتلی کے مچلتے ہوئے پروں میں رنگوں کا سماں ہو، جیسے ٹھنڈی ہوا کے اندر ہلکورے لیتا سکون ہو، جیسے بہتے پانی کے اندر ٹکراتا ہوا شور ہو، جیسے پہاڑ کی چوٹیوں پہ جھکا ہوا بادل آوارہ ہو، جیسے گھٹاؤں کے اندر چھپا طلسم ہو شربا ہو، جیسے مریض لاعلاج کے لیے اس کی امید اس کی دوا ہو۔۔۔ پتا نہیں ماں صرف اس کو ایسی لگتی تھی یا سب کو ہی ایسی لگتی ہے۔ زین اس کے ساتھ ہر وہ بات بانٹ لیتا جو اس کے من میں سماتی۔

ماں بھی اپنی ساری ہی منوا لیتی یا اس کی من مانیوں میں خوش ہو جاتی۔ ان دونوں کے لیے زندگی سے بہترین تحفہ کوئی نہ تھا کیونکہ ان دونوں کی زندگی میں وہ خود تھے اور پسندیدہ تھے۔ اب زین کی زارا کے لیے پسندیدگی نے سلطانہ کو ایک لمحے کے لیے ہلایا۔

یہ وہ بچہ تھا جسے پانچویں کے امتحانات کی مکمل تیاری کروا کے امتحانات نہیں دینے دیے۔ من میں سمایا کہ حافظ قرآن بنانا ہے اور مسجد میں جا کر دم لیا۔ بچے نے کوئی ہوں ہاں نہیں کی۔ بس عمل کیا۔

سلطانہ بے شک کم پڑھی لکھی تھیں لیکن عقل شعور میں اچھی تھیں۔ سمجھ بوجھ رکھتی تھیں۔ اس نے اپنی شادی کے بعد اللہ سے اپنے میاں کے ہمیشہ ساتھ کی دعائیں مانگیں وہ نہ قبول ہوئیں، دل میں بال

آگیا اور یہ بال تب نکلا جب زین نے قرآن پاک حفظ کر لیا۔

وہ ان لوگوں میں سے تھیں جن کو اللہ نواز کے اپنے قریب کرتا ہے۔ اب انہیں اللہ سے دور جانے سے خوف آتا تھا۔ وہ اس مقام پہ آگئی تھیں کہ باتوں کو رب کی مرضی کے پیمانے میں پرکھ لے۔ اس کی دعاؤں میں اللہ کی رضا مانگنا شامل نہیں ہوا تھا بلکہ رچ گیا تھا۔

اب زین کی خواہش جان کر سلطانہ نے سوچا کہ ہم اللہ سے ناراض ہو جاتے ہیں جو چاہے تو اگلی سانس نہ آنے دے۔ ہمارے دل میں اس کی مصلحت کے باوجود بال آجاتا ہے تو پھر اولاد کیا چیز ہے؟ اولاد کے لیے ماں باپ کی کیا وقعت ہے؟ میں نے زین کی نہ مانی اور اوپر والے نے مان لی تو میرا ٹھکانا کیا ہو گا؟ ایک خواہش کے ادھورا رہ جانے پہ اگر اس کے دل میں بال آگیا جو میرا ہی حصہ ہے تو دل کیسے دھڑکے گا؟

سارے خواب اور سارے اندیشے زین کے حق میں فیصلہ کروانے میں کامیاب ہوئے۔ ہوا اٹکھیلیاں کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ ابھی اس نے بہت جگہ خوف کے طوفان برپا کر کے بہت سے فیصلے کروانے تھے۔

خوف فیصلے کرواتا ہے۔ فیصلے ٹھیک ہوتے ہیں یا غلط... یہ صرف وقت بتاتا ہے لیکن وقت کے طوفان کے سامنے جو اپنے فیصلوں پہ ڈٹ کر سوئے مقتل جاتے ہیں۔ وقت ان کے سامنے سر کو جھکا دیتا ہے۔



"صبغتہ اللہ و من احسن من اللہ صبغتہ۔"

وہ بوڑھا یہ کہتے ہوئے دانہ مزار کے صحن میں ڈالنے لگا۔ پرندے یوں آئے جیسے انہیں دانے پہ اپنا نام لکھا نظر آرہا ہو۔ فضا میں صبغتہ اللہ کی آواز گونج رہی۔ آسمان پہ سورج نے اپنے پنکھ [illegible] چھپنے لگی جیسے اندھیرے کا قرض دینا [illegible] اندھیرے کے تال میل سے پرندوں [illegible] فلک پر ڈالی اور اڑان بھر لی۔ اب غول [illegible] نظر آنے لگے۔ مزار کے صحن سے بھی سارے پرندے غولوں میں شامل ہو گئے۔ بوڑھے نے پھر آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔

صبغتہ اللہ... صبغتہ اللہ...

کپڑے ابھی ہی ختم ہوئے۔ زارا نے انہیں پھیلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو دروازے پہ دستک سنائی دی۔ امید نے یوں سر اٹھایا جیسے بنجر زمین میں اچانک کوئی بیج نمو پاتا ہے۔ دروازہ کھولا تو سامنے بلقیس آنٹی کھڑی نظر آئیں۔ کوئی امید ٹوٹی تھی۔

"آئیں آنٹی بیٹھیں!" زارا نے پلاسٹک کی کرسی باقی تمام کرسیوں سے الگ کر کے سامنے رکھی۔ بلقیس بیٹھ گئیں۔ زارا تیزی سے کام نمٹاتی نظر آئی۔ سامنے کھڑکی سے آدھی سوئی آدھی جاگی کشور بیگم بھی دکھائی دیں اور ان کے منہ سے رال بہہ رہا تھا۔ نظر بھر کر اوپر والے کمرے کو دیکھا تو غیر آباد دکھائی دیا۔ ان کے منہ سے اچانک نکلا۔

صبغتہ اللہ صبغتہ اللہ..."

زارا تب تک کپڑے پھیلا چکی تھی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

"کچھ کہا آپ نے!"

"میں تو بس اللہ کے رنگ دیکھ رہی ہوں۔ واقعی اللہ کا رنگ تو سب رنگوں سے پکا ہے اور اللہ کے رنگ کی ذرا سی چاہ کرو تو وہ آپ کو رنگ ورنگ کر دیتا ہے۔ اس کا رنگ نور جو ہے اور نور کہاں ہے؟ نور چار سو ہے۔ مجھے تو اب یہ گھر بھی نور کا منبع لگتا ہے۔" بلقیس آنٹی مکمل متاثر لگیں۔

"آنٹی آپ کیسی بات کر رہی ہیں۔ میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔ یہ آپ کا حسن نظر ہے۔ میں نے صرف آپ کی بات مانی ہے۔ اپنے اردگرد کے لوگوں سے محبت کرنے کی کوشش کی ہے۔ پتا ہے جب آپ نے مجھے یہ بات سمجھائی تو میرا دل چاہا کہ میں کسی دارالامان یا ایدھی سینٹر چلی جاؤں۔ وہاں کے لوگوں سے محبت کروں۔ مجھے لگتا تھا میں کشور چچی سے کبھی محبت کر ہی نہیں سکتی لیکن دیکھیں نا وقت بھی کیا دکھاتا

ہے۔ نشا کو اس کی خالہ لے گئیں اور یہ خدمت میرے حصے میں آئی۔ اب مجھے لگتا ہے کہ میں یہاں آئی ہی اس لیے تھی۔ اپنی ماں کی گود میں اس گھر کا سفر اللہ نے اس لیے ہی میرے نصیب میں لکھا تھا کہ میں یہ کر سکوں۔ میں اپنی کوئی بڑائی نہیں کر رہی لیکن یقین جانیں جو سکون مجھے یہ بے لوث محبت کر کے ملتا ہے' اس سکون کو اگر میں اپنے آگے پیچھے ریوڑیوں کی طرح بانٹنا شروع کر دوں تب بھی یہ ختم نہیں ہو گا!" زارا کے چہرے کی الوہی سی چمک بلقیس آنٹی کو بہت بھائی۔

"یہی تو ساری بات ہے گڑیا وہ خالق ہے اور تخلیق سے محبت کرتا ہے۔ تم اس کی تخلیق ہو اور اگر اس کی باقی تخلیق سے محبت کرو گی تو وہ اپنی محبت تمہیں ضرور دے گا۔" بلقیس آنٹی اپنے ہاتھوں سے روشن کیے دیئے کی لو سے آنکھیں خیرہ کرتی بولیں۔

"آنٹی محبت کی قسم بھی ہوتی ہے؟ کیسے پتا چلتا ہے کہ کون سی محبت ٹھیک ہے کون سی غلط ہے؟" دل نے زارا کو سوال کرنے پہ اکسایا۔

"محبت ٹھیک اور غلط بھی ہوتی ہے؟ محبت محبت ہوتی ہے اور ہمیشہ محبت رہتی ہے۔ ہر وہ محبت ٹھیک ہے جو آپ کو اللہ کے قریب کر دے اور آپ کے اردگرد بسنے والوں کو نفع دے۔ اگر آپ کو کسی جذبے پر محبت کا گمان ہوتا ہے لیکن وہ آپ کو اللہ کے سامنے گڑگڑانے پر مجبور نہیں کرتا۔۔۔ وہ جذبہ آپ کے ہاتھوں میں دعا بن کر نہیں اترتا یا پھر آپ کے اردگرد بسنے والوں کو نقصان پہنچاتا ہے تو وہ جذبہ کچھ بھی ہو سکتا ہے محبت نہیں ہو سکتی۔ محبت کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس سے دل میں کھٹک نہیں ہوتی۔ اس میں قدم نہیں بندھتے۔ محبت آپ کو بے لگام کر دیتی ہے لیکن خود سر نہیں کرتی۔ محبت کرنی ہے تو وہ کرو جو اللہ کو بھائے۔۔۔ اللہ سے ملوائے۔۔۔ جس کو اللہ ملوائے۔"

بلقیس آنٹی نے کھوجتی آنکھوں سے جواب دیا۔

زارا کے دل کے چور نے چہرے کے رنگ بدلے۔ اس سے پہلے کہ دھاگے کا سرا بلقیس آنٹی کو دکھائی دیتا زارا ان کے لیے پانی لینے چل دی۔ اس نے نشا کا راز سنبھال لیا تھا اپنی بات کی بھنک کیسے پڑنے دیتی۔

"کیسے ہو رہا ہے گزارا؟" بلقیس آنٹی نے گلاس پکڑتے ہوئے سوال پوچھا۔ عورتیں کیسی بھی کیوں نہ ہو' موضوعات ایک جیسے ہوتے ہیں!

"دو دکانیں ہماری تھیں اور تین کشور چچی لوگوں کی! ان کے کرائے سے بس گزر بسر ہو ہی جاتی ہے۔ پچھلے مہینے ہی شبیر انکل نے تیسری دکان بھی اپنے لیے لے لی ہے۔" زارا کے بتانے پر بلقیس آنٹی نے سر ہلایا۔

شبیر انکل محلے بھر کے انکل تھے۔ کپڑوں کی دکان تھی جو آہستہ آہستہ خوش اخلاقی سے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

اللہ کا رنگ ہرا یا سفید نہیں ہے۔ اللہ کا رنگ اس کی صفات کا رنگ ہے۔ کوئی ایک وصف جو اس کو پسند ہو اپنے اندر بے دار کر لو پھر چاہے پیلے ہو جاؤ یا نیلے۔ اللہ کا رنگ ساتھ نہیں چھوڑتا۔ سایہ بن کر ساتھ ساتھ دوڑتا ہے!

جیسے زارا پر تخلیق سے محبت کا رنگ چڑھا۔۔۔
جیسے بشیر انکل پہ خوش اخلاقی نے رنگ چڑھا دیا۔۔۔
سارا کھیل ہی رنگ کا ہے۔۔۔
اللہ کا رنگ۔۔۔ صبغتہ اللہ۔۔۔



دن رات کی جھولی میں گرتے رہے اور رات دن کے آنگن میں کھلتی رہی۔ پتا ہی نہیں چلا کہ کب سال مزید گزر گیا۔ اس کے خیال بھی دستک دیتے رہے اور وہ بھی اپنا دامن بچاتی رہی۔

ایک سامنا تھا جو نہیں ہوا۔ ایک دعا تھی جو محفوظ کر لی گئی۔ اللہ نے تاحال نہیں ملوایا۔ وہ خواب ہے یا حقیقت۔۔۔ زارا بے خبر رہی۔ اس چارہ گر کا خاموش انتظار مشکل ہونے لگا تھا۔ خواب کو زندہ ہونے کے لیے نیند چاہیے تھی۔ اور زندگی کے تیز جھونکے آنکھ کو لگنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

آج سورج کا غیض و غضب اپنے پورے عروج پہ تھا۔ مجبوریاں اپنا منہ کسی اژدھے کی طرح کھول کر

کھڑی تھیں۔ مجبوریوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کیا کیا مصیبتیں سامنے آ سکتی ہیں مجبوریاں سفر کرواتی ہیں اور سفر میں رکھتی ہیں۔ پتا بھی نہیں چلتا کہ اس سفر میں مجبوریوں کا پیچھا کرتے کرتے زندگی گزر جاتی ہے۔

کشور چچی کی دوائیاں لانی تھی۔ بشیر انکل نے تاحال کرایہ نہیں دیا تھا۔ آج سات تاریخ ہو گئی تھی۔ عموماً کرایہ پانچ تک لازمی آجاتا تھا۔ زارا نے کشور چچی کو سلایا اور سلانے سے پہلے دکان تک جانے کی اجازت مانگی جسے انہوں نے آنکھ کے اشارے میں دے دیا۔ گھر کی کنڈی باہر سے اٹکا کر وہ باہر نکل آئی۔

"یہ اب اس گھر سے باہر قدم نہیں نکالے گی!"

جانے کہاں سے بازگشت سنائی دی۔

اب وہ آواز کہاں تھی؟ کہیں نہیں.... کوئی بندہ کسی پر کوئی قید نہیں لگا سکتا۔ جب تک اللہ نہ چاہے۔ کبھی زارا نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس گھر کو سنبھالے گی۔ گھر میں چیونٹی کی حیثیت رکھنے والی اس گھر کو سنبھال رہی تھی۔ وہ آواز جو اسے مانوس بھی نہیں لگتی تھی۔ اب وہ اس آواز کے نکلنے سے پہلے ضرورت سمجھ جاتی تھی۔ وہ کہاں تھی اور کیا تھی۔ یہ معنی نہیں رکھتا۔ معنی یہ رکھتا ہے کہ اللہ نے کس لیے بھیجا ہے اور اللہ اب اس سے کیا کام لے رہا ہے! کیا بلقیس آنٹی سچ کہتی ہیں کہ مجھ پر اللہ کا رنگ چڑھ گیا ہے؟

اللہ معافی توبہ استغفار' میں کیا اور میری اوقات کیا؟ میں بھی کتنی خوش فہم ہوں۔ میری تنہائی بھی پاک نہیں اور میں اتنے اوپر کا سوچتی ہوں! پتا نہیں کیا سوچتے سوچتے وہ بشیر انکل کی دکان پر پہنچ گئی۔ بشیر انکل اسے دیکھ کر جی بھر کر شرمندہ ہوئے۔

"اوئے بچہ جمورا۔ ام کو معاف کرنا۔ ام ضرور تم کو کرایہ بھیج دیتا لیکن یہ جو نیا چھوکرا رکھا ہے اس کو ککھ سمجھ نہیں آتا۔ ذرا جھلا ہے ویسے بڑی ایٹم مشین بنتا ہے لیکن ہے للو کا للو۔ سو دفعہ تمہارے گھر کا بتایا لیکن اس کو سمجھ ہی نہیں آتا۔ اماری ٹانگوں کا مسئلہ نہ ہوتا تو بچہ جمورا تم کو زحمت نہ اٹھانی پڑتی!"

"اوہو کوئی بات نہیں انکل۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے بھی پیسے ضروری نا چاہیے ہوتے تو انتظار کر لیتی!"

زارا جانتی تھی انکل سچ بول رہے ہیں لہٰذا ان کو دوبارہ شرمندہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ "وہ چھوکرا ساتھ والی دکان میں مال کی سیٹنگ کر رہا ہو گا۔ اس کو جا کر بولو تم کو کرایہ دے گا۔ ہماری ٹانگوں کا مسئلہ نہ ہوتا تو خود تمہارے ساتھ جاتا!"

زارا نے شکر ادا کیا۔ اسے پیسوں سے مطلب تھا۔ انکل کو اللہ حافظ کہہ کر ساتھ والی دکان میں داخل ہوئی۔ یہ دکان ایک طرح سے گودام بنی ہوئی تھی۔ اندر جانے کا رستہ بھی مشکل سے ملتا۔ یہ دکان ساتھ والی دکان کی نسبت چھوٹی تھی۔ ایک لڑکا پسینے سے نچڑتی قمیص میں سر پر تھان رکھے زارا کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔

"بے چارہ ضرورت مند ہے۔ آج کل لوگ دال روٹی میں گزارا نہیں کرتے۔ اور سے اور کی لالچ کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ پتا نہیں کیسے اپنے پیاروں کو خوار ہونے بھیج دیتے ہیں!" یہ سوچتے ہوئے زارا نے سلام داغا۔

"السلام علیکم!" اس لڑکے کے سارے تھان سر سے گر گئے۔

"وعلیکم السلام۔" کہتے ہوئے مڑا۔

اس کے سامنے کوئی اور نہیں زین کھڑا تھا!

کچھ دیر دونوں گنگ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ انبساط کے سرور نے یکایک ان کو دنیا و مافیہا سے بے گانہ کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے درمیان میں سال دو سال کا وقفہ آیا ہی نہیں تھا۔ وہی زارا تھی وہی زین تھا۔ نظروں نے بتایا کہ ایک بھی لمحہ یا کوئی ایک بھی جملہ بھلایا نہیں گیا۔ نظروں کی پگڈنڈی پہ ہاتھ تھامتے انہیں موسم کی سختی بھول گئی تھی۔ وہ صرف ایک دوسرے کی موجودگی کو خاموشی سے حفظ کر رہے تھے۔

"ان کی دید ہو گئی.... ہماری عید ہو گئی!" زین نے شرارت کے ساتھ ابتدا کی تو زارا بری طرح سٹپٹا گئی۔

"مگر آپ کو پسند تو نہیں آیا ہو گا.... کیچڑ جو رہ چکی

ہا!"

زین نے اگلا جملہ پھینکا اور زارا کو واقعی جالگا۔ اس کی آنکھوں کی شرارت نے زارا کو تپایا۔

"تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو؟" زارا اسے یہاں دیکھ کر بری طرح حیران ہوئی۔

"وہ پاگل کر کے پوچھتے ہیں پاگل تو نہیں ہوگئے ہو؟ کوئی بتلائے گا یا ہم بتلائیں کیا؟" زین کے لہجے میں شرارت برقرار رہی۔ زارا کے چہرے پہ آوارہ سی لٹ اب بڑی ہو کر ٹھوڑی کو چوم رہی تھی۔ گزرتے سالوں نے اس کی معصومیت کو سونے رنگ کو کندن کر دیا تھا۔

"گرمی سر پہ چڑھ گئی ہے تمہارے۔ کرایہ دو میں نے گھر بھی جانا ہے!" زارا کو شہد رنگ آنکھوں کے ارتکاز سے کوفت ہوئی۔

"اسی لیے تو میں خود کرایہ دینے گھر نہیں آیا۔ میں آجاتا تو آپ نہ آتیں۔" زین پیچیدہ پہیلی کا انسانی شکل میں بھیجا گیا نمونہ لگا۔

ان دو سالوں نے اس کی بازوؤں کی رگوں کو تھوڑا اور نکھار دیا۔ اس کی کنپٹی سے بہتا ہوا پسینہ اس کی بھنوؤں کا صدقہ اتارنے لگا۔ ماہ و سال کی محنت اس کے روپ کو بدل چکی تھی۔ آج یہ لڑکا اسے چھوٹا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی تو بھی اسے بچہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔

دل سائباں کی خواہش میں ایک دم مچلا۔ اس نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی لیکن کئی رنگ اس کے چہرے پہ آکر ٹھہر گئے۔ سامنے والا رنگوں کی اس دھنک سے کہاں انجان تھا.... وہ تو ان رنگوں کی تتلیاں پکڑ کے اپنے دل کے باغ کو رنگین کرنے کا خواہش مند تھا۔

وہ کچھ بھی کر سکتا تھا لیکن محبت اسے زارا کو زچ کرنے کی اجازت دیتی نظر نہیں آئی۔ اس نے خاموشی سے اپنی جیب سے کرایہ نکالا۔ جسے خاموشی سے ہی زارا نے لے لیا۔ خاموشی نے آج وہ کام کیا تھا جو اس سے پہلے زارا کا گریز نہ کر سکا، جو زین کی چلتی زبان نہ کر سکی۔

ان دونوں نے اس خاموشی کو دل کے مندر میں بجتی گھنٹیوں کے شور میں بخوبی سنا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ یخ بستہ چاندنی کے مسافروں کی طرح ٹھنڈے ہوئے۔ باہر چلتی گرم ہوائیں ان کے اندر کے موسم پہ اب ذرہ برابر بھی فرق نہیں ڈال سکتی تھیں۔

زارا دکان سے باہر نکل چکی تھی لیکن دل اتھل پتھل کرتا وہیں کہیں دکان میں ہی رہ گیا۔ اسے اچھا لگا کہ وہ اسے بھولا نہیں ہے۔ اسے اچھا لگا کہ آج بھی ویسے ہی جذبات رکھتا ہے۔ اسے اچھا لگا کہ وہ آج بھی وہیں کھڑا ہے جہاں وہ اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ یہ بات وہ اسے بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ آج وہ اسے واقعی اچھا لگا تھا!

حاصل عمر زار واپس آ، عشق نا کردہ کار واپس آ
کوچہ یار کا سکوں صد حیف، اے دل بے قرار واپس آ



کبھی یوں بھی تو ہو
دریا کا ساحل ہو
پورے چاند کی رات ہو
اور تم آؤ
کبھی یوں بھی تو ہو
پریوں کی محفل ہو
کوئی تمہاری بات ہو
اور تم آؤ
یہ نرم ملائم ٹھنڈی ہوائیں
تمہارے گھر سے گزریں
تمہاری خوشبو چرائیں
میرے گھر لے آئیں
کبھی یوں بھی تو ہو
سونی ہو محفل ہو
کوئی تمہاری بات ہو
اور تم آؤ
یہ بادل ایسا ٹوٹ کے برسے

میرے دل کی طرح ملنے کو
تمہارا دل بھی ترسے
تم نکلو گھر سے
کبھی یوں بھی تو ہو
تنہائی ہو دل ہو
بوندیں ہوں برسات ہو
اور تم آؤ

زین ''اور تم آؤ۔۔۔ اور تم آؤ۔'' دھیمے سروں میں گنگناتے جا رہا تھا۔ لفظ اس کے لبوں سے نکلتے مسکراہٹ کی خوب صورت سی دھن میں تبدیل ہوتے رہے۔ یہ دھن جب سلطانہ نے سنی تو اپنی ایڑیوں پہ مڑیں۔ سلطانہ نے اپنے بیٹے کی بند آنکھیں دیکھیں تو ٹھہر کر اس کے چہرے کو یوں دیکھنے لگیں جیسے مسافت کو اپنی آنکھوں سے چننا چاہتی ہوں۔ یہ پاگل کتنی محنت کر رہا تھا۔ دن رات ایک کر رکھا تھا۔ وہ کمپیوٹر کے سینکڑوں کورس ان ڈیڑھ دو سالوں میں کر چکا تھا۔

سلطانہ جب بھی اس کے گھر رشتہ لے کر جانے کا کہتیں زین ہمیشہ منع کر دیتا۔

''اب دونوں کے پاس ٹھوس وجوہات ہیں۔ اس کو اپنی چچی کی فکر کھائے گی وہ ہاں نہیں کرے گی اور مجھے اب ضد ہے اس کو ویسے ہی لاؤں جیسے اسے لانا چاہیے۔ اسے کسی چیز کی کمی نہ ہو!'' وہ کہتا۔

سلطانہ آگے سے چھیڑنے کو کہتیں۔

''اتنا خیال تو کبھی تو نے میرا بھی نہیں رکھا!''

زین پریشان ہو جاتا۔ اپنی ماں کو خفا کرنا اس نے سیکھا ہی کہاں تھا۔

''آپ تو ماں ہیں نا اور ماں کی محبت۔۔۔ میں نے کیا اس دنیا میں سب ہی نے یوں لیا ہے جیسے پچھلی صدیوں میں کہیں کسی روپ میں ماں کو قرضہ دے رکھا ہو۔ ماں کی محبت کو تیکن فار گرانٹڈ لیا جاتا رہا ہے اور لیا جاتا رہے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ میں آپ کی محبت کو سمجھتا نہیں ہوں۔ لیکن اس کا صلہ دینا ممکن ہی نہیں۔ ساری زندگی کم ہے آپ کا احسان اتارنے کے لیے!''

سلطانہ ان باتوں پہ مسکرا دیتیں تو زین کی ساری ... یوں ہوا ہو جاتی جیسے دیگچی سے ڈھکن اٹھاؤ تو ... کی ساری بھاپ بخارات بن کر ہوا ہو جاتی ہے ... دیگچی کے ڈھکن کی طرح نم دیدہ ہو جاتا۔ ایسی ... محبت، جس نے باپ کی شفقت سے بھی نوازا ہو ... واقعی کوئی صلہ نہیں دے سکتا تھا۔

''زین بیٹا تھک جاؤ گے!'' سلطانہ نے آنکھیں موندے لیٹے بیٹے کو فکر مندی سے دیکھا۔

''اس کا چہرہ تھکنے نہیں دیتا اماں!'' زین نے آنکھیں کھولیں اور آنکھوں میں بھی مسکراہٹ کی دھنیں رقصاں نظر آئیں۔

''ملی وہ؟'' سلطانہ مارے اشتیاق کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

''اللہ نے ملوا دیا!'' زین نے محکم یقین سے جواب دیا۔ پھر ماں کے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے ان کے ساتھ شوخ ہوا۔ ''اماں آپ اتنی ماڈرن کیسے ہیں؟''

''میں نے کیا ماڈرن ازم دکھا دیا ہے تجھے؟'' سلطانہ نے اچنبھے سے پوچھا اس سے ان کا ہاتھ ناک کی لونگ پر تھا جس کی چمک ممتا کی سانولاہٹ سے کہیں دور تک تھی۔ زین نے دل ہی دل میں نئی لونگ لینے کا سوچا۔

''اماں ماڈرن ازم ہی تو ہے ایسے ہی تو آپ کو زارا کی چچی نے نہیں کہا تھا نا؟'' وہ سخت شرارت پر آمادہ ہوا۔

حسب توقع اماں ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

''ہاں بھئی جو عورتیں دوستیاں کرنے کی اجازت دیتی ہیں، بیٹے کو تختے بٹورنے دیتی ہیں، آنکھیں بند رکھتی ہیں، وہ ماڈرن نہیں ہیں۔ میں جو تیرے سیدھے راستے پہ مان گئی۔ میں ماڈرن ہوں۔ تجھے بڑا یاد ہے زارا کی چچی نے کیا کہا تجھے؟ پتر سچی سچی بات کر کل کو زارا گھر آئے گی تو مجھے بازو سے پکڑ کر باہر تو نہیں نکال دے گا؟'' زین کا قہقہہ ابل پڑا۔

''ماں کو تھوڑا سا زچ اور تنگ کر کے جو مزا ملتا ہے مزا دوستوں کی ٹانگ کھینچنے میں بھی نہیں ملتا۔'' اماں اب چارپائی سے کھڑے ہو کر زین کو دیکھنے لگیں۔ اس سے پہلے ان کی چپل اترتی اور زین کی کمر سینکی جاتی۔

وہ فوراً" بولا" ہائے اماں مذاق کر رہا ہوں۔۔۔ زارا آئے گی تو آپ کو بازو سے پکڑوں گا ضرور لیکن گھر سے باہر نکالنے کے لیے نہیں بلکہ سکون اور آرام دینے کے لیے!" اماں بے چاری پھر بیٹھ گئیں۔

مائیں کیا ہوتی ہیں؟ روبوٹ جس کا ہر بٹن اولاد کے ہاتھ کے اوپر انحصار کرتا ہے۔ اولاد خوش تو ماں خوش۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں الگ انسان ضرور بنایا ہے لیکن ان کی اپنی کوئی مرضی کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ بس اولاد کی خوشی میں ہنسنا اور اس کے غم میں رونا!

"تجھے پتا ہے زین میں دل کو بڑا کر کے گئی تھی زارا کے گھر۔۔۔ جب زارا کو دیکھا تو یوں لگا جیسے پتا نہیں کب سے اسے ہی دیکھنا چاہتی تھی۔ بیٹا پیدا ہوتا ہے تو ماں کا دل بڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے حوالے سے بہت سے خواب دیکھتی ہے۔ میں نے بھی خواب دیکھے۔ اپنے لیے سیدھی اور بھولی بھولا نے کا خواب۔۔۔ زارا ایسی ہی ہے۔۔۔ آنکھیں مٹکانا یا چال بنانا اسے ذرا بھی نہیں آتا۔ بس اللہ لوک سی ہے۔ جدھر ہوائیں موڑتی ہیں ادھر مڑ جاتی ہے۔ آنکھوں میں شرم ہے، حیا ہے۔ اگر مجھے پسند نہ آتی تو میں کسی طرح تجھے اس سے ہٹا دیتی۔ اس نے تجھے کتنی اچھی مت لگائی ہے۔ اس کی محبت نے تجھے سیدھا بندہ بنایا ہے۔ یہ محبت ہی تو ہے جو بندے کو بے پر کے اڑا دیتی ہے۔ اختتام پہ صرف اوج کمال نصیب ہوتا ہے۔ کوئی کتنا بھی اڑیل کیوں نہ ہو محبت ناک میں نکیل ڈال کر اسے بندے کا بچہ بنا دیتی ہے۔"

"اماں اس کی آنکھیں آپ کے سامنے اٹھیں آپ کو لگ پتا جائے۔ پتا ہے اتنی بڑی آنکھیں نکال کر مجھے گھورتی ہے!" زین نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اور یہ اشارہ مبالغہ آرائی کی حدوں سے بھی پرے نکلا۔

"وہ سچا موتی ہے۔ وہ پارس ہے اسی لیے تو آپ کا پتھر کملا ہو گیا ہے۔ مجھے پتا ہے وہ اس گھر کو جنت تو بنا سکتی ہے۔ دوزخ کبھی نہیں بنائے گی۔ اماں لوگ کہتے ہیں ناں محبت اندھی ہوتی ہے۔ محبت اندھی نہیں ہوتی۔ جو لوگ صرف شکل دیکھ کر محبت کرتے ہیں یا پیسے پر نظر رکھتے ہیں، ان کی محبت اندھی ہوتی ہے اور جب بینائی لوٹتی ہے تو ساری زندگی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر سسکنے لگتی ہیں۔ جو محبت کسی کی فطرت، کسی کی سادگی کو دیکھ کر کی جائے وہ اندر باہر جل تھل کر دیتی ہے۔ من کے میل کو اتنا دھوتی ہے کہ بندہ اپنے دل کی ہر بات بس ایک نظر میں دیکھ کر جان لیتا ہے ورنہ تو ساری عمر مخمصے میں مبتلا رہتا ہے۔ نہ خود کو جان پاتا ہے نہ کسی اور کو پہچان پاتا ہے!" زین کہتا رہا۔ سلطانہ اس کی آنکھوں کی چمک کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہیں۔

محبت جہاں بھی سر اٹھائے کھڑی نظر آتی ہے اس کے ماننے والے ہاتھ باندھے پہنچ جاتے ہیں۔ کوئی ان کو بھوکا کہے تو بھوکا ہی سہی، کوئی پاگل کہے تو پاگل ہی سہی، کوئی بے وقوف سمجھے تو بے وقوف ہی سہی۔

محبت کی وجہ سے ملنے والے سارے خطاب ماتھے پہ لگا لینے کا دل کرتا ہے۔ محبت کا ملنا، محبت کو دیکھنا، محبت کو محسوس کرنا ہر سکھ پر حاوی ہوتا ہے۔ ان محبت کے بھوکوں کو پتا ہوتا ہے محبت چودھویں کے چاند کی چاندنی ہے۔ مخمور سی چاندنی جو روشن کرے گی! محبت بہتے جھرنوں کی ٹھنڈک ہے۔ جو روح کو پر سکوں کر دے گی!

محبت پرندوں کی نغمگی ہے جو سماعتوں میں امرت رس گھول دے گی!

پرندے اپنے نغموں کے سرور میں کھوئے ہوئے اپنے پر پھیلاتے اور سمٹتے افق کی نیلگوں روشنی پہ اپنا حق جتاتے رہے۔

جس تن لگیاں عشق کمال
ناچے بے سر تے بے تال

✲ ✲ ✲

دیکھ بندیا اسماناں تے اڈدے پنچھی
ویکھ تے سہی کی کردے نے
ناں او کردے رزق ذخیرہ
ناں او بکھے مردے نے
کدی کسی نے اڈدے پنکھ پکھیرو
بکھے مردے دیکھے نے؟

بندے ہی کر دے رزق ذخیرہ
بندے ہی لکھے مر دے نے

گھر کے دروازے پہ پہرہ دار نہیں رہا تھا۔ رنگ رنگ کے لوگ آنے جانے کی کوشش کرتے۔ کسی کو کسی کام کے لیے گھر بلاتی تو دکانوں کی لالچ میں کوئی اور بن سنور کر دوڑا چلا آتا۔ زارا دامن بچاتی ' کبھی شیر کی طرح دھاڑتی ' کبھی ناگن کی طرح پھنکارتی۔ اپنے آپ کو سمیٹے اپنے اندر بیٹھی رہتی۔

کچھ ناک گھسانے کی عادت اس دکان دار کی بھی تھی جو اس کی اپنی دکانوں میں رہتا تھا۔ وہیں پلاسٹک کا مال بیچتا۔ وہیں گدھے گھوڑے بیچ کے سویا رہتا۔ ایک دفعہ گھر آکر کرایہ دینے کی کوشش کی۔ یوں لگتا تھا جوتوں سمیت آنکھوں میں گھر جائے گا اور حیا کو برہنہ کر کے ہی دم لے گا لیکن بھلا ہو بلقیس آنٹی کا کہ اس وقت گھر پر موجود تھیں۔ آگے بڑھیں ' کرایہ لیا ' اس آوارہ کو چلتا کیا اور ساتھ تنبیہہ بھی کی کہ آئندہ میں خود کرایہ لینے آوں گی۔ اس کے بعد ان کی مہربانی خود ہی دکان پر چکر لگا لیتیں اور کرایہ دے جاتیں۔

اس بار مہینے کی پندرہ ہونے کو آئی تھی۔ کرایہ گھر نہیں آیا تھا۔ بلقیس آنٹی بھی گاؤں نکل پڑیں۔ بھلا فوتگی ماتم بھی چھوڑے جاتے ہیں۔ شبیر انکل کی دکانوں کے کرائے سے بمشکل گھر کی دیواروں پہ سیمنٹ کی لپائی کی تھی۔ دروازے کی کنڈی یا زنجیر کی۔ موٹر ٹھیک کروائی۔ چھوٹا سا کولر خریدا اور باقی علاج پہ اٹھ گئے۔ اب کھانے کو گھر میں آٹا موجود لیکن پکانے کو سالن ندارد تھا۔

دل سے آواز آئی۔ ہاں کرایہ لے آؤ۔ ساتھ اسے بھی دیکھ آنا ' وہیں ٹکا ہوا ہے۔

دماغ نے کہا۔ اب ذرا جا کر دکھاؤ۔ تمہاری اپنی غرض شامل ہے۔ روٹی سالن سب بہانہ ہے۔ تمہیں تو دیدار کرنے کروانے جانا ہے۔ پیٹ نے بحث میں حصہ لیا۔ عقل نے نظر کے ہاتھوں مار کھائی۔ کشور چچی کی بے چارگی جیت گئی۔ بڑی سی چادر اوڑھی اور دکان پر چلی گئی۔ یہ دکان اور شبیر انکل کی دکان بس آمنے سامنے ہی تھی۔

"میں کرایہ لینے آئی ہوں۔" پلاسٹک کی دکان والے ظہور سے سپاٹ لہجے چہرے کے ساتھ مطالبہ کیا۔

"یہی ذرا مسکرا کر مانگ لو تو کرائے سے زیادہ پیسے وار دوں!" اس کی آنکھوں میں خبیث ایکسرے مشین نظر آئی۔ زارا کو لگا وہ چھلنی ہو رہی ہے۔

"بھیک مانگنے نہیں آئی ' کرایہ مانگنے آئی ہوں!" اس نے خود کو مضبوط ظاہر کرنے کے لیے چادر مزید مضبوطی سے تھام لی۔

کتنا مشکل ہوتا ہے.... نازک جسم کی نزاکت چھپانا ' آنکھوں کے کٹوروں میں ڈر کے دستک دیتے قطرے چھپانا ' پاؤں کے انگوٹھے میں چلاتے ہوئے اضطراب کو چھپانا! ظہور کاؤنٹر سے اتر کے عین سامنے کھڑا ہوا۔ اطوار ٹھیک نہ لگے۔ ضرور وہ پیسے ہاتھ میں تھمانے کے بہانے کوئی خباثت کرنا چاہتا تھا۔ زارا کے پیر کے تلووں تک پسینہ آگیا۔

"مجھے دے دو!" زین نے ظہور کے ہاتھ سے پیسے یکبارگی لینا چاہے۔ وہ فرشتے کی طرح وارد ہوا۔ ظہور سخت بدمزا ہوا۔ زارا کی جان میں جان آئی۔ پسینہ کچھ خشک ہوا۔

"کیوں بھئی صرف تم ہی حسن کے لشکارے دیکھو؟ کھلا مال ہے.... ہمارا بھی حق ہے!" زارا کو لگا وہ بھرے بازار میں ننگے سر کھڑی ہے۔ اس سے پہلے کہ آنسو اس کی پلکوں کی باڑ بھگوتے اس نے ظہور کو مٹی چاٹتے دیکھا۔ زین اسے گھونسا مار چکا تھا۔

"بکواس کرتے ہو؟ جانتے ہو کون ہیں؟ ان کے چچا عرصہ دراز تک مسجد کی خدمت پر مامور رہے ہیں!" زین دھاڑا۔ ظہور کی آنکھوں میں شرمندگی جھانکی۔ ایک زندہ لڑکی سے زیادہ اینٹ گارے کی عمارت شرم دلانے کو کافی ہو جائے تو وہ معاشرہ کہاں کھڑا ہوتا ہے؟ اپنے پاؤں پر کھڑا تو بہرحال نظر نہیں آتا۔ زین نے ظہور کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے پیسے لیے اور زارا کو

غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔
"چلو!" اشارہ بشیر انکل کی دکان کی طرف تھا۔ وہ ساتھ چل دی۔
"تمہیں گھر سے نکلنے کو کون کہتا ہے؟" زین نے خفگی سے پوچھا۔
"یہ تم کیسی محبت کرتے ہو مجھ سے؟ رسوا کر کے چھوڑو گے مجھے؟" زارا چڑھائی کو تیار نظر آئی۔
"تو کیا کرتا اسے پھولوں کی مالا پہناتا؟ مذاق بنایا ہوا ہے تم نے؟ اٹھ جاؤ تو محبت نہیں ہے۔ بیٹھ جاؤ تو محبت ہے۔ لیٹ جاؤ تو محبت نہیں ہے۔ سو جاؤ تو محبت ہے۔ بڑی عجیب تعریف ہے تمہاری محبت کی۔ ادھر دیکھو میری طرف؟ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اف کر دیا تڑف... محبت محبت ہے!" زین نے باقاعدہ ناراض ہوتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو سہلایا۔ جوش میں آ کر مکا تو مار دیا لیکن سیدھے اس کے دانت ہاتھ پر لگے۔
"پتا نہیں کس لوہے کا دندانہ استعمال کرتا ہے ظالم کا بچہ... ہاتھ چھیل کر رکھ دیا!" وہ دل ہی دل میں ظہور کو کوستا، زارا سے ہاتھ چھپاتا ساتھ ساتھ چلنے لگا۔
وہ دیکھ لیتی تو ہنس پڑتی یا مذاق ہی بن جاتا کہ ٹھیک سے کھڑے ہو کر ایک مکا بھی نہیں مار سکتے۔ اور اگر مار ہی لیا تو اب ہاتھ سہلا رہے ہو۔
شبیر انکل بھی اپنی جگہ پر منتظر کھڑے نظر آئے۔ دونوں کو اندر آتا دیکھ کر زارا کی طرف متوجہ ہوئے۔
"بچہ جمورا تم ہمارے پاس آتا، ہم تم کو کرایہ لے دیتا۔" پھر اپنا چہرہ زین کی جانب موڑا۔ "چھوکرے تم کیوں لڑنے پر اتر آیا؟"
"چاچا دماغ نہ خراب کرو۔ تم مری کی چڑھائیاں چڑھ جاتے ہو لیکن ان محترمہ کے گھر کرایہ دیتے ٹانگیں درد کرتی ہیں۔ ہر مہینے ظہور کا اور اپنا کرایہ خود جا کر دیا کرو۔ میں دوبارہ اسے بازار میں نہ دیکھوں!" زین کے الفاظ میں اتنا دبدبہ تھا کہ جیسے وہ اس دکان کا مالک ہو اور انکل شبیر اس کے ملازم!
انکل شبیر بھی اس کے رنگ حیرت سے دیکھتے رہے پھر زارا کو دیکھ کر لحاظ کر گئے۔ کہنا تو چاہتے تھے یہ اس دن تم نے ہی منع کیا تھا کہ آپ کی ٹانگیں درد کریں گی۔ آپ کرایہ دینے نہ جائیں۔ میں راستہ سمجھ کر خود لے جاؤں ورنہ وہ خود آ جائے گی جسے ضرورت ہے۔ لیکن کالی دال نے منہ بند کروا دیا۔
"اور تمہیں میں دوبارہ بازار میں گھومتا ہوا نہ دیکھوں!" وہ دوبارہ زارا کی طرف گھوما۔
"میرا دماغ خراب ہو گیا تھا جو تمہاری بکواس سننے یہاں آ گئی۔ مجھے کرایہ دو!" زارا پیر پٹختے ہوئے بولی۔
زین نے مسکرا کر اس کی ہوا بھری ناک کو دیکھا اور کرایہ آگے کیا۔ زارا نے تقریباً" کرایہ چھینا اور جاتے جاتے پتا نہیں کیسے اس کا رومال وہیں گر گیا۔
زین نے انکل شبیر سے آنکھ بچاتے ہوئے رومال اٹھایا اور ہنستے ہوئے ہاتھ پر باندھ لیا!



یقین

سائیاں ذات ادھوری ہے، سائیاں بات ادھوری ہے
سائیاں رات ادھوری ہے، سائیاں مات ادھوری ہے
دشمن چوکنا ہے لیکن، سائیاں گھات ادھوری ہے
سائیاں رنج ملال بہت، دیوانے بے حال بہت
قدم قدم پر جال بہت، پیار محبت کال بہت
اور اس عالم میں سائیاں، گزر گئے ہیں سال بہت
سائیاں ہر سو درد بہت، موسم موسم سرد بہت
سائیاں میرے درد گھٹا، سائیاں میرے زخم بجھا
سائیاں میرے عیب مٹا، سائیاں کوئی نوید سنا
اتنے کالے موسم میں، سائیاں اپنا آپ دکھا

وہ آج بہت خوش تھا۔ وہ اس معاشرے میں سالوں بھی جتا رہتا تو بہتری مشکل تھی۔ آمدن کم سے کم ہو جاتی اور اخراجات زیادہ سے زیادہ۔ اس کے خیال میں نجات کا ذریعہ یہی تھا کہ وہ اس ملک سے نکل جائے۔ آج اسے یہ موقع ملا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔
"اماں میں بہت خوش ہوں!" وہ خوشی سے تمتماتا چہرہ لیے گھر میں داخل ہوا۔

"اللہ تجھے خوش رکھے۔ زارا سے تو نہیں ملوایا۔ تجھے اللہ نے؟" سلطانہ نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے پوچھا۔

"زارا سے ہمیشہ کے لیے ملوانے کا بندوبست کردیا ہے اللہ نے!" وہ خوشی سے بولا۔

"مطلب کوئی لاٹری نکل آئی ہے۔" سلطانہ اس کا ہاتھ تھام کر بیٹھ گئیں۔

"اماں باہر ملک کا بندہ ہے۔ مجھے باہر ملک لے جائے گا۔ یہاں کے روپے پیسے سے دگنا کماؤں گا۔ یہاں کے پیسوں کی کیا عزت ہے؟ وہاں کا پیسا جب یہاں بدلے گا تو مزید پانچ سال پیسے جوڑنے کے بجائے چھ مہینے میں تیری بہو کو لے آؤں گا!" زین تھوڑا ہچکچایا لیکن سارا مدعا بیان کر ہی دیا۔

"زین تجھے پتا ہے میرا تیرے سوا کوئی نہیں ہے۔ تو نے جو کرنا ہے یہیں کر۔ اسی ملک میں کر۔ تجھے جو رزق ملنا ہے وہ یہاں بھی وہی ملنا ہے۔ اور وہاں بھی وہی ملنا ہے۔ کرنسیوں کا فرق ہے تو ہوا کرے۔ خدا کا فرق تو نہیں ہے نا۔ تیری ہر ضد میں نے مانی ہے۔ اب میری برداشت سے زیادہ نہ آزما مجھے!" سلطانہ زین کی توقع سے زیادہ سنجیدہ اور ناراض نظر آنے لگیں۔

"اماں آپ نے ایک بات کی تو اجازت دے دی ہے تو دوسری کی بھی دے دیں۔ زارا کو پانے کے لیے صرف اجازت ہی تو کافی نہیں ہے ناں۔ مجھے اس تک پہنچنا بھی ہے۔ اس تک پہنچنے کا یہی راستہ ہے!" زین گھٹنوں میں آکر بیٹھ گیا۔

"اگر یہی راستہ ہے تو پھر اسے چھوڑ دے!" سلطانہ کا دل بھی کہتے ہوئے کانپا۔ وہ کچھ بھی برداشت کرسکتی تھیں بیٹے کی جدائی کیسے برداشت کرتیں۔ اس نے زین کا سب سے بڑا خواب توڑنے کی کوشش کی۔

"اماں مجھے مرا ہوا دیکھنا چاہتی ہیں؟" زین بضد ہوا۔

"دیکھ سکتی ہوں؟ یہ کیسے سوال پوچھ رہا ہے؟ میرا دل ہول رہا ہے۔ میرا دل نہیں مانتا کہ تجھے جانے دوں۔ تیری بات سنتے ہی میری آدھی سانسیں میرے اندر گھٹ گئی ہیں۔ مجھے تجھے دیکھنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوتا۔ سارا دن تیرے آنے کا انتظار کرتی ہوں مجھے کیسا انتظار تمھارا رہا ہے؟ میں کیسے رہوں گی؟" سلطانہ اپنی بات پہ مصر رہیں۔

"اماں اگر پیسے زیادہ کمانے ہیں تو مجھے باہر جانا ہی ہوگا۔ مانا خدا ایک ہے لیکن عمان کے ریال کا مقابلہ کسی بھی صورت پاکستان کے روپے سے نہیں کیا جا سکتا۔" ماں کو سائیکل کے لیے کی جانے والی ضد یاد آئی تب بھی ماں نے ہتھیار ڈالے تھے۔

مائیں بھی کبھی بیٹوں سے جیتی ہیں؟
جیت ہی نہیں سکتی.... مائیں جو ہوتی ہیں!

"جا تیرا رب راکھا میں کیا کرسکتی ہوں؟ ہٹ پیچھے تجھے روٹی لا کر دوں!" سلطانہ اسے ہٹا کر چولہے کے پاس گئیں۔

اسے امید تھی کہ زین پیچھے سے آئے گا' گلے میں بازو ڈال کر کہے گا۔ اچھا اب نہیں جاتا۔ اب نہیں کہتا۔ میں خود بھی تو تیرے بغیر نہیں رہ سکتا! لیکن اس دن پہلی بار سلطانہ کی امید ٹوٹی۔ زین اس دن پہلی بار اپنی بات سے نہیں ہٹا۔

واقعی زندگی میں بہت سی چیزیں بہت سی باتیں پہلی بار ہوتی ہیں اور بہت مشکل سے برداشت ہوتی ہیں۔ بعض اوقات انجام تک پہنچتے پہنچتے یہ سب چیزیں اتنی بھیانک ہو جاتی ہیں کہ انسان ان کے کبھی نہ ہونے کے لیے "کاش کاش" کرتا رہ جاتا ہے۔

فلک نے معصوم پرندوں کی من مانی پرواز کو بے حوصلہ آنکھوں سے دیکھا۔



ریڑھی والا مکمل سر لگا کر اپنی سبزی بیچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زارا نے مکمل کان لگا کر سنا تو بھنڈی توری کی آواز آئی۔ وہ فوراً" دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ سبزی والے سے سبزی لی۔ گلی سنسان تھی۔

ان گرمیوں میں انسان گویا زمین کھا جاتی ہے یا آسمان۔ ہاتھی مانندوں کو کھر نگل لیتے ہیں۔

گلی کے سینے پہ کوئی مونگ دلتا دکھائی نہیں دیا۔ سبزی والے کے پاس دھنیا سبز مرچیں پودینہ ٹماٹر پیاز بھی نظر آیا۔ زارا نے سب خرید لیا۔ شاپر دروازے میں رکھتی گئی۔ سبزی والے کا حساب چکتا کیا۔ وہ ذرا آگے بڑھا تو پہلے دو لفافے لے کر باورچی خانے میں رکھے۔ پھر باہر گئی مزید شاپر اٹھائے اور انہیں بھی لا کر باورچی خانے میں رکھا۔ واپس دروازہ بند کرنے آئی تو دروازہ پہلے سے بند تھا اور زین سامنے کھڑا تھا۔ زارا اسے دیکھ کر سہم گئی۔

"بدلہ لینے آئے ہو؟" زارا نے ڈر پر قابو رکھ کر اس سے پوچھا۔

"بدلے تم سے لے ہی نہیں سکتا۔ میری پاس تمہارے جیسے نمکین نقش تو ہیں نہیں جن کو آنکھیں چکھنے کے بعد کسی اور شے کو دیکھنے سے منکر ہو جاتی ہیں۔ میرے بال بھی تمہاری زلفوں جیسے نہیں جنہیں دیکھ کر دل ان کی چھاؤں میں عمر بتانے کا سوچے۔ میری موجودگی تمہاری موجودگی کی طرح ست رنگی پھول نہیں کھلاتی۔ جیسے تمہیں دیکھ کر میرے دل میں کلیاں چٹخنے لگتی ہیں ویسے تمہارے دل کی دہلیز پہ روشنی کی کرنیں دستک نہیں دیتیں۔ میں آپ کا غلام میری اتنی مجال کہ ملکہ عالیہ سے بدلہ لوں۔ ویسے کس بدلے کی بات کر رہی ہو؟" اس نے قریب ہوتے ہوئے جانثاری سے کہا۔

زارا دو قدم پیچھے ہوئی۔

"وہ جو اس دن دکان میں ہوا!"

"ہاں اس کا بدلہ لینا تو بنتا ہے لیکن کیا یاد کرو گی۔ معاف کرتا ہوں۔" زین متضاد بیان دیتا دو قدم مزید اس کی طرف بڑھانے لگا۔ اس گھر میں یوں آنے کی جرات کوئی نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ کوئی اور نہیں تھا۔ وہ زین تھا!

"او ہیلو میں نے معافی نہیں مانگی۔ اگر رعب جھاڑو گے تو یہی سنو گے کہ تمہاری بکواس سننے یہاں نہیں آئی۔ بالکل ٹھیک کہا تھا اس دن میں نے۔ تمہیں منع کیا تھا کہ مجھے نہ دیکھنا پھر کیا لینے آئے ہو!" زارا تلخ ہوئی۔

"آج تو اس لیے آیا ہوں کہ تم مجھے دیکھ لو!" دو قدم بڑھاتے وہ اس کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ اب زارا پلکیں اٹھانے کی ہمت ڈھونڈنے لگی۔ اوپر سے چچی کی نیند ٹوٹ جانے کا بھی خدشہ بھی منہ کھولے نظر آیا۔

"کس خوش فہمی میں آئے ہو؟" زارا نے ابرو اٹھا کر خود ایک طرف سے نکلنے کی کوشش کی۔ وہ راستے میں آگیا۔

"میں جا رہا ہوں!" آواز تھی یا سیسہ..... ڈر بہت سی تہیں توڑتا ہوا لاوے کی طرح باہر آیا۔

"میں نے کہا تھا ناں تم چلے جاؤ گے!" یہ کہنے والی زارا نہیں تھی۔ یہ ڈر تھا! ڈر ان آنکھوں کے سامنے کھڑا سوال کرنے لگا۔

"تم مجھے ایک دفعہ بھی کہہ دیتیں تو نہ جاتا۔ یہی تو مسئلہ ہے کہ تم نے کہا نہیں!" زین اس کی بات سن کر ان کہے جملے جان گیا۔ اس کی بازوؤں کی نمایاں رگیں مزید تن گئیں۔ اندر شورش بپا تھی۔

وہ ساری باتیں جو زارا نے کبھی نہیں کہی تھیں زین نے محسوس کر لیں۔ وہ سب اس لمحے زین کو سمجھ آ گئیں۔ اب زارا خاموش رہی۔

"سچ بتاؤں تو صرف آٹھ ماہ کی بات ہے۔ ابھی اماں کو نہیں بتایا آٹھ ماہ میں واپس آجاؤں گا۔ تمہیں یہیں اپنا منتظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ لو چوڑیاں۔ کانچ کی ہیں لیکن لوہے کی سمجھنا۔ زنجیر سمجھتی ہو؟ زنجیر گردانو..... کسی اور کا بڑھا ہاتھ تھامتے ہوئے دیکھ لیا تو اپنی جان سے بھی جاؤں گا اور تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ میرا انتظار کرو گی نا؟" وہ ایک لمحے کو سلطان راہی بنا اور آخر میں پھر وحید مراد! اسے الوداع کہنا زین کو بہت مشکل لگ رہا تھا۔ اسے خود اپنی باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

محبت کیسے روپ بدلتی ہے۔ کبھی ملکیت جتانے لگ جاتی ہے۔ کبھی پیروں میں لوٹتی ہے۔ محبت بس تجدید مانگتی ہے۔ یقین مانگتی ہے۔ اپنے ہونے کا احساس مانگتی ہے۔ محبت چاہتی ہے کہ محبوب محبت

پہن لے، محبت اوڑھ لے۔ محبت کی زبان میں بات کرے۔ محبت لکھے، محبت پڑھے، محبت سمجھے، محبت کا راگ الاپے۔ محبت آنکھوں میں بینائی بن کر اترے۔ محبت آواز میں سوز بن کر نکھرے۔ محبت جھلا کر دے اور اس سارے جھلے پن کی بے قراریوں کو بیان کرنے میں لمحے کم لگنے لگ جاتے ہیں!

زارا نے بمشکل اپنے دل کی بدتمیزیوں سے منہ چھپایا اور اسے گھور کر دیکھا۔

"تمہیں لگتا ہے میں تمہارا انتظار کروں گی؟" اپنا انداز دیکھا ہے؟ محبت میں جبر کیسا؟"

"محبت کے قاعدے نہ پڑھایا کرو۔ اپنے اندر کی استانی سے چھٹکارا پاؤ۔ بیوی بننے کی تیاری کرو۔ ہاتھ بڑھاؤ اور محبت تھام لو۔" زین نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنی طرف کیا۔ وہ اب اس کے ہاتھوں میں کانچ کی کالی چوڑیاں پہنانے لگا۔ گرمی سے بہہ نکلنے والے پسینے میں ایسی ٹھنڈک سمٹ آئی کہ شبنم گمان ہونے لگا۔ زارا ہاتھ نہ کھینچ سکی وہ آرام سے کلائی تھامے چوڑیاں پہناتا رہا۔

ایک آنسو زارا کی بائیں آنکھ سے نکلا۔ گال پر پھیلا۔ زین نے انگلی کی پور پہ چنا!

"یہ آنکھ لیک تو نہیں کرتی؟" اس نے مذاق کرنے کی بھونڈی سی کوشش کی۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہنسا۔

"اللہ انتظار کروائے گا اور پھر اللہ ہی ملوائے گا۔"

زین نے زارا کے ہاتھ کی پشت تھپکی اور باہر نکل گیا۔ وہ کچھ لمحے بھی اور ٹھہرتا تو پتھر کا ہو جاتا۔ یہ لڑکی اپنی سادگی میں بھی اسے امتحان میں مبتلا کر دیتی تھی۔ روشنی جب جاتی ہے تو کیسا اندھیرا چھوڑ جاتی ہے۔ زارا کو آج وہ اندھیرا نظر آیا۔

کوئی سانپ تھا کہ جس کا پھن دماغ میں پھنکارنے لگا۔ اس نے ڈر کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن محبت نے یقین تک کے سفر میں آنے والی آزمائش نے سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

خاموشی ناچتی رہی۔۔۔

ڈر پھنکارتا رہا۔۔۔

محبت سر اٹھانے کی کوشش کرتی رہی۔۔۔

اور۔۔۔

یقین سر پٹختا رہا!

☼ ☼ ☼

وہ آیا ہی کیوں تھا میری زندگی میں۔۔۔ وہ یہ سوال کرتی جاگتی اور یہی سوال کرتی سو جاتی۔ اس کی باتوں میں یہ سوال کانٹا بن کر چبھ گیا۔ تکلیف کے احساس سے وہ سوئی جاگی سی ہو گئی۔ اس کی کالی آنکھوں میں وحشت کے سائے ناچنے لگے۔ زلفیں جنہیں وہ بادل کہہ کر گیا تھا اس سوال کی بازگشت سے اڑنے والی خاک سے اٹ گئیں۔ وہ اس کو آخری دفعہ نہیں کہہ سکی تھی کہ وہ اسے اچھا لگتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود تھوڑا سا اظہار اس بے حوصلہ آنسو نے کر ہی دیا تھا۔ کیا اس بے حوصلہ آنسو نے مجھے بے مول تو نہیں کر دیا؟ میرا یہ آنسو اس کو مغرور تو نہیں کر دے گا؟ مغرور تو کبھی واپسی کے راستوں پہ قدم نہیں رکھتے۔ خود ہی سوال کرتے اور خود ہی جواب دیتے وہ اپنی لٹ کو سلجھانا بھولنے لگی۔ پانچ مہینے گزر گئے تھے انتظار کرتے کرتے

کشور چچی کافی حد تک بہتر ہو گئیں۔ معالج کی ادویات نے کام دکھایا اور باقی کسر دعاؤں نے نکال دی۔ پھر بھی احتیاط لازمی تھی ان کو دوبارہ اٹیک ہونے کا خطرہ تھا۔ ان کے بہتر ہونے سے زارا کو وقت ملا اور یہ وقت ہی تو مصیبت بنا۔۔۔ کٹتا ہی نہیں تھا!

زارا روز سیڑھیوں پہ بیٹھ کر اپنی چوڑیاں گنتی۔ پوری چھتیس تھیں۔ اس نے جب بھی گنیں۔ وہ چھتیس ہی رہیں۔ ایک دن سیڑھیوں سے صفائی کرتے [illegible] گر گئی۔ ایک بازو نے نیچے لگنا تھا۔ اگر دایاں بازو نیچے لگتا تو چوڑیاں ٹوٹ جاتی۔ وہ بائیں بازو کے سہارے گری اور بازو چھل گئی لیکن وہ خوش تھی کہ چوڑیاں پوری رہیں!

آخر چھٹے مہینے کسلمندی نے اپنی زنجیریں خود ہی

تو ہیں۔ زارا اپنی فطرت میں جاگ اٹھی شوخی کی سرمستی سے محظوظ ہوتی رہی۔ اس نے مہندی گھولی۔ اپنے بال رنگے کہ دھوپ میں چمک اٹھیں۔ وہ ہمیشہ دھوپ میں سائے کی طرح ہی تو ملا کرتا تھا۔ اس نے مالٹے کے چھلکے پیسے انہیں دودھ میں ملا کر گالوں پہ لگاتا تھا۔ ہاتھوں پیروں پہ دودھ ملائی کا مساج ہونے لگا۔

اماں کے صندوق سے دو نئے جوڑے نکال کر سی لیے۔

پتا نہیں کرنے کو اتنے کام کہاں سے نکل آئے کہ آٹھواں مہینہ بھی سر پر آگیا۔

وہ تیار تھی۔ مکمل تیار۔ اس کے انتظار نے اشتیاق کا لباس پہن لیا!

کسی کے اسی شہر میں ہونے سے ہوا میں آکسیجن کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ زارا کو ایسے سارے غیر منطقی فلسفے ان مہینوں میں سمجھ آگئے۔ نہیں سمجھ میں آیا تو صرف یہ کہ آخری مہینہ کیسے گزرے گا۔

اس کے کرنے کو کچھ بھی نہیں بچا تھا کیوں کہ وہ تو تیار تھی۔۔۔ مکمل تیار!

آٹھ ماہ بارہ ماہ میں بدل گئے اور پھر چھ ماہ اور گزر گئے۔ وہ زندہ لاش بن گئی۔ اس کے سجدے طویل تر ہوتے گئے۔ انتظار نے اس کے اندر سے زندگی کی ساری رمق چوس لی لیکن وہ پھر بھی واپس نہیں آیا تھا۔ اسے گئے ہوئے ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ اس نے صرف آٹھ ماہ کہا تھا اور اب ڈیڑھ سال بعد بھی وہ یہاں نہیں تھا۔۔۔ وہ کہاں تھا کسی کو معلوم نہیں تھا! بے رونق زندگی اپنا کرخت چہرہ لیے نظر آئی۔ زارا کو ہر صورت جینا ہی تھا۔ کشور چچی تقریباً" مکمل ٹھیک ہو گئی تھیں۔ وہ چلتی پھرتی صحن میں نظر آتیں۔ ان کے پاس کہنے کو لفظ تھے لیکن ڈانٹنے کو رعب باقی نہ رہا۔ زارا کو چپ کھا گئی۔ وہ خاموش پورے گھر میں چکر کاٹتی۔ گھر کے سارے کام کرتی لیکن منہ سے لفظ نکلتے اور سننے والی سماعت نہ پہچان پاتی۔ کیونکہ آواز سنے عرصہ گزر چکا تھا!

وہ جو سوٹ اس نے سلوا لیے تھے وہ فقیرنی کو دے دیے۔ جواب میں خوش رہنے کی دعا ملی۔ وہ اس دعا کو کیا کرتی؟ کس پلڑے میں رکھتی؟ اس کے پاس کوئی ترازو ہی نہیں تھا۔ آنکھیں بنجر ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے اتنے بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے کہ شک پڑتا کسی قبر میں سے تعلق رہا ہے۔ ہاں یادوں کی قبر ہی تو تھی، جو روز پکارتی تھی۔

کالی چوڑیاں وہ اتار دینا چاہتی تھی مگر کوئی لمس اسے جکڑ لیتا!

دروازے کے پاس کھڑی ہوتی تو یاد آتا۔ "میں اس لیے آیا ہوں کہ تم مجھے دیکھ لو!" زین کے نقش نمکین نہیں تھے لیکن شہد آنکھوں کا مرہم روتا ہوا جسم ڈھونڈتا رہتا! اس کی آواز واقعی دل پہ دستک نہ دیتی بلکہ حکومت کرتی!

اس کی موجودگی آپ اتنی قوی تھی کہ کوئی اور خیال سامنے نہ آتا!

اس کی ساری مثالوں کے جواب ڈھونڈ لیے تھے لیکن وہ خود مجسم سوال بن کر کہیں روپوش ہو گیا تھا۔

وہ انتظار کی سولی پر ٹانگ گیا تھا۔ زندگی اس کے بغیر کیا تھی؟ کچھ بھی نہیں۔۔۔ ایک غلط نقطے کے سوا کچھ بھی نہیں!

وہ ابھی سامنے آئے گا اور ہاتھ باندھ کے قریب آنا شروع ہو جائے گا۔ لیکن وہ خوابوں میں بھی گھومتا پھرتا نظر نہ آتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ سلطانہ آنٹی کے گھر جائے۔ اس کی کوئی خیر خبر لائے لیکن یہ کوئی کہانی تو تھی نہیں کہ وہ اسے گلے لگا لیتی' نہ ہی وہ محبت کے نام پر زندہ انسانوں کے درمیان معاشرتی ضوابط سے ہٹ کر کوئی کام کر سکتی تھی۔ وہ صرف اس کو سوچے جاتی۔ یاد کرتی رہتی۔ وہ لڑکی تھی بس یہی کر سکتی تھی۔

چھت پر جاتی اور باجرے کو مٹی کے ٹوٹے مرتبان میں ڈالتی۔

کہاں چلا گیا ہے وہ؟ کہیں روٹھ تو نہیں گیا؟ اگر روٹھ گیا ہے تو میں اسے کیسے مناؤں گی؟ میں کیا کروں گی؟ میں کس حد تک جاؤں گی؟ وہ خود سے سوال پوچھتی رہتی۔۔۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے ملک کو اپنی پہچان کو دھتکار کر یہاں آیا تھا۔ ایجنٹ کے کہنے میں آکر اس نے صرف چالیس ہزار میں اپنے وطن سے جدائی خریدی تھی۔

ایک کشتی میں اس جیسے بیس اور مسافر بھی غیر قانونی طور پہ ریال کمانے کے خواب لیے بیٹھے تھے۔ جونہی کشتی پاکستانی ساحل کی نظروں سے اوجھل ہوئی۔ ایجنٹ کا رویہ بدلتا گیا۔ ایجنٹ کی شکل پہلے ہی کرخت سی تھی۔ اب اس کرختگی میں کچھ کچھ نحوست سی در آئی۔ ایجنٹ نے اپنا نام پرویز بتایا تھا۔

پرویز کا رویہ ان کے ساتھ حاکموں جیسا ہونے لگا۔ وہ ان سب کو حقائق سے واقف کروانے لگا۔

"آج کل سرحد پہ سختی بہت ہے۔ میرے احکام مانو گے تو زندہ رہو گے۔ ورنہ عمان کی پولیس کے ہاتھ چڑھ گئے تو یہیں مر کھپ جاؤ گے۔" بیس کے بیس مسافر اسی جیسے تھے۔ نوجوان' ڈرے ہوئے' سہمے سہمے' ورغلائے ہوئے چہرے لیے 'اپنی اپنی ماں کے زین....

زین کو یہ محاورہ ان کی بے چاری شکلوں پہ صادق آتا دکھائی دیا کہ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ ان لہروں کی طغیانی کہیں سے آئینہ چرا کر لاتی اور وہ زین کے سامنے رکھا جاتا تو وہ اپنی ہکابکا شکل دیکھ کر کبھی پہچان نہ پاتا کہ یہ وہی زین ہے جو کسی دوسرے سے ایک ہی گھونسے میں مٹی چٹوا سکتا تھا۔

یہ تقریباً "رات کا آدھا پہر بیت جانے کے بعد کے لمحے تھے۔ جب کشتی میں غیر معمولی سرسراہٹیں ہوئیں۔ ان سرسراہٹوں نے خوابیدہ اعصاب کے زین کو جھنجوڑ کر جگا دیا۔ زین دبے قدموں کشتی کے دوسرے کونے میں جانے کی کوشش کرنے لگا جہاں سرگوشیاں مسلسل سرسراہٹوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی آواز کا سرا پکڑتا۔ ایک بلند آواز نمایاں ہوئی۔

"اٹھو' اٹھو سب اٹھو۔ میرے ایک ساتھی کی کشتی پکڑی گئی ہے۔ اس میں بھی تم جیسے دس گھامڑ سوار تھے۔ اب بتاؤ اگر سرحد پہ جاکر قربان ہونا ہے تو یہیں تمہیں ماردوں۔" بلند آواز پرویز کی تھی اور باقی کی دہشت اس کے ہاتھ میں پکڑی رائفل نے پھیلادی۔ ان مسکینوں کی نیند کے نشے میں ڈوبی آنکھیں کھلی یہ خبر سن کر کھلی کی کھلی ہی رہ گئیں۔

ڈر اور دہشت سے ان کی آنکھیں لرزنے لگیں اور وہ ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ اگر پرویز اکیلا ہوتا تو شاید یہ حال نہ ہوتا۔ اس جیسی کرخت شکل' لمبے قد اور چوڑے شانوں والے پانچ ساتھی مزید کشتی پہ اپنی رائفلز کے ساتھ موجود تھے۔ جب ڈر اور دہشت نے اپنے پر اچھی طرح پھیلا دیے تو پرویز رائفل کی نالی نیچے کرتے ہوئے بولا۔

"میں بھی تم لوگوں کو مارنا نہیں چاہتا۔ افتاد ایسی آن پڑی ہے کہ کچھ مہینے تم لوگوں کو ہمارے اڈے پہ رہنا پڑے گا۔ ہمارا اڈہ تم لوگوں کے لیے محفوظ ہے۔ جونہی حالات بہتر ہوں گے تم لوگوں کو آزاد کردیا جائے گا۔"

اس حکم کو جاری کرنے کے بعد انہیں ایک کشتی سے دوسری کشتی میں منتقل کیا گیا۔ منتقل کرنے کے بعد انہیں جو کھانا ملا وہ بندوق کے نشانے پہ کھلایا گیا۔ کھانے کے بعد انہیں کوئی ہوش نہیں رہا۔

جب ہوش آیا تو وہ صندوق نما بیرک میں تھے۔

عمان اور پاکستان کے درمیان تعلقات بہت اچھے ہیں۔ عموماً" جو لوگ غیر قانونی طور پہ سرحد پار کرتے ہیں۔ ان کو واپس بحفاظت بھیج دیا جاتا ہے اگر سرحد پہ ہی پکڑ لیا جائے۔ لیکن کچھ عادی مجرم بھی ہوتے ہیں اور کچھ پرویز کی طرح جرم کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا تمام ریکارڈ پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس دھندے میں رنگ بھرتے بھرتے اکثر ہی شکنجے میں آجاتے ہیں۔ ایسے عادی مجرموں کے لیے کوئی رعایت نہیں ہوتی۔ پرویز اگر گروہ کے ساتھ پکڑا جاتا تو گروہ کی زندگی خطرہ نہیں تھا لیکن پرویز کو بھاری بھرکم نقصان اٹھانا پڑتا۔ یہ بات گروہ میں شامل زین اور زین جیسوں کو نہیں معلوم تھی لیکن پرویز کو معلوم تھی۔ اس نے

اسی لیے کھیل کو اپنی مرضی سے کھیلا۔ سرحد پار کے ساتھیوں سے رابطہ کر کے ان جوانوں کو چھپانے کا سوچ لیا۔ جونہی حالات سازگار ہوتے انہیں عمان میں سر پہنچنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔

وہ اپنے ملک سے کہہ کر آیا تھا کہ پاکستان میں کیا رکھا ہے۔ لیکن وہ اب پاکستان جانے کے لیے ترس رہا تھا۔ وہ ایک بار پاکستان جانے کے لیے ترس رہا تھا۔



تیری ہر اک نشانی جھوٹی
تیری یادوں کو مٹا دیتا ہے
چہچہائے نہ کوئی آنگن میں
سب پرندوں کو اڑا دیتا ہے
اب بسیرا نہ کریں وہ تازی
آخری پیڑ گرا دیتا ہے

وہ کشور چچی کے کہنے پر لاہور آئی تھی داتا دربار میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کے لیے کشور چچی آگے بڑھ گئی تھیں دعا مانگنے کے لیے وہ سسک رہی تھی۔ اس کے آنسو اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

"کیا ہوا کہ اگر میں کچھ نہیں ہوں.... تو تو سب کچھ ہے میرے اللہ!

کیا ہوا کہ میرا کوئی اختیار نہیں.... تیرے اختیار میں تو سب کچھ ہے اللہ!

کیا ہوا کہ میں کچھ نہیں کر سکتی.... اس کائنات کا ہر ذرہ تیرے کن فیکون کا نتیجہ ہے اللہ!

کیا ہوا کہ اگر میں فانی ہوں.... تو تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہے گا اللہ!

کیا ہوا کہ میں مانگنے کا سلیقہ سیکھتی ہوں اور پھر بھول جاتی ہوں.... تو مجھے ہر پل یاد رکھتا ہے اور بن مانگے نوازتا رہتا ہے اللہ!

اے اس دنیا اور آخرت کے مالک! میں تیری عظمت و بزرگی کو تسلیم کرتی ہوں۔ میں اپنے دل کی بے چینی، بے کلی کو تیرے حوالے کرتی ہوں۔ نہ میرا اس سلسلے کی شروعات پہ اختیار تھا نہ میں اس بے سکونی سے نجات پانے میں قادر ہوں۔

اپنا آپ وہ قادر مطلق کو سونپ کر ہچکیاں لے لے رو رہی تھی۔ اس کے آنسو تہجد کی وقت کی خاموشی میں رینگتے چلے جا رہے تھے۔ بادلوں کی اوٹ سے چاند نے خود کا ظاہر کیا۔ وہ چاندنی میں نہا گئی۔ قریب ہی لگا پیڑ من موجی ہوا کی اٹکھیلیوں سے لطف اندوز

ہوتے زمین چومنے لگا۔ ہلکورے لیتا وجود سجدے میں پڑے ہوئے نیند کی آغوش میں چلا گیا!

☆ ☆ ☆

صبح اس کی آنکھ کسی کے جگانے پر کھلی تھی۔

اس نے حیران نظروں سے سامنے دیکھا۔ وہ وہیں تھی اور اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک وقت تھا کہ وہ اس سے بات بھی کرنا پسند نہیں کرتی تھی اور اس کا غرور خاکستر ہو کر اس کے عین سامنے راکھ کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھی کہ وہ بات کرنے کو ترس رہی ہے لیکن اس کا حلیہ کسی کو اس کے پاس پھٹکنے نہیں دے رہا تھا!

زارا پوچھنا چاہتی تھی کہ تم یہاں کیسے.... لیکن نہیں پوچھ سکی۔

زارا نے اسے کشور چچی سے ملوانا چاہا لیکن نشا نے ہاتھ جوڑ دیے وہ ایسا بالکل نہیں چاہتی تھی۔ اور پھر وہ ہاتھ جوڑے ہوئے ایک لمحے میں غائب ہو گئی۔ زارا اس کو ڈھونڈتی رہی لیکن وہ کہیں نہ ملی۔

اس نے کشور چچی کو بھی نہ بتایا کہ دینے کو کوئی ثبوت نہ تھا۔ اگلے دن وہیں اس کی گود میں کوئی کاغذ ڈال گیا۔ زارا نے بے حد وحشت سے دیکھا تو وہی نیلی چادر کا سایہ لہرایا جو نشا نے اوڑھی ہوئی تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ اٹھ کر پیچھے جائے لیکن نہیں جا سکی۔

کشور چچی کی ایک بچپن کی سہیلی لاہور میں مل گئیں۔ زارا کا تعارف نشا کے طور پر ہی ہوا۔ انہیں یہی بتایا گیا کہ یہ نشا ہے بعد میں نام زارا رکھ دیا تھا کیونکہ نشا کی پیدائش سے وہ خاتون واقف تھیں۔ ناہید آنٹی نیک خاتون تھیں۔ فوراً" گھل مل گئیں۔ اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئیں۔

"سعودی عرب میں ایک اسکول میں نان ٹیچنگ اسٹاف کی ضرورت ہے۔ اپنی بیٹی کو لے جاؤ۔ یہاں رہنا ہے یا وہاں۔ تمہارے لیے ایک برابر ہے!" ناہید آنٹی نے تجویز دی۔

"اپنی ایسی قسمت کہاں کہ ہمیں وہ ملک دیکھنے کو ملے!" زارا آنٹی کی بات پر ہنس دی۔

"یہاں تو ایک انسان نہیں ملتا اور رب اپنے پاس بلائے کہاں ممکن ہے؟"

خیر طے یہ ہوا کہ زارا اکیلی انٹرویو وغیرہ دینے جائے گی۔ اگر تمام معاملات بخوبی حل ہو گئے تو پھر کشور چچی کو بھی اپنے پاس بلا لے گی۔ ابھی سب زاویوں سے اس بات کو جانچا جا ہی رہا تھا کہ سب کی آنکھ بچا کر زارا کمرے سے باہر نکل آئی۔

دوسرے کمرے میں جا کر دروازے کی اوٹ میں ہو کر نشا کا دیا کاغذ کھولا۔

"زارا!

کچھ بھی ہو جائے مگر بیٹی کو گھر سے بھاگ کر نہیں جانا چاہیے۔ شاید یہ ایک ہی لائن کافی ہے تمہیں میرا حال سمجھانے کے لیے۔ مجھے چاہیے تھا میں کاشف کو گھر بلاتی۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو جاتا۔ منع ہی کر دیتے .... وہ پھر آجاتا لیکن میں رخصت باپ کی دعاؤں میں ہی ہوتی۔ مجھے تیسرے روز ہی خبر مل گئی تھی کہ ابا دنیا چھوڑ گئے ہیں۔ اس کے بعد کاشف کا اور میرے اندر کا گلٹ سارے گھر میں پھیل گیا۔ وہ مجھے کہتے رہے کہ گھر جاؤ۔ آنٹی سے مل آؤ۔ اگر میں گھر آتی تو مجھے کوئی بھی قبول نہ کرتا۔ اماں کے غصے سے واقف تھی۔ میں ضد کر کے شہر ہی چھوڑ آئی۔ جانتی ہو مہینہ ہی گزرا تھا کہ کاشف کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ پھر انہوں نے لاہور آنے کی خواہش کی۔ وہ داتا دربار آنا چاہتے تھے۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر وہ یہ خواہش نہ کرتے تو میں اپنی ماں کو ایک دفعہ اور کیسے دیکھتی؟ میں آج لاہور میں اسی لیے ہوں کہ وہ مجھے لاہور ہی میں چھوڑ کر گئے۔ تمہیں زندگی میں رشتے نہیں ملے۔ یا یوں کہہ لو کہ کم ملے۔ تم نے ان سے سمجھوتا کر لیا۔ میرا دکھ یہ ہے کہ مجھے رشتے بہت ملے اور جب مجھے ان کی قدر آئی یا ان کی موجودگی کا احساس ہوا.... وہ مجھ سے بچھڑ گئے!

گھر سے نکلنے سے پہلے ابا کو دیکھنا آخری مرتبہ کا دیکھنا ثابت ہوا۔ جب کاشف کی ٹانگ ٹوٹی تو وہ سخت دلبرداشتہ ہو گئے۔ زندگی سے مایوس ہو گئے۔ میں نے

لاکھ کہا کہ میں آپ کی لاٹھی بنوں گی لیکن وہ دل چھوڑ بیٹھے۔ ایک عام سے دن معمولی سے دل کے درد کے بعد فوت ہو گئے۔ جانتی ہو کیا ہوا تھا انہیں؟ صرف ہارٹ اٹیک ... وہ شخص جو کہتا تھا میں نے اپنا دل تمہیں دے دیا وہ مجھ سے جھوٹ کہتا تھا۔ اس نے مجھے دل دیا ہوتا تو کیا دل کے اٹیک سے مرتا؟ اگر مجھے دل دیتا تو کیا میں اسے سنبھال کر نہ رکھتی؟ اگر دل میرے پاس ہوتا تو کیا اس شخص کو درد محسوس ہوتا؟ میری محبت کے دامن میں اس کے دل کو کچھ ہو سکتا تھا؟ وہ شخص جس کے لیے میں نے اپنی زندگی تیاگ دی 'اپنا گھر چھوڑ دیا۔ وہ مجھے چھوڑ گیا۔ میں بھول گئی کہ وہ شخص بھی انسان ہے۔ خدا تو ہے نہیں کہ میں اس سے ہمیشہ ساتھ نبھانے کی توقع کرتی۔ یہ اللہ ہی ہے جو مجھے نواز رہا ہے کہ جب مجھے وہاں ہونا چاہیے جہاں تم ہو اور میں وہاں نہیں ہوں تو دو وقت کی روٹی مل جانا نوازا جانا ہی تو ہے۔ اللہ نے میرے سارے گناہوں کے بعد بھی 'میری خطاؤں کے بعد بھی مجھے بھوکے پیٹ سونے نہیں دیا۔ تمہیں مزار کے اندر اماں کے ساتھ داخل ہوتے دیکھا۔ ایک دم دل چاہا دوڑ کر آؤں اور اماں کے گلے لگ جاؤں۔ انہیں بتاؤں کہ گھر سے بھاگنے والی ابھاگن ہی رہتی ہے' وہ کبھی سہاگن نہیں بنتی۔ وہ جیت گئی ہیں اور میں ہار گئی ہوں۔ پھر سوچا ان کے سینے میں ماں کا دل دھڑکتا ہے۔ مجھے سینے سے لگا بھی لیں گی لیکن دیکھو ابھی وہ مطمئن ہوں گی کہ میں انہیں اپنی خوشی کے لیے چھوڑ گئی۔ میں شاید خوش ہوں یہ خیال انہیں مطمئن رکھتا ہو گا۔ اور وہ جب مجھے یوں میلی چادر میں دیکھیں گی تو ہزار بد دعائیں بے شک دیں۔ ان کا دل میری تکلیف پہ تڑپے گا۔ وہ مجھے یوں دیکھ کر برداشت نہیں کر سکیں گی۔ اور اب میں مزید تکلیفیں نہیں دے سکتی۔ میں نے جنت کا دروازہ اپنے ہاتھوں سے بند کر دیا ہے۔ میں نے جنت کے ہوتے ہوئے جنت گنوادی۔ تم نے جنت کھو کر جنت کمالی۔ تمہیں اللہ کا واسطہ ہے اماں کو میرا حال کبھی نہ بتانا۔ اللہ تمہاری نیکیاں قبول کرے۔

فقط قسمت کی ماری۔ نشا

چرمرائے کاغذ کے ذرا نے ٹکڑے کیے اور اسے قریبی آیتوں کے شہید ہوئے صفحات والے باکس میں ڈال دیا۔ وہ اس راز کو آنٹی تک منتقل کرتی تو شاید برسوں بعد کمایا ہوا اعتبار کا لحہ کھو بیٹھتی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کشور آنٹی کے پاس تھی۔ اسے آج ایک کہانی کا انجام پتا چلا تھا۔ اس کا دل پورے زور سے دھڑکا کہ ہم عقیدہ آخرت کو لازمی رکن مان کر حساب سے نظریں کیوں ہٹا لیتے ہیں!

ضروری تو نہیں کہ سب اعمال کی پوچھ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پہ ہی ہو!

معجزہ

محبت معجزہ کوئی
محبت دل کے پنوں پر
لکھی اک نظم ہو جیسے
مدھر سی
سات سروں میں سمٹی راحت میں
کہی کوئی غزل جیسے
محبت کا سفر اک سہم سے آغاز ہوتا ہے
یقین کی منزلوں سے ہوتے ہوتے
دل اچکتا ہے
یہ کامل ہو تو جاں تو کیا
یہ جاں کی جاں بھی لیتا ہے
یقیں ایسا
جو جیون کی کٹھن ہر آزمائش میں پنپتا ہے
مگر پھر بھی
محبت کی کہانی کا کوئی انجام جو ہوتا ہے
تو وہ ہے معجزہ کوئی
محبت معجزہ کوئی

اس کی آنکھ پانی کے قطروں سے کھلی جو اس کے چہرے پر مسلسل پڑ رہے تھے۔ اسے ہوش میں لے آنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ پتا نہیں کب کہاں اور کیوں اور کیسے اس کو صندوق سے نکال کر یہاں لا پھینکا گیا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ کس کے سجدے میں بندھی ہچکیاں اور کس کی دعائیں اللہ سے رحم سمیٹنے میں کامیاب رہی تھیں۔ نجانے وہ کون سا اسم اعظم تھا جس نے عرش کے دروازے کھلوا دیے تھے!

یک بارگی کسی نے پوری پانی کی بوتل ہی الٹ دی۔

"تم کون ہو؟" اردو میں پوچھا گیا۔ اتنا اسے یاد تھا کہ وہ جہاں بھی ہے، بہرحال اپنے پاکستان میں نہیں ہے۔

"انسان ہوں!" رسی جل گئی تھی لیکن بل نہیں گیا۔

"نظر آ رہا ہے مجھے۔۔۔ آئے کہاں سے ہو؟" اب پوچھنے والے کو غصہ آیا۔

"پتا نہیں کس جہنم میں تھا اور اب کون متھے لگ گیا ہے!" زین بڑبڑایا۔

"ہاہاہا۔ پاکستانی ہو؟ وہی زیادہ گدھے بنتے ہیں۔" سامنے والے کو ہنسی آئی۔

"پاکستانی اپنے اچھے دل کی وجہ سے بے وقوف جلدی بن جاتے ہیں۔" زین اس حالت میں کم از کم اپنی قومیت کے بارے میں کچھ نہیں سن سکتا تھا۔ اسے اپنا پاکستان ہی تو یاد آیا تھا اور بار بار یاد آیا تھا!

"میں بھی پاکستانی ہوں اٹھو۔" ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کیا گیا۔ مسیحا بن کر اس کی زندگی میں دستک دینے والا سکندر تھا!

عمر میں کوئی دس سال بڑا لیکن چھوٹے بچوں جیسا مہان۔ جعلی طریقے سے ایجنٹ نے زین کو سرحد تو پار کروا دی تھی لیکن اتنا عرصہ یوں رکھا کہ اس کی ایڑھیاں پھٹ گئی اور جسم سکڑ گیا۔

اس کے ساتھ کے باقی سوار کہاں گئے؟ کیا ان کو بھی اسی طرح کسی صحرا میں چھوڑ دیا گیا ہو گا؟ یہ سب سوال اپنے پورے قد کے ساتھ موجود تھے لیکن وہ جواب نہیں جانتا تھا۔ اتنا ضرور معلوم تھا اسے کہ وہ زندہ رہا تو ہر ایسے ناسوروں کو منظر عام پہ لے کر آئے گا!

صحرا سے نکلنا اس کے لیے سب سے مشقت والا کام

تھا۔ زندگی بھر وہ اس مشقت کو بھول نہیں سکتا تھا۔

سکندر کو اللہ نے چھپر پھاڑ کر نوازا تھا۔ نوازے جانے نے اس کے دل کو سخت نہیں کیا بلکہ مزید نرم کر دیا۔ وہ جتنا امیر تھا اس سے کہیں زیادہ سخی تھا۔ اس نے مزید چار ماہ لگائے۔ زین کی عمان میں رہائش کو قانونی کروایا۔ تب تک اسے اپنے پروں میں ڈھانپے رکھا۔

سکندر کے والد کا شمار پاکستانی رئیسوں میں ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے کاروبار کی شاخیں کئی ممالک میں پھیلا دیں تھی۔ ان کی زندگی میں ہی جب ٹیکسٹائل ملز کا نظام ٹھپ ہوتا نظر آیا۔ تو وہ اپنی متاع حیات اپنی اکلوتی اولاد سکندر کو لے کر ریاض میں رہائش پذیر ہو گئے۔

سکندر عمان اپنے کاروبار کے حوالے سے آیا تھا۔ اسے تنہا زندگی گزار گزار کے صحراؤں میں بہت کشش نظر آتی تھی۔ اس لیے اس نے سوچا کہ تنہائی کو صحرائی کیا جائے۔ اسے گلف آف عمان صحرا دیکھنے کا شوق چرایا۔ رئیس زادے نے خصوصی جیپ لی اور نکل پڑا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ صحرا تنہا ہوتے ہوئے بھی کتنی وسعت رکھتے ہیں۔ ان کے دامن میں کتنے ہی طوفان اٹھتے ہیں لیکن گرد صحرا کی حدود سے باہر نکل کر نہیں جاتی!

وہ اپنے اندر بھی یہ ظرف پیدا کرنا چاہتا تھا کہ تنہائیاں جب بال کھول کر بین کرتی ہیں تو اس کے چہرے پہ کسی قسم کی وحشت اپنا نشان نہ چھوڑ سکے۔ کوئی نہ جان سکے کہ چھ فٹ لمبے اس مرد کا تکیہ رات کے آخری پہر اکیلے پن سے اوب کر نم ہونے لگتا ہے!

اس کی زندگی میں جو بھی قدم رکھتا صرف اپنی زندگی سنوارنے کی نیت سے رکھتا تھا۔ اسے لوگوں کے چہرے پڑھنے نہیں آتے تھے۔ وہ ان کو فائدے دے کر پھر تنہا ہو جاتا۔

اس صحرا کے دامن میں اس نے زندگی کے بقا کی جنگ لڑتے ہوئے زین کو دیکھا تو اس کا دل ہمدردی کے مارے پسیج گیا۔ اس کے تمام قانونی معاملات حل کروا کر وہ اسے اپنے ساتھ اپنے شہر ریاض میں لے گیا۔۔۔۔

سکندر کو زین سے انسیت ہو گئی تھی۔ وہ اپنے خلوص کی وجہ سے سکندر کے دل میں گھر کرتا اس کا دست راست بن گیا۔ زین بھی سکندر کی نرم طبیعت کی برکتوں سے فیض یاب ہونے لگا۔ اس کے ساتھ معجزہ ہوا تھا کہ وہ زندہ بچ گیا تھا۔ سکندر کے پے در پے احسانات زین کے گلے میں یوں اٹکنے لگے کہ وہ اپنی ماں یا زارا کا نام بھی نہیں لے سکا۔ تاوقتیکہ اسے یہاں رہتے ہوئے دو ماہ مزید گزر گئے۔

زندگی ناقابل یقین حد تک ناقابل یقین ہے! یہ بات سو فیصد ٹھیک ہے۔ زین کو سمجھ آ گئی تھی۔



اگلے تین دن میں زارا کا پاسپورٹ بن گیا۔ ناہید آنٹی کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔ انہوں نے انٹرویو کے لیے آنے جانے کا بندوبست کیا۔ زارا کشور چچی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی' اس لیے پہلے وہ اکیلی امید کی ڈور تھامے مکہ اور مدینہ جا رہی تھی شاید وہیں کوئی دعا قبول ہو جائے! انسان کتنا بے یقین ہے' صبر ہی نہیں کرتا اسے پتا ہی نہیں ہوتا کہ کس کس دعا پہ رب تعالیٰ کن کن کہہ چکا ہے! دو دکانیں شبیر انکل کو بیچ دیں اور گھر کو تالا لگا دیا۔ کشور چچی نے اس کے پیچھے اس گھر میں نہیں رہنا تھا بلکہ لاہور ناہید آنٹی کے ہاں ٹھہرنا تھا۔ زارا روکنا چاہتی تھی۔ اگر کالی چوڑیوں والا یہاں آیا تو تالا دیکھ کر خفا ہو جائے گا۔ وہ چاہتی تھی تالے پہ کوئی نشانی چھوڑ دے۔ اتنا آسان کہاں ہے نشانیاں چھوڑنا!

زارا ڈر رہی تھی' میرے پاس اس کی تلاش میں بھٹکنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور اب وہ اگر میری تلاش میں نکلا تو کہاں جائے گا؟ سالم چوڑیاں اور ٹوٹی ہوئی ہمت لیے وہ جہاز میں بیٹھ گئی۔

وہ باب الفہد سے حرم شریف میں داخل ہوئی۔ ٹھنڈا ٹھنڈا فرش ارم لگ رہا تھا۔ اس نے نظر نہیں اٹھائی۔ اس نے سنا تھا کہ پہلی نظر میں جب کعبہ شریف کو دیکھو تو جو دعا مانگو قبول ہوتی ہے۔ اس نے

سوچا کہ وہ اس کے ملنے کی دعا مانگے گی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اللہ کے گھر کے پاس جاتی گئی اور پھر نظر اٹھائی۔

بس ایک نظر کی بات تھی۔ اس نے ایک نظر اٹھائی اور وہ سب کچھ بھول گئی۔ وہ کیا مانگنے آئی تھی۔ وہ خود کون تھی۔ عہد الست اس کے اندر چیخ چیخ کر اللہ کو پکارنے لگا۔ اسے لگا کہ وہ تو صدیوں سے یہیں پہ بس رہی ہے۔ اسے خود پہ افسوس ہوا۔ وہ ہر چیز ہر انسان بھول گئی۔ یاد رہی تو بس اپنی نافرمانیاں۔۔۔ اپنی خواہش اس وقت عذاب بن گئی۔

"اللہ میں کتنی بری ہوں ناں؟ میں اس شخص کی خواہش پلو میں باندھ کر آئی ہوں۔۔۔ میں تجھ سے قیامت کے دن تیرا اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار بھی مانگ سکتی تھی۔ میں تجھ سے مغفرت بھی مانگ سکتی تھی۔ بخشش بھی مانگ سکتی تھی۔ جس ماں نے جنم دیا اس کے درجات کی بلندی بھی مانگ سکتی تھی لیکن میں نے کیا مانگا۔ اللہ میں کتنی حقیر ہوں۔ میری خواہش کتنی حقیر ہے۔ میں کیوں بھول جاتی ہوں کہ اگر تو نہیں چاہے گا تو میں خواہش بھی نہیں کر سکوں گی!"

اس کے آنسوؤں نے چہرہ بھگو دیا تھا۔ اسے سب قصے ساری کہانیاں بھول گئیں۔ نظر نے چاہا وہ کسی کی تلاش میں اٹھے۔ سچ کی موجودگی کا احساس ہوا کا جھونکا خوشبو کی صورت لایا تھا۔ لیکن شرمندہ دل اجازت نہ دے سکا۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔ روتی رہی۔ وہ مسلسل روتی رہی۔ اس نے ایک لفظ کی دعا نہیں مانگی۔ بس آنچل میں شرمندگی سمیٹتی رہی۔ اللہ سے راز و نیاز کرتی رہی۔ اس سے بخشش مانگتی رہی۔ رحمت مانگتی رہی۔

اس نے بے جان گھر سے جانا کہ وہ ذات کیا ہے۔۔۔ اس گھر کا جلال ایسا ہے اس کا اپنا جلال کیا ہو گا۔ اس جگہ پر نظر نہیں رک رہی تو اس کے سامنے پیش کیسے ہوا جائے گا۔ اس کا دل کسی ادھ ٹوٹے پتے کی طرح مسلسل لرزتا رہا۔ وہ اب ٹوٹی کے تب ٹوٹی کی عملی تفسیر بنی رہی۔ بہت دیر بعد اس نے نظریں اٹھائی تو بس لی خوشبو ہوا لائی تھی۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ وہ مزید شرمندہ ہو گئی۔

وہ وہیں تھا۔ اس کے پاس سے گزرا تھا۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ لیکن جب ہوا نے اس کی خوشبو کا پیرہن اوڑھ آئی ہے۔ اس نے بہت مشکل سے اس کا خیال جھٹکا۔

اللہ کے گھر کے سامنے کھڑا وہ اپنی ماں کی سلامتی کی دعائیں مانگتا رہا۔ زارا سے ملنے کی دعائیں مانگتا رہا۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی پھر سکندر نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دونوں حرم شریف سے باہر نکل گئے۔ اس نے آج پاکستان جانا تھا۔

وہ آج مکہ شریف آئی تھی اور وہ آج جا رہا تھا۔

وہ پاکستان واپس امید اور اندیشے لے کر آیا۔ اس کے امید بھی جیت گئی اور اس کے اندیشے بھی سچ ثابت ہوئے۔ اس کی ماں منتظر تھی۔ زندہ سلامت تھی۔ دیکھا تو گلے سے لگایا اور تب تک نہ چھوڑا جب تک ہچکی نہ بندھ گئی۔ وہ روتی جاتی اور اس کی بلائیں لیتی جاتی۔ زندگی کی دھوپ نے جہاں ماں کو کملایا۔ وہیں بڑھی ہوئی داڑھی نے اسے عمر سے بڑا بھی کر دیا۔ سلطانہ کے لیے یہ بیٹا نہیں چھاؤں تھا۔ وہ یکایک ٹھنڈک محسوس کرنے لگی۔

زین کی آنکھیں منتظر تھیں' اس کی سماعت منتظر تھی کہ کوئی تذکرہ تو دشمن جان کا بھی ہو۔ سلطانہ تو بس ایک ہی دفعہ گئی تھی۔ اس لڑکی کے پاس نہ کوئی تسلی دلاسا نہ تھا۔ ماں بھی اگر بار بار جاتی تو کہیں مورد الزام نہ ٹھہرا دیتی۔ منحوس کا لقب نہ دے دیتی۔ ماں اب بیٹے سے جھجک رہی تھی۔ زین کا انتظار سوال بن کر لبوں پہ اتر آیا۔ جب زارا کے متعلق پوچھا تو ماں کے پاس دینے کو صرف خاموشی تھی۔ زین زیادہ سوال نہیں کر سکا۔ فرمانبردار اولاد ایسی ہی ہوتی ہے!

ماں کی جدائی نے اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے وہ صحیح معنوں میں فرمانبردار بن گیا تھا۔

وہ اگلا اور زارا کے گھر گیا۔ بڑا سا تالا منہ چڑا رہا تھا۔ رہی نشانی نہیں تھی۔ نہ ہی سالم اور نہ ہی کوئی ٹوٹی

ہوئی چوڑی تھی۔ اس نے بشیر انکل سے جاکر پوچھا۔ انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ماں کو زارا کے آس پڑوس میں بھی بھیج کر دیکھا۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ روز جاتا اور تالا دیکھ کر واپس آجاتا۔

ہفتے بعد اس نے واپس سعودی عرب جانا تھا۔ سکندر سے وعدہ کرکے آیا تھا۔ ماں کا پاسپورٹ بنوا چکا تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں اس کی گلی میں رل رہا تھا۔ اسے یہ کہنے والا کہ تم مجھے ڈھونڈتی پھرو گی۔ اسے ڈھونڈ رہا تھا اور وہ تھی کہ مل ہی نہیں رہی تھی۔

اس کی آواز کا پیاسا رانجھا بن بیٹھا تھا.... رات کے اندھیرے جونہی سیاہی پکڑتی وہ اس کی دہلیز پہ جاکر بیٹھ جاتا! یہیں کھڑی ہوتی تھی وہ یہیں سے گزرتی تھی وہ ....وہ دہلیز کو ہاتھ سے چھو چھو کر مٹی پہ رشک کرتا....

کیا پتا وہ اچانک سے آجائے.... ہوا اس کی خوشبو ہی چرالائے.... اس کی کوئی تصویر ہی ہوا کے ساتھ اڑتی باہر آئے۔ ان پیاسی آنکھوں کو دید کی کوئی سبیل تو ملے ....! وہ صحرا میں رینگ کر اتنا نہیں تھکا تھا جتنا اس دہلیز پہ بیٹھ کر ٹوٹا تھا۔

جونہی سورج کی روشنی اندھیروں سے اپنے مقام کا شکوہ کرنا شروع کرتی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوتا۔

بدنامی اسے آج بھی مقصود نہیں تھی۔

زین کو صرف زارا چاہیے تھی!

وہ کیسے ملتی؟ وہ یہاں تھی ہی نہیں!

☆ ☆ ☆

وہ آج سعودیہ سے واپس آئی تھی۔ انٹرویو اچھا ہو گیا اور فلائٹ لاہور کی تھی۔ ناہید آنٹی کے گھر سے کشور چچی کو لیا اور اپنے گھر راولپنڈی آئی۔ کہیں گھر پہ لگا تالا اس کی خوشیوں کو مقفل نہ کردے۔ بند گھر کھولا تو جالے لٹکے نظر آئے۔ موٹر تو کام کرنے سے ہی انکاری ہو گئی۔

"اتنے دنوں سے بند پڑی پڑی خراب ہو گئی ہے۔ گھر بیچنے سے پہلے اسے ٹھیک تو کروانا ہی ہو گا۔ میں فضل کو بلا کر لاتی ہوں تم تب تک صحن میں جھاڑو دے دو۔" کشور چچی تیزی سے بولتی زارا کو ہدایات دیتی باہر چلی گئی۔

وطن واپسی کا مقصد بوریا بستر سمیٹنا تھا۔ شاید خوشیاں واقعی مقفل ہونے والی تھیں۔

زارا کسلمندی سے اٹھی۔ اب اس کا شہر تو کیا یہ ملک بھی چھوٹنے والا تھا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

کس کے سہارے یہاں رہنے پہ زور دیتی۔ وہ درخت کی اوٹ سے پرانی جھاڑو اٹھانے کو جھکی۔

اسی لمحے روز تالے کی شکل دیکھنے والا اندر آیا۔ کھلے دروازے نے اس کے تنفس کو تیز کر دیا۔

اس کے حواس بے قابو ہونے لگے۔ خوشی کے مارے وہ چیخنے کی خواہش کرنے لگا۔

اس نے زارا کو بازو سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ وہ گنگ تھی.... معجزہ ہوا تھا! جس کی آمد تک دم توڑ چکی تھی وہ سامنے کھڑا سانس لے رہا تھا۔

جس کی خوشبو دھوکا دیتی رہی تھی وہ سامنے جدائی جھیلنے کے بعد کمزور ہوئی کھڑی تھی۔

صاف لگ رہا تھا محبت نے مات دی ہے۔ اس سادگی میں بھی اس کی کالی آنکھیں حسین قہر ڈھانے لگیں۔ اتنے مہینوں کا انتظار اس کے آنسوؤں میں جگہ بنانے لگا۔ اس کی اپنی حالت کہاں ٹھیک تھی۔ کچھ پھولا ہوا جسم اس کی جوانی کا باقاعدہ اعلان کر رہا تھا۔ بڑھی ہوئی داڑھی اور آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے ہجر کی داستان سنانے کو بے قرار نظر آئے۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

"اب کیوں رو رہی ہو۔ اب تو آگیا ہوں میں۔" وہ شوخ ہوا!

"اسی لیے رو رہی ہوں۔" اس نے ناک پر مکھی کہاں بیٹھنے دینی تھی۔

"بہت انتظار کیا میرا؟" وہ سوال پوچھ رہا تھا۔

"تم اتنے خوش فہم کیوں ہو؟" اس نے بھی جواباً سوال ہی پوچھا۔

"تو تم نے انتظار نہیں کیا؟" وہ مسلسل سوال پر اٹکا رہا۔

"تم نے دیکھا مجھے گلیوں میں؟ میں تمہارے انتظار میں بالکل نہیں بھٹکی!" لہجے میں انتظار کی مسافتیں بلبلا اٹھی۔
"پھر یہ چوڑیاں کیوں نہیں اتاریں؟" زین نے زارا کی کلائی پکڑ کے زارا کے سامنے رکھی۔
"چھوٹی ہو گئی تھیں ورنہ اتار دیتی!" وہ نظریں چرا کر ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کرنے لگی۔
"اسٹیل کی تو تھیں نہیں۔ کانچ کی تھیں۔ توڑ دیتیں یا میرے کہے پہ اندھا یقین تھا؟" وہ اس کے چہرے کی قوس و قزح کا لطف لینے لگا۔ کلائی ابھی بھی تھامی ہوئی تھی۔
"میرا سر مت کھاؤ!" اسے پتا نہیں کیوں غصہ آنے لگا۔
"لفظ تو ٹھیک بولا کرو۔ اچھا تمہیں پتا ہے میں نے کعبہ شریف کے سامنے تمہیں مانگا!" وہ بہت کچھ بتانا چاہتا تھا۔
"کیا مطلب؟ تم بھی وہاں تھے؟" زارا کی آنکھیں کھل گئی۔
"تم بھی سے کیا مراد ہے تمہاری؟ کیا تم بھی وہاں گئی تھیں؟" وہ بھی حیران ہوا۔
اس نے خود کو دل ہی دل میں کوسا۔ گویا دل کو یونہی سکون نہیں آیا تھا حرم شریف میں۔۔۔ میں بھی کتنا خبیث ہوں۔ اس ایک لڑکی کو سوچ کر باقی ساری باتیں بھول جاتا ہوں۔ اللہ نے میرے دل میں اتنی محبت ڈال ہی کیوں دی۔
"ہاں لیکن اچھا ہوا۔ تم مجھے وہاں نہیں ملے ورنہ میں تمہارا چہرہ تک نہ دیکھتی!" زارا کو سابقہ شرمندگی پھر یاد آئی اور کچھ ماندہ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔
"اگر اللہ چاہتا تو مجھے وہاں بھی تمہارے سامنے لاتا۔ تم وہاں بھی میرا چہرہ دیکھتیں۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں۔ دیکھنا نہ دیکھنا تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ ملنا نہ ملنا بھی ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ تو اللہ ہے جو ملواتا ہے۔ معجزے دکھاتا ہے۔" زین اسے سمجھا رہا تھا اور وہ اس کی کلائی چھوڑ چکا تھا۔

"کیا چاہتے ہو؟" زارا کچھ سننا چاہتی تھی۔
"تمہیں چاہتا ہوں۔ شادی کرو گی؟" زارا کو زین کے دھیمے لہجے میں کیے گئے سوال سے خوشی ملی۔
"کہاں لے کر جاؤ گے؟" زارا سوال کے بدلے سوال لیے کھڑی ملی۔ زین کو حیرت ہوئی' اسے جواب نہیں ملا تھا۔
"سعودیہ۔۔۔ اماں کا ویزا آگیا ہے۔ تم بھی چلو ساتھ!" زین اپنے سوال سے آگے کی بات کہہ بیٹھا۔
"کشور چچی کو بھی لے جاؤ گے؟" زارا نے پوچھا۔
"بشیر چچا کو بھی لے جاؤں گا!" وہ ہنس کر بولا۔
"تم میری بات پر ہنسو گے اب؟" وہ پھر سوال کر رہی تھی۔
"ہاں جب تک تم مجھے جواب نہیں دو گی!" وہ اس ایک جواب کے لیے ترسا ہوا تھا۔
"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے!" اس نے منہ موڑا۔
"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا۔ میرا انتظار نہیں کیا تھا؟ اس لیے کیا تھا کہ مجھ سے منہ موڑ کر کھڑی ہو؟ میرے سوال کا جواب نہ دو؟ مجھے ٹال دو۔" وہ پریشان ہو گیا۔
"میں تمہیں نہیں ٹھکرا رہی۔ سمجھو میں خود کو ٹھکرا رہی ہوں!" زارا نے سامنا نہ کیا۔ کوئی سودا سر میں سمایا۔
"تم میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ مان کیوں نہیں لیتیں۔ ہاں کر دو۔ مزید مت تڑپاؤ۔ خود کو بھی اور مجھے بھی۔ تم واقعی نہیں رہ سکتیں۔" وہ فریاد پہ آگیا زارا نے اپنی کلائی زور سے درخت پہ ماری چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں۔
"میں رہ سکتی ہوں۔" زارا نے اسے حیران کیا۔
"کیسے مانو گی؟" زین اپنے گھٹنوں پہ بیٹھ گیا۔
"ایک کام کرو میرا!" زارا نے فرمائش کی۔ زین نے سر جھکا کر بات سنی۔
"یہ لڑکا پھر آگیا! پیچھے سے آنے والی کشور چچی تھیں۔ زین ان کے سامنے اپنا ہاتھ ماتھے تک لے کر

گیا۔ ہلکا سا مسکرایا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ گھٹنے جھاڑے ' ہاتھوں پہ لگی گرد کو زارا کے سامنے پھونکا اور باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ اس کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ وہ آنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کس منہ سے سامنا کرے گی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اس کا استقبال کیسا ہو گا۔ ہزاروں وسوسے لیے اس گھر کی دہلیز پہ قدم رکھے ' اس کا لٹا پٹا سا حلیہ حال سنا رہا تھا۔

کشور چچی آگے بڑھی اور اس چہرے کو ہاتھوں میں تھام کر چومنے لگی۔ وہ چہرہ جس کے بارے میں وہ بات بھی کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے اس کی غیر موجودگی میں ایک دفعہ بھی اس کا نام نہیں لیا تھا اور اس چہرے والی کو بھی سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا منہ لے کر گھر جائے۔ آج بھی اس گھر میں اس کا چہرہ چوما جا رہا تھا۔ نشا اور کشور چچی کا ملنا... زارا کی آنکھیں بھگو رہا تھا۔

"تو نے کیا حال بنا لیا ہے اپنا؟ کوئی تکلیف تھی تو واپس کیوں نہیں لوٹ آئی!" کشور چچی نے خود سے الگ کر کے پوچھا۔

"سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ واپس کیسے آؤں؟" نشا نے جھکی نگاہوں سے جواب دیا۔

"جانے والے کو روکنے کا طریقہ نہیں ہوتا لیکن آنے والے کے لیے اگلے پچھلے سب دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ بے شک منہ اندھیرے آتی بے شک صبح سویرے آتی۔ یہ دروازہ تجھ پہ بند نہیں ہو سکتا تھا۔ تیرے باپ نے اپنی آخری سانسوں میں تیرے لیے معافی ہی مانگی تھی۔" ماں بول رہی تھی۔

اولاد کتنی ظالم شے ہے۔ صحیح ہی تو کہا ہے اولاد فتنہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں ہوتا۔ سو برائیاں بھی کر کے واپس آئے تو ماں باپ گلے سے لگا لیتے ہیں۔ غلطیاں بھول جاتے ہیں۔ اولاد کی خراشیں یاد رہتی ہیں اپنے زخم یاد نہیں آتے۔

زین پاس کھڑا دیکھتا رہا۔ کشور چچی نے زین کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیا۔ اس سے زیادہ اچھا شکریہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ زارا نے نظر اٹھا کر زین کو دیکھا۔ آنکھیں شکریہ کہہ رہی تھیں وہ زارا کا کام کر چکا تھا۔

زین نے سکندر سے فون پر بات کی اور پھر بشیر انکل کو چھوڑ کر باقی سب کو حق سے لے کر واپس ریاض آ گیا۔

☆ ☆ ☆

سب سے زیادہ خوشی زارا کو تھی وہ زین کی منکوحہ کی حیثیت سے ریاض آئی تھی۔ کشور چچی نے اپنے اور نشا کے ساتھ جانے کی مخالفت کی لیکن زارا جیسی بیٹی کی ضد کے آگے وہ بھی نہ ٹھہر سکیں۔ ساتھ چلی آئیں۔ نکاح کے ساتھ ہی رخصتی کے حق میں زین نہیں تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ اس کا محسن ولیمے میں شرکت کرے۔ کشور چچی نے بھی سوچا زارا کی رخصتی کے بعد واپس لوٹ آئیں گی۔

ریاض میں آئے دوسرا روز تھا۔ زین نے سب سے نظر بچا کر زارا کو اکیلے میں جا لیا۔ اس من موہنی سے لڑکی کے نمکین نقوش اور تیکھے پن پہ اب اس کا حق تھا۔ وہ بہت خاموشی سے دیکھتا رہا کہ اس کے ہاتھ تھام لینے پہ زارا کا تیکھا پن تابعداری میں بدلا ہے۔ وہ اس میں اتنی سی تبدیلی بھی برداشت نہیں کر سکا۔ اس کے کالے بالوں کی ایک لٹ کو کان کے پیچھے سے نکالا اور لبوں پہ اٹکھیلیاں کرنے کو آزاد چھوڑ دیا۔ بال اس کے سائے میں رنگ منعکس کرنے لگے۔ وہ محظوظ ہوا۔ تھوڑا قریب آ کر مکمل شوخی سے اس کی ناک دبا کر گویا ہوا۔

"مجھ سے پوچھو گی نہیں کہ کیسے ڈھونڈا تمہیں؟"

"میں کیوں پوچھوں؟ تمہیں خود شوق ہے تو بتا دو۔" زین کی شرارتوں نے اس کی تیکھے پن میں رنگ ڈالے۔ زین نے جواباً اپنی آنکھوں سے محبت نثار کر کے اس کی بلائیں لینے کی کوشش کی۔ زارا نے بوکھلا کر اسے پرے دھکیلا اور پوچھا۔

"تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا۔" زین ہاتھ سینے پہ لپیٹے

یقین تک کا سفر سناتا رہا۔
"اللہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔" زین کی اس بات کو زارا نے پورے دل سے تسلیم کیا۔ واقعی اللہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے تب ہی اللہ نے زارا کو زین سے نوازا۔



سکندر نے نشا کو دیکھا تو اسے اس بات پہ یقین آگیا کہ دو ادھورے لوگ ایک دوسرے کو مکمل کر سکتے ہیں۔ نشا کا سوگوار سا حسن اپنے اردگرد پھیلی مادی اشیاء کو قابل داد گردانتا نظر نہ آیا۔ پہلے اسے کاشف کا ساتھ درکار تھا۔ اس ایک ساتھ کے لیے وہ چار دیوار چھوڑ کر نکلی تھی۔ اب کاشف کے بعد اسے دنیا اپنی طرف کھینچنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی۔ نشاء کی آنکھوں میں سہمی ہوئی ہرن چھپتی پھرتی۔ سکندر نے اس ہرن کو نقصان پہنچائے بغیر کستوری حاصل کرنے کا خواب دیکھا۔ اس خواب سے وہ گڑبڑا کر اٹھا۔ اسے آج تک لوگوں سے شکایت رہی تھی کہ وہ اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے پاس آتے ہیں۔ اس نے اپنے ضمیر کو ٹٹولا۔ کیا وہ بھی کسی کو اپنے فائدے کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ضمیر اس فیصلے پہ مطمئن نکلا۔
مکمل اطمینان کرنے کے بعد اس نے سوچا اس خواب کا بوجھ کسی اور کے کندھے پہ ڈالا جائے۔ نکاح کی خواہش کا اظہار کیا۔ زارا نے سنا تو بہت خوش ہوئی۔ سلطانہ آنٹی سے یہ خبر لے کر وہ سیدھا زین کے کمرے کی طرف بڑھی۔ سکندر نے زین پہ سلطانہ آنٹی کو ترجیح دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی خواہش کو احسان سمجھا جائے یا احسان کا بدلہ گردانا جائے۔
زارا زین کے کمرے میں اس کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ رخصتی سے پہلے یہ اس کی انجانے میں کی جانے والی جسارت تھی۔ دروازہ کھول کر جیسے ہی داخل ہوئی۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتی۔ زین کا دھیان اس کی خالی کلائی پہ گیا۔ اسے کا پارہ اچانک چڑھا۔ وہ تھوڑا غصے سے بولا۔
"تم نے چوڑیاں کیوں توڑیں؟"
"کیوں کہ وہ کالے رنگ کی تھیں۔" زارا نے جواب دیا اور اس ایک جواب میں سارے جواب پنہاں تھے۔ زین نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پشت سے دروازہ دھکیلا وہ بند ہو گیا۔ سوال باقی نہیں رہا تھا لیکن تنگ کرنے کا حق زین کو بھی تھا۔
"کالی تھیں تو کیا ہوا... دی تو میں نے تھیں نا؟"
"اب یوں کرو گے؟ اور چوڑیاں لے کر دیتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے؟" وہ ایسے بے تکلف ہوئی جیسے سدا ساتھ رہی ہو۔
"کہو تو چوڑیوں کی دکان کھول کر بیٹھ جاؤں؟" اس نے چڑایا۔
"چوڑیوں کی دکان سے کمائی اچھی نہیں ہوتی!" اس نے بھی چڑایا اور زین کو ہنسی آگئی۔
"زین۔" زین کو لگا اس نے پہلی دفعہ اپنا نام سنا ہے۔ کوئی مدھر سا نغمہ دھڑکنوں نے چھیڑا۔
"جی زین کی جان!" وہ چڑا نہیں رہا تھا۔ ستا بھی نہیں رہا تھا محبت کر رہا تھا اور اسے یوں ہی محبت کرنا آتی تھی۔
"میں نے یقین تو کیا نہیں پھر معجزہ کیسے ہوا؟" وہ یوں سوال کر رہی تھی جیسے ہر سیڑھی پر ساتھ رہا ہو۔ وہ زارا کے لیے ہم جان تھا۔
"تم نے محبت تو کی تھی نا۔ محبت خود یقین ہے۔ وہ خود معجزے کے سامنے کھڑی ملتی ہے!" زین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا یا جذب کر رہا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔
"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو محبت معجزے کے ساتھ کھڑی ملتی ہے۔ موسیٰ کو اللہ کی چاہ تھی تو انہیں معجزہ ملا۔ یہ معجزہ ہی تو تھا کہ موسیٰ نے عصا ڈالا۔ وہ فرعون کے دربار والوں کو اژدھا نظر آیا اور جادوگروں کے سارے سانپ نگل گیا۔ یہ معجزہ ہی تو تھا کہ ایک رات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے ملاقات کی۔ وہ والی براق جس کی رفتار بہت تیز تھی۔ لفظ برق بھی تو

بجلی کے معنوں میں آتا ہے یعنی بجلی کی سی تیزی سے۔ دیکھو آج اس بات کو سائنس بھی ثابت کرتی ہے۔ یعنی معجزہ وہ ہے جس کو عقل بھی تسلیم کرے جیسے تمہارا ملنا بھی معجزہ ہے۔ محبت خود معجزہ ہے۔" وہ کسی اثر میں آئی ہوئی لگی سوبنا ٹھہرے کہتی رہی۔

"میں تمہاری آدھی بات سے متفق نہیں ہوں۔ زارا معجزہ کوئی کہانی کوئی قصہ کوئی حکایت کوئی داستان نہیں ہے۔ معجزہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ معجزہ حقیقت سے ماورا ہے۔ حضرت موسیٰ کا عصا ڈالنا معجزہ ہے۔ لیکن ان کے لیے عقلی توجیہہ پیش کرنا غلط ہے۔ میرا دل نہیں مانتا۔ میں ان خاص باتوں کو عام باتوں کے معیار پر لا ہی نہیں سکتا۔ تمہارا اور میرا ملنا تمہارے اور میرے لیے خاص ہے ورنہ عمومی طور پر دیکھا جائے تو یہ بہت عام بات ہے زرا۔ اس کی عقلی توجیہہ پیش کرنا ٹھیک ہے۔ یہ ہم نکموں کے لیے معجزہ ہے۔ چھوٹا سا معجزہ جو حرف کن کا محتاج ہے لیکن حضرت موسیٰ کا عصا کیسے اژدھے میں بدلا' براق کیسے اتنی رفتار سے چلا۔ اس بارے میں بات کرنا ہمارا کام نہیں۔

ہمارا کام اللہ اور اس کے احکامات اور اس کی کتاب پہ آنکھیں بند کر کے یقین کرنا ہے ہم کیوں دلائل ڈھونڈنے لگ جاتے ہیں؟ یہ تو اللہ کا احسان ہے۔ ہم پیدائشی مسلمان ہیں۔ ہمیں بلائنڈلی ٹرسٹ کرنا چاہیے۔" وہ رسان سے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی شرارت نہیں تھی۔ وہ صاف سیدھے لفظوں میں بات کر رہا تھا۔ یہ اس کا بھروسا تھا جو اسے بیرک سے پھر صحرا سے زندہ نکال لایا۔ وہ اس بارے میں مذاق یا شرارت کر ہی نہیں سکتا تھا۔

"لیکن زین ہمیں دلائل تو ڈھونڈنے چاہیے۔ غیر مسلموں کو مطمئن کرنے کے لیے ہمیں تعلیمات کو پرکھنا چاہیے۔ پھیلانا چاہیے۔ ایک دوسرے کو بتانا چاہیے" زارا اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

"اسلام قبول کرنے کے لیے کوئی دلائل کوئی توجیہہ نہیں چاہیے ہوتی۔ اس کے لیے ایک لمحہ چاہیے۔ وہ لمحہ جسے اللہ قبول کر لے۔ جو لوگ "اف" اور "بٹ" میں پڑتے ہیں' وہ بھروسا کر لیتے ہیں یقین نہیں کر سکتے۔ یقین جانو۔۔۔ یقین بھروسے سے کہیں آگے کی چیز ہے!" وہ اسے اپنی سوچ سے ملوا رہا تھا۔ وہ سوچ جو اس کی شکل و صورت سے بھی کہیں زیادہ پیاری تھی۔

"یقین بھروسے سے کہیں آگے کی چیز ہے اور تم چاہتے ہو میں تمہارا یقین کر لوں۔" زارا نے اسے واپس اپنی طرف متوجہ کیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی اگلی سیڑھی سامنے نہ آئے اور ساتھ کوئی آزمائش نہ لائے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے زین کی سوچ سمجھ آجائے اور وہ اس سے مزید محبت کرے۔ وہ اس سے زیادہ محبت نہیں کر سکتی تھی۔

"ہاں یقین ہی تو مانگا ہے تمہارا۔ یقین کرو گی مجھ پر؟" زین اس کے قریب آیا۔

"ہاں تاکہ تم مجھے پھر چھوڑ کر چلے جاؤ!" زارا نے جواباً "روٹھے لہجے میں کہا۔ زین کا قہقہہ ابل پڑا۔

"اب گیا تو جان سے مار دینا۔ اب جہاں جاؤں گا تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا!" زین اس کے عین سامنے کھڑا ہوا۔

"حق مہر میں کیا دو گے؟" زارا نے عجیب سوال پوچھا۔

"میں حق مہر ادا کر چکا ہوں۔ اماں نے دیا نہیں تمہیں؟" زین حقیقتاً "پریشان ہوا۔

"وہ حق مہر تو کاغذ کے صفحوں پر لکھا تھا۔ اب یقین کے پروں پہ بھی کچھ لکھ دو!" زارا نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور اس کی پریشانی سے فائدہ اٹھاتی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ زین دروازے کے پیچھے لپکا تو اس کی مدھر سی ہنسی سنائی دی۔ وہ وہیں دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

معجزہ واقعی بڑا تھا۔۔۔ اسے احساس ہوا!
اب زارا نے پھر کچھ مانگا تھا۔



آج سکندر اور نشا کا ولیمہ اور زارا کی رخصتی بھی تھی۔ ولیمے کے بعد سب نے زین اور زارا کو اللہ حافظ کہا۔

آج واقعی اس کا حق مہر ادا ہونے ہی والا تھا۔ وہی جو اس نے یقین کے پروں پہ لکھنے کو کہا تھا۔ وہی جو اس کے رشتے کو اور بھی مضبوط کر دیتا۔ ایک ساتھ کیا جانے والا حج.....!

وہ کعبہ شریف کے قریب تھے۔ دعائیں مانگ رہے تھے۔ ایک سوڈانی جوڑا زارا کے قریب سے گزرا۔ ساتھ ہی کچھ تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ زارا کا بریسلٹ اس لڑکی کے ریشمی گاؤن کی ایک تار سے الجھا۔ زارا نے بازو چھڑوانی چاہی۔ زین کو ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا۔ زین نے آنکھ کے اشارے سے کہا' جانے دو یہاں بچھڑنے والے کھو جاتے ہیں۔ زارا کی آنکھوں میں تذبذب لپکا۔ وہ اس بریسلٹ کو کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ یہ زین نے اسے تحفہ میں دیا تھا۔ اس پر نگوں سے "zain's zara" لکھا ہوا تھا' زین نے اس کا ہاتھ تھاما۔ زارا نے زین کے ہاتھ کو سختی سے دبایا۔ محسوسات سے تسلی کی لہریں بھیجیں اور ہاتھ چھڑوالیا۔ وہ بریسلٹ لینے جا رہی تھی۔ زین اسے روکنا چاہ رہا تھا' لیکن روک نہیں سکا۔ صرف چند ساعتوں کی بات تھی وہ جو جان جہاں تھی۔ جان بن گئی تھی۔ دھڑکنوں کے قریب تھی۔ نظروں سے ذرا سی اوجھل ہوئی اور ساتھ ہی کرین گر گئی۔ ایک لمحے میں منظر بدلا تھا۔ خوشیاں رینگنے لگی تھیں اور آزمائش منہ کھولے ہنس رہی تھی۔



زین کا فون اس کے پاس نہیں رہا تھا۔ بھگدڑ میں وہ زخمی ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال میں موجود تھا۔ پہلا لفظ اب جو اس نے بولا زارا بولا۔ اس نے زارا کے بارے میں پوچھا' لیکن کسی کو اس کی زارا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اسے نیند کا انجکشن دے کر پھر سلا دیا گیا۔ وہ نیند میں بھی بے چین تھا۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ اس کا ہاتھ اس سے زیادہ مضبوطی سے تھام لیتا تو کیا وہ چھڑا پاتی' لیکن نہیں اس میں ہاتھ تھامنے کا ہنر ہی نہیں تھا۔ وہ ناکام ہوا تھا۔ بہت بری طرح ناکام ہوا تھا۔ وارڈ چھان ڈالے۔ وہ کہیں نہیں تھی' پھر اسے پتا چلا کہ یہ واحد اسپتال نہیں ہے۔ جہاں زخمیوں کو لایا گیا ہے۔ پھر اس نے ہر اسپتال میں دیکھا زارا سے کہیں نہیں ملی۔

کسی نے اسے کہا کہ مردہ خانے جا کر دیکھو۔ وہ اسپتال میں یوں داخل ہوا جیسے خود کوئی اور زندوں میں زندگی ڈھونڈنے آیا ہو۔ ہر لاش کو دیکھتے اس کے چہرے پر ایسی تکلیف آجاتی کہ اس کے پاس کھڑے لوگوں کو لگتا کہ اس کی تلاش کو منطقی انجام مل گیا ہے' لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھی۔

اس نے وہیں وہ لاش دیکھی جس نے ریشمی تاروں سے سجا گاؤن پہنا ہوا تھا۔ اس کی بازو کے ساتھ بریسلٹ اٹکا ہوا تھا۔ زارا بریسلٹ نہیں چھڑا سکی اور زین زارا کو نہیں بچا سکا۔ اس نے خاموشی سے بریسلٹ اٹھایا اور مٹھی میں دبا کر زور سے چلانے لگا۔ اسے خود سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اسے خود بھی سنائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ چلاتے ہوئے کیا کہہ رہا ہے۔ اسپتال والوں نے اسے زبردستی باہر نکالا۔

وہیں سڑک پر پڑے پڑے زین کو خیال آیا۔ کہیں دوسرے اسپتال میں کوئی وارڈ رہ گیا ہو۔ لمحے کا اعجاز تھا' ورنہ وہ تو اپنی طرف سے سارا اسپتال چھان آیا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ ہمیں پریشانی میں منہ کے سامنے پڑی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ کہیں میرے ساتھ بھی ایسا نہ ہوا ہو۔ وہ اٹھا اور سرپٹ دوڑا۔ اس کے ہاتھوں میں پسینہ آرہا تھا اور بریسلٹ ہاتھ سے پھسلتا جا رہا تھا' لیکن وہ دوڑتا جا رہا تھا۔ ایک گاڑی اس کے سامنے آکر رکی اور اسے زبردستی لفٹ دی۔ وہ اپنے دل کی سن رہا تھا۔ دل نے کہا سیڑھیاں چڑھ جاؤ۔ اب وہ ایسی مرد... وہ نہیں ہو گی۔ اس نے دل کی سنی۔ وہ گیا۔

اس نے حسبنا اللہ و نعم الوکیل پڑھا اور دروازے کی ناب ہلا کر اندر داخل ہو گیا۔ نچڑی ہوئی اور کمزور سی خاموشی۔۔۔ بالکل خاموش وہ وہی تھی۔ وہ زارا تھی۔ اس کے ساتھ اتنی مشینیں لگی ہوئی تھیں' جیسے اسے قید کر دیا گیا ہو۔ وہ دوڑتا ہوا اس کے پاس گیا۔ سر اس کے کینولا لگے ہاتھوں میں گرا کر بولا۔

"شکر الحمدللہ۔" وہ یہی کہہ سکتا تھا وہ شکر ہی ادا کر سکتا تھا۔ اور وہ شکر ادا کر رہا تھا۔

زین' زارا کا ہاتھ تھامے وہیں ہوش کھو بیٹھا۔ ہاتھوں' پاؤں اور آنکھوں میں مسافتوں کی تھکن تھی۔ زارا کے لمس سے آشنائی پاتے ہی سکون نیند کی چادر اوڑھ کر زین کے سینے سے لپٹ گئی۔ کمرے میں آہٹ ہوئی۔ ڈاکٹرز کا ایک وفد اندر آیا۔ زین جھینپ کر اپنا تعارف کروانے لگا۔ ڈاکٹرز نے خاطر خواہ توجہ نہ دی۔ وہ آپس میں بحث میں مصروف تھے۔ زین ان کو سن ہوتے دماغ سے سننے لگا۔

"میرے خیال میں مریضہ کو traumatic stress disorder Post ہے۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے کیسز سامنے آ چکے ہیں۔ بوڑھے ڈاکٹر نے جیب میں ہاتھ ڈالے اطمینان سے کہا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سر' لیکن اس کیس میں ایک چیز مختلف ہے۔ باقی جتنے پیشنٹس ہیں۔ وہ خاموش ہیں یا پھر کوئی رسپانس کرتے ہیں' لیکن یہ پیشنٹ جیسے ہی ہوش میں آتی ہیں۔ چیخنے چلانے لگ جاتی ہیں۔" جوان ڈاکٹر تھوڑا پریشان نظر آیا۔

"جب ایسے حادثات کو Witness کیا جاتا ہے تو دماغ کافی حد تک متاثر ہو جاتا ہے۔ انسان کا چیخنا اور چلانا نارمل ہے۔ آپ ان کو ریلیکس رکھنے کے لیے نیند کے انجکشن لگاتے رہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ خود چلا چلا کر چپ ہو جائیں گی۔ جتنا ممکن ہو سکتا ہے ان کو پر سکون رکھنے کی کوشش کریں۔" سینئر ڈاکٹر اپنا تجربہ نچوڑنے لگا۔

زین کو بے ہوش زارا پہ پیار آیا۔ وہ جتنا آزمائش سے ڈرتی تھی' اتنی ہی آزمائش کے شکنجے میں آتی تھی۔

اگلے دن سکندر کو زین کی کال آئی کہ زارا ٹھیک نہیں ہے۔ زین نے سکندر کو واپس جا کر کشور چچی اور سلطانہ آنٹی کا خیال رکھنے کو کہا۔ اس نے کہا تھا' اس زمین پر میں بہت ہوں جو اس کا خیال رکھ سکتا ہوں۔ مجھے صرف اوپر والے کی رحمت کا انتظار ہے۔ سکندر مادی وسائل کی فراہمی یقینی بنا کر واپس چلا گیا۔ زین پھر سے یقین کے پر تھامے اور معجزے کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔



اس نے کھڑکی کے پٹ وا کیے۔ سورج کی روشنی اپنی تمام تر طاقت کے ساتھ اندر داخل ہوئی جیسے وہ فاتح ہو اور کمرے کے اندر موجود نفوس مفتوح ہو۔ زین نے اس کے ہونے کو تسلیم کیا اور اپنی بازو آنکھوں پر رکھ دی' لیکن زارا کے وجود میں ذرا برابر بھی جنبش نہ ہوئی۔ وہ بستر پر لیٹی تھی اور اس کے اطراف میں ویسی ہی مشینیں تھیں جیسے اسپتال میں موجود تھیں۔ روز یونہی ہوتا رہا۔ زین پہ روشنی اثر کرتی رہی۔ زارا روشنی سے بے خبر لیٹی رہی۔ تقریباً" سال گزر چکا تھا۔ زین روز آتا۔ اس سے بہت سی باتیں کرتا۔ صفحے کالے کرتا رہتا' لیکن وہ تھی کہ خاموش بالکل خاموش رہتی۔ آنکھیں کھول کر زارا سامنے دیوار کو دیکھتی اور آنکھوں میں اتنی اجنبیت ہوتی کہ زین خوف کھانے لگتا۔

"ایسی بھی کیا ناراضی زارا۔ کچھ تو بولو؟" وہ اس کا ہاتھ تھام کر رو دیتا۔ اس کی ساری ہمت آنسوؤں کے راستے بہہ نکلتی۔ زارا کو کوئی فرق ہی نہ پڑتا۔ وہ ساکن تھی بالکل ساکن۔۔۔ اگلے دن پھر ہمت پکڑ کر کمرے میں آتا۔ زارا کو بتاتا۔ "تمہیں پتا ہے میں نے تمہارے لیے ہر رنگ کی چوڑیاں لی ہیں' سوائے کالے رنگ کے۔" وہ پھر بھی نہ بولتی۔

ڈاکٹر اس سے ناامید ہو چکے تھے۔ اس کی بیماری کی دو اقسام تھیں اور زارا disorder

delayed post traumatic کی میعاد سے بھی زیادہ عرصہ گزار چکی تھی۔ اس میں کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔ وہ ویسی ہی تھی۔ بالکل خاموش۔۔۔ اسپتال والے زارا کو رکھنے سے انکاری ہو گئے تھے۔ کیونکہ زین نے انہیں الیکٹرک شاک لگانے سے منع کر دیا تھا۔ زین اسے اپنی ذمہ داری پہ فلیٹ میں لے آیا تھا۔ وہ اس کی امید تھی۔ وہ بھلا اپنی امید سے کیسے ناامید ہوتا۔ تمام طبی سہولتیں مہیا کی۔ کشور چچی اور اماں کو آنے سے روکا۔ وہ آکر غلطی سے بھی ناامیدی کی باتیں کرتیں یا روتیں تو شاید یہ اچھا نہ ہوتا۔ زین کے خیال میں زارا کو دو چیزوں کی ضرورت تھی' اللہ کی نظر عنایت اور زین کی محبت۔ وہ اللہ سے دعائیں کرتا اور اس کی اپنی محبت تو تھی ہی زارا پہ نچھاور کرنے کے لیے۔ آج وہ امید کے ہاتھوں پہ یقین لے کر آیا تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ وہ زارا کو مزید اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"زارا مجھ سے پوچھو گی نہیں؟ میں اتنے دن تک صفحے کالے کر کے کیا کرتا رہا ہوں؟" زین نے اس سے پوچھا۔

"تمہاری داستان محبت لکھ رہا ہوں۔ تمہیں پتا ہے زارا میں نے اب اس سارے قصے کو چند لفظوں میں سمونا ہے' تاکہ اس کو کوئی پبلشر پڑھ کر چھاپ دے۔ پوری کتاب تو مجھ نکمے کی کسی نے نہیں پڑھنی۔ میں تمہیں کبھی یقین کی کہانی کہنا چاہتا ہوں۔ جانتی ہو میں نے یقین کو محسوس کیا' بالکل ویسے جیسے اس وقت تم نے میرا پیار محسوس کیا۔ بالکل ویسے جیسے تم نے تب میرا پیار محسوس کیا تھا جب میں نے بریسلٹ پہنایا تھا۔ جیسے تم نے اپنی کلائی پر مجھے محسوس کیا تھا' جب میں تمہارے گھر چوڑیاں پہنانے آیا تھا۔ میں نے بالکل اسی جذب سے یقین کو محسوس کیا اور پھر یقین میرے اندر سانس لینے لگا۔ مجھے حالات نے مارنے کی بہت کوشش کی' لیکن یہ یقین تھا جو میرے اندر سانس لیتا رہا اور میں لوٹ کر تمہارے سامنے کھڑا ہوا۔ زین اب اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ اس نے اس کی آنکھوں پہ بہت نرم بوسے دیے اور آہستگی سے گرتے ہوئے آنسوؤں کو اس کی ٹھوڑی پہ چھوڑ کر پیچھے ہوا۔ پھر یقین نے مجھے معجزہ دکھایا۔ مجھے تم مل گئیں اور یوں ملیں جیسے مرنے والے کو زندگی ملتی ہے' لیکن میں غلط تھا۔ میں کہہ رہا تھا کہ تم مجھے ملیں۔ دیکھو اگلی ساری باتیں میرے دماغ سے محو ہو گئیں۔ بالکل ایسے جیسے میں تمہارے اوپر جھکا ہوا تھا اور تمہارے سے اگلا سانس نہیں لیا جا رہا تھا۔ سچ کہہ رہا ہوں نا میں۔" زین اب ہنسا اور ہنستے ہوئے اس کے پیروں کی طرف آیا' وہ اس کے پاؤں پہ ناک رگڑ رہا تھا۔

"زارا حقیقت تو میں اور تم جانتے ہیں۔ میں کبھی تمہارے قابل تھا ہی نہیں۔ اماں نے صحیح کہا تھا۔ میں نظر بٹو ہوں۔ اس دنیا میں آیا۔ اپنے باپ کو کھا گیا۔ ماں کو رلا کر باہر گیا۔ واپس آیا۔ تمہیں لے کر یہاں آیا تو تمہیں اس حال میں پہنچا دیا۔ آج جب تک تم معاف نہیں کرو گی میں تمہارے پیروں سے اپنی ناک نہیں ہٹاؤں گا۔" وہ رو رہا تھا اور اس کے بڑے بڑے آنسو زارا کے پیر بھگو رہے تھے۔ پاؤں میں ہلکی سی جنبش ہوئی' زین نے نظر انداز کی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں رات کے چمکتے چاند پہ بدنما سیاہ داغ ہوں۔ میں ٹاٹ میں لگا پیوند ہوں۔ تم نے ہنستا' بولنا اسی لیے چھوڑا کہ میں تمہاری زندگی سے چلا جاؤں۔ تم نے مجھے ٹھکرانے کی بہت کوشش کی' لیکن میں کمبل ہوا رہا۔ اگر آج تم نے مجھے معاف نہ کیا تو اللہ کی قسم میں رو' رو کر یہیں جان دے دوں گا۔"

"زین۔۔۔" زین کے رونے میں شدت آگئی۔ اس نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نہیں تھی۔ حیرت کا سمندر تھا۔ واقعی آج اس کی سن لی جائے گی' اسے نہیں معلوم تھا۔ اس نے بمشکل اپنے اعصاب پہ قابو پایا۔ وہ آج آسانی سے پاگل ہو سکتا تھا۔ اس نے زارا کو نہیں دیکھا۔ اس کے پیر تھام کر وہیں رونے لگ گیا۔ وہ دھاڑیں مار رہا تھا' جیسی اسپتال میں ماری تھیں۔ وہ شکر ادا کر رہا تھا اور بہت ادا کر رہا تھا۔ پھر وہ اس کے پیروں سے الگ ہوا اور سجدے میں جھک گیا۔

وہ یہی کر سکتا تھا۔ اسے یہی کرنا تھا۔ اللہ اسی کو دیتا ہے جو سر جھکاتا ہے۔ وہ واپس آیا اور زارا کا ہاتھ تھاما۔ زارا کی پلکیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے لیٹی ہوئی زارا کو اپنے سینے میں سمیٹ لیا تھا۔ اب اس کا اپنے رونے سے اختیار مکمل ہٹ گیا تھا۔ وہ ہچکیاں لے رہا تھا۔ وہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ اسے ترسنے کے بعد شکر کرنے کا موقع ملا تھا۔ کتنی ہی ساعتیں وہ روتا رہا' پھر اس نے اپنے بالوں میں کمزور سی انگلیاں چلتی محسوس کیں۔ وہ پرسکون ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہوا۔

"میں بکواس کر رہا تھا۔" زین روتے ہوئے مسکراہٹ دبا کر بولا۔

"میں جانتی ہوں۔" زارا نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔" زارا نے اظہار کیا۔

"میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ یہ لفظ "محبت" میرے جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکتا۔" اس کے انداز میں بچوں کی سی ضد بولی۔

"لیکن ہم سے کوئی اور بھی تو محبت کرتا ہے۔" زارا نے اس کی تائید چاہی۔

زین نے زارا کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ وہ جو کہنے والا تھا زارا جانتی تھی اور یہ زارا کا اندازہ تھا۔ اس کے پھیکے چہرے پہ یقین کی خوب صورت لہریں ابھرنے لگیں۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں محبت کی جلترنگ نے اپنی ساری دھنیں بکھیر دیں۔ وہ موت کے برحق ہونے اور زندگی کے اللہ کی رضا میں باقی رہنے پہ اعتبار کر چکی تھی۔ اسے زندہ رہنا تھا۔ اس کے لیے جس کے دل میں اللہ نے اس کی محبت ڈالی۔ اس محبت کے لیے جو اس کے اپنے دل میں بھی زین کے لیے موجود تھی۔ چیخ کر چلا کر رو کر کسی بھی طریقے سے وہ کسی حادثے کو بھلا نہیں سکتی تھی' لیکن سبق ضرور سیکھ سکتی تھی۔ اس آنے والے کل کی تیاری بھی کر سکتی تھی جس کے برپا ہونے کو ایک حادثے میں دیکھ کر آئی تھی۔

"ہاں.... سب سے زیادہ ہم سے اللہ محبت کرتا ہے۔" زین نے کہا تو زارا نے اس کے ہاتھ کو تھام کر اپنی آنکھوں پہ رکھ لیا۔ پھر دھیرے سے بولی۔ "واقعی اللہ تعالیٰ ہم سے محبت کرتے ہیں۔"



ناولٹ

قرۃ العین سکندر

شہرِ درد میں ڈوبی تنہائی

ہانیہ خان درانی بے حد پریشانی کے عالم میں یونی ورسٹی کی ایڈمیشن فیس جمع کروانے کے لیے لمبی قطار میں لگے لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک ہجوم بیکراں کا پرغور مشاہدہ کررہی تھی۔ سوچوں میں غلطاں تھی کہ اب وہ کیونکر اپنی ایڈمیشن فیس جمع کرواپائے گی۔ اس کو ہمیشہ سے ہی ہجوم سے وحشت ہوتی تھی اور اب وہ اتنی لمبی قطار کو کیسے عبور کرپائے گی۔ فائل کو دونوں ہاتھوں کے درمیان مضبوطی سے تھامے وہ نروس سی دکھائی دے رہی تھی۔

''ایکسکیوزمی..... مے آئی ہیلپ یو۔'' (کیا میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں۔) کسی بھاری مردانہ آواز پر وہ چونک سی گئی اور خیالات کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے مڑکر آواز کے تعاقب میں دیکھا تو ایک بے حد پر وجیہہ چوڑے چکلے شانے والا دراز قد شخص اس کی جانب ہی متوجہ تھا۔ اس کی بلیک آنکھوں میں ہانیہ کے لیے اپنائیت ہی اپنائیت تھی۔ ہانیہ نے محض ایک پل میں یہ فیصلہ کرڈالا تھا کہ وہ اس مہربان اجنبی کو اپنا مدعا بیان کردے۔ تب ہی اس نے سارا معاملہ اس اجنبی کے گوش گزار کرڈالا۔

''اتنی سی بات' آپ مجھے دیں' میں جمع کروا دیتا ہوں۔ فارم دیں اور آپ اس طرف آجائیں۔'' دراز قد شخص اسے ایک جانب سنگی بینچ کی جانب لے آیا۔

''یہاں بیٹھیں اطمینان سے.....''

''یہ لیں فیس لے لیں۔'' اس نے رقم اس شخص کو تھمانا چاہی تھی۔

''بعد میں دے دیجیے گا۔'' اس کی آواز میں اتنی قطعیت تھی کہ وہ اس کو انکار نہ کرسکی اور ہانیہ کا بڑھا ہوا ہاتھ واپس پلٹ آیا تھا اور پھر وہ لمبی طمانیت بھری سانس لے کر رہ گئی۔ وہ شخص لمبے ڈگ بھرتا ہوا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

''بی جان نے نامعلوم دوائی ٹائم پر لی بھی ہوگی کہ نہیں۔'' تشویش نے دل میں جگہ بنائی۔ وہ پرفکر انداز میں بی جان کے متعلق سوچنے لگی۔ درحقیقت بی جان کے علاوہ اب اس کا کوئی تھا بھی نہیں۔ اس نے بی جان کی ممتا بھری آغوش میں آبلہ پائی کا لمبا سفر کاٹا تھا۔ اسے یاد نہ تھا کہ ممتا کیا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس نے کبھی اپنی امی کو نہیں دیکھا تھا اور یہ وہ واحد سوال تھا۔ جس کا جواب تلاشتے تلاشتے اس کا سارا وجود سنگ ریزہ ہوچکا تھا۔ مگر اسے اس سوال کی آرزو میں نہ جانے اور کتنا لمبا سفر طے کرنا تھا۔

بی جان نے اس کو درحقیقت کبھی بھی ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی' مگر ہر سال جب اسکول میں ہونے والی تقریبات میں والدین کو مدعو کیا جاتا تو ہانیہ کو ایک عجب سی خلش گھیرے رکھتی۔ بابا جانی کو تو اپنے بزنس کو بڑھانے کے علاوہ کسی شے سے کوئی رغبت نہ ہو جیسے' ان کا ٹیکسٹائل مل کا اپنا بزنس تھا اور وہ بے حد مصروف رہا کرتے تھے۔ کبھی کبھار گھر آتے بھی تو گوشہ نشینی میں ہی بسر کیا کرتے تھے۔ اسے ذہن پر زور دینے سے بھی یاد نہ آیا تھا کہ کبھی بابا جانی نے اس سے اس کی مصروفیات کا احوال دریافت کیا ہو یا علمی سرگرمیوں میں کوئی دلچسپی ظاہر کی ہو۔ ان سے اگر کبھی سرسری سی ملاقات ہو بھی جاتی تھی تو درانی صاحب کے لبوں سے فقط اتنا ہی جملہ ادا ہوا کرتا تھا۔

''اور ہانیہ کسی قسم کی رقم کی ضرورت ہو تو میرے

کیشیئر کو بتا دینا۔ جتنی رقم چاہیے ہوگی' وہ دے دے گا۔" درانی صاحب چلتے پھرتے صرف اتنا ہی کہہ کر اپنے ہر فرض سے بری الذمہ ہو جایا کرتے تھے اور وہ سوچ کر رہ جاتی تھی کہ کیا رقم کے لیے بھی اسے بابا جانی کے کیشیئر سے بات کرنا ہوگی۔

"یہ لیجیے جناب... ہو گیا آپ کا کام۔" وہ اپنی سوچوں میں اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ سامنے موجود شخص پر نگاہ ہی نہ پڑی تھی اس کی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ اپنے ماضی میں جینے والی۔ اپنے ماضی کی ہر یاد کو دل سے لگا کر رکھنے والی۔ حالانکہ اس کے ماضی میں پڑھنے جیسا

کوئی یادگار صفحہ رقم نہ تھا۔

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔" وہ بے حد ممنونیت سے بولی تھی۔

"آفتاب عالم۔" اس نے ذرا سا سر کو خم کر کے اپنا



تعارف کروایا تھا اور دل نشین انداز سے مسکرایا تھا۔

"جی میں ہانیہ خان درانی۔" اس نے جھٹ سے اپنا تعارف کروایا تو وہ بے ساختہ ہنس دیا تھا۔ "کیا ہوا' کچھ غلط کہہ دیا۔" وہ خجل سی ہوئی۔

"نہیں تو۔۔۔ مگر یہ تو میں پہلے سے جانتا ہوں۔" وہ پرشوق نگاہوں سے اس معصوم سی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے اندر اور باہر دونوں اطراف میں روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ کرنیں تھیں سچائی اور بے ریا معصومیت کی۔

"مگر میں تو آپ کو نہیں جانتی۔" وہ بے حد متعجب ہوئی۔

"آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں' سچ کہوں تو آپ کو پریشان حال دیکھا تو مجھے پہلے بھی اچھا نہیں لگا۔ دل بضد تھا کہ آپ کی پریشانی دور کی جائے اور رہی بات آپ کے نام کی تو ابھی ابھی تو آپ کی فیس جمع کروا کر آرہا ہوں۔" آفتاب عالم نے سنجیدگی سے کہا' تو وہ بے حد شرمندگی سے کھسیانی ہنسی ہنس دی۔ "اوکے' اب تو ملاقات ہوتی رہے گی۔ میں بھی اسی ڈیپارٹمنٹ میں ہوں۔ مگر سینئر کلاسز میں۔ آپ کو کسی قسم کی پریشانی ہو' کوئی ضرورت ہو تو آپ بلا جھجک مجھے کہہ سکتی ہیں۔" آفتاب عالم نے خوش دلی سے کہا اور پھر رکا نہیں' اللہ حافظ کہتا ہوا لحظہ لحظہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ مگر وہ خاصی دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی اور تب اچانک یاد آیا کہ فیس تو اس نے آفتاب عالم کو دی ہی نہیں۔ یک بارگی وہ بے حد اضطراب محسوس کرنے لگی تھی۔ اسے یوں کسی کا زیر بار ہونا پسند نہ تھا' جبکہ اس اجنبی کا یہ ہی احسان بہت تھا کہ اس نے اس کی مدد کی تھی۔



آج یونی ورسٹی میں اس کا پہلا دن تھا۔ وہ بے حد نروس تھی۔ اس کا یوں بھی گھر سے نکلنا بہت کم ہوتا تھا۔ کسی سے کوئی خاص میل ملاقات بھی نہ ہوتی تھی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے غول در غول گروہوں میں بٹے محو گفتگو ہجوم کو دیکھ کر وہ بوکھلا سی گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کسے مخاطب کرے۔ فطری اور ازلی جھجک مانع آگئی تھی۔ وہ خاموشی سے ایک جانب بیٹھ کر سب کو دیکھنے لگی۔

"السلام علیکم سسٹر۔" شولڈر اسٹیپ کٹنگ میں ایک لڑکی چیونگم چباتی ہوئی اس کے پاس بینچ پر آکر بیٹھ گئی تھی۔ چست پاجامے اور لانگ فراک میں وہ بے حد الٹرا ماڈرن دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا سراپا لڑکوں کے لیے تقویت کا باعث ہو سکتا تھا۔ مگر ہانیہ نے بے حد الجھن سے اور کوفت سے اسے سر تاپا دیکھا۔

"وعلیکم السلام۔" ہانیہ نے سپاٹ لہجے میں سلام کا جواب دیا۔

"مائی نیم از ارم۔۔۔ فرینڈز۔" ارم نے ہاتھ بڑھایا تو ایک پل کے لیے ہانیہ کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اس کی فرینڈ شپ کی اس آفر کو قبول کرلے یا پھر ریجیکٹ کروے۔

"ارے سوچ کیا رہی ہو' مجھ سے اچھی دوست تمہیں کہیں نہیں ملے گی۔" ارم نے حیرت سے پوچھا تو ہانیہ نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا دیا۔ ارم نے اس کے ہاتھ کی گرفت سے اس کی گرم جوشی کا اندازہ لگایا۔ وہ بے حد پرجوش تھی۔ اس کے لمس میں گرم جوشی تھی۔ اس احساس نے ہانیہ کو چونکا دیا تھا۔

"اتنی دیر سے تمہیں یہاں تنہا بیٹھے دیکھا' تمہارے علاوہ تو یہاں کوئی بھی تنہا نظر نہ آیا۔ کیا کسی نے فرینڈ شپ کی آفر نہیں کی تمہیں۔ شکل سے تو بالکل کشمیری لگتی ہو' بلکہ لال گلاب۔" ہانیہ کو ارم کا یوں بے لاگ بصرہ بالکل پسند نہ آیا تھا۔ "آؤ نوٹس بورڈ دیکھیں' شیڈول کا تو معلوم ہو کچھ۔" ہانیہ اس کی بات پر بیگ کندھے سے لٹکائے اس کے ساتھ چل دی۔

نوٹس بورڈ سے کلاس کی ٹائمنگ کا اندازہ ہوگیا تھا۔ وہ لوگ کلاس میں آگئے۔ میڈم کیانی سب سے متعارف ہو رہی تھیں۔ ارم اور ہانیہ نے بھی باری

باری اپنا تعارف کروایا۔ نیچر پر میڈم کیانی نے ایک مختصر سا لیکچر دیا۔

یوں یہ ارم اور ہانیہ کی پہلی ملاقات تھی اور پھر ہانیہ اگرچہ ارم سے چند باتوں میں شدید اختلاف رائے رکھتی تھی۔ مگر ارم کے بے حد خلوص بھرے جذبات نے ہانیہ کو مجبور کردیا تھا کہ وہ اس کی دوستی کو نہ جھٹلائے۔ یوں ہانیہ کو بسا اوقات ارم کی باتیں اچھی بھی لگنے لگی تھیں۔ خاص کر ارم کا ہر آنے جانے والے پر بے لاگ تبصرہ اور پھر خود ہی محظوظ ہو کر قہقہہ لگادینا، شروع میں ہانیہ کو بے حد عجیب لگتا تھا اور پھر بعد میں اسے ارم کی یہ ادا بھی اچھی لگنے لگی تھی۔ زندگی کے کینوس پر تراشیدہ رنگوں کو خود سے بکھیریں اور اپنے من چاہے رنگوں میں بدل ڈالیں۔ یہ احساسات ہانیہ کے لیے بالکل نئے تھے۔ اس نے عمر کا ایک لمبا عرصہ تنہا کاٹا تھا۔ فقط بی جان وہ واحد ہستی تھیں، جن سے وہ اپنے تمام غم و خوشی کا برملا اظہار کرلیا کرتی تھی۔ اس کی ذات کی رہنمائی کرنے والی بھی بی جان ہی تھیں۔ مگر اس کے باوجود بھی ہانیہ تشنگی کا ایک احساس اپنے دل میں جاگزیں پاتی تھی۔ ہانیہ نے پورے دل، پورے خلوص اور پوری نیت کے ساتھ ارم کو اپنا دوست مانا تھا۔

دوستی کے اولین دنوں میں ہانیہ شیئرنگ سے احتراز کرتی تھی۔ وہ سارے گلے شکوے جو بابا جانی کی ذات سے منسوب تھے۔ وہ ساری محبتیں جو بی جان کے وجود سے لپٹی تھیں اور وہ ساری اذیت ناک و کرب ناک تنہائیاں جو اس کی ذات کا محور تھیں۔ ان سب کی شیئرنگ میں وہ کسی دوسرے فرد کو حصہ دار بنانے پر آمادہ نہ تھی۔ مگر اب وہ رفتہ رفتہ ارم کی محبت کے آگے خود کو بے دست و پا پاتی تھی۔ اسے کئی دفعہ آفتاب عالم دکھائی دیا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا یا پھر اس کا وہم۔ مگر ہر دفعہ جب بھی وہ آفتاب عالم کو بلانے کی نیت کرتی تھی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوجایا کرتا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہ ہوسکا تھا کہ وہ ہر رنگ، ہر روپ میں ہنستا مسکراتا کبھی کسی سے محو گفتگو اسے کیوں دل کے نہاں خانوں سے اتنا قریب لگتا تھا کہ بسا اوقات وہ خود کو بھی بھول جایا کرتی تھی۔ گرد و پیش کی کچھ خبر نہ رہتی، ہر مرتبہ وہ لڑکوں کے ہجوم میں ہوا کرتا تھا اور ہانیہ کی ہمت نہ ہوسکی کہ وہ اسے پکارتی یا ان لڑکوں کے ہجوم میں جاکر اسے مخاطب کرتی۔ یوں یہ معاملہ التوا کا شکار رہا اور اس کی فیس آج تک اس کی امانت بن کر اس کے پاس ہی تھی۔



سر حمید اللہ نے ایک اسائنمنٹ دی تھی، جو ساری کلاس کو گروپس کی صورت میں کرنی تھی۔ ہانیہ نے بہت دعا کی کہ اس کو ارم کے ساتھ ہی یہ اسائنمنٹ کمپلیٹ کرنی ہو۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اس کے نام کے ساتھ ایک لڑکی عابدہ تھی اور ارم کے ساتھ ایک لڑکے خاور کا نام تھا۔

"خاور ہمدانی۔" "یہ کون ہے؟" ارم نے جز بز ہو کر نوٹس بورڈ دیکھا تھا۔

"فکر مت کرو ہوجائے گا سب، مگر یہ عابدہ کون ہے؟ وہی اسکارف میں لپٹی ہوئی لڑکی نا۔" ہانیہ کو ایک دم یاد آیا کہ عابدہ ہر وقت اپنا سر ڈھانپ کر رکھا کرتی تھی۔

"چلو چھوڑو نا، پہلے کچھ کھا کر آتے ہیں کینٹین سے، میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔" ارم نے کہا اور باقاعدہ اسے تھام کر کینٹین لے آئی۔

"قسم سے پہلے پیٹ پوجا ہوجائے، اس کے بعد ان دونوں کو بھی ڈھونڈ لیں گے۔" ہانیہ ہنس دی۔ معلوم ہی تھا کہ ارم بھوک کی کتنی کچی تھی۔ بریانی کا آرڈر دے کر ارم منتظر نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لینے لگی۔ وقت گزاری کے لیے اس نے ہر آنے جانے والے کا جائزہ لینا شروع کردیا۔

"تم نے ناشتا کیا تھا کیا آج؟" ارم نے پوچھا تو ہانیہ نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"واہ کتنا ڈیشنگ ہے نا یہ بندہ۔ دیکھو ہانی۔" ارم نے اسے ایک جانب اشارہ کیا۔ ارم نے ایک جذب

کے عالم میں کہا تو ہانیہ نے بھی رخ موڑ کر ارم کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ اسے دور سے ہی وہ دکھائی دے گیا تھا۔ اس چہرے کو تو وہ لاکھوں میں تلاش کرلیا کرتی تھی۔ بعض چہرے ایسے ہوا کرتے ہیں جو دل کے نہاں خانوں میں بسیرا کرلیتے ہیں' پھر انہیں ہم بند آنکھوں سے بھی دیکھ سکتے ہیں اور یہاں تو وہ کھلی آنکھوں سے آفتاب عالم کو دیکھ رہی تھی۔ آف وائٹ شرٹ اور بلیک پینٹ میں وہ پہلے دن کی طرح ہی جاذب نظر اور ڈیشنگ لگ رہا تھا۔ وہ چند لمحے دیکھتی ہی رہی اور پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ اس ایک انسان کا وہ ڈھنگ سے شکریہ تک ادا نہ کرسکی تھی۔ ہانیہ نے دل میں گوناگوں مسرتوں کے شگوفے پھوٹتے ہوئے پائے۔

"کہاں کھو گئی' ایک تو میں تمہاری اس کھو جانے والی عادت سے سخت بے زار ہوں۔" ارم نے سخت کوفت سے کہا۔

"نہیں' یہیں ہوں تمہارے پاس۔" ہانیہ نے مسکرا کر کہا تو ارم نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تو تم نے پھر جواب کیوں نہیں دیا میری بات کا۔" ارم بولی۔

"ٹھیک ہے' اب میں اور کیا کہوں۔ رطب اللسان ہو جاؤں یا پھر تمہاری طرح ہر آتے جاتے کے قصیدے پڑھوں۔" ہانیہ کو شاید پسند نہ آیا تھا کہ کوئی اور بھی آفتاب عالم کو محبت سے دیکھے 'یا سراہے۔

تو کیا میں واقعی اس حد تک اسے پسند کرنے لگی ہوں؟ یہ وہ سوال تھا جو ذہن میں آتے ہی اس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

"تم تو ہو ہی کسی سڑیل قوم سے' توبہ ہے' تمہاری تو....." ارم نے منہ بسورا۔ اتنی دیر میں بریانی کا آرڈر آگیا اور ہانیہ نے شکر ادا کیا۔

☆ ☆ ☆

اسے بھول جانے کی جہد مسلسل
رائیگاں ٹھہری
کیونکہ ہر بار میں ہاری
اور دل جیتا

ہانیہ چاہ کر بھی آفتاب عالم کے تصور سے خود کو آزاد نہ کرپائی تھی۔ ہانیہ کو کسی بک کی ضرورت تھی۔ وہ بک ایشو کروانے کے لیے لائبریری میں آئی۔ مطلوبہ بک تلاش کرنے کے لیے ریک میں رکھی گئی بکس کا جائزہ لینے لگی۔ تب ہی اس کی نگاہ بالکل قریب کھڑے آفتاب پر پڑ چکی تھی۔ آفتاب نے بھی اسے دیکھا اور شناسائی کی رمق اس کی آنکھوں میں عود کر آئی تھی۔

"السلام علیکم' کیسی ہیں آپ۔" آفتاب نے مسکرا کر پوچھا تھا۔ وہ بے حد نروس ہو گئی تھی۔ ایسا بھی نہ تھا کہ اس نے کبھی کسی لڑکے سے بات نہ کی تھی' مگر کیا وہ کسی لڑکے میں شمار ہوتا تھا۔ شاید وہ تو دل کا مکین تھا۔ جو دل کا مکین بن جائے اس سے بڑھ کر تو کوئی حسین نہیں ہوا کرتا اور نہ ہی قیمتی۔ وہ ہانیہ کے لیے بیش قیمت تھا۔

"جی وعلیکم السلام۔" وہ دھیمی آواز میں بولی تھی۔

"کیسی جارہی ہے آپ کی پڑھائی؟" اس نے تعلیم کی بابت پوچھا تھا۔ تب ہی کسی نے آفتاب کو آواز دی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ اس کا کوئی دوست اسے بلا رہا تھا۔

"اوکے' پھر ملاقات ہوتی ہے۔" آفتاب ایکسکیوز کرتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ وہ خاصی دیر اس کو سوچتی رہی۔ وہ کچھ ہی فاصلے پر کھڑا اپنے دوست کو کچھ بتا رہا تھا۔ ہانیہ گاہے بہ گاہے کن انکھیوں سے دور کھڑے آفتاب عالم کو دیکھتی رہی اور شدت سے دل نے ایک دعا مانگی کہ کاش یہ شخص ہی اس کی زندگی کا رفیق بنے۔ تمام زیست اس کی رفاقت میں بسر ہو۔ اس کی آنکھ کے گوشے نم ہو چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

ارم کی بدولت خاور بھی گروپ میں شامل ہو چکا تھا اور عابدہ بھی۔ عابدہ ایک بے حد مشرقی لڑکی تھی اور اپنے اقدار و قیود کی پاسداری کرنے والی لڑکی تھی۔ خاور انتہائی ہنس مکھ اور ملنسار تھا اور ہانیہ اسے خاور بھائی

کہا کرتی تھی اور خاور خود بھی ہانیہ کو ہنسا کہہ کر بلاتا تھا۔ اب اکثر ارم اور ہانیہ ہی نہیں بلکہ عابدہ اور خاور بھی ساتھ کینٹین جاتے تھے۔ کبھی کسی قسم کے نوٹس درکار ہوتے تو خاور تمام گروپ کی مدد کر دیا کرتا تھا۔ ہانیہ نے اکثر نوٹ کیا تھا کہ جب سب بیٹھے ہوتے تھے تو خاور کی نگاہیں بار بار پلٹ کر ارم کے چہرے کا طواف کیا کرتی تھیں۔ ہانیہ خود اس احساس سے روشناس تھی۔ یہ محبت کے لازوال رنگ اس کے لیے انوکھے نہ تھے۔ اسے اگر قلق تھا تو اتنا کہ ارم کے چہرے پر ڈھونڈے سے بھی خاور کے خوابوں کی تعبیر نہ ملتی تھی۔ ہانیہ بخوبی سمجھتی تھی کہ یک طرفہ محبت کس قدر جان لیوا ہوا کرتی ہے۔ جو روح کو اندر تک گھائل کر دیا کرتی ہے۔ ناقدری کا آنسو اتنا کرب ناک اور تکلیف دہ ہوا کرتا ہے کہ جس کا کوئی مداوا ہی نہ ہو۔ بے حد اذیت ناک۔



شہر درد میں ڈوبی ہوئی تنہائی ہے
اے مرے چارہ گر سن مری سنوائی ہے

ہانیہ کی اداسی کی وجہ خود ہانیہ کی سمجھ سے بھی بالاتر تھی۔ جب جب آفتاب عالم کو دیکھتی تھی۔ وہ خود کو بے حد، بے بس اور کمزور محسوس کرتی تھی۔ محبت کی یہ جلتی ہوئی لو لحظہ لحظہ اسے جلا کر خاکستر کر رہی تھی۔ وہ ایک نامعلوم منزل کی مسافر بن گئی تھی۔ اس پر محبت ہو جانا اتنا دشوار گزار راستہ ہو گا یہ ہانیہ کو معلوم ہی نہ تھا۔ ورنہ وہ کبھی مکتب عشق کی پہلی سیڑھی پر قدم نہ رکھتی۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ آبلہ پائی کا یہ سفر کیونکر کٹے گا اور ابھی یہ آغاز سفر ہی تھا۔

محبت اگر دو طرفہ ہو تو دل میں شبنمی پھول کھلا دیتی ہے اور اگر یک طرفہ ہو تو خزاں رسیدہ موسم دل کے نہاں خانوں میں ہمیشہ کے لیے بسیرا کر لیا کرتا۔ "نامعلوم لازوال دکھ میرا مقدر ہی کیوں؟" ہانیہ اکثر سوچتی، اس شخص کو تو خبر بھی نہ تھی کہ ہانیہ اسے کس درجہ شدت سے چاہتی ہے کہ وہ نس نس میں لہو بن کر دوڑنے لگا۔

"ارے میری ہانی، کیوں اداس اداس سی ہے؟" بی جان نے لاڈ سے گود میں لیٹی ہانیہ کے بال سہلائے تھے۔

"بی جان سب کے اتنے کزن، اتنے دوست ہوتے ہیں، ہمارا تو کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔" دل عجب انداز میں سوگواری لیے تھا۔ اور بی جان کی بال سہلاتی انگلیاں مضطرب انداز میں تھم سی گئی تھیں۔

"میری جان ایسا کیا ہوا ہے۔ آج سے پہلے تو تم نے ایسا سوال نہیں کیا؟ کیا ہم کافی نہیں۔" بی جان نے تشویش زدہ لہجے میں دریافت کیا۔

"بی جان آج سے پہلے میں نے خود کو یوں تنہا بھی نہیں محسوس کیا۔" ہانیہ کے لہجے میں آزردگی گھلی تھی۔ "یہ ہمارا عالی شان بنگلہ کسی اجڑے ہوئے آسیب زدہ مکان جیسا ہے، جہاں خاموشی کا ڈیرہ رہتا ہے، جہاں مکین بستے تو ہیں، مگر فقط ان کی چلتی ہوئی سانسیں ہی ان کے زندہ رہنے کی ضامن ہیں؟" ہانیہ کے لہجے میں دکھ ہلکورے لیتا دکھائی دے رہا تھا۔

"بیٹا میں تمہاری بات بخوبی سمجھتی ہوں، مگر اس میں راضی بہ رضا رہو۔" بی جان کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے تشفی کریں۔

"بی جان آج تک بابا جانی نے مجھے گلے سے نہیں لگایا، کیا جب میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گی، تب مجھے گلے لگائیں گے؟" ایک معصوم سوال اس کے لبوں پر مچلا تھا۔

"اللہ نہ کرے، ہانی تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ میری بچی تجھے کس کی نظر لگ گئی ہے۔" بی جان نے گلوگیر لہجے میں کہا اور ہانیہ کے آنسو پھسل پھسل کے اس کے گالوں کو بھگونے لگے۔ یہ آنسوؤں کا ریلا اور بہتا سیلاب بھی اس کی روح کی تشنگی کو سیراب نہ کر سکتا تھا۔

"بی جان کیا واقعی میری ماما اس دنیا میں نہیں ہیں؟" نہ جانے اس کے لہجے میں کیا کچھ تھا۔ آس، امید یقین.....

"بیٹا اذان مغرب ہو رہی ہے۔ اس وقت ایسی

باتیں کرنا نحوست ہوتا ہے۔ آؤ وضو کرو اور نماز ادا کرو۔" بی جان نے سے خود سے الگ کیا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس کے اس سوال کے جواب سے گریزاں ہیں۔



آج تیسرا دن تھا کہ ارم یونی ورسٹی نہیں آئی تھی۔ وہ بے حد بوریت کا شکار ہو رہی تھی۔ فون کرنے پر معلوم ہوا تھا کہ ارم کی طبیعت ناساز ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کسی دن ارم کی خیریت دریافت کرنے اس کے گھر جائے۔ مگر روز ہی یہ کام کل پر ٹل جاتا تھا اور یوں طوالت کا شکار تھا۔ وہ کلاس اٹینڈ کر کے باہر نکلی تو خاور نے اسے پکارا تھا۔

"سسٹر ارم نہیں آرہی ہے۔ خیریت تو ہے نا۔" تشویش زدہ لہجہ لیے وہ سوال کر رہا تھا۔

"جی' میں جاؤں گی اس کی خیریت معلوم کرنے' بتا رہی ہے بیمار ہے۔" ہانیہ نے رک کر اس کی پریشان صورت دیکھ کر وضاحت کی۔

"سسٹر آپ کی دوست کچھ مغرور سی لگتی ہیں۔" خاور نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ نامعلوم وہ کیا سننا چاہتا تھا۔ مگر ہانیہ کو وہ بے حد مضطرب لگا تھا۔

"نہیں تو بہت ہی نائس سی ہے میری دوست۔" ارم کے ذکر پر ہانیہ کے دل میں محبت کے شگوفے پھوٹے تھے' جو گہری دوستی پر دلالت کرتے تھے۔

"کبھی ارم نے میرا ذکر کیا آپ سے؟" آس کے دیپ جلائے خاور لب بستہ تھا۔

"نہیں تو...... کچھ خاص نہیں۔" ہانیہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے اسے۔ اس لیے سادگی سے ہی منہ سے نکل گیا۔ ہانیہ کے کہنے پر خاور کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ لہرایا تھا ناامیدی کا۔

"اچھا۔" وہ دھیمے لہجے میں بہت مرجھایا ہوا لگا۔ کسی کملائے ہوئے پھول کی مانند۔

"ایک بات کہوں آپ سے خاور بھائی۔" ہانیہ نے کہا۔

"کیوں نہیں' آپ تو میری بہت اچھی سی سسٹر ہیں۔" خاور ہمہ تن گوش تھا۔

"آپ پلیز ارم سے کہہ دیں جو آپ کہنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ایسا نہ ہو بعد میں پچھتاوا ہی باقی رہ جائے اور بہت دیر ہو جائے۔" ہانیہ نے سنجیدگی سے کہا تو خاور کی آنکھوں میں حیرت کا شعلہ کوندا تھا۔ اس نے تو محبت کے یہ رنگ خود پر بھی عیاں نہ کیے تھے تو ہانیہ کو کیونکر معلوم ہو گیا سب؟ کیا اس کا چہرا اب کھلی کتاب کی مانند صفحہ صفحہ دعوت نظارہ رہتا تھا کہ آؤ اور اس پر رقم ارم کے نام کی مہر پڑھ لو۔ "آج واپسی پر میں ارم کی طرف جا رہی ہوں' آپ بھی تیار رہیے گا۔ اسی بہانے آپ اس سے ملاقات بھی کر لیں گے اور گھر بھی دیکھ لیجیے گا۔" ہانیہ اسے ایک کے بعد ایک جھٹکے دینے پر آمادہ دکھائی دیتی تھی۔ وہ مسکرا دیا تھا۔ پھر ہانیہ نئی کلاس لینے چل دی تھی۔

وہ اپنی آخری کلاس اٹینڈ کر کے کلاس روم سے باہر نکلی تو کوریڈور میں وہی ستم گر تھا۔ جس کو دیکھنے کے لیے اس نے آج پھر شدتوں سے دعا کی تھی۔ قدم قدم چلتے چلتے وہ اس کے بے حد قریب آچکا تھا۔

"السلام علیکم ہانیہ۔" آفتاب کی نگاہوں میں شناسائی کی رمق تھی۔ وہ دشمن جاں بالکل سامنے موجود تھا۔ اپنی تمام تر حشر سامانیوں سمیت اگر ہانیہ چاہتی تو اسے چھو کر یہ احساس یقین میں بدل سکتی تھی کہ یہ خواب نہیں' ایک حقیقت ہے۔

"وعلیکم السلام۔" ہانیہ کو اپنی ہی آواز کہیں دور سے جیسے آتی ہوئی سنائی دی تھی۔ کانوں کی لو تپ رہی تھیں اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"آپ دوبارہ دکھائی ہی نہیں دیے۔" ہانیہ کی زبان سے بے ساختہ شکوہ پھسلا تھا۔ وہ بے حد خوب صورت مسکراہٹ سے خاصا حیران ہوا تھا ہانیہ کی بات پر۔

"آئیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" آفتاب کے کہنے پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کیسے اس کی کوئی بات ٹال جاتی۔ جو دل کا حکمران تھا وہ اس کے سنگ سنگ

چلتے ہوئے خود کو بے حد معتبر گردان رہی تھی۔ قدم قدم اس شخص کی ہمراہی میں چلنا کتنا خوش کن احساس تھا جو اس کی تمام تر ہستی ناتمام پر حاوی تر ہو رہا تھا۔ کاش یہ سفر کبھی تمام نہ ہو اور وہ یوں ہی آفتاب کے سنگ ہم قدم چلتی رہے یوں ہی گامزن۔ اس نے خوش گمانی کو دل میں جگہ دی تھی۔

"اور کیسی جارہی ہے آپ کی پڑھائی؟" وہ کسی بڑے بزرگ کی مانند اس سے تعلیم کی بابت دریافت کررہا تھا۔

"بہت اچھی۔" اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا تھا۔ پھر ہینڈ بیگ سے کچھ تلاش کرنے لگی۔ یہ ہی موقع تھا کہ وہ اس شخص کی زیر بار نہ رہتی۔ کیا محبت میں زیر بار ہونا ہی کم عذاب تھا؟ اس نے رقم نکال کر آفتاب کے آگے بڑھائی تھی۔

"یہ لیں، آج تک آپ کی امانت یوں ہی ایک سائڈ پر رکھی ہے۔ نہ جانے کب موقع مل جائے امانت لوٹانے کا۔" ہانیہ نے کہا۔

"آپ بھی نا کبھی بالکل فارمل سی ہوجاتی ہیں، یہ اتنا بھی ضروری نہ تھا کہ رقم لوٹائی جاتی اور مجھے تو یاد بھی نہ رہا تھا۔" اس نے متانت سے کہا تھا۔ مگر خاموشی سے وہ لفافہ تھام لیا تھا۔ کیونکہ ہانیہ کے چہرے پر ملتجی سا رنگ اُمڈ پڑا تھا۔ ایک قطعیت تھی کہ وہ رقم لازماً لوٹا کر ہی رہے گی۔

"آپ اکثر دکھائی دیتی ہے اپنی دوست کے ساتھ، آپ کو اس لیے مخاطب نہیں کیا کہ آپ مطمئن سی ہی دکھائی دیں ہر بار۔" آفتاب نے وضاحت کی۔ ایک پل کے لیے ہانیہ کا دل اس بات پر پھر خوش گمانی میں مبتلا ہونے لگا تھا کہ آفتاب اس کے پل پل سے آگاہی رکھتا تھا اور اتنا بھی لاتعلق نہ تھا۔ "اوکے، پھر ملتے ہیں مجھے لائبریری میں ایک بہت ضروری کام ہے۔" آفتاب خاموشی سے وہاں سے چل دیا تھا۔ اس کا خیال رعنائی۔ وہ جذب کی کیفیت میں خاصی دیر بیٹھی گزرے لمحات میں خود کو مقید کرتی رہی۔ حالانکہ وہ تو قبل اس کے بھی خود کو محبت میں مبتلا ایک قیدی کی مانند ہی پاتی تھی۔

جب کبھی
سرراہ، سر محفل
کسی در و بام سے گزرتے ہوئے
پل صراط کی مانند
تیری شبیہہ دکھائی دے جائے مجھ کو
مانوں وقت تھم جائے
اگلے ہی پل
پھر سے تتلیاں بن کر اڑ جائے
بولو، میں تمہیں کسی مضبوطی سے درجہ شدت سے تھاموں
کہ پھر تو تیرا نقش پا بھی جدا نہ ہو
جاگزیں دل میں خیال یار ہو

✡ ✡ ✡

ہانیہ مقررہ وقت پر خاور ہمدانی کے ہمراہ ارم کی عیادت کی غرض سے اس کے وسیع العریض عالی شان بنگلا میں بنے جدید طرز کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ارم کے لیے محو انتظار تھی۔ خاور کے چہرے پر اس کے دل جذبات رقم تھے۔ کسی لمحہ بھی اس ہستی کی آمد ممکن تھی۔ جس کے انتظار میں وہ گھڑیاں گن رہا تھا۔ مگر ہانیہ بالکل مطمئن سی بیٹھی در و دیوار پر آویزاں مختلف تصاویر دیکھ رہی تھی اور طائرانہ نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے اچھا لگ رہا تھا کہ ارم بھی اس کی طرح خوش حال ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ایک قدم آگے ہی تھی۔ تب ہی ڈرائنگ روم میں ارم آگئی۔ ہنستی مسکراتی بے حد پرجوش سی۔ مگر خاور پر نگاہ پڑی تو لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک کر رک گئی۔ خاور کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت کا سمندر موجزن ہوگیا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی پل بالکل نارمل انداز میں ہانیہ سے گلے ملی تھی۔

"شکر ہے تمہیں بھی میرے گھر آنے کی توفیق ملی۔ مگر اس چپکو کو کیوں ساتھ لے آئی ہو۔" ارم نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ یوں بھی خاور مختلف رنگوں

کے پھولوں کا بوکے ارم کے ہاتھ میں تھما کر خاصے فاصلے پر بیٹھ چکا تھا۔ تاکہ دونوں دوست آرام وہ ماحول میں گفت و شنید کر سکیں۔ خاور ارم کی سرخ ہوتی ناک کو دیکھ رہا تھا۔ جو شدت فلو کے باعث تھا اور ارم کا چہرا بھی بخار کی بدولت گل گلنار سا ہو رہا تھا۔ وہ تو اسے یوں بھی ہر رنگ، ہر روپ میں سندر لگا کرتی تھی۔ مگر آج تو اتنے دنوں بعد نظر آنے کی بدولت پہلے سے بڑھ کر حسین اور جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی۔

"یہ سب اسی چیکو کی بدولت ممکن ہوا ہے۔" ہانیہ نے ہنس کر کہا تھا تو ارم نے پلٹ کر خاور کو دیکھا جو خاصے فاصلے پر بیٹھا ارم کو ہی پرشوق انداز میں دیکھ رہا تھا۔

"وہ تو پاگل ہے، چھوڑو اس کو۔" ارم نے ہنس کر بات کو ٹالا تھا۔ ہانیہ کچھ دیر بیٹھی تھی۔ تب ہی ملازمہ ٹرالی گھسیٹتی ہوئی آگئی۔ لوازمات سے پر ٹرالی دیکھ کر ہانیہ کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

"ہم فقط تمہاری خیریت دریافت کرنے آئے ہیں۔" ہانیہ نے جز بز ہو کر کہا تھا۔

"آئی نو..... مگر اس میں میری خوشی ہے۔ ماما آج کسی سوشل ورک پر گئی ہیں۔ ورنہ میں کبھی بھی تمہیں کھانا کھلائے بنا نہ بھیجتی۔" ارم نے کہا تو وہ ہنس دی۔

"توبہ کرو، بی جان کو بتا کر آئی ہوں، جلدی آجاؤں گی۔" ہانیہ نے مسکرا کر کہا۔

"ہونہہ..... میری ماما نے بہت دکھ دیکھے تھے۔ اب تو وہ پاپا کے ساتھ بے حد سرشار سی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اتنی خوش ہیں۔ ان کے پہلے شوہر بے حد دقیانوسی اور تنگ دل تھے۔ امی کو زنجیروں میں قید کرنے کے خواہاں تھے۔ پابندی لگا کر اذیت دے کر خوش ہوتے تھے۔ ماما نے ان کو ٹھکرا دیا ہمیشہ کے لیے۔ میرے پاپا اتنے لونگ ہیں کہ بس۔ ماما اب بے حد خوش ہیں۔" ارم نہ جانے کون سی باتیں لے کر بیٹھ گئی تھی۔ مگر ہانیہ ہمہ تن گوش سن کر مطمئن سی تھی کہ ارم اس سے اپنے غم بھی شیئر کر رہی تھی اور خوشیاں بھی۔ پھر وہ شام کو اپنے گھر آگئی تھی۔ بی جان فکر مندی سے لاؤنج میں ٹہل رہی تھیں۔

"اتنی دیر ہانی۔" بی جان نے متفکر انداز میں کہا تو وہ ہنس دی تھی۔ بی جان نے اسے گلے لگا لیا تھا۔ آج کتنے دنوں بعد انہوں نے ہانیہ کو ہنستے مسکراتے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بی جان..... ایک بات پوچھوں آپ سے۔" ہانیہ نے تسبیح کے دانے گراتی بی جان کے کندھے پر سر ٹکا دیا تھا۔ بی جان نے سر کی جنبش سے ہاں میں اسے پوچھنے کی اجازت دے دی تھی۔

"بابا جانی اس گرین والے روم میں کیا کرتے رہتے ہیں۔ ایسا کیا خاص ہے اس کمرے میں کہ ہمیں اس کمرے میں تو جانے کی اجازت نہیں ہے، مگر وہ خود ہمیں اگنور کر کے اس کمرے میں اتنا وقت گزارتے ہیں۔" اس نے سوال کیا، تو بی جان کے تسبیح کے دانوں پر حرکت تھم گئی تھی۔ ان کی انگلیاں مضطرب سی رک گئی تھیں۔

"بیٹا تمہارا ہر سوال گھوم پھر کے اپنی ماں کی جانب کیوں چلا جاتا ہے۔ اب میں عاجز آگئی ہوں تمہارے ان سوالات سے۔" بی جان نے مضطرب انداز میں کہا۔

"تو کیا اس کمرے میں میری ماما کی کوئی یاد ہے یا میری ماما کے حوالے سے کوئی راز پوشیدہ ہے۔" ہانیہ ایک دم ہی پرجوش ہو گئی تھی۔

"ہانی! اس کمرے سے دور رہنے میں ہی تمہاری عافیت ہے اور ایسا کچھ بھی نہ کرنا جو تمہارے بابا جانی کے لیے دکھ کا باعث بنے۔ میرے بیٹے نے بہت غم جھیلے ہیں۔ اس نے ان غموں سے چھٹکارا پانے کے لیے خود کو کاموں میں مدغم کر دیا۔ اتنا مصروف کر ڈالا کہ کبھی یہ غم اسے یاد نہ آئیں۔ مگر بیٹا بعض دکھ تو جی کا روگ ہوا کرتے ہیں۔ یہ روگ بھی اس کی جان سے چمٹا ہے۔ آتی جاتی سانسوں سے لپٹی ہے دکھ کی ڈور، کسی روگی کی مانند، تم کیا چاہتی ہو میرا بیٹا، جس نے تنکا

تنکا اپنے بکھرے ہوئے وجود کی دھجیاں سمیٹتی ہیں' اب پھر سے وہ بکھر کر ٹوٹ جائے۔ اس کی ہستی پھر سے اجڑ جائے۔" بی جان کا اتنا بول کر سانس پھولنے لگا تھا۔ دزدیدہ لہجہ غموں سے چور تھا۔ ہانیہ نے پریشانی سے بی جان کو دیکھا' ملال سے پر چہرا' ہانیہ کو ایک دم شرمندگی نے گھیرا تھا۔

"بی جان' آج سے پہلے تو آپ نے کبھی نہیں بتایا کہ بابا جانی کی خاموشی کے پیچھے کوئی گہرا ملال پوشیدہ ہے۔" وہ فکر مندی سے بولی تھی۔

"بیٹا! آج سے پہلے میرے ضبط کے بندھن بھی نہ ٹوٹے تھے' بیٹا ان باتوں کے پیچھے مت جاؤ' اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔" بی جان نے کہا تو وہ سر جھکا کر پرسوچ انداز میں اثبات میں سر ہلانے لگی۔



تم پاس نہیں ہو تو کیا
دید کی آس و یاس میں چند سانسیں ہی رہنے دو
مت پابندی لگاؤ اس چشم نم پر
اسے آزاد رہنے دو
باقی بچا جو یہ رشتہ گمنام
تمہارے نام کے یہ چند آنسو ہی رہنے دو

ہانیہ جہاں بے حد خوش تھی کہ ارم نے خاور کی محبت کو قبولیت کی سند بخش دی تھی۔ وہاں دل بے طرح اداس بھی تھا۔ وہ دشمن جان اسے کئی دنوں سے دکھائی نہ دیا تھا۔ ارم نے اسے ہر طرح سے کریدا تھا' اس کی اداسی کی وجہ دریافت کی تھی۔ مگر اس نے ارم کے پوچھنے پر بھی اصل بات نہ بتائی تھی۔ وہ دل کے دکھوں کو بند دریچہ کی مانند سینت سینت کے رکھنے کی قائل تھی۔ اپنے دکھوں کا اشتہار لگوانا اسے اول روز سے پسند نہ تھا اور آفتاب عالم تو ایسا نام تھا' جسے وہ ہر کسی سے چھپا کر دل کے نہاں خانوں میں کسی انمول قیمتی نایاب تحفہ کی مانند سینت سینت کے رکھتی تھی۔

خاور نے ارم سے باقاعدہ اعتراف محبت کے بعد اسے یقین دلا دیا تھا۔ اپنی محبتوں کی شدتوں کا۔ اس اعزاز میں آج خاور نے سب کو ڈنر کے لیے مدعو کیا تھا۔ اپنی اس خوشی کو سیلبریٹ کرنے کے لیے۔ مگر ہانیہ کشمکش میں تھی۔ شاید بی جان اسے اجازت نہ دیتیں۔ مگر جب اس نے ڈرتے ڈرتے بی جان سے پوچھا۔ تو انہوں نے ہاں کر دی تھی۔ اسی لیے آج وہ خوب اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ ارم کی خوشی اس کے لیے بھی اہم تھی۔ اس نے خاص طور پر ارم اور خاور کے لیے گفٹ پیک کر لیا تھا۔ بابا جانی نے ایک گاڑی گھر میں ہی کھڑی کر رکھی تھی کہ جب بھی کسی کو ضرورت پیش آئے تو اس کو استعمال کرے۔ ڈرائیور کے ساتھ وہ مقررہ ہوٹل میں آگئی تھی۔

رسما" جلد ارم اور خاور کی منگنی متوقع تھی۔ کیونکہ ارم کو اس کے والدین نے ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی اور اس پر بے جا پابندیوں کے قائل نہ تھے۔ زندگی کے اہم ترین فیصلے میں بھی کسی قسم کی بندش حائل نہ تھی۔ اس نے پہنچ کر بیل دی تھی فون سے' تو خاور اسے لینے باہر تک آگیا تھا۔ خاور کے چہرے پر اس کی دلی خوشی کی تمام کہانی رقم تھی۔ اندرونی خوشی اس کے چہرے پر رقص کر رہی تھی۔ سائڈ پر ٹیبل ریزروڈ تھی۔ ارم اور عابدہ بیٹھی تھیں۔ ساتھ میں آفتاب کو بیٹھا دیکھ کر وہ پلک جھپکانا بھی بھول چکی تھی۔ آفتاب اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا تھا۔

"آفتاب یہ میری بہت پیاری سی سسٹر ہے ہانیہ۔" خاور نے تعارف کا مرحلہ طے کیا تھا' تو آفتاب ہنس دیا تھا۔

"میں ہانیہ جی کو جانتا ہوں۔" آفتاب نے مسکرا کر کہا تھا۔

"ہانیہ کو جانتے ہیں آپ؟" ارم نے قدرے حیرت سے ہانیہ اور پلٹ کر آفتاب کو دیکھا تھا۔ ہانیہ کو موضوع بحث بننا پسند نہ آیا تھا۔ آفتاب' خاور کا کزن تھا۔ اسے یہ بات بھی ابھی ہی معلوم ہوئی تھی اور پھر خاور اور آفتاب کی گہری دوستی بھی تھی۔ کھانے کا آرڈر دیا گیا۔ سب نے باتوں کے درمیان پرلطف سا ڈنر کیا۔ وہ بے حد جھجک محسوس کر رہی تھی۔ آفتاب

کے سامنے یوں بیٹھنا بھی اسے دوبھر ہو رہا تھا۔ شرم ہی مانع آرہی تھی۔ حالانکہ آفتاب بالکل ریلیکس تھا۔ اس کے کسی فعل سے بھی عیاں نہیں ہو رہا تھا کہ وہ بے چین ہے۔

"ارم پھر اب تو آپ بھی ہماری فیملی ممبر بن جائیں گی بہت جلد۔" آفتاب نے ہنس کر کہا تھا۔ تو ارم ہنس دی تھی۔ ارم بسا اوقات کتنی ایڈوانس ہو جایا کرتی تھی۔ آج ہانیہ کو بات بے بات قہقہہ لگاتی ارم اچھی نہ لگ رہی تھی۔ کچھ حدود و قیود ہمارے معاشرے کی حد کردہ تجاویز ہوتی ہیں اور کچھ حدود وہ ہوتی ہیں جو اقدار و روایات کی پاسداری میں ہماری اپنی سرشت کا خاصا بن جایا کرتی ہیں۔ نامعلوم ارم کیوں اتنی کھلی ڈلی سی ہو جایا کرتی تھی۔ عابدہ سب سے پہلے بولی تھی کہ اسے گھر جانا ہے۔ کیونکہ اس کے بھائی لینے آگئے تھے۔ وہ جلد ہی چلی گئی تھی۔

"میں بھی اب چلتی ہوں۔" ہانیہ نے کہا تھا۔ تو ارم نے اسے روکنے میں کوئی خواہش ظاہر نہ کی تھی۔ ارم آج اسے کچھ بدلی بدلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر وہ ہنوز خاموش ہی رہی اور آفتاب نے اس کی خاموشی کو گہری نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"آئیں، میں آپ کو باہر تک چھوڑ آتا ہوں۔" آفتاب کی بات پر وہ پھر بھی کچھ نہ بولی تھی۔ اسے اپنا آپ یہاں بن بلائے مہمان کی مانند لگ رہا تھا۔ ہانیہ نے گفٹ خاور کو تھما دیا تھا۔ پھر آفتاب اسے گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا۔

"آپ آج بہت اچھی لگ رہی ہیں، بہت مختلف سی۔" آفتاب کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر سی گئی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے آفتاب نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ آفتاب کا اسے وی آئی پی انداز میں بٹھانا اسے اچھا لگا تھا۔ وہیں ارم کا لاتعلق سا انداز اسے بری طرح کھل رہا تھا۔ گھر واپس آئی تو بی جان نے اطمینان کا اظہار کیا۔ وہ جتنی دیر باہر رہی تھی بی جان دعائیں ہی کرتی رہی تھیں۔

"بیٹا اپنی دوست سے کہنا آئندہ شام کے بعد وقت نہ رکھا کرے۔ مجھے پسند نہیں کہ تم شام کے بعد تنہا گھر سے نکلو۔ تم میری ذمہ داری ہو۔ ناتواں وجود ہے۔ مگر دعاؤں کا حصار بے حد مضبوط ہے۔ جو میری ہانیہ کو گھیرے رکھتا ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا۔ بیٹیاں آبگینے کی مانند ہوتی ہیں، جن کی حفاظت ہی انہیں انمول بناتی ہیں۔" بی جان کی بات پر اس نے وعدہ کیا تھا۔ آئندہ شام کے بعد گھر سے نہ جائے گی۔



درانی صاحب راکنگ چیئر پر بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ ماضی کے دریچے ان کے دل پر آج بار بار دستک دے رہے تھے۔ آج پانچ جنوری کا دن تھا۔ وہی دن جو ان پر ایک عذاب کی مانند گزرا تھا۔ وہ اہم فیصلہ کر ڈالا تھا۔ جس سے انہوں نے اپنے دل کو اپنے ہی سینے سے نکال کر پھینک ڈالا تھا۔

زہرہ کو انہوں نے بے حد چاہت سے اپنی زندگی کا ساتھی بنایا تھا۔ زہرہ کے تمام لاڈ اٹھاتے ہوئے وہ تھکتے نہ تھے۔ زہرہ اتنی ہی حسین اور نازک اندام تھی کہ اسے چاہا جاتا، سراہا جاتا۔ اس کے ناز اٹھائے جاتے۔ درانی صاحب کے پاس زہرہ کی صورت ہی تمام دولت تھی۔ ورنہ معاشی اعتبار سے وہ اس قدر خوش حال نہ تھے۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ زہرہ کی تمام آرزوؤں کو پورا کریں۔ اور زہرہ کی کوئی بھی خواہش تشنہ لب نہ رہے۔ مگر بسا اوقات زہرہ کوئی ایسی فرمائش کر دیتی تھی۔ جو ان کی بساط سے باہر ہوا کرتی تھی۔ وہ چاہ کر بھی زہرہ کی وہ آرزو پوری نہ کر پائے تھے۔ یہیں سے محبت میں دراڑ سی پڑنے لگی تھی۔

جب کبھی درانی زہرہ کی کوئی آرزو پوری نہ کر پاتے تھے تو درانی کے دل پر گراں گزرتا اور زہرہ کا موڈ بھی بے حد آف ہو جایا کرتا تھا۔ حالانکہ زہرہ خود بھی کسی خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے نہ تھی۔ مگر خوب صورتی اس کے پاس واحد ایسا ہتھیار تھا کہ وہ سمجھتی تھی کہ وہ اس کے سہارے اپنی ہر بات منوانے کا ہنر

جانتی تھی اور پھر وہ دوسرے شخص کو مجبور کرسکتی تھی کہ اس کی بات مان لے۔ پھر زہرہ نے درانی کا انتخاب بھی اسی لیے کیا تھا کہ درانی وجیہہ خوبرو ہونے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ مگر زہرہ کی حرص نے اس کو جلد سب حاصل کرنے پر بضد کیا تھا۔ خواہشات کا انبار اگر لگا دیا جائے تو جتنا بھی میسر ہو وہ کم ہی پڑ جایا کرتا ہے۔ زہرہ بھی آسودہ حال تھی۔ مگر مزید کی لگن اور مزید کی ہوس نے اسے درانی سے بدظن کر دیا تھا۔ آئے دن کے تقاضے بڑھنے لگے تھے۔ منہ زوری کی لت منہ کو ایسی لگ چکی تھی کہ ہٹتے نہ ہٹتی تھی۔

قدرت کو بھی زہرہ اور درانی کی آزمائش مقصود تھی۔ ان کی زندگی میں ایک تیسرا فرد شعیب داخل ہو گیا۔ شعیب نے ایک بزنس میٹنگ میں درانی کی بیگم زہرہ کو دیکھ لیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ میٹنگ کے بعد زہرہ کو لے کر درانی نے کسی شاپنگ پر لے جانا تھا۔ اسی لیے وہ زہرہ کو بھی آفس لے آئے تھے کہ میٹنگ کے فوراً" بعد لے چلیں گے۔ مگر زہرہ کی تیاری عروج پر تھی۔ خوب اہتمام سے تیار ہو کر وہ گھر سے نکلا کرتی تھی۔ اگر وہ یہ سب تیاری نہ بھی کرتی تو وہ حسن کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ مگر تیاری کے بعد تو دو آتشہ ہو جایا کرتی تھی۔

شعیب کی نگاہ زہرہ پر پڑی تو بس وہ اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ زہرہ بھی شعیب کی نگاہوں میں چھپی تپش محسوس کر چکی تھی۔ وہ شعیب کی مراعات سے بھی مرعوب ہو رہی تھی۔ اگر عورت شریف النفس ہو تو محتاجی کو گلے لگا لیا کرتی ہے۔ مگر ہر حال میں اپنی نیک نامی اور عزت کو داؤ پر نہیں لگاتی اور اگر عورت کو حرص و ہوس کی لت لگ جائے وہ خواہ دولت کی ہو۔ یا مزید ترقی کی۔ تو وہ پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی۔ زہرہ کا تعلق جس گھرانے سے تھا وہاں غربت و افلاس کی گہری کھائی تھی۔ زہرہ نے بمشکل وہاں سے خود کو نکالا تھا۔ مگر وہ اس پر بھی رب کریم کا شکر ادا کرنے کے بجائے مزید حرص کی طلب میں آگے بڑھتی جاتی تھی۔ اسے شعیب نہیں اس کی دولت کے انبار دل کو بھا رہے تھے۔

اب گاہے بہ گاہے زہرہ آفس آ جایا کرتی تھی۔ پھر فون نمبرز کے تبادلے ہوئے اور زہرہ اور شعیب کو آفس میں بھی ملاقات کی حاجت نہ رہی۔ اب زہرہ بہت اونچی اڑان اڑنے کی تمنائی تھی۔ اسے شعیب میں اپنی منزل کا حصول دکھائی دیتا تھا۔ اسے اب ہر گزرتے لمحے کے ساتھ درانی بے حد ناگوار خاطر لگنے لگا تھا۔ جس سے وہ جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کی تمنائی تھی۔ آئے دن جھگڑے ہونے لگے۔ درانی کا فقط اتنا کہنا ہی زہرہ کو بپھری ہوئی شیرنی کی مانند کر دیا کرتا تھا۔

"زہرہ گھر پر توجہ دو۔ ہانیہ بے حد متاثر ہوتی ہے' دیکھو کتنی کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ آئے دن بیمار رہنے لگی ہے۔" درانی کے لہجے میں ہانیہ کے لیے فکر مندی ہوا کرتی تھی۔

"تو میں کیا کروں' چوبیس گھنٹے اس کے چونچلے اٹھاتی رہوں۔ گھڑی دو گھڑی اس ماحول سے نکلنے کے لیے آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے گھر سے کیا جاتی ہوں تمہاری ماں تمہارے کان بھر دیتی ہے میرے خلاف۔" زہرہ ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر بولتی چلی جاتی تھی۔

"بی جان نے تو مجھے کچھ بھی نہیں کہا زہرہ۔ میں تو ہانیہ کی جانب سے فکر مند ہوں۔" درانی مزید پریشان ہو جایا کرتے تھے۔ ان کے لیے زہرہ کی ناراضی کا تصور ہی سوہان روح ہوا کرتا تھا۔

"ہاں جی وہ تو کچھ کہتی ہی نہیں' پل پل کی تو پورٹ دیتی ہے بڑھیا۔" زہرہ ہر حد پھلانگ رہی تھی۔

"زہرہ یہ کیسی زبان ہے۔ ایسی بات تمہارے منہ سے اچھی نہیں لگتی۔ کچھ تو پاس لحاظ رکھا ہوتا۔" درانی کو غصہ آ گیا۔

"سارا دن میں اس بچی کے پاس نہیں بیٹھ سکتی۔ یہ بات تم ذہن نشین کر لو اور میرے بولنے پر اتنا ہی اعتراض ہے تو کوئی اور لے آؤ جس کی بولی تمہیں پسند

ہو۔" زہرہ بے حد بے ادبی اور گستاخی سے بولی تھی۔ درانی تاسف سے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔ مگر دوبارہ انہوں نے زہرہ سے ہانیہ کی بابت کچھ نہ کہا تھا۔

پھر آئے دن ہانیہ بیمار رہنے لگی تھی۔ بی جان نے ہانیہ کو اپنی آغوش محبت میں لے لیا تھا۔ ورنہ ہانیہ شاید زندہ ہی نہ رہتی۔ وہ اکثر اپنے کپڑے گیلے کرلیا کرتی تھی اور گھنٹوں سردی میں ٹھٹھرتی رہتی تھی۔ تب بی جان نے یہ سب اپنے ذمے لے لیا۔ انہوں نے ہانیہ کو اپنی بیٹی بنالیا تھا۔ یوں بھی ان کی گود میں درانی کی صورت بیٹا تو تھا۔ گر بیٹی نہ تھی۔ پوتی ہی ان کے لیے بیٹی بن گئی تھی۔ کل کائنات۔ یوں زہرہ اس ذمہ داری سے بھی بری الذمہ ہوگئی تھی۔ ہر فکر سے آزاد۔

ایک دن درانی نے خود اپنی آنکھوں سے زہرہ کو شعیب کے ساتھ گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہنستے مسکراتے دیکھا تھا اور وہ جس طرح قریب ہو کر بیٹھی تھی وہ منظر دیکھ کر درانی کے دل پر گہری ضرب لگی تھی۔ رہ رہ کر یہ منظر ان کے دل کو کچوکے لگا رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ زہرہ ان کے اعتماد کو یوں ٹھیس پہنچائے گی۔ ان کے یقین کی یوں دھجیاں اڑائے گی۔ سرشام جب زہرہ گھر آئی تو اس وقت درانی لاؤنج میں ہی بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں شدت درد سے سرخ ہو رہی تھیں۔ گریہ خون آنکھیں' لہو برساتی آنکھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ زہرہ خوب سج دھج سے تیار تھی۔ چہرے پر مسکان سجی تھی۔ مگر جوں ہی درانی پر نگاہ پڑی تو وہ مسکراہٹ کافور ہو چکی تھیں اور ایک دم اس مسکراہٹ کی جگہ بے زاری نے لے لی تھی۔ چہرے پر سرد مہری در آئی تھی۔ ناگواریت کا احساس تھا۔ جو درانی کی نگاہ سے نہ چھپ سکا تھا۔

"میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم کہاں سے آرہی ہو۔ یہ میں بخوبی سمجھتا ہوں اور جانتا ہوں۔ مگر میں تم سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ زہرہ میری محبت میں ایسی کون سی کمی تھی کہ تم نے یہ قدم اٹھایا۔ تم نے میری پاک محبت کو ٹھکرا کر یہ دلدل سے پر راستہ چنا۔ تم نے اپنے آپ کو میری نظروں سے گرا دیا ہے زہرہ۔ مگر کیا کروں یہ دل کم بخت دل۔ تمہیں آج بھی شدتوں کی انتہاؤں سے چاہتا ہے۔ آج بھی طلب گار ہے کہ تم میری وہی پہلی والی زہرہ بن جاؤ۔ میری اپنی زہرہ' ہانیہ کی ماں میری بیوی' زہرہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیا تم بھول چکی ہو۔ میں نے کس طرح چاہتوں سے تمہیں اپنایا۔ ایک کمرے کی بند سی کوٹھڑی سے یہاں اس کشادہ گھر میں لا کر تمہاری آرزو پوری کی۔ تمہیں نام دیا' عزت دی اور تم نے یہ صلہ دیا میری محبت کا؟" وہ بے حد گریہ لب تھا۔

"اگر شادی کی تو کون سا احسان کیا ہے مجھ پر۔ بہت زیربار ہو چکی تمہاری۔ اب مزید نہیں رہنا چاہتی۔ اچھا ہے' تم نے سب جان لیا۔ میں بھی جلد ہی تمہیں سب کچھ بتانے والی تھی۔ آج نہیں تو کل یہ سب تو تمہیں معلوم ہونا ہی تھا۔ میں یوں بھی اس گھٹے گھٹے ماحول میں نہیں جی سکتی۔ میں آزاد فضا کی باسی ہوں۔ یہاں دم گھٹتا ہے میرا۔ میں تم سے طلاق چاہتی ہوں۔ اگر تم نے نہ دی۔ تو شعیب جلد ہی کچھ کریں گے کہ تم مجبور ہو جاؤ گے۔ اب یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ اپنی عزت کا جنازہ نکالنا پسند کرو گے یا بخوشی مجھے الگ کردو گے۔ اس میں ہی تمہاری بھی بھلائی ہے۔ مجھے کب تک قید کی زنجیروں میں رکھو گے۔ آج نہیں تو کل میں شعیب کی بن ہی جاؤں گی۔" زہرہ نے دیکھا ہی نہیں کہ درانی کے چہرے پر کتنے گہرے ملال کے سائے تھے۔ کتنے دکھ تھے جو زہرہ نے لکھ ڈالے تھے۔ اگر دیکھ لیتی تو شاید کبھی بھی درانی کو چھوڑ کر نہ جاتی۔ کیونکہ زندگی میں ہر شے مل جایا کرتی ہے۔ مگر نہیں ملتی تو سچی محبت اور اس کے انمٹ نقوش۔

پھر درانی نے خاموشی سے اپنے دل کے ٹکڑے کو دل سے نکال کر پھینک دیا ہو جیسے۔ انہوں نے زہرہ کی ہر بات مانی تھی۔ اس کی ہر آرزو پوری کی تھی۔ تو کیونکر ممکن تھا کہ یہ آرزو تشنہ چھوڑ دیتے؟ انہوں نے زہرہ کو طلاق نامہ دیا' مگر زہرہ کی ایک فرمائش سمجھ کر۔ یوں وہ زہرہ کی زندگی سے دور چلے گئے تھے۔ اور زہرہ نے عدت ختم ہوتے ہی شعیب سے شادی کرلی

تھی۔ اس کے بعد انہیں زہرہ کی کوئی خبر نہ ملی تھی۔
ان کا ہاتھ ایک بڑی سی آویزاں تصویر پر آن پر رک سا گیا تھا۔ مسکراتی ہوئی زہرہ۔ یہ وہ تصویر تھی جو زہرہ نے بطور خاص ان سے کہہ کر بنوائی تھی۔
"میں چاہتی ہوں آپ جو ہر وقت تصاویر بناتے رہتے ہیں نا۔ ایک نقش میرا بھی تو بنائیں۔ اتاریں اس کینوس پر۔" زہرہ نے مسکرا کر کہا تھا اور انہوں نے زہرہ کی تصویر بنا ڈالی تھی۔ اب تو عرصہ ہوا زہرہ کی محبت سے دست بردار ہوئے۔
انہوں نے اس محبت کو جیسے چھوڑا تھا۔ اسی طرح رنگوں سے بھی دست بردار ہو گئے تھے۔ اب وہ کبھی کوئی تصویر نہ بناتے تھے۔ سچ تو یہ بھی تھا کہ انہوں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ اتنی رقم اتنے دولت کے انبار اکٹھے کرلیں گے کہ ایک دن زہرہ کو دکھا سکیں کہ وہ بھی شعیب سے کسی صورت کم نہ تھے۔ نہ ان کی محبت میں کوئی کمی تھی۔ اسی لیے وہ دن رات بزنس میں ڈوبے رہتے تھے۔ ہانیہ کو بھی بھول چکے تھے۔ اگر چند لمحات ملتے بھی تھے تو وہ اس کمرے میں آکر زہرہ کی یادوں سے باتیں کرتے۔ یا ان تمام تصاویر سے جو انہوں نے شادی کے بعد زہرہ کی محبت میں بنائی تھیں۔ یہ سارے رنگ اب بے رنگ ہو کر رہ گئے تھے۔ اب فقط ان تمام رنگوں پر ایک ہی رنگ حاوی تھا۔
جدائی کا رنگ۔

☆ ☆ ☆

اور وہ لان میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی۔ جب بے حد خاموشی سے کوئی اس کے پاس آکر دھم سے گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور دیکھتی ہی چلی گئی تھی۔ آفتاب عالم روبرو تھا۔
"آپ سے بہت ضروری بات کرنی تھی ورنہ آج بھی مخاطب نہ کرتا آپ کو۔" ہانیہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس بات کا اب کیا جواب دے۔ اسے تو یہ ہی سمجھ نہ آرہی تھی کہ یہ خواب ہے یا حقیقت' بسا اوقات حقیقت بھی کتنی خوش کن ہوا کرتی ہے کہ اس پر حقیقت کے بجائے خواب کا سا گمان گزرتا ہے۔ وہ آفتاب عالم کے ساتھ تھی اس لمحے اس کی سنگت میں۔
"میں چند دنوں کے بعد فارغ ہو جاؤں گا' تو یہاں آنے کا کوئی جواز باقی نہ رہے گا' میں ایک پریکٹیکل انسان ہوں اور صاف کھری دو ٹوک بات کرنے والا انسان ہوں۔ آپ کو اپنی زیست کا ساتھی بنانے کا خواہاں ہوں۔ آج بھی شاید مخاطب نہ کرتا' مگر دل نے کہا کہ آج تو بات کر ہی لی جائے۔ تنہا دیکھ کر آگیا۔"
آفتاب عالم وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ براؤن اسکارف میں اس کا چہرا دمک رہا تھا۔ روشن ستارہ آنکھیں بے حد صاف اور دل میں اترتی جاتی تھیں۔ وہ بے انتہا حسین تھی اور آج اعتراف محبت کے بعد وہ اور بھی حسین ہو گئی تھی۔
"کچھ کہو گی نہیں؟" آفتاب عالم نے کہا تو وہ نظریں جھکا کر گھاس کو نوچنے لگی تھی۔
"میں کیا کہوں؟" اس کے ہاتھوں پر ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ بے حد نروس سی تھی۔
"کچھ بھی ہانیہ کہو۔ کچھ ایسا کہ جس سے میرے دل کو یہ تقویت مل جائے کہ تم میری ہو۔ یہ درخشندہ چہرا میرا ہے۔ یہ شادابی آنکھیں میری ہیں۔ یہ مخروطی انگلیاں میری ہیں۔ یہ سراپا مجسم میرا ہے۔ بس اتنا ہی سننا چاہتا ہوں۔" آفتاب عالم کا لہجہ اس کی مانند ہی دلنشین ہو رہا تھا۔ بے حد مخمور ہو رہا تھا۔ جذبوں کی شدت سے۔ اس کا لہجہ بھی بے حد بھاری ہو رہا تھا اور ہانیہ کے چہرے پر حیا کی لالی چھائی تھی۔ شرم کے شبنمی رنگ لیے وہ سر جھکائے تھی۔ کیا کہتی۔ فقط خاموشی۔
تب ہی ہانیہ کو دور سے ارم آتی دکھائی دی تھی۔
"السلام علیکم!" ارم نے پاس آکر بڑے کھردرے انداز میں کہا تھا۔
"وعلیکم السلام' میں اب چلتا ہوں ہانی۔" آفتاب نے مسکرا کر کہا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ ارم نے دیکھا' ہانیہ کا چہرا بے حد

چمک رہا تھا۔ جو اندرونی خوشی پر دلالت کر رہا تھا۔

"بہت باتیں ہو رہی تھیں' ایسا کیا خاص تھا؟" ارم نے ذو معنی انداز میں پوچھا۔ کریدتے ہوئے۔

"وہ مجھے پروپوز کر رہے تھے۔" ہانیہ نے ہنس کر کہا۔

"اچھا۔۔۔" ارم کی آواز میں ایک عجیب سی بات تھی۔ ارم نے بہت عرصہ پہلے آفتاب کو دیکھ کر اس کی آرزو کی تھی۔ تب اسے معلوم ہوا تھا کہ آفتاب عالم ایک بے حد مغرور سا انسان ہے اور لڑکیوں سے تو وہ بے حد دور رہتا ہے۔ اس کا نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں ایک نام تھا۔ وہ بے حد دل داد لڑکا تھا۔ ہر دل عزیز' ہر کوئی اس کے گن گاتا تھا۔ کیونکہ وہ بے حد مہذب' بااخلاق لڑکا تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ سوشل ورکس میں بھی سرگرداں رہا کرتا تھا۔ تمام اساتذہ اس کے گرویدہ تھے اور وہ اس کو بے حد پسند کرتے تھے۔ مگر وہ کسی لڑکی کو لفٹ نہ کرواتا تھا اور نہ ہی اس کا نام کبھی کسی لڑکی کے ساتھ لیا گیا تھا۔ اگرچہ ہزاروں لڑکیاں اس کی گرویدہ تھیں۔ مگر وہ خشک اور آدم بے زار مشہور تھا۔ آج وہی آفتاب عالم جس نے ارم کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی کو ٹھکرا دیا تھا۔ یہ بات ارم ہی جانتی تھی کہ اس نے آفتاب سے بارہا بات کرنے کی سعی کی تھی۔ مگر آفتاب عالم نے بے حد روکھے انداز میں جواب دیا تھا۔ ارم نے محض یہ جان کر کہ خاور اس کا کزن اور بہترین دوست ہے' خاور سے شادی کا فیصلہ کر ڈالا تھا۔ آفتاب عالم کو محض یہ جتانے کے لیے کہ وہ اتنی بے قیمت اور ارزاں نہیں ہے۔

وہ سمجھتا نہیں
میں ارزاں نہیں
میں بے مول ہوں
میں انمول ہوں
محض اس کی چاہت کی طلب
کرتی ہے اکثر بے وقعت

یہ ہی معاملہ درحقیقت اس کے ساتھ بھی تھا۔ اب وہ اسے یہ باور کروانا چاہتی تھی کہ وہ اتنی بھی بے قیمت اور گئی گزری نہ تھی۔ خاور خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد امیر و کبیر انسان تھا۔ سب سے بڑھ کر محبت کرنے والا تھا۔ ارم نے شادی تو کرنی ہی تھی تو پھر خاور کیوں نہیں۔ سو اس نے یہ فیصلہ کر ڈالا تھا۔ مگر اب یہ جان کر آفتاب عالم کی منظور نظر کوئی اور نہیں اس کی اپنی اکلوتی دوست ہانیہ تھی۔ اس کو بے حد ذلت کا احساس ہو رہا تھا اور غصہ بھی آ رہا تھا۔ اپنی کم مائیگی کے احساس پر اور پھر۔ ارم نے خاور کے سامنے ایک شرط رکھ دی تھی۔ ایسی شرط کے جس کو سن کر ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ ارم نے کہا تھا کہ وہ صرف اس شرط پر خاور سے شادی کرے گی کہ وہ ہانیہ کو آفتاب کی نظروں سے گرا دے اور یہ بات آفتاب کے دل میں بٹھا دے کہ ہانیہ ایک غلط لڑکی ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں وہ کبھی بھی خاور سے شادی نہیں کرے گی۔ خاور ارم کو بے انتہا چاہتا تھا۔ مگر یہ سن کر اور ارم کی سوچ جان کر اس کو شدید دکھ ہو رہا تھا۔

"ارم میں نے تم سے بے پناہ محبت کی ہے۔ مگر میں اتنا گرا ہوا کام نہیں کر سکتا۔" خاور کے لہجے میں دکھ تھا پاتال کی طرح گہرا' ارم بہت اونچائی سے اس کی نظروں میں نیچے گری تھی۔ یوں جیسے دل سے بھی اتر گئی ہو۔

"ایسا کیا کہہ دیا میں نے۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہو گا کہ آفتاب کو بتانا ہو گا کہ ہانیہ ایک کریکٹر لیس لڑکی ہے' ایک وقت میں تمہارے ساتھ بھی انوالو رہ چکی ہے۔" ارم نے کہا۔ اسے بالکل اندازہ نہ ہوا تھا کہ ارم کے عین پیچھے کوئی کھڑا ہے جو یہ ساری بات سن رہا ہے۔ وہ ہانیہ تھی۔ دھواں دھواں ہوتا چہرا لیے۔ اعتماد کی کرچیاں بکھری تھیں چار سو۔

☆ ☆ ☆

زہرہ نے شعیب کی خاطر تمام کشتیاں جلا ڈالی تھیں۔ مگر اسے کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔ محض پچھتاوے حاصل ہوئے تھے۔ شعیب سے شادی اس نے مال و دولت کی خواہش میں کی تھی۔ اس کا حصول تو ہو گیا تھا۔ مگر آزادی کی تمنا جو اس کی اولین خواہش

تھی۔ وہ بھی پوری ہوئی۔ کچھ ایسے رنگ میں کہ اسے اپنے وجود سے نفرت ہوگئی تھی۔ مکروہ وجود لگتا تھا اسے۔ شعیب نے اس سے شادی اس کی محبت میں گرفتار ہو کر نہ کی تھی۔ بلکہ اس کے حسن کی وجہ سے کی تھی۔ جسے وہ ہر روز کیش کرواتا تھا۔ مختلف پارٹیز میں لے جاکر اسے زہرہ کے خریدار مل جاتے تھے۔ اور یہ ہی وجہ تھی کہ اس کا بزنس بے حد تیزی کے ساتھ پھیلا تھا۔ بے حد وسعت اختیار کر گیا تھا۔ مگر اس کے لیے زہرہ کو اپنا آپ گروی رکھنا پڑا تھا۔ اپنی ذات کی دھجیاں بکھیرنی پڑی تھیں۔ اپنا آپ گنوا کر اس نے شعیب کو پالیا تھا۔ اس شعیب کو جس کے مکروہ ذہن نے اسے پاتال کی گہرائیوں میں گرا دیا تھا۔ اسے اس کی ذات کی قدروقیمت جو غرور اسے اپنے حسن پر تھا اور وہ سوچتی تھی کہ وہ حسن جاوداں کی مالکہ ہے۔ بس اب فقط ذلت بھری زندگی تھی۔ دہشت کی سیاہی تھی جو اس کے چہرے پر رقم تھی۔



آج بی جان ہمسایے میں کسی فوتگی پر گئی تھیں۔ فوتگی سے واپسی دیر سے ہونی تھی۔ اس نے سوچا آج سنہری موقع ہے کہ آج بابا جانی کے کمرے میں جائے۔ وہ بابا جانی کے کمرے میں گئی۔ باہر سے لاک تھا۔ ہانیہ کو یاد آیا کہ ڈپلی کیٹ چابیوں کا گچھا کہاں ہوتا ہے۔ وہ بی جان کی الماری میں ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ اس نے بی جان کی الماری سے ڈپلی کیٹ چابیاں لیں۔ باری باری آزمایا تو ایک چابی لگ گئی۔ اس نے دروازے کھولا اور اندر چلی آئی۔ کافی عرصہ بند رہنے کی بدولت عجیب سی بساند کمرے میں چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اندازے سے لائٹ جلائی۔ تو تمام کمرا روشنی میں نہا گیا۔ چار سو تصاویر آویزاں تھیں۔ مگر کسی سفید کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک تصویر سے کپڑا ہٹایا۔

"ارے یہ کیا... اف... اف نہیں۔" وہ ایک دم پیچھے ہٹی تھی۔ وہ اس صورت کو اس چہرے کو جانتی

تھی۔ یہ چہرا اس کے لیے اجنبی نہ تھا۔ ارم کے گھر بارہا وہ گئی تھی تو آنٹی سے بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ ہر تصویر پر زہرہ لکھا تھا۔ "زہرہ درانی"

"کیا یہ میری ماما ہیں؟" سوال تھا کہ خنجر لیے ہوئے۔ وہ صدمے کی کیفیت میں ہر تصویر دیکھتی رہی۔ اسے اندازہ نہ ہوا کہ کتنی دیر ہوگئی ہے۔ اسے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی تو اس نے دیکھا تو بابا جانی کھڑے تھے۔ اسے بابا جانی بے حد بوڑھے لگے۔ بے حد آزردہ سے ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔

"بیٹا! اب اگر تم آہی گئی ہو یہاں تو جان لو کہ یہ ہی تمہاری ماما ہیں۔ حیات ہیں۔ مگر اب میرا ان سے کوئی تعلق نہیں' سوائے ایک تمہارے ناطے کے۔" یہ کہہ کر وہ رکے نہیں تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔



بابا جانی نے اسے منع نہیں کیا تھا۔ اسے اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ چاہے تو اپنی ماں سے مل لے۔ اس کی ایسی خاص تمنا نہ تھی' مگر کچھ سوالات تھے جو تشنہ لب تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ ان سوالات کے جوابات حاصل کرے اور اپنی تشنگی کو آسودگی میں بدل ڈالے۔ وہ اسی غرض سے ان سے ملنے گئی تھی۔ ارم نے اسے دیکھا تو نظریں چرا گئی تھی۔ ہانیہ نے ارم کو گلے سے لگایا تو ارم بھی رو دی تھی۔

"ہانیہ مجھے معاف کردو۔ میں نے بہت برا چاہا تمہارے حوالے سے۔ میں ناقابل معافی ہوں۔" ارم کے چہرے پر سچی ندامت تھی۔

"تم جانتی ہو ہانیہ اس کو کھو کر مجھے ادراک ہوا کہ میں تو خود اس کی محبتوں پر ایمان لے آئی تھی۔ اب خود کو ادھورا پاتی ہوں۔ اب مجھے چار سو خاور کی خوشبو ملتی ہے' مگر وہ خود نہیں ملتا۔ دیکھو اس کی تلاش میں میرا سارا وجود سنگ ریزہ ہوگیا ہے۔" ارم نے رو کر کہا تھا۔

"میں نے تمہیں معاف کیا' کیونکہ تم غیر نہیں ہو۔ میری بہن ہو ارم۔"

"کیا کہا۔" ارم نے بے یقینی سے دیکھا۔ تب ہی زہرہ کمرے میں آئی تھیں۔ ہانیہ کی بات پر وہ صدمے سے ہل بھی نہ سکی تھیں۔ ہانیہ ان کی اپنی اولاد تھی۔ یہ وہی ہانیہ تھی جس کو وہ چھوڑ کر آگئی تھیں۔ اپنی خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے۔ ہانیہ اور زہرہ کی نظریں ملیں تھیں۔

"ہانیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" زہرہ نے کہا۔ "یہ تمہاری بہن ہے۔ مگر سوتیلی بہن۔" ان کی آواز میں درد تھا۔ ارم بے حد خوش تھی۔ وہ اسی خوشی میں چائے لینے چلی گئی۔ ہانیہ اور زہرہ بے حد خاموش صوفے پر بیٹھی تھیں۔ آخر زہرہ نے اس خاموشی کو توڑا تھا۔ ہانیہ تمہارے بابا بہت عظیم انسان ہیں۔ ان سے کہنا میں نے ان کو کھو کر بہت کچھ کھو دیا۔ اپنی انا' عزت نفس' اپنا وقار اور تمہیں بھی۔" وہ رو رہی تھیں۔ "آج میرے پاس سب کچھ ہے' مگر سکون نہیں ہے۔ بابا سے کہنا مجھے معاف کردیں' تاکہ مجھے سکون مل جائے۔" وہ رو دیں۔ "شعیب نے ارم کے دل میں تمہارے بابا جانی کے خلاف زہر بھر دیا ہے۔ حالانکہ ارم کا تو کوئی واسطہ بھی نہ تھا درانی سے۔ مگر شعیب اتنا زہریلا ہے کہ وہ زہر آلود کرنے کا کوئی موقع نہیں گنواتا ہے۔" تب ہی آہٹ پر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

"تم دونوں باتیں کرو' میں آتی ہوں۔" زہرہ سے بیٹھنا دشوار تھا' دل آبدیدہ تھا۔ وہ بہت سا رونا چاہتی تھیں' تنہائی میں۔ وہ اتنا بھی حق نہ رکھتی تھی کہ ہانیہ کو چوم لیتیں۔ وہ چلی گئیں تھیں تو ارم بولی۔

"مجھے معاف کردیا نا ہانیہ۔" ارم نے اس سے پوچھا۔

"ہاں معاف کردیا اور ارم! خاور کو میں ضرور بتاؤں گی کہ تم اس کی آرزو ہو تو تمہاری آرزو بھی ارم کے دل میں عود کر آئی ہے۔ دعاؤں میں بہت تاثیر ہوا کرتی ہے۔" ارم پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ دونوں گلے لگ کر بے ساختہ رو دی تھیں۔ اس رونے میں غم اور خوشی دونوں کا امتزاج اور آمیزش تھی۔



بابا جانی کو اس نے من و عن تمام کتھا سنا ڈالی تھی۔ بابا جانی سر جھکائے اس کی تمام بات سن رہے تھے۔

"بیٹا! میں تو تمہاری ماما کو کب سے معاف کر چکا ہوں۔ بس دل سے ہی نہ نکال سکا۔ میں نے کبھی چاہا ہی نہیں کہ اسے دل سے کھرچ ڈالوں۔" بابا جانی کا لہجہ بے حد آزردہ تھا۔ ہانیہ نے بڑھ کر بابا جانی کا برف بار ہاتھ تھام لیا تھا۔



آفتاب عالم نے باقاعدہ اپنے والدین کو ہانیہ کے گھر اس کا ہاتھ مانگنے کے لیے بھیجا تھا۔ جسے غور و خوض کے بعد درانی صاحب نے قبولیت کی سند بخش دی تھی۔ بی جان نے جب ہانیہ سے پوچھا تو اس نے شرما کر سر جھکا دیا تھا۔ آج اس کا نکاح تھا۔ گھر میں بے حد سادگی سے رکھا گیا تھا۔ ہانیہ نے بطور خاص زہرہ بیگم کو مدعو کیا تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ ضرور شرکت کریں۔ مگر شرمندگی کے بوجھ میں لپٹا زہرہ بیگم کا وجود درانی صاحب کے مدمقابل آنے کی خود میں ہمت نہ پاتا تھا۔ سو انہوں نے بہانا بنا کر معذرت کر لی تھی۔ شاید یہ ہی ان کی سزا تھی کہ آج اپنی بیٹی کے اہم دن پر بھی وہ شرکت کا حق گنوا بیٹھی تھیں۔ آفتاب اور ہانیہ کو روبرو بٹھایا گیا تھا۔ باقاعدہ رنگ بھی تبدیل کی گئی تھیں۔ ہانیہ کی رنگ پر اے اور آفتاب کی رنگ پر ایچ کا ورڈ جگمگا رہا تھا۔

بابا جانی بے حد سرشار تھے۔ بی جان کی آنکھیں خوشی سے اشکبار تھیں۔ اپنے بیٹے کے چہرے پر حسرت کے کھوئے ہوئے رنگ دیکھ کر وہ نہال ہو رہی تھیں۔ وہ سمجھ نہ سکی تھیں کہ درانی صاحب اس لیے آسودہ تھے کہ انہوں نے تو اپنی محبت گنوا دی تھی مگر ان کی بیٹی نے اپنی محبت کو پا لیا تھا۔ آفتاب نے مسکرا کر ساتھ بیٹھی کانچ سی لڑکی کو دیکھا۔ جو ہر بار کی طرح آج بھی شرمائی ہوئی، سر جھکائے تھی۔ اسے ہانیہ کی یہ ہی بات پسند تھی کہ وہ سب لڑکیوں سے مختلف اپنے دل کی بات دل میں رکھنے والی مشرقی لڑکی تھی۔ ورنہ لڑکیوں کے آزادانہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر ایک وقت میں تو اس نے شادی کے نام سے ہی توبہ کر لی تھی۔ مگر پہلی مرتبہ جب ہانیہ کو دیکھا تھا۔ تب سے اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس پیاری سی لڑکی کو ہی جیون ساتھی بنائیں گا اور آج وہ واقعی ان کی منکوحہ تھی۔

ہانیہ خان درانی سے ہانیہ آفتاب عالم بن گئی تھی۔

ہانیہ اس دن بہت سرشار تھی، بعض محبتیں انسان پر بارش بن کر نازل ہوا کرتی ہیں۔ ان کی ننھی ننھی پھوار انسان کو قلب جاں تک سیرابی عطا کرتی ہے۔ زندگی دھوپ کی تپش بھی ہے اور ڈھلتی شام کی خنک رو چھاؤں بھی، بسا اوقات یوں ہی تمام عمر آبلہ پائی کا سفر طے کرنا پڑتا ہے اور پھر کبھی یوں ہی چلتے چلتے کوئی ہمدرد غمگسار مل جاتا ہے، جیسا ہانیہ کو مل گیا تھا آفتاب کی صورت میں۔۔۔

ساجدہ حسین

اک تمنا لاحاصل

آج موسم مائنس ڈگری پر چل رہا تھا اور کینیڈا کی اس سردی کے ہم عادی ہو چکے تھے۔ آج بچے مزے سے اپنے پاپا کے ساتھ ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے اور میں ٹی وی سے الرجک کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ میپل کے درخت سفید سفید برف سے اٹے پڑے تھے زندگی مفلوج ہونے کے باوجود یہاں چلتی پھرتی رہتی ہے۔ میرے دل میں نجانے کیا سمائی کہ جلدی سے سنو جیکٹ اور شوز پہن کر عادل سے کہا کہ "میں مریم کی طرف جارہی ہوں۔"

"اس وقت؟" وہ خلاف توقع حیرت سے بولا۔ ویسے وہ میری بے وقت کہیں نا کہیں روانگی کا عادی تھا۔

"ارے بابا برابر میں ہی تو جارہی ہوں کون سا مال جارہی ہوں۔"

"او کے او کے گو ہیڈ۔" وہ لاپروائی سے بولا۔ میں جلدی سے برف پر چلتی لان کراس کرکے مریم کے کچن کی جانب چل دی ان کا کچن بیک ڈیک کی طرف تھا۔ لمبے لمبے شیشوں سے برف کا نظارہ بہت خوب صورت لگتا تھا۔ وہ اکیلی بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں میرے شیشہ بجانے پر وہ چونکیں۔

"السلام علیکم!" انہوں نے خوش دلی سے دروازہ کھول کر مجھے گلے لگالیا۔

"یار کافی کا موڈ ہورہا تھا۔" میں نے اپنی جیکٹ اسٹینڈ پر ٹانگتے ہوئے کہا۔

"او شیور۔ آؤ..... آؤ۔" انہوں نے میرے اندر پہنچتے ہی الیکٹرک کیٹل آن کردی اور میں کارپٹ پر پڑے بڑے بڑے ریڈ کشن پر براجمان ہوگئی۔

وہ ہمیشہ کی طرح ہولے ہولے گنگنا رہی تھیں اور پھر مزے دار سے کافی بمعہ براؤنیز کے جو وہ خود بیک کرتی تھیں، لے کر آگئیں۔ آنکھوں میں ہمیشہ کی اداسی تھی۔

"یہ نرگسی آنکھیں۔" میرے چھیڑنے پر وہ مسکرا دیں ان کی گہری نرگسی آنکھوں میں اداسیوں نے ڈیرے جمارکھے تھے۔ وہ بہت زود رنج تھیں، میں نے ہمیشہ انہیں اداس پژمردہ دیکھا کوئی بہت گہرا دکھ اپنے اندر چھپائے پھرتی تھیں۔

فیض احمد فیض کی یہ غزل اکثر گنگناتی تھیں۔ "نثار میں تیری گلیوں کے" آواز میں عجیب سوز پنہاں تھا۔ میرے اکثر پوچھنے پر وہ ٹال جاتیں۔ "لگتا ہے پاکستان سے دوری آپ کو یہ غزل گنگنانے پر مجبور کرتی ہے۔" انہوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ پھر وہ چپ ہوکر خلاؤں میں گھورنے لگیں۔ نجانے کون سی دکھ بھری یاد ان سے وابستہ تھی، میں کافی پیتے پیتے ان کے بارے میں سوچتی گئی میری تشویش بڑھتی جاتی اور الجھی گتھی کے دھاگے مزید الجھتے جاتے۔

"کافی ٹھنڈی ہورہی ہے۔" میرے کہنے پر وہ چونکیں۔

"آپ اتنی دکھی کیوں ہیں کون سا دکھ ہے خدارا! میں آپ کے ساتھ پچھلے دس سال سے رہ رہی ہوں، مگر اس مصروف زندگی میں کبھی موقع نہ ملا کہ آپ سے اس اداسی کے بارے میں استفسار کرسکوں کیا آپ کو پاکستان، اپنے پیرنٹس یاد آتے ہیں یا پھر زین؟" میرے پوچھنے پر وہ ہلکے سے مسکرائیں۔

"ہاں! بہت سی چیزیں ہیں۔"

"رومی تم تو جانتی ہو پاکستان میں میرا اب کوئی

نہیں۔ ماں کے مرنے کے بعد پاپا بھی چل بسے۔"

"یہ تو نیچرل فیکٹس ہیں۔" میں نے قدرے لاپروائی سے کہا تو وہ مسکرا دیں۔

"ہاں ہیں تو فیکٹس، مگر کچھ حقیقتیں اتنی تلخ ہوتی ہیں کہ بھلائی نہیں جاسکتیں۔" اور پھر وہ خلا میں گھورنے لگیں۔



"وہ بہت بادلوں بھری خوب صورت شام تھی اور بادل ہمیشہ میری کمزوری رہے ہیں۔" مریم نے گویا اپنے لب کھول دیے اور ماضی کے دریچے ہولے ہولے وا کرنے لگیں۔

میں اپنی اسائنمنٹ مکمل کر رہی تھی دیر کافی ہو چکی تھی۔

"اف... پانچ بج گئے۔" میں جلدی سے بیگ اٹھا کر نکلنے لگی کہ زین آگیا۔ "جا رہی ہو۔"

"ہاں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"کیسے جاؤ گی۔"

"گاڑی ہے میرے پاس۔" میں اسے چابی دکھا کر جلدی سے پارکنگ کی طرف چل دی۔ وہ میرا بہت اچھا کلاس فیلو، بچپن کا دوست اور فسٹ کزن تھا اور میری ہر اچھی بری بات سے واقف تھا۔ پڑھتے

پڑھاتے وقت پر لگا کر اوڑنے لگا اور زین کو آرمی میں کمیشن مل گیا اور وہ سیالکوٹ چلا گیا۔ پھر میری تعلیم بھی آگے بڑھنے لگی اور میں نے اکنامکس میں ماسٹر کرلیا۔ سبجیکٹ بہت بورنگ اور تلخ تھا، مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے ایک ایمبیسی میں اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں اچھی جاب مل گئی۔ امی کی وفات کے بعد ابا بالکل اکیلے رہ گئے تھے اور فارغ وقت میرا ابا کے ساتھ ہی گزرتا۔ پھر ایک دن زین کا فون آیا کہ وہ کیپٹن ہوگیا ہے اور عنقریب اسلام آباد آرہا ہے۔ میں ابا کے لیے چائے بنارہی تھی کہ وہ ہمیشہ کی طرح بغیر بتائے کچن میں آدھمکا میری خوشی کی انتہا نہ رہی وہی جو ایک دیرینہ دوست کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے میں بورنگ ماحول میں بیٹھنے نہیں آیا۔" اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر باہر نکالا۔

"واٹ ڈو یو مین بورنگ ماحول۔" میں نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں نا بھئی اتنے عرصے بعد کچن میں بیٹھنے نہیں آیا۔ چلو بارش میں گھومتے ہیں۔"

"آخ!" میں نے برا سا منہ بنایا۔ تو وہ مجھے کھینچتا ہوا لان میں لے گیا۔

"منہ اوپر کرو۔" عجیب سا آرڈر تھا۔

"کیا۔"

"ارے کرنا یار!" اس کا یہ ہی اسٹائل تھا۔ میں نے منہ اوپر کیا تو بارش کے موٹے موٹے قطرے میرے چہرے پر گر کر میرا چہرا بھگو گئے۔

"ان قطروں میں قدرت کے بہت سے راز پنہاں ہیں۔" اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"مثلاً!" میں نے ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔ جو بہت وجیہہ ہوگیا تھا موٹی موٹی سیاہ موچھوں تلے ہلکی ہلکی مسکان تھا، وہ بہت ہینڈسم مگر میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔

"تم نک چڑھی کی نک چڑھی ہی رہنا کبھی قدرت کو انجوائے نہ کرنا۔"

"اچھا تو بتاؤ نا فلاسفر صاحب ان بارش کے قطروں میں قدرت کے کون سے راز پنہاں ہیں۔"

"دیکھو بارش اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت ہے یہ جو اب ہم پر برسی تو کیا اس کی رحمت نہیں! ہمارے باہر آنے پر وہ اپنی اس رحمت کو روک بھی تو سکتا تھا۔ یہ اسی کی قدرت کا کمال ہے جہاں چاہے جس پہ چاہے اپنی رحمت کا نزول کردے۔" میں بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ بہت حکیمانہ گفتگو کررہا تھا۔

"یہ تم آج کل کوئی درس ورس تو نہیں اٹینڈ کررہے۔" میں نے ازراہ مذاق اسے چھیڑا تو یک دم مزاح سے سنجیدگی کی طرف لوٹ آیا۔

"نہیں یہ بات نہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"آج کل میں قرآن اسٹڈی کررہا ہوں۔"

"او۔۔۔ آئی سی۔" پھر ہم ایک ریسٹورنٹ میں کافی پینے چلے گئے۔ اس نے بیٹھتے ہی میرا ہاتھ پکڑ کر دیکھنا شروع کردیا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔ "اور تمہیں پتا ہے اسلام میں ہاتھ دیکھنا منع ہے، چالیس دن کی نمازیں ضائع ہوجاتی ہیں۔"

"یس آئی نو۔۔۔" اس نے میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب دیکھ لیا تو بتادو کیا دیکھا۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"بتاؤ نا پلیز۔۔۔!" میں نے اصرار کیا۔

"بس اتنا جانتا ہوں کہ تمہاری شادی ایک فورسز کے بندے سے ہونے والی ہے۔"

"او۔۔۔ یہ بات ہے۔"

"اور ہاں آگے بھی سنو!"

"۔۔" میں نے حیرت سے دیکھا۔

"پھر تمہیں ایک بچے سے عشق ہوجائے گا۔" اور ساتھ ہی وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگیا۔ میں نے ٹشو گھما کر اسے مارا۔

"مگر یہ تو تمہارا ہاتھ کہہ رہا ہے۔"

"اور تم بکواس کرتے ہو۔ ضائع ہوگئیں تمہاری

نمازیں۔" میں نے اسے چھیڑا۔



زندگی کے بھاگتے دوڑتے لمحوں میں پتا چلا کہ زین میجر ہوگیا ہے اور اس کے ساتھ ہی تایا ابا نے میرا رشتہ مانگ لیا۔ پھر کافی دن شادی کی تیاریوں میں لگ گئے۔ شادی کی تیاری میں نے اور زین نے مل کر کی اور پھر میں مریم سے مسز زین بن گئی۔ زین کے ساتھ شادی کا تجربہ خاصا اچھا رہا۔ کوئی چیز نئی نہیں تھی۔ ایک روز میں اور زین لان میں بیٹھے مختلف ٹاپک پر باتیں کررہے تھے کہ اچانک زین بہت سنجیدہ ہوگیا۔

"تم جانتی ہو نا ہم آرمی والوں کی زندگی رسک پر ہوتی ہے۔ کسی وقت جنگ کی کال آسکتی ہے اور ہمیں محاذ پر جانا پڑجاتا ہے۔ مریم میری خواہش ہے کہ میں اپنے وطن کی خاطر شہید ہوجاؤں۔ اور تمہیں پتا ہے جب ہم یونیفارم پہن لیتے ہیں نا تو پھر شہادت کا جذبہ بڑی شدت سے دل میں اترتا ہے۔ وہ جذبہ ایک محب وطن سپاہی کا جذبہ ہوتا ہے۔" میں نے اس کے سنجیدہ چہرے کو بغور دیکھا۔ اس نے کبھی ایسی سنجیدہ گفتگو نہیں کی تھی۔

"کیا کوئی الارمنگ سچویشن ہے؟"

"نہیں ایسے ہی۔" اس نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے کہا تو میں کچھ پریشان سی ہوگئی۔

"ہماری زندگیوں میں ایسے موقعے آسکتے ہیں لہٰذا ڈونٹ وری اباؤٹ اٹ۔ اور تم ایک سپاہی کی بیوی ہو سو بی بریو۔"



شادی کے تین ماہ بعد زین سیاچن چلا گیا مجھے اکیلا چھوڑ کر۔ وہ بڑے روح فرسا اور جانگسل لمحے تھے جو میں نے گزارے۔ ابا نے مجھے اسلام آباد بلالیا یہ بڑی عجیب سی بات تھی وہی گھر جہاں میں نے بائیس سال گزارے تھے میرے لیے بڑا سونا سونا اور اداس سا ہوگیا تھا۔ سائیں سائیں کرتے کمرے میں اور ابا۔ اس عالم تنہائی میں ابا نے میرا حوصلہ بندھایا۔ ابا کے اور زین کی اجازت سے میں نے ایک این جی او جوائن کرلی یہ این جی او ایک ورلڈ وائڈ ایجوکیشن سے متعلق تھی تمام پس ماندہ علاقوں کا ڈیٹا جمع کرتا تھا اور پھر ان پر کام۔ میں نے پاکستان کے پس ماندہ علاقوں کو ترجیح دی۔ اس جاب میں خاصا وقت گزر جاتا۔ رات زین سے بات ہوجاتی' مگر سگنل کی وجہ سے بھی بات لمبی نہ ہوپاتی وہ برفانی پہاڑوں پر اہلگو میں رہتا تھا۔ جب اسے گھر یاد آتا تو فیض احمد فیض کی یہ غزل گنگناتا۔ "نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن" اور رومی یہ ساری چیزیں جو ہماری زندگیوں میں وقوع پذیر ہونے والی ہوتی ہیں نا وہ مقدر کردی جاتی ہے اور یہ اللہ کا نظام قدرت ہے پھر ہم اسے مصلحت سمجھ کر اگلے لمحے میں ہونے والے واقعہ کا انتظار کرنے لگ جاتے ہیں۔"

مریم نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خلاؤں میں گھورنے لگی' میں بغور ان کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ ان کے مدبرانہ چہرے پر دھوئیں کے کئی بادل ایک ساتھ لہرا گئے۔ بمشکل انہوں نے اپنی آنکھوں کو رگڑا۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھیں' مگر بڑی دل نشیں۔ میں ان کی کمپنی میں خاصی محظوظ ہوتی تھی۔ وہ پچھلے دس سالوں سے میری ہمسائی تھیں اور ہم کینیڈا میں قیام پذیر تھے۔ اپنے ابا کی وفات کے بعد مریم نے اپنی جائداد بیچ کر کینیڈین امیگریشن لے لی تھی۔ پھر انہوں نے مزید تعلیم حاصل کرکے ایک بہت اچھی فنانس کمپنی میں جاب کرلی تھی۔

"پھر کیا ہوا مریم.... زین واپس آئے؟"

"نہیں۔"

"کیا؟" آواز میرے حلق میں اٹک گئی۔

"ایک روز رات کے وقت اچانک وہاں دشمن کی طرف سے فائرنگ ہوئی اور زین سمیت ہمارے دو اور جوان شہید ہوگئے۔ چار دن بعد اس کی باڈی تابوت میں بند لائی گئی۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا کہ وہ وطن پر قربان ہونا چاہتا ہے۔"

"اُف...." میں نے دکھ سے سوچا اور میرا گلا آنسوؤں

سے رندھ گیا۔

"پھر؟" میرا تجسس بڑھتا جارہا تھا۔

"پھر میں اپنی زندگی سے اتنا مایوس ہوئی کہ ہر طرف مایوسی نظر آنے لگی۔ زندگی کے شب و روز انتہائی مایوس کن گزرنے لگے۔ اور...." پھر ایک لمبی خاموشی تھی۔ باہر سرد ہوائیں سیٹیاں بجاتی گزر رہی تھیں۔ اندر کا ماحول عجیب سا ہوگیا تھا۔ "میرے اپنے وطن میں کوئی نہ تھا سوائے تایا ابا کے ابا کے انتقال کے بعد انہوں نے میرا رشتہ اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے مانگا تو میں نے سختی سے انکار کردیا جس کی وجہ سے وہ بہت برہم ہوئے اور مجھ سے تعلق توڑنے کی دھمکی دی تو میں نے اپنی پراپرٹی (جائداد) کو بیچ کر کینیڈین امیگریشن لے لی اور پھر میں یہیں شفٹ ہوگئی۔" مریم کے بارے میں میرا تجسس بڑھتا گیا نہ جانے آج اتنے برسوں بعد مریم سے کیوں ان کے دل کے پھپھولے کریدنے بیٹھ گئی۔ شاید آج بہت عرصہ بعد ہم لمبے عرصہ کے لیے اکٹھے بیٹھے تھے۔

"تو آپ کا کوئی.... بچہ....؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں...." انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔

"اچھا تو پھر کبھی شادی کا نہیں سوچا۔"

"نہیں کبھی خیال ہی نہیں آیا۔"

"تو کیا آپ تنہا خوش ہیں اور آپ کی زندگی میں کوئی آیا ہی نہیں۔"

"ہوں...." لمبی ہوں کے بعد وہ خاموش ہوگئیں۔

"مگر آپ تو ابھی بھی...." میں نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"جی.... جی بالکل ابھی بھی...." وہ طنزاً ہنسی۔ پھر مریم نے اپنی زندگی میں رونما ہونے والا ایک اور واقعہ سنایا جس نے ان کی زندگی کو مزید بکھیر دیا تھا یا شاید ہمیں اپنے جذبات پر کنٹرول نہیں رہتا۔



"ایک روز میں آفس سے چھٹی کرکے واپس آرہی تھی کہ سگنل پر رک گئی۔ میری نظر روڈ پر لگے ایک بڑے سے پوسٹر پر رک گئی۔ فلم فیسٹیول ہو رہا تھا یہ تین دن ایرانی فلموں کے دن تھے۔

"کوئین اسٹریٹ ای روز تھیٹر برمنٹن" میں نے جلدی سے پتا نوٹ کیا اور فلم فیسٹیول جانے کا پروگرام بنا لیا' اتفاق سے جس ملک کی فلم چلتی فیسٹیول میں اس کی پوری ٹیم آیا کرتی بمعہ ہیرو ہیروئن اور سارا عملہ وغیرہ۔ یہ تینوں فلمیں ایران کے منصور سید الفراج کی تھیں جو میرا بہت فیورٹ تھا۔ گہری نیلگوں آنکھوں والا وہ ینگ سا خوب صورت ہیرو۔ یہاں ہمارے ارد گرد کتنے سبز اور نیلی آنکھوں والے لڑکے بکھرے ہیں کبھی نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ ایک بڑی مزے دار سی ایکٹولی کے تحت میں فلم دیکھنے چلی گئی۔

فلم خاصی ٹریجک تھی اور ہیرو کا کام کمال تھا گو کہ فلم فارسی زبان میں تھی اور انگلش سب ٹائٹل کے ساتھ تھی' میں نے پڑھا تو کم مگر فلم زیادہ دیکھی پھر مجھے سمجھ میں نہ آیا کہ میں تھیٹر کے باہر اپنی گاڑی میں نہ جانے کیوں بیٹھی رہی میری نظریں مسلسل تھیٹر کی جانب لگی تھیں کہ اچانک ایرانی تمام ٹیم بمعہ اس خوب صورت ہیرو کے بلیو جینز اور میرون چمک دار شرٹ میں ملبوس چیونگم چباتا ہوا کوئی تیس بتیس سال کا نوجوان نکلا نہ جانے کیسے میں بھیڑ کراس کرتی اس کے پاس جا پہنچی۔

"ہیلو...." میں نے پھولی سانس سے اسے دیکھ کر کہا تو وہ مڑ کر دھیمے سے مسکرایا۔

"آٹوگراف پلیز...." میں نے اپنا ہاتھ آگے کردیا تو اس نے بغیر میرا ہاتھ پکڑے اپنے سائن کردیے اور شان بے نیازی سے چلا گیا اور میں کافی دیر اس کی پشت دیکھتی رہی اسے اپنی بے تحاشا خوب صورتی کا اندازہ تھا اس سے پہلے میں نے اس کی کافی فلمیں انگلش اینگ میں دیکھی تھیں مگر اچانک اپنے شہر میں دیکھ کر میری تو حالت ہی بدلی تھی۔ میرے اندر بالکل ایک عجیب سا ہیجان برپا تھا میں اسے کوئی نام نہیں دے سکتی پھر گاڑی اسٹارٹ کرکے میں اسٹار بکس کے آگے رکی۔

ٹھنڈ کی وجہ سے کافی کی طلب ہو رہی تھی۔

دوسرے دن موسم بہت خوب صورت اور خاصا چمک دار تھا اوائل اپریل کی خوب صورت، مگر ٹھنڈی دھوپ۔ دوسرے دن کی فلم "لو اسٹوری تھی" چنانچہ میں دوسرے دن پھر فلم دیکھنے چلی گئی اس روز بھی یہی ہوا میں فلم دیکھنے کے بعد گاڑی کے بجائے تھیٹر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر نہ جانے کیوں اس ہیرو کا انتظار کرنے لگی جس سے میرا کوئی واسطہ نہ تھا، مگر میری بڑی عجیب سی کیفیت تھی جو مجھے بھی سمجھ نہ آئی اور آج اچانک وہ تیزی سے اکیلا ہی نمودار ہوا نیوی بلیو جیکٹ اور ریڈ اسکارف میں بلا کا حسین لگ رہا تھا۔

"ایکسکیوزمی!" وہ جاتے جاتے رکا اور پھر مڑ کر ٹھہر گیا۔

"کین یو پلیز کم اینڈ آ کپ آف کافی ودمی۔" میں نے بغیر توقف سے کہہ ڈالا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ بلینک سا مجھے دیکھنے لگا گویا یہ بات اس کے غیر متوقع تھی پھر وہ کسی کو بتا کر میری سوچ کے برعکس وہ میرے ساتھ چل دیا۔ وہ دھیمے دھیمے مسکرا تا رہا اور میں اسے گاڑی میں لے کر کافی شاپ آگئی بعد میں مجھے اپنی یہ حرکت بالکل بچگانہ سی لگی، مگر وہ سب اچانک ہوا شاید وہ ہیرو میرا پسندیدہ تھا۔ میرے سامنے ہلکے ہلکے کافی پی رہا تھا۔ کافی کے اٹھتے دھوئیں کے پیچھے اس کی گہری نیلی آنکھیں دھندلا سی رہی تھیں۔

"کین یو اسپیک انگلش؟" اس نے مسکرا کر اثبات میں سرہلایا تو میں نے اسے بتایا کہ میں اس کی بہت بڑی فین ہوں سمجھ میں نہ آنے کے باوجود فارسی فلمیں دیکھتی ہوں میرے "نہ سمجھ آنے" پر وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ اس دن میں بہت خوش تھی میرے دل کی عجیب کیفیت تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک غیر ملکی مجھ سے بالکل مختلف ہے۔ اس نے ٹھہر ٹھہر کر انگریزی میں مجھے بتایا کہ وہ بھی مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا ہے حالانکہ اس کے سینکڑوں پرستار تھے، میں نے جلدی سے اس کا فون نمبر اور ای میل لے لیا اور پھر اگلے دن دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے پھر کبھی نہ ملنے کا وعدہ کیا۔ ہاں اگر پھر کبھی لائف میں کینیڈا آنا ہوا تو مجھ سے کانٹیکٹ کرے گا ورنہ ممکن نہیں۔

فلم فیسٹیول کا تیسرا اور ایرانی مووی کا آخری دن تھا یہ اس کی تیسری ایوارڈ یافتہ فلم تھی۔ وہ مجھے چند لمحے ملا اور پھر بغیر کچھ کہے چلا گیا اور میرا دل ایک بھاری بوجھ تلے آکر دب گیا حالانکہ وہ ایک چھوٹا سا ینگ لڑکا تھا' میں بھاری دل لیے گھر آگئی اور رات تک سوچتی رہی۔



دن روزانہ معمول کے مطابق گزرنے لگے صبح شام کا چکر بھی فرینڈز کے ساتھ ملاقات ہو جاتی تو دن اچھا گزر جاتا۔ ورنہ وہی عالم تنہائی اور دل پر لگی اداسی اک کائی بن کر جمی تھی جو کسی طور اترنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ زین سے بچھڑنے کا غم اور تنہائی کیا کم تھی کہ ایک اجنبی سے لڑکے کے جانے کی تنہائی کا غم بھی پال لیا۔ بھلا میرا اس ایکٹر لڑکے سے کیا کام جس کی معاشرتی رنگ نسل تہذیب اور زبان فرق، مگر اس کے باوجود ایک ان دیکھی محبت میرے اندر پروان چڑھنے لگی اور پھر مجھے زین کی وہ بات یاد آنے لگی۔ "تم ایک بچے سے عشق کروگی" اور میں نے اسے مذاق میں اڑا دیا تھا۔

اسی طرح دن اپنی رفتار سے گزرنے لگے۔ ایک دن میں اپنی ایک دوست کا نمبر تلاش کر رہی تھی کہ ڈائری میں سید الفراج کا ای میل ایڈریس اور فون نمبر نظر آیا اور میں نے پورے چار سال بعد اسے ای میل کردی کہ "اگر میں ایران آؤں تو کیا تم مجھے ملوگے۔"

بہت دن گزرے کوئی جواب نہ آیا' میں بھی عجیب تھکی ہوئی عورت تھی بھلا ایک اتنا بڑا سلیبریٹی بھلا دو ہفتہ ملنے کے بعد مجھے کیوں جواب دے گا اور اب تو غالباً"بھول بھی چکا ہوگا' میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ میں اس کی عام سے پرستار ہی تو ہوں بھلا کیوں جواب دے گا۔

میں پھر اپنی دنیا میں لوٹ آئی کہ اچانک ایک دن اس کی میل کا جواب آگیا حیرت کی بات تھی کہ چار

سال بعد اس نے نہ صرف یاد رکھا بلکہ آنے پر اصرار کیا کہ میں آؤں اور وہ مجھے اپنے ملک کی سیر کرائے گا اور یہ کہ آج کل اس کی شوٹنگز آف ہیں وہ چھٹیوں پر تھا۔ میل کا جواب اس کا پرسنل سیکریٹری دیا کرتا ہے اور فون پر بھی اسی نے بات کرائی۔ نہ جانے مجھے کیوں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اسے صدیوں سے جانتی ہوں۔ پھر تقریباً" چار سال بعد میں نے ایران جانے کا ارادہ کیا۔ وہ خلاف توقع ایرپورٹ پر مجھے ریسیو کرنے آیا تھا اور میں سمجھ رہی تھی میں ناکام ہی واپس آؤں گی۔ مجھے اسکارف اور لونگ کوٹ میں دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"لکنگ گریس فل۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"یس! آئی ایم۔" میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

"نو۔ ناٹ بی فور۔" اس نے میرا بیگ پکڑتے ہوئے کہا۔

"واٹ ڈو یو مین۔" میں نے جواباً" پوچھا۔

"آپ شارٹ شرٹ جینز اور بغیر دوپٹے میں تھیں۔ پہلی بار۔" اس کی یادداشت پر میں حیران ہوئی اور ایران میں کوئی خاتون اس حلیے میں نہیں پھرتی یا بلیک گاؤن اسکارف یا لونگ کوٹ اسکارف سر کور۔" اسے اپنی تہذیب کا پتا تھا اور پسند بھی کرتا ہے۔ وہ مجھے کچھ بڑا بڑا سا لگ رہا تھا اور خوش یوں تھا کہ دو دن بعد اس کی شادی تھی اور یوں بھی خوش تھا کہ میں اس کی شادی میں شرکت کروں گی۔

"نو.... آئی ہیو ٹو لیو ڈے آفٹر ٹومارو۔" میں نے عجلت میں کہہ دیا۔

"تو.... " وہ تھوڑا حیران ہوا۔ "اتنی جلدی؟؟"

"ہاں! تم سے ملنا تھا۔"

"اتنا لمبا سفر صرف ایک دن ملنے کے لیے۔" اس نے حیرت میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

"ہوں۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔

"آپ کو میری شادی کا سن کر خوشی نہیں ہوئی میری لومیرج ہے۔"

"کیوں نہیں.... میں بہت خوش ہوں، مگر زیادہ رک کر کیا کروں گی۔ تم مجھے بہت پسند ہو فراج، مگر ایسا نہیں کہ میں تمہاری شادی سے ناخوش ہوں اور ناخوش ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں۔" میں نے روانی سے کہا "اور ویسے بھی یو آر لائک آ کڈ" (تم بچے جیسے ہو) اس پر وہ بہت زور سے ہنسا۔

"اوکے میم! تو پھر میری شادی تک رک جائیں۔ واپسی کی تاریخ تو نہیں نا میرا مطلب ہے اوپن ٹکٹ ہیں نا۔"

"اوکے۔"

"گڈ۔" اور وہ تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا اس کے شوفر نے میرا چھوٹا سا بیگ پکڑ لیا اور پھر میرے بک کرائے ہوئے تہران ہوٹل کے سامنے رکا۔

"کل آپ میرے ساتھ گھر چلیں گی اپنی فیملی سے ملواؤں گا۔"

"اوکے۔" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے باہر دیکھ کر کہا۔ تہران میں ٹھنڈ خاصی تھی اور کافی خوب صورت ملک تھا۔ میں اس کی فیملی سے ملی بہت سادہ لوگ تھے اور وہ فخریہ مجھے ملوا رہا تھا کہ کینیڈا میں صرف اس سے ملنے آئی ہوں۔ اس کی شادی خالص ایرانی روایتی طریقے سے ہوئی۔ شادی بہت دلچسپ تھی۔ اس کی بیوی بھی بہت خوب صورت اور نازک تھی۔ سفید ڈریس میں پری سے لگ رہی تھی۔ شادی کے بعد اس نے مجھے اپنا شہر اور خاص خاص جگہیں دکھائیں، شاپنگ کرائی۔ یہ ایرانی کارپٹ اس نے مجھے تحفے میں دیا تھا۔" مریم نے کارپٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"پھر میری اس سے فون پر بات ہوتی، مگر کم کم کیونکہ وہ بہت مصروف ہو گیا تھا۔ میں سوچتی ہوں کہ وہ بالکل مغرور نہیں تھا۔ میری اس کی ساتھ بڑی بے ضرر سے فرینڈ شپ ہو گئی۔ پھر وہ شادی کے کچھ عرصہ پھر میرے اصرار کرنے پر اپنی بیوی کے ہمراہ میرے پاس ٹھہرا۔ وہ ایک ہفتہ میری زندگی کا خوب صورت ترین زمانہ تھا۔ اب اس کی انگریزی بھی خاصی اچھی ہو گئی تھی۔ ایک دن میں نے اسے آفر کی کہ وہ اپنے

بیوی کے ساتھ کینیڈا ہمیشہ کے لیے رہ جائے۔ تو اس نے لحہ بھر کو مجھے حیرت سے دیکھا۔

"اینڈ واٹ اباؤٹ مائی مام۔" میرے دل کو دھکا سا لگا یہ میں کیا کہہ رہی تھی۔ وہ تو میرا کچھ بھی نہیں تھا۔

"نہیں نہیں میرا مطلب ہے ہالی ووڈ جوائن کرلو کوئی فلم۔۔۔۔"

"تو۔۔۔۔ میں جو کام کروں گا اپنے ملک کے علاوہ کسی دوسرے ملک کے لیے نہیں' ویسے بھی اپنے پیرنٹس سے دور نہیں جاسکتا۔" اور پھر ایک دن وہ دونوں چلے گئے اور اپنے پیچھے لامتناہی اداسی چھوڑ گئے۔" میں نے دیکھا مریم کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔

"پھر آپ کا اس کے ساتھ کوئی کانٹیکٹ نہیں ہوا۔"

"نہیں۔۔۔۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میری محبت میں شدت ہے اور میں اس پر ملکیت جتانے لگی ہوں۔ ویسے بھی وہ تو کسی کی پرا پرٹی تھا پھر وہ مجھے کبھی نہ ملا نہ فون پر رابطہ ہوا۔"

"آپ نے بھی۔۔۔۔" میری ادھوری بات پر وہ جلدی سے بولیں۔

"نہیں۔۔۔۔ مجھے اپنے والہانہ پن پر غصہ آنے لگا اور وہ چلا گیا۔" انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بے بسی سے کہا تو ان کی آواز رندھ گئی۔ باہر بارش کا زور ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا اور مجھے اپنے گھر جانا تھا' میں نے اپنا ہڈ پہنا اور جلدی سے لان کی دیوار سے اپنے گھر چھلانگ لگائی' میں مریم کو اداس چھوڑ کر گھر آگئی وہ پوری رات میں ڈسٹرب رہی۔



گزرتے دنوں میں اچانک مریم نے انکشاف کیا کہ وہ حج پر جارہی ہیں۔ کینیڈا سے ایک گروپ جارہا تھا چلو اچھا ہے۔ اب ان کی زندگی کا رخ بدل جائے گا اور پھر وہ حج پر روانہ ہوگئیں۔ سفید اسکارف میں وہ بہت پاکیزہ سی لگ رہی تھیں۔ مریم کے حج کا پروگرام پندرہ دن تھا۔ میں انہیں الوداع کہہ کر گھر آگئی۔ میں زیادہ اداس اس لیے نہ ہوئی کہ پندرہ دن بعد تو وہ واپس آجائیں گی۔

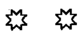
پھر ایک دن مریم نے فون کرکے بتایا کہ الحمدللہ انہوں نے حج کرلیا اور یہ کہ خوب ہم سب کے لیے دعائیں مانگیں اور حیرت انگیز خبر یہ تھی کہ سید الفراج طواف کے دوران انہیں نظر آگیا۔ بڑی عجیب بات مریم کے ساتھ ہوئی' یعنی وہ ہر دفعہ کہیں نہ کہیں اسے ملا۔

"آپ کی اس سے بات ہوئی؟"

"ہاں۔۔۔۔ ملی تھی' مگر اس کے لہجے میں خاصی اجنبیت آگئی تھی نہ جانے کیوں شاید عرصہ بعد ملا تھا۔" اور اس کے ساتھ ہی مریم کا فون منقطع ہوگیا۔ مریم کے آنے کے دن آہستہ آہستہ قریب آرہے تھے اور میرا انتظار بڑھتا جارہا تھا کہ ایک رات میں سونے جارہی تھی کہ فون کی بیل بجی حج گروپ سے کسی نامعلوم بندے کا فون آیا کہ طواف کے دوران دل کا دورہ پڑنے سے مریم کا انتقال ہوگیا۔

"اناللہ وانا الیہ راجعون" میں وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ گویا سارا آسمان میرے سر پر گر جائے گا۔ جب ہوش آیا تو میرے بچے اور شوہر میرے اوپر پریشان کھڑے تھے' مریم کی ڈیتھ کا سن کر عادل بھی سکتے میں آگیا۔ آخر مریم اپنے سارے دکھ لے کر اس مقدس سرزمین میں دفن ہوگئیں۔

"یہ جو آپ کی زندگی میں ہو رہا ہوتا ہے نا وہ آپ کا مقدر بن جاتا ہے۔" ان کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے' میں حسرت سے ان کے اس کاٹیج کو دیکھ رہی ہوں' جو چنار کے لمبے درختوں میں گھرا سائیں سائیں کرتی ہواؤں میں روحوں کا کوئی مسکن لگ رہا تھا۔ میری دیرینہ دوست مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی اور وہ سید الفراج کو جیسے غالباً "اپنے کھونے کا ڈر تھا" چپ چاپ کہیں گم ہوگیا۔ نہ جانے ہم اپنی زندگیوں میں ایسے لوگوں کو کیوں شامل کرلیتے ہیں جن کا ملنا اک تمنا لاحاصل بن جاتا ہے۔



دوسرا اور آخری حصہ

عنبرین ولی

ناولٹ

روشن چہرہ

"مجھے موحد کا فون آیا تھا۔" وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہاتھوں پر کولڈ کریم لگا رہی تھی جب زبیر نے اسے بتایا۔

"کون موحد؟ وہ جس نے تمہارے ساتھ یونی کے ابتدائی دنوں میں بدتمیزی کی تھی؟" مریم کا حافظہ کافی تیز تھا۔ زبیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اس نے تمہیں کیوں فون کیا؟" وہ حیران تھی۔

زبیر اس کے پیروں کے پاس لیٹ گیا اور سائڈ پر پڑا تکیہ کھینچ کر سر کے نیچے رکھ دیا۔

"اس دن جب اطہر کو امی اس گھر میں لے کر آئی تھیں اور تم نے مجھے فون کیا تھا تو میں پریشانی میں اپنے سارے نوٹس اور بیگ وہیں چھوڑ آیا تھا۔ اس وقت لائبریری میں موحد موجود تھا۔ میرے واپس نہ آنے پر اس نے میرا سامان اٹھا لیا۔ اب واپس کرنا چاہتا ہے۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"تم تین دن سے اس لیے ہونق تھے کہ نوٹس تم بھول آئے تھے اور یہ بات تم مجھے آج بتا رہے ہو؟" مریم نے غصے سے اسے تھپڑ مارا۔ زبیر نے اس کو گھورا۔

"ویسے یہ بدتمیز آدمی اتنا نیک کیسے ہو سکتا ہے؟ کہ تمہارا سامان اور نوٹس دینے کے لیے تمہیں کال کرے۔" مریم حیران تھی۔

"اب وہ اتنا بھی برا نہیں۔ لڑکے ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ اور یونی ورسٹی لائف میں تو یہ سب چلتا ہے۔"

"تم بہت طرف داریاں نہیں کر رہے اس کی؟" مریم نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

"میں نے کوئی طرف داری نہیں کی۔ میں تو صرف سچائی بیان کر رہا ہوں۔ اگر ایک بندے نے اچھائی کرنے کی ٹھانی ہے تو مجھ پر لازم ہے کہ میں اس کی برائی کو بھول جاؤں۔" مریم نے اسے گھور کر دیکھا وہ ہنس پڑا۔

☆☆☆

رات گہری ہو رہی تھی، وہ اسٹڈی میں کتابیں کھولے بیٹھا تھا لیکن اس کی توجہ کا ایک نقطہ بھی کتاب پر نہیں تھا۔ اس کی غلافی آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ دادی سے اور پھر ممی پاپا سے ہونے والی تلخ کلامی نے اس کا دماغ بھٹکا دیا تھا۔ ذہن کسی بھی ایک جانب مذکور کرنا بے حد مشکل تھا۔ پھر اسے اپنی گرل فرینڈ یاد آ گئی، اس سے زبیر اور زبیر سے وہ فون کال ریسیو کرنے والی لڑکی۔

وہ لڑکی یقیناً اس کی بہن ہو گی۔ کتنی خوب صورت آواز تھی اس کی، جیسے کوئی جھرنا بہتا ہو۔ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اسے فرصت سے سوچنے لگا۔ آواز اتنی حسین ہے چہرہ بھی ایسا ہی ہو گا۔ لیکن نہیں اکثر خوب صورت آواز رکھنے والے لوگوں کے چہرے حسین نہیں ہوتے۔ لیکن زبیر بھی ٹھیک ٹھاک ہینڈسم ہے۔ اگر وہ لڑکی اس کی بہن ہوتی تو یقیناً وہ بھی خوب صورت ہو گی۔ اس نے کتاب ہاتھوں میں اٹھاتے ہوئے سوچا اور پھر سے کتاب پر نگاہیں جما دیں۔ کوشش

کے بعد وہ پڑھائی پر توجہ مرکوز کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اگلی صبح اسے زبیر سے ملنے جانا تھا۔ زبیر نے اسے پرسنل نمبر سے کال کی تھی۔ اور جگہ متعین کی لیکن اس نے منع کر دیا۔

"تم میرے گھر آ جاؤ یا میں تمہارے گھر آ جاتا ہوں، ریسٹورنٹ میں جانے کا بالکل موڈ نہیں۔" اس نے بہانہ تراشا، موحد کی دل پھینک طبیعت اس سندر ناری کو دیکھنے کے لیے بے چین تھی۔ جس کی آواز نے ہی اس کے گرد مندر کی گھنٹیوں کا ساز بکھیر دیا تھا۔ اس کی توقع کے مطابق زبیر نے موحد کو گھر پر انوائٹ کر لیا تھا۔ موحد اچھی طرح تیار ہوا۔ اس کا بیگ اٹھایا اور ایک بار پھر اس لڑکی کی تصویر نکالی۔ "افسوس ہے زبیر تمہاری پسند پر۔۔۔ بے حد افسوس۔۔" اس نے ہنستے ہوئے وہ تصویر اسی جگہ پر رکھی اور بیگ بند کر دیا۔

☆☆☆

مریم کمرے میں بیٹھی کتاب پڑھنے میں مصروف تھی جب زبیر اس کے کمرے میں آیا۔ اس کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔

"ابھی مجھے موحد کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے



ڈنر پرانوائٹ کیا ہے۔" زبیر کی بات سن کر مریم کے ہاتھوں کتاب چھوٹتے چھوٹتے بچی۔
"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے؟ مہینے کا آخر چل رہا ہے اس نواب صاحب کو ایسے وقت میں کیوں دعوت دے دی؟" مریم بے اختیار پریشان ہوگئی تھی۔
"موحد نے کہا کہ وہ باہر ملنے کے موڈ میں نہیں ہے یا تو میں اس کے گھر آجاؤں یا وہ میرے گھر۔ اب ایسے میں، میں اسے کیسے منع کرتا۔" اس نے بے چارگی سے وجہ بتائی۔ مریم نے کتاب سائڈ پر رکھی۔
"اچھا کوئی بات نہیں۔ کس وقت تک آئے گا؟"
اس نے وقت پوچھا۔
"آٹھ بجے تک۔ تم بس دو چیزیں ہی بنانا۔ زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔" زبیر نے آہستگی سے کہا۔
"ارے اب ایسا بھی برا حال نہیں کہ میں اپنے بھائی کے مہمانوں کی ڈھنگ سے مہمان داری نہ کر سکوں۔ میں اس لیے پریشان ہوگئی تھی کہ ایسے لوگوں کے گھر تو ایک ایک وقت میں نجانے کتنے قسم کے کھانے پکتے ہیں۔ ہمارا اہتمام بھی اسے معمول لگے گا۔" مریم نے مسکرا کر وجہ بتائی۔ زبیر کے چہرے سے شرمندگی کم ہوئی۔ وہ اپنے کسی بھی دوست کو گھر پر اسی لیے مدعو نہیں کرتا تھا کہ یہ گھر مریم کی کمائی پر چلتا تھا۔ زبیر کے سارے خرچے بھی وہی پورے کرتی تھی۔ زبیر کی خواہش تھی کہ اگر وہ اس کی مدد نہیں کرسکتا، بوجھ کم نہیں کرسکتا تو کم از کم اس کی وجہ سے بجٹ بھی خراب نہ ہو۔ مریم اس کی شرمندگی بھانپ کر اب افسوس میں مبتلا تھی کہ اس نے یہ بات کیوں کہی۔ لسٹ بنا کر زبیر کو پکڑائی اور خود کچن میں آگئی۔
"یہ اچھا ہے کہ وہ موصوف ایسے وقت آئیں گے کہ صرف کھانا کھلانا پڑے گا۔ چائے کے وقت آتے تو مشکل ہوجاتی۔ کوکیز تو! نجانے کیا کیا یہاں کی سیدھی سادی بیکریوں سے تو ملنے سے رہے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے ہاتھ چلا رہی تھی۔ زبیر کے سامان لا دینے پر اس نے مرغی نکالی۔
"تم باقی کام کرو میں مرغی دھو دیتا ہوں۔" وہ مریم کی ایسی مدد کرتا رہتا تھا۔ مریم نے اسے تھیلا پکڑایا اور خود باقی کام کرنے لگی، چولہے پہ آلو ابالنے کو رکھ دیے۔
"ویسے بناؤ گی کیا کیا؟" زبیر نے مرغی کو رگڑ رگڑ کر دھوتے ہوئے پوچھا۔
"سستی اور آسان چیزیں۔" مریم نے شرارت سے کہا۔
"مثلاً؟"
"مثلاً کڑھائی، پلاؤ، کٹلس، کباب اور میٹھا۔ کافی ہے اتنا؟" زبیر نے ہنستے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ رات آٹھ بجتے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ زبیر کو مریم نے کالی مرچ لینے کے لیے بھیجا تھا۔ مریم دروازے پر آئی۔ اسے علم نہیں تھا کہ موحد وقت کی پابندی کرے گا۔ وہ یہی سمجھی تھی کہ زبیر یا پھر محلے کے بچوں میں سے کوئی ہوگا۔
"کون ہے؟" اس نے پوچھا
"میں۔ موحد۔ زبیر کا دوست۔" باہر سے آنے والی آواز پر وہ سیدھی ہوگئی۔
"ایک منٹ۔ اتنا کہہ کر وہ اندر آگئی"۔ اماں۔ زبیر کا کوئی دوست آیا ہے، اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیں۔ زبیر بس آتا ہی ہوگا۔" زلیخا نے اسے خون خوار نگاہوں سے دیکھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گئیں۔ مریم اندر آگئی تھی۔ جب اسے لگا کہ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں جاچکے ہیں تو وہ کچن میں آگئی۔ شکر کہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر لٹکتے پردے کو برابر کردیا تھا۔ پانچ منٹ بعد ہی زبیر آگیا۔
"تمہارا دوست تو وقت کا کچھ زیادہ ہی پابند ہے۔ آچکا ہے۔ یہ جوس کا گلاس لے جاؤ ساتھ۔ دروازہ بجایا تھا مگر امی نے سنا نہیں شاید۔" اس نے کانچ کا نفیس سا گلاس اس کے آگے کیا۔
"یہ کب خریدے؟ بہت خوب صورت ہیں۔" زبیر نے گلاس کی سطح پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔
"پچھلے ہفتے ہی لائی تھی۔" اچھا تفصیلات بعد

میں پوچھنا۔ پہلے یہ لے جاؤ۔ زبیر نے گلاس اٹھایا اور اندر بڑھ گیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد اس نے کھانا لگانے کا کہا۔ مریم سب کچھ تیار کرچکی تھی۔ کچن سے اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ مریم کے ہاتھ میں قدرتی ذائقہ تھا اور اتنے سالوں کی پریکٹس نے اسے ماہر کردیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ٹیبل سائڈ پر رکھ کر اس نے دسترخوان بچھایا۔ تاکہ آرام سکون سے کھانا کھا سکیں۔ موحد کو زبیر کام کرتا دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

''گھر میں کیا کوئی اور نہیں؟ جو کھانا تم لگا رہے ہو؟'' اس نے حیرت سے استفسار کیا۔

''میری بڑی بہن ہے۔ اسی نے یہ کھانا بنایا ہے۔ لیکن جب بھی مرد مہمان آئیں تو کھانا میں ہی لگاتا ہوں۔'' زبیر نے سادگی بھرے لہجے میں کہا۔

''آئیں بیٹھیں۔'' زبیر نے اسے اشارہ کیا۔

موحد نیچے آکر بیٹھ گیا۔ خوب صورت برتنوں میں دل سے بنایا گیا کھانا نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ موحد کے منہ میں پانی آگیا۔

''آنٹی ہمارے ساتھ نہیں کھائیں گی؟''

''وہ اپنے کمرے میں کھانا کھاتی ہیں۔''

''اور بہن؟ وہ بھی ہمیں جوائن نہیں کریں گی؟'' زبیر بے اختیار مسکرایا۔

''اصل میں ہم لوگ تھوڑے سے الگ ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ میری بہن باقاعدہ پردہ کرتی ہے۔ میری فیملی کی اکثر عورتیں ایسی ہی ہیں۔ اور مرد مہمانوں کے سامنے آنا انہیں پسند نہیں'' ۔ زبیر نے اس کی پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کررہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنی دادی کے پاس بیٹھا ہے۔ انہیں بھی زمین پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھانا پسند تھا اور وہ بھی مہمانوں کا یوں ہی خیال رکھتی تھیں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جب تک وہ کھانا کھاتے رہے زبیر کسی ذمہ دار انسان کی طرح کچھ نہ کچھ اس کی پلیٹ میں ڈال دیتا۔ نہ نہ کرتے بھی وہ بہت کچھ کھا گیا۔ ڈنر کا مینیو کس قدر سادہ تھا۔ اس میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو وہ ڈیلی روٹین میں نہ کھاتا ہو۔ مگر اسے آج زبیر کے ساتھ ڈنر کرکے بہت مزا آیا۔ اس کی بالکل سادہ باتیں۔ جن میں نہ تو کوئی عیاری تھی اور نہ ہی مطلب۔ اس نے موحد کو عزت دی تھی۔ اخلاص دیا تھا۔ موحد کا دل جھک سا گیا تھا۔ اسے پہلی دفعہ اس بات کا احساس ہوا کہ وہ کس قدر مصنوعی ماحول میں رہتا آرہا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کچھ ہی دیر بیٹھے گا اور پھر چلا جائے گا لیکن وہ ساڑھے دس تک وہیں رکا رہا۔ کچن میں سے کھٹ پٹ کی آوازیں اس کی سماعتوں میں اترتی رہیں۔ کسی کی موجودگی اسے شدت سے محسوس ہوتی رہی۔ زبیر سے رخصت لے کر وہ گھر جانے کے بجائے دادی کے گھر آگیا۔ ان کا گھر بھی اب زبیر کے گھر سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ عفان کی موحد سے کئی بار بحث ہوچکی تھی۔ وہ ان پیسوں کو لوٹانا چاہتا تھا جس کی وجہ سے اس کی دادی کی تضحیک کی گئی لیکن موحد نہیں مانا۔ عفان بے حد پریشان تھا۔ اس نے قرض کے طور پر یہ رقم لی تھی۔ اسے خوف تھا کہ اگر وہ پھر سے ناکام ہوگیا تو؟

''یہ میرا لاسٹ سمسٹر ہے۔ اس کے بعد میں آپ کو جوائن کرلوں گا۔ آپ نفع نقصان بھول کر کام شروع کیجیے۔'' اس نے عفان کو تسلی دی۔ اور دادی کے کمرے میں آگیا۔ ان کے ساتھ ان کے بستر میں کسی ننھے بچے کی طرح گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

''دادی! آپ ممی کی وجہ سے اب اس گھر میں نہیں آئیں گی؟ آپ سے پیار کروانے کے لیے مجھے یہاں آنا پڑے گا؟'' وہ ناراضی سے کہہ رہا تھا، دادی جو اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ رک گئے۔

''موحد تم کیا چاہتے ہو؟ میں وہاں کسی مجرم کی طرح جاؤں۔ تمہاری ماں مجھے کٹہرے میں کھڑا کرے اور میری محبت کا احتساب کرے؟'' ان کی بات سن کر موحد تڑپ گیا۔

''میں ایسا بالکل نہیں چاہتا دادی۔'' اس نے ان کا بوڑھا ہاتھ تھام لیا۔ جواباً انہوں نے اس کے

ہاتھ پر بوسہ دیا۔
"تو بس آج کے بعد یہ بات مت دہرانا۔" انہوں نے موحد کا چہرہ چھو کر کہا۔ وہ پھر سے لیٹ گیا۔
"آج رات میں یہیں رکوں گا۔ شہریار سے کہیں جا کر اپنے ابا کے پاس سوئے۔" اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ دادی ہنس پڑیں۔
"بن ماں کا بچہ ہے۔ باپ بے چارہ اپنے دھندوں میں الجھا رہتا ہے۔ اسے نئے اسکول میں داخل کروایا ہے۔ وہاں بہت خوش ہے۔ اس کی ایک ٹیچر ہیں دن بھر اس کی ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔ وہ بھی اسے بہت پیار کرتی ہے۔" انہوں نے اسے تفصیل بتائی۔
"دادی ایک بات بتائیں؟ کیا ساری عورتیں عفان بھائی کی بیوی جیسی ہوتی ہیں؟ جنہیں صرف خوش حال شوہر ہی چاہیے؟" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ اس کے سوال پر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔
"ساری عورتیں، سارے مرد ایک سی فطرت کے نہیں ہوتے۔ اپنی اپنی ترجیحات کی بات ہے۔" انہوں نے گہری سانس بھر کر کہا۔
"کچھ لوگ اپنی ترجیحات پر کبھی کمپرومائز نہیں کرتے جیسے تم، تمہارے والدین، تمہارے بہن بھائی۔ عفان کی بیوی کی بھی پہلی ترجیح کامیاب شوہر کی بیوی بننا ہوگا۔ ایک ناکام مرد کے ساتھ اسے زندگی گزارنا بے حد مشکل بلکہ ناممکن لگتا ہوگا اسی لیے وہ چھوڑ کر چلی گئی۔ اسے بچے سے بھی اتنی انسیت نہیں، شاید ہو گی لیکن بچہ اس کی اولین ترجیح نہیں ہوگا۔" وہ بے حد صاف سیدھے انداز میں بول رہی تھیں لیکن دکھ پھر بھی چھلک رہا تھا۔ موحد لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔
"وہ کون عورتیں ہوتی ہیں، کیسے مرد ہوتے ہیں جن کے لیے ان کی ذات سے زیادہ بھی کچھ اہم ہوتا ہے؟" موحد ان کے ہاتھوں کو اپنے توانا ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بولا۔
"تمہارے دادا جیسے مرد، میرے عفان جیسے مرد۔" ان کے لہجے میں لمحے بھر کے اندر محبت چھلکنے لگی۔ "تمہارے دادا کی پہلی ترجیح میں اور ہمارا گھر تھا۔ عفان کے لیے اس کی پہلی ترجیح میں اور شہریار ہیں۔ تمہارے باپ کی پہلی ترجیح پیسہ اور اسٹیٹس ہے جبکہ تمہارے لیے حسن۔" ان کی آخری بات پر وہ گڑبڑا گیا۔ مگر چپ کر کے سنتا رہا۔
"خدا تمہیں ایسی بیوی سے نوازے جس کی پہلی اور آخری ترجیح تم ہو۔" انہوں نے اس کی ٹھوڑی چھو کر محبت سے کہا۔ موحد کے دل سے بے اختیار ہی آمین نکلی۔ وہ دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا اور پھر ان کے پاس ہی سو گیا۔ صبح اس کی آنکھ عفان کے شور سے کھلی۔ موحد ہڑبڑا گیا تھا۔ دادی فرش پر گری ہوئی تھیں۔ عفان بدحواسی کے عالم میں انہیں جھنجوڑ رہا تھا۔ پاس ہی شہریار کھڑا تھا۔ ہراساں اور روتا ہوا۔ ہوش وحواس میں آنے سے پہلے وہ بستر سے چھلانگ لگا کر اترا۔
"کیا ہوا؟" دادی کے قریب جاتے ہوئے اس نے عفان سے پوچھا۔ عفان نے کوئی بھی جواب نہیں دیا اور دادی کو بازوؤں میں بھر کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔ شکر کہ موحد کی گاڑی موجود تھی، انہیں فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ عفان کا چہرہ بے حد سرخ تھا، وہ موحد سے بات نہیں کر رہا تھا۔ چہرے پر پریشانی اور غصے کے تاثرات تھے۔ موحد خاموشی سے ڈاکٹر سے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر بعد ڈاکٹر آیا۔ دادی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا لیکن جلدی ہسپتال پہنچ جانے کے باعث ان کی جان بچ گئی۔ ابھی وہ انڈر آبزرویشن تھیں اور کسی کو بھی ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ شہریار باپ سے چمٹا خوف زدہ سا کھڑا تھا۔ عفان کا رویہ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا، جب عفان ڈاکٹر کے کہنے پر دوائیں لینے گیا تو وہ شہریار کے قریب آیا اور اسے اپنی گود میں بٹھایا۔
"بیٹا آپ صبح کتنے بجے جاگے تھے؟" شہریار کے گرد بازو لپیٹ کر اس نے نرمی سے پوچھا۔
"سات بجے۔" اس نے یاد کر کے بتایا۔
"تب دادی ماں کیا کر رہی تھیں؟"

وہ میرے لیے ناشتا اور ٹفن بنا رہی تھیں۔
''اس کے بعد کیا ہوا؟'' موحد نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرے۔
''اس کے بعد۔۔ مجھے دادی نے کہا کہ میں آپ کو جگاؤں۔ جب میں آپ کے کمرے میں آیا تو فون بج رہا تھا۔ چھوٹی دادی کا فون آیا تھا۔ میں نے دادی کو آکر بتایا، انہوں نے آکر ان سے بات کی اور پھر نیچے گر گئیں۔'' موحد نے ساری بات سن کر گہری سانس بھری۔ اسے عفان کے غصے کی وجہ سمجھ آگئی تھی۔ عفان کے آنے پر وہ اٹھا اور دادی سے ملے بغیر ہی گھر کی طرف چلا آیا۔ جہاں اس کی ممی صبح ہی صبح کہیں جانے کے لیے تیار تھیں، ساتھ ہی اس کے ڈیڈ بھی تھے۔ موحد کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اس کے ڈیڈی ٹھٹک گئے۔ جبکہ ممی نے غصے سے منہ بگاڑا۔
''کیا بات ہے موحد؟ بہت پریشان لگ رہے ہو؟'' عاصم نے اسے دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔
''پریشان تو ہوگا۔ رات اپنی دلاری دادی کے گھر جو گزار کر آیا ہے۔ خوب کان بھرے ہوں گے۔'' تنزیلہ کے اس جملے پر موحد نے انہیں بے حد سرد نگاہوں سے دیکھا، مگر کچھ نہ بولا۔ اور سیڑھیاں چڑھتا گیا۔
''کچھ تو ہوا ہے۔ موحد کا چہرہ دیکھا کیسا پھیکا ہوا پڑا ہے۔ تم جا کر گاڑی میں بیٹھو میں پوچھ کر آتا ہوں۔''
''کوئی ضرورت نہیں ہے پوچھنے کی، میں نے صبح انہیں فون کر کے جائداد کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔ انہوں نے دس لگا کر بتادی ہوں گی اسی لیے غصے میں ہے۔'' انہوں نے جیسے ناک پر سے مکھی اڑائی۔
''نہیں۔۔ مجھے بہت عجیب سا لگا وہ، اگر ایسی بات ہوتی تو وہ آکر تم سے جھگڑا کرتا۔'' وہ سچ مچ پریشان ہو گئے تھے۔ دونوں آگے پیچھے اس کے کمرے میں آئے جہاں وہ اپنی بھیگی آنکھیں صاف کرتے ہوئے ایک بیگ میں کپڑے بھر رہا تھا۔
''یہ کیا کر رہے ہو تم؟'' انہوں نے بیگ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا لیکن وہ جواب دیے بنا اپنے کام میں مصروف رہا۔
''کچھ پوچھ رہا ہوں میں تم سے۔'' اس بار ان کی آواز بلند تھی۔ موحد نے ہاتھ روک کر انہیں دیکھا۔
''میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں، کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔'' اس نے یوں کہا جیسے دوستوں کے ساتھ ٹرپ پر جانے کی بات کر رہا ہو۔
''دادی نے ایسی کیا آگ لگائی ہے جو گھر چھوڑ کر ہی بجھے گی۔'' وہ جو بیگ میں کپڑے ٹھونس رہا تھا، ماں کی بات سن کر اس نے غصے سے ہاتھ میں پکڑی شرٹ بستر پر پھینکی۔
''وہ کیا آگ لگائیں گی؟ ہسپتال میں پڑی ہیں وہ۔ ہارٹ اٹیک ہوا ہے انہیں۔'' وہ درد بھری آواز میں چلایا۔ لمحے بھر کے لیے چاروں طرف جیسے موت کا سناٹا پھیل گیا۔
''ک۔ کیا مطلب؟ کب ہوا؟ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' عاصم کی آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔ موحد استہزائیہ لہجے میں ہنسا
''اگر آپ کو علم ہوتا بھی تو آپ کیا کر لیتے؟ جیسے تایا کی بیماری کے وقت کھڑے کھڑے حال چال پوچھ کر آجاتے تھے دادی کے ساتھ بھی یہی کرتے۔ اگر بالفرض دو گھڑی بیٹھنے کا سوچتے تو آپ کی بیگم کو ناگوار گزرتا اور ماشاء اللہ سے یہ تو آپ کا دوسرا خدا ہیں۔'' اس کے لہجے میں نفرت تھی۔ تنزیلہ بلبلا اٹھیں۔
''بکواس بند کرو اپنی۔'' وہ غصے کی شدت سے چلائیں۔
''یاد رکھیے گا پاپا، جو کچھ آپ دونوں کر رہے ہیں ناں۔ خدا اس کی سزا آپ دونوں کو دے گا۔ اور بہت جلد دے گا۔ اتنی ہوس اچھی نہیں کہ انسان خون کے رشتوں سے بغاوت پر اتر آئے۔'' اس نے ساکت کھڑے باپ کی طرف ایک نگاہ دیکھا اور بیگ کی زپ بند کر کے کندھے پر لٹکایا۔ ماں کی طرف دیکھے بنا وہ باہر نکل گیا۔ اسے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ آگے کیا کرے گا، کہاں جائے گا لیکن ایک بات تو طے تھی کہ

اسے اب اس گھر میں نہیں رہنا تھا۔
"دیکھا آپ نے یہ کیا بکواس کر کے گیا ہے؟ ہمیں بددعائیں دے رہا ہے یہ؟ یہ تربیت دی ہے آپ کی ماں نے۔" ان کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔
"تم اپنی بکواس کسی وقت بند نہیں کر سکتیں؟ جب دیکھو بک بک بک، چپ کر جاؤ۔ ہسپتال جانا ہے یا نہیں؟" لمحے بھر کے لیے وہ شاک رہ گئیں۔ ایسا لہجہ، ایسے الفاظ۔ انہوں نے کبھی استعمال نہیں کیے تھے۔ وہ منہ کھولے انہیں دیکھ رہی تھیں۔
"تم یہاں کھڑی ہو کر کوئی نئی چال سوچو۔ فری ہو جاؤ تو آ جانا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے، وہ وہیں کھڑی رہ گئیں۔

☆☆☆

بیگ گاڑی میں پھینک کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اور سر اسٹیئرنگ سے ٹکا دیا۔ اس کی سرخ آنکھوں سے کب پانی بہنے لگا اسے احساس نہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں تو دادی کے چہرے کی تکلیف کرچیاں بن کر چبھ رہی تھی۔
"ہم لوگ کتنے بدقسمت ہیں۔ بہت بدقسمت۔" موحد نے سر اٹھا کر آنکھیں رگڑیں۔ اس کا رخ اس راستے پر تھا جو دادی اور عفان کے چھوٹے سے گھر کی طرف جاتا تھا۔ گھر جا کر اس نے ایک کمرے میں اپنا بیگ رکھا۔ اور کچھ سوچتے ہوئے ڈاکٹر کو کال ملائی۔ انہوں نے بتایا کہ جہاں آراء بیگم کو ہوش آ چکا ہے، ان سے باقی تفصیلات لے کر اس نے فون کاٹ دیا۔ بیگ میں سے کپڑے نکال کر الماری میں لٹکاتے ہوئے اس کے ذہن میں زبیر گھوم رہا تھا۔ الماری سیٹ کر کے اس نے اسے کال ملائی۔ دوسری بیل پر ہی کال ریسیو کر لی۔
"میں موحد بات کر رہا ہوں۔" زبیر کے ہیلو کہنے پر اس نے تعارف کروایا۔
"کیسے ہیں آپ؟" دوسری جانب سے اس نے خیریت دریافت کی۔
"میں ٹھیک ہوں۔ میری دادی ہسپتال میں ہیں۔ اور گھر میں کوئی خاتون نہیں جو ان کے لیے پرہیزی کھانا بنا سکیں۔ کیا تم اپنی بہن سے کہہ کر مجھے فیور دے سکتے ہو؟" موحد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
"کیا ہوا دادی کو؟" زبیر کے لہجے میں پریشانی تھی۔ اس نے فون کان سے ہٹا کر اسپیکر کو دیکھا۔ ایک غیر انسان اس کی تکلیف سن کر گھبرا گیا تھا، اور ایک اس کی ماں تھیں، موحد نے ڈھکی چھپی تفصیل بتائی۔
"آپ کو مجھے پہلے بتانا چاہیے تھا۔ مریم بنا دے گی جو بھی بنوانا ہے آپ بتا دیں۔ کیا میں انہیں دیکھنے ہسپتال آ سکتا ہوں؟" موحد کو سکون محسوس ہوا۔
"ہاں میں تمہاری طرف آتا ہوں، پھر ساتھ ہی چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے کال کاٹی اور زبیر کی طرف آ گیا۔
"مجھے علم نہیں کہ یہ ساری چیزیں کیسے خریدتے ہیں۔ تم یہ پیسے رکھو اور پلیز سامان منگوا دو۔" موحد کو اپنی احمقانہ حرکتوں کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کھانے پینے اور اس قسم کی چیزیں اس نے واقعی کبھی نہیں خریدی تھیں، لیکن اس قدر مسکینیت طاری کیے بغیر بھی زبیر اس کی بات سن لیتا، وہ بہت پریشان تھا۔ کسی کا سہارا چاہیے تھا شاید یا کچھ اور؟ وہ سمجھ نہیں پایا۔
"یہ پیسے بھی آپ رکھیں اور سکون سے بیٹھ جائیں۔ میں سامان لے آتا ہوں۔" زبیر نے مسکرا کر کہا۔ مگر موحد نہ مانا۔ زبردستی اسے پیسے پکڑائے۔ زبیر کے جانے کے پانچ منٹ بعد ڈرائنگ روم کے دروازے پر دستک ہوئی اور ہلکا سا دروازہ کھلا۔ بس اتنا کہ ایک زنانہ ہاتھ چائے کے کپ سمیت اس پار آ جائے۔ صاف ستھرا لمبی انگلیوں والا ہاتھ جس کے ناخن بھی تراشے ہوئے نہیں تھے پھر بھی اسے بہت حسین لگا۔
"یہ چائے لے لیں۔" یقیناً گھر میں کوئی نہیں تھا اسی لیے وہ خود یہاں تک آئی تھی۔ موحد کا دل چاہا وہ چائے کی جگہ ہاتھ ہی تھام لے، مگر ایسا کرنا ناممکن تھا۔ چائے کا کپ احتیاط سے پکڑ کر وہ پیچھے ہوا، اسے دروازہ بند کرنے اور پھر اسی دروازے پر کنڈی لگانے کی آواز آئی وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

''احتیاطی تدابیر۔'' اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگالیا۔ باہر سے کسی کے چلنے اور کام کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ صوفے سے اٹھا اور دروازے سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ دروازے میں چھوٹا سا سوراخ تھا۔ حرکت تھی تو انتہائی گھٹیا لیکن اس حسن کی دیوی کو دیکھنے کی خواہش نے اسے اس فرق کو بھولنے پر مجبور کردیا تھا۔ سوراخ میں سے بس اس کی پشت کا کچھ حصہ اور بالوں کی لمبی چوٹی دکھی۔ موحد کی دھڑکن اس پر نگاہ پڑتے ہی تیز ہوگئی۔ وہ بے اختیار پیچھے ہوا۔ مگر پھر دروازے سے چمٹ گیا۔ مگر وہ شاید کچن میں جاچکی تھی۔ دبلی پتلی چوڑے شانے اور پتلی سی کمر۔ موحد بس حیران تھا۔ اس عام سے گھر میں رہنے والی اور اس قدر پرفیکٹ۔ اس نے چائے پی۔ کچھ ہی دیر بعد زبیر بھی آگیا۔ وہ دونوں ڈیڑھ گھنٹہ وہاں رکے، اس دوران مریم نے نہ صرف پرہیزی کھانا بنالیا تھا بلکہ ان کے لیے بھی لنچ کا اہتمام کیا تھا۔ موحد کی بھوک چمک اٹھی تھی۔

ہسپتال جاتے ہوئے وہ بار بار ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ آخر اس گھر میں ایسا کیا ہے جو وہ یوں کھچا چلا آتا ہے؟ جواب میں خلوص اور بھروسا آیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہسپتال پہنچ گئے۔ عفان موحد کو دیکھ کر کچھ نہیں بولا کیونکہ اس کے ساتھ زبیر بھی تھا۔ دادی سے مل کر ان کی خیریت معلوم کرکے زبیر چلا گیا جبکہ وہ دادی کو سوپ پلانے لگا۔ عفان کو موحد پر بے تحاشا غصہ آرہا تھا، نہ وہ رات ان کے گھر رکتا نہ ہی یہ سارا کھڑاک ہوتا۔

''تمہارا باپ آیا تھا مجھ سے ملنے، رو رہا تھا۔'' دادی نے خوشی سے بتایا۔ موحد نے کوئی تاثر نہیں دیا۔

''آپ کو ڈاکٹر نے باتیں کرنے سے منع کیا ہے اور آپ فضول باتیں کرنے لگیں؟ چپ چاپ اسے ختم کیجیے یہ ساری باتیں یہاں سے ڈسچارج ہونے کے بعد کریں گے۔'' اس نے بڑے آرام سے انہیں خاموش کروادیا۔ موحد انہیں دوا پلا کر باہر آیا۔ عفان یہاں سے وہاں بے چینی سے چکرا رہا تھا۔ موحد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''میں آپ کی بے چینی اور غصے سے واقف ہوں لیکن یہ بے جا ہے۔ فضول ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ جتنا پیار آپ کو دادی سے ہے اتنا ہی مجھے بھی ہے۔ ان کے ساتھ آج جو کچھ ہوا مجھے اس کا بے حد اور بے تحاشا افسوس ہے، افسوس شاید بہت معمولی لفظ ہے۔ میری اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہوگی کہ میں اپنے والدین کو دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ میرے دل میں موجود ان کی محبت پر گرد جمنے لگی ہے۔'' وہ بولتے ہوئے بینچ پر بیٹھ گیا۔ ''اگر آپ کو یہ لگتا ہے کہ مجھے دادی سے دور رکھ کر آپ انہیں خوش رہنے پر مجبور کرسکتے ہیں تو کرلیجیے یہ کوشش بھی۔ لیکن اس بات سے آپ بھی واقف ہیں ممی کی طرح آپ بھی انہیں صرف ہرٹ کریں گے اور کچھ نہیں۔'' عفان تھک کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

''یہ سب اس جائداد کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ مجھے نہیں چاہیے یہ سب۔ میرے پاس ایک دادی ہی تو ہیں اور کون ہے میرا؟ اور یہ پیسا مجھ سے انہیں دن بدن دور کرتا جارہا ہے۔'' وہ بہت دکھی اور پریشان تھا۔ موحد نے انہیں تسلی دی۔ دونوں ایک ساتھ بیٹھے ایک جیسی الجھنوں میں گھرے تھے۔ کہیں پیسے کی کمی انسان کو خوار کرتی ہے تو کہیں زیادتی۔ عجیب ہی کہانی ہے۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد جہاں آرا کو ہسپتال سے گھر بھیج دیا گیا تھا۔ اس دوران تقریباً روز ہی موحد اپنے غم کی پوٹلی اٹھائے زبیر کے گھر پہنچ جاتا۔ امتحانات شروع ہوچکے تھے، زبیر بے حد مصروف تھا لیکن موحد کی آمد پر ایک دن بھی اس نے ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ وہ سامان لاکر مریم کو دے دیتا، مریم پرہیزی کھانا بنا دیتی۔ اس دوران جتنا بھی وقت لگتا وہ دونوں پڑھائی میں مصروف رہتے۔ لنچ کرکے زبیر اس کے ساتھ کچھ دیر کے لیے دادی کی خیریت معلوم کرنے چلا جاتا۔ جبکہ موحد وہیں ٹھہر جاتا اور پھر شام سے پہلے عفان کے آنے کے بعد وہ گھر چلا جاتا تھا۔ باقی کا

تمام وقت وہ پڑھائی میں مصروف رہتا۔ ان کے گھر واپس آجانے کے بعد اسے راحت محسوس ہوئی تھی۔ وقتاً فوقتاً اس کے پاپا بھی آتے رہے تھے، اسے گھر واپس لے جانے کی بات بھی کی تھی، لیکن اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ فی الحال اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ موحد نے کہہ دیا تھا کہ جب تک اس کی ممی کا رویہ تبدیل نہیں ہوگا وہ اس گھر میں نہیں جائے گا۔ اس کے دونوں بہن بھائی کالج اور یونی ورسٹی سے واپسی پر ان سے ملنے آتے تھے، جہاں آراء ان کو دیکھ کر خوش ہوتی تھیں۔

دادی کے واپس آجانے کے بعد اس نے خود کو مکمل طور پر پیپرز میں مصروف کرلیا۔ اس دوران ایک بار مریم زبیر کے ہمراہ ان سے ملنے آئی تھی۔ مگر موحد ایک بار پھر اسے دیکھنے میں ناکام ہی رہا۔ اس کا پورا وجود سیاہ عبائے میں لپٹا تھا۔

کیا میں کبھی اس لڑکی کا چہرہ دیکھ پاؤں گا؟ اس نے تنگ آکر سوچا۔

☆☆☆

شام کے سائے گہرے ہورہے تھے۔ وہ چھت پر بیٹھی ہاتھ میں چائے کا کپ تھامے گہری سوچوں میں ڈوبی تھی۔ وہ زبیر کی ہمراہی میں موحد کی دادی کی خیریت معلوم کرنے گئی تھی۔ موحد نے یقیناً انہیں بتا دیا تھا کہ کھانا مریم ہی بنا کر دیتی رہی ہے۔ وہ اتنی مشفق خاتون تھیں کہ اگر اس نے ان کی کوئی مدد نہ بھی کی ہوتی تو بھی اسی محبت اور پیار سے ملتیں۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد سے اس کی آنکھیں چھلکنے کو وجہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کی اپنی بوڑھی دادی کی دھندلی شبیہہ اس کی آنکھوں میں اتر آئی۔ ایک واحد وہی تو تھیں جنہوں نے اسے اپنے سینے سے لگایا تھا۔ ان کے جانے کے بعد سے وہ اس شفقت کو آج تک ترستی رہی اور آج جب جہاں آراء نے اسے گلے سے لگا کر پیشانی پر بوسہ دیا تو مریم کو یوں لگا جیسے وہ ریت کی طرح پھسل کر بکھر جائے گی۔

ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ اگر زبیر نہ ہوتا تو میں یہاں کیسے رہتی؟ کیا میں زندہ ہوتی؟ اس نے چھت کی دیواروں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ سردی بڑھ رہی تھی اور ہوا کی شدت میں تیزی آتی جارہی تھی، وہ نیچے آگئی۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ زلیخا کب باہر نکلیں اسے علم نہ ہوسکا۔ غصے سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے دروازے کو کنڈی لگانے کا سوچا ہی تھا کہ زلیخا نے دھاڑ سے دروازہ کھولا۔

وہ بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا؟ خیریت ہے نا؟'' مریم نے ان کی بدحواسی دیکھ کر گھبرا کر پوچھا۔ وہ فرش پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئیں۔

''امی بتائیں بھی ک۔۔ کیا ہوا ہے؟'' مریم کے اپنے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ زلیخا کی حالت بہت خراب تھی۔

''وہ ز۔۔ زبیر اور اطہر۔۔'' ان سے بولا نہیں جارہا تھا۔ زلیخا جلدی ہاتھ پاؤں چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ مریم کی سانس بھی رک سی گئی۔

''امی خدا کا واسطہ بولیں بھی۔ میرا دم نکل جائے گا۔'' وہ کانپتی آواز میں بولی۔ زلیخا نے اس کی طرف بھیگی آنکھوں سے دیکھا۔

''زبیر اور اطہر کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ دونوں ایمرجنسی وارڈ میں ہیں۔'' انہوں نے جملہ مکمل کرتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا تھا۔ یہ سنتے ہی مریم کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی۔ وہ وہیں بیٹھتی چلی گئی۔

''ابھی ہسپتال سے کسی نے فون کیا تھا۔ زبیر کی ڈائری سے میرا نمبر ملا۔ میں رمضان بھائی کے گھر تھی، رمضان بھائی (پڑوسی) ابھی ہسپتال جارہے ہیں۔ وہ ہمیں ساتھ لے جائیں گے، تم اٹھو اور چلو۔'' انہوں نے ضبط کی کوشش میں ہلکان ہوتے ہوئے کہا۔ مریم کی ٹانگوں میں جان نہیں تھی نہ ہی اس کے منہ سے کوئی بات ادا ہورہی تھی۔ وہ بمشکل اٹھی۔ پانچ منٹ میں دونوں دروازے پر تھیں جہاں رمضان صاحب گاڑی لے کر کھڑے تھے۔ راستے میں زلیخا کا موبائل بجا۔ انہوں نے فون اٹھایا۔ موحد کا فون تھا۔

"ہیلو۔" زلیخا کی آواز کپکپا رہی تھی۔ مریم کی توجہ کسی بھی جانب نہیں تھی۔ اس کے دماغ میں صرف زبیر تھا۔ اسے لگنے والی چوٹوں کی تکلیف وہ بنا دیکھے بھی محسوس کر رہی تھی۔ اس تکلیف کا احساس اسے رونے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہسپتال تک کا سفر بیس منٹ پر مشتمل تھا۔ یہ بیس منٹ اس کی زندگی کے طویل ترین اور جان لیوا لمحے تھے۔ ہسپتال پہنچ کر ایمرجنسی تک کا سفر کچھ مزید طوالت اختیار کر گیا۔ اسے کچھ علم نہیں تھا کہ زبیر کس حالت میں ہے۔ وہ اس کا سامنا کرنے سے بھی خوف زدہ تھی۔ وہ لمحہ بھی آن پہنچا جب اس نے پٹیوں میں جکڑے ہوئے زبیر کو بے ہوشی کی کیفیت میں دیکھا۔ تکلیف کی انتہا کیا ہوتی ہے، انسان خود کو کیسے بے بس محسوس کرتا ہے اسے ان لمحوں میں معلوم ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر سامنے کھڑی زلیخا کو دیکھا۔ ان کی رنگت خطرناک حد تک سفید ہو رہی تھی اور وہ بنا پلک جھپکائے بہتی آنکھوں سے اپنے لخت جگر کو دیکھ رہی تھیں۔ پھر نجانے کیا ہوا انہیں۔ وہ مریم سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگیں۔ دونوں کا غم سانجھا تھا۔ اطہر کو بھی کافی چوٹیں آئی تھیں، لیکن وہ ہوش میں تھا۔

کچھ ہی دیر میں موحد بھی پہنچ گیا۔ وہ دونوں اکیلی عورتیں تھیں۔ رمضان صاحب بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ مریم بینچ پر اپنے گرد بازو لپیٹ کر سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ زلیخا موحد کو دیکھ کر ایک بار پھر سے رونے لگیں۔ وہ انہیں دلاسا دینے لگا۔

"میری ابھی بات ہوئی ہے ڈاکٹر سے۔ انہوں نے کہا ہے کہ زبیر خوش قسمت ہے کہ اسے ایک بھی اندرونی چوٹ نہیں آئی۔ وہ جلد ہی صحت یاب ہو جائے گا۔" موحد نے تفصیل بتائی۔

"اگر ایسا ہے تو وہ پٹیوں میں کیوں جکڑا ہے؟" روئی روئی سی بوجھل سرخ آنکھیں موحد پر جمی تھیں۔ وہ مسکرایا۔

"ایکسیڈنٹ کے دوران اسے بہت سی چوٹیں آئی ہیں۔ زبیر کا پورا جسم خراشوں سے بھرا ہے لیکن کیا آپ خدا کا شکر ادا نہیں کریں گی کہ اس کی تمام ہڈیاں سلامت ہیں؟" وہ نرمی سے بولا، مریم سے ضبط مشکل ہو گیا۔

"کتنی تکلیف ہو گی میرے بچے کو۔" زلیخا کا برا حال تھا۔ ایک بار وہ اٹھ کر اطہر کو بھی دیکھ آئی تھیں۔ اس کی پریشانی پر بھی زبیر کی تکلیف حاوی تھی۔

"امی آپ اطہر بھائی کے پاس جائیں، وہ بھی تو تکلیف میں ہیں اور اکیلے ہیں۔ زبیر کو ہوش آیا تو میں آپ کو بلا لوں گی۔ اس نے اطہر کا خیال آتے ہی ان سے کہا۔ اطہر کے لیے اس کے دل میں موجود ساری نفرت اس وقت سو چکی تھی۔ زلیخا، موحد کے ہمراہ اطہر کے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔ اسے روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ جبکہ زبیر ابھی بھی آئی سی یو میں تھا۔ چند گھنٹوں بعد زبیر کو بھی ہوش آ گیا۔ اگلے دن اسے آئی سی یو سے روم میں شفٹ کر دیا۔ زبیر کی پریشانی کم ہوئی تو اسے نئی فکر ستانے لگی۔ اس وقت زبیر کا علاج ایک پرائیویٹ ہسپتال میں ہو رہا تھا، اور پرائیویٹ ہسپتال کے خرچے پورے کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ ایک نئی پریشانی، خوف۔۔۔ وہ کھانا تیار کرنے کا بہانہ بنا کر گھر آ گئی۔ وہاں سے سیدھا کمیٹی والی کے پاس گئی۔ مریم کی کمیٹی ابھی کافی دور تھی لیکن اس کی پریشانی دیکھ کر وہ نمبر تبدیل کرنے پر راضی ہو گئی۔ ان سے رقم لے کر وہ گھر آ گئی۔ ابھی اس نے گھر سمیٹنا اور باقی کام شروع کیا ہی تھا کہ دروازہ بجا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ باہر موحد تھا، زلیخا نے اسے بھیجا تھا تاکہ وہ مریم کو ساتھ لے آئے۔ زلیخا نے اسے یہ کہا تھا کہ وہ اگر ایسے وقت واپس آ رہا ہو اجب مریم کو بھی ہسپتال پہنچنا ہو اتب وہ اسے اپنے ساتھ لے آئے لیکن موصوف ہسپتال سے سیدھا یہیں آ گئے۔ مریم پھر سے کھول کر رہ گئی۔

"آپ چلے جائیں، میں بس سے آ جاؤں گی۔ ابھی گھر کا بہت سا کام باقی ہے اور کھانا بھی تیار نہیں ہوا۔" اس نے وجہ بتائی۔

"کوئی بات نہیں، میں انتظار کر لیتا ہوں۔ آپ

فری ہو کر آجائیں۔ اتنا سارا سامان لے کر بس میں کیسے جائیں گی۔" بات اس کی بھی معقول تھی۔
"اچھا ٹھیک ہے۔ آپ گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کیجیے۔" موحد کے لیے یہ جملہ کسی شاک سے کم نہیں تھا۔ وہ گھر آئے مہمان کے ساتھ ایسا سلوک کر رہی تھی۔ لیکن پھر وہ سمجھ گیا۔ اس وقت وہ گھر پر اکیلی تھی اور اس درجہ محتاط لڑکی سے ایسے ہی جملے کی توقع کی جانی چاہیے تھی۔
"جی میں بیٹھ جاؤں گا لیکن آپ اگر ایک کپ چائے دے دیں تو......" موحد نے فرمائش کی۔
"آپ پانچ منٹ انتظار کریں میں لاتی ہوں۔
اس کے جاتے قدموں کی آواز اس کی سماعتوں میں اتری۔ موحد کو اپنا آپ عجیب سا لگنے لگا تھا۔ اسے یہ گمان ہونے لگا تھا کہ وہ بھی بالکل ایک عام سا مرد ہے، ایسی عورت کے پیچھے بھاگنے والا جو اسے آسانی سے دستیاب نہیں۔ اس سے بات کرنے اور اس کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے گھٹیا طریقوں پر عمل پیرا ہونے لگا ہے لیکن اسے اپنی یہ عامیانہ حرکتیں مزے دار لگ رہی تھیں۔ آج تک اسے کسی لڑکی کے لیے محنت نہیں کرنی پڑی تھی، وہ پہلی بار اس عمل سے گزر رہا تھا اور لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ اب تک دروازے میں ہی کھڑا تھا۔ مریم کسی بھی وقت آجاتی۔ اور وہی ہوا، کچھ ہی دیر میں دروازے کی کنڈی بجی۔ یہ اسے متوجہ کرنے کی کوشش تھی، اس نے جھٹ سے گلا کھنکارا۔
"یہ لیں چائے۔" وہی خوب صورت سا ہاتھ اس کے سامنے آیا چائے سے زیادہ اس کی توجہ دکھائی انگلیوں پر تھی۔ چائے تھام کر وہ کچھ دیر یونہی مسحور سا کھڑا رہا۔ پھر گاڑی میں آبیٹھا۔ جب اس نے مریم کی آواز سنی تھی تب سے اس کی تمام تر توجہ صرف اسی پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ مریم کو کیوں سوچتا ہے؟ اسے دیکھنے میں کیوں دلچسپی ہے؟ ان سارے سوالوں کا جواب بس یہ تھا کہ وہ متجسس ہے۔ اسے دیکھ کر تجسس ختم ہو جائے گا۔ اسے خوب صورتی پسند ہے اور اسے دیکھ کر آنکھیں خیرہ کرنے کی خواہش ہے اس کی۔

موحد کی سوچ بس یہیں تک تھی۔ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر اس کی چھوٹی بہن کا اسکارف پڑا تھا۔
"ایک تو یہ لڑکی۔۔۔ جب اسکارف استعمال نہیں کرنا تو خریدتی کیوں ہے؟ اور اگر خرید ہی لیا ہے تو جگہ جگہ بھول کر چلی جاتی ہے۔" اس نے چڑ کر سوچا اور سیٹ سے اٹھا کر ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ ایک گھنٹے سے بھی زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ مریم کی کوئی خبر نہیں تھی۔ چائے کے خالی کپ میں بچی ذرا سی چائے پیالی کے پیندے سے سوکھ کر چپک گئی تھی۔ وہ تھک کر گاڑی سے نکلا اور ایک بار پھر دروازہ بجایا۔
"مجھے مزید آدھا گھنٹا چاہیے۔ ابھی سوپ نہیں بنا۔" اس کی شرمندہ سی آواز ابھری۔
"میں تو کپ دینے آیا تھا۔" موحد نے فوراً ہی کہا، دروازہ ہلکا سا کھلا گیلا ہاتھ باہر آیا، ہاتھ سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اور انگلیاں سرخ ہو رہی تھیں۔ موحد نے مشکل سے نگاہ ہٹائی۔ اور فوراً ہی وہاں سے ہٹ گیا۔ جس شدت سے اس کے دل نے اس ہاتھ کو چھونے کی خواہش کی تھی وہ خوف زدہ ہی ہو گیا۔ کم از کم وہ زبیر اور مریم جیسے لوگوں کے ساتھ ایسی بے شرمی اور بے حیائی نہیں دکھا سکتا تھا، لیکن اس دل کا کیا کرتا جو کسی کم عمر عاشقوں والی حرکتیں کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ خود سے بے زار ہو گیا۔ کچھ دیر پہلی والی کیفیت یکسر بدل چکی تھی اب اس پر جھنجلاہٹ سوار تھی۔ خود سے لڑتے وقت گزارا۔ مریم بڑی سی باسکٹ اٹھائے اس کی جانب آرہی تھی۔ اس نے فوراً ہی آگے بڑھ کر گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولا۔ مریم گڑبڑا گئی۔
"میں پیچھے بیٹھوں گی۔" اس نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔
"اگر آپ پیچھے بیٹھیں گی تو لوگ مجھے آپ کا ڈرائیور سمجھیں گے۔ اس لیے مہربانی فرما کر آگے آجائیں۔" وہ شرافت سے نگاہیں جھکائے بولا۔ مریم شش و پنج میں تھی۔ اتنا کہہ کر موحد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔
"آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ بس میں سفر کر رہی ہیں۔

پھر آپ کو اتنا سوچنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی۔" موحد نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ مریم اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"آپ نے تو سچ میں ہی اسے بس سمجھ لیا، سامان مجھے دیں میں اسے پیچھے رکھ دوں۔" مریم شرمندہ ہوگئی اور باسکٹ اسے تھمادی، جو کہ اس نے گود میں رکھی ہوئی تھی۔ دو منٹ بعد گاڑی چلنا شروع ہوئی۔ مریم کے لیے کسی اجنبی کے ساتھ گاڑی کا سفر کرنا پہلا تجربہ تھا۔ وہ گھبراہٹ کا شکار تھی۔ ان کے محلے کے لوگ کافی آزاد خیال تھے، لیکن وہ نہیں تھی۔ اس نے ہمیشہ ہی اس طرح کے سفر کو معیوب سمجھا تھا۔ اسے عجیب سی پریشانی محسوس ہو رہی تھی۔ روڈ پر گاڑی ڈالتے ہی گاڑی کی رفتار تیز ہوگئی۔ موحد نے اسے مخاطب کیا۔

"بس پندرہ منٹ میں ہی ہم ہسپتال پہنچ جائیں گے۔" اس نے جیسے مریم کو تسلی دی تھی۔ اسی ایک لمحے میں نجانے کیا ہوا تھا، موحد کی توجہ محض دو سیکنڈ کے لیے ڈرائیونگ سے بھٹک کر مریم کی طرف ہوئی تھی اسی ایک لمحے میں سامنے سے آنے والی گاڑی ان سے ٹکرا جاتی اگر موحد مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑی کا رخ نہ موڑتا۔ اس کے پیچھے اسی طرح بے ہنگم انداز میں انتہائی تیز رفتاری سے ایک اور کار گزری۔ یقیناً دونوں گاڑیوں کے درمیان مقابلہ تھا، موحد نے دل ہی دل میں ان دونوں ڈرائیورز کو گالیاں دیں۔ گاڑی روڈ سے سائڈ پر آچکی تھی۔

"آپ کے پاس پانی کی بوتل ہے؟" مریم کی مدھم سی آواز اس کی سماعتوں میں اتری۔ اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا تھا، وہ ناک پر ہاتھ رکھے بول رہی تھی۔

"آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" اس نے تشویش سے پوچھا۔ مریم نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ سخت مضطرب تھی۔ اس نے اسکارف کے اوپر سے ناک پر رکھا ہاتھ ہٹا کر اس کے سامنے کیا۔

"ٹکرانے کی وجہ سے میری نکسیر پھوٹ گئی ہے۔ پانی ہے تو دیدیں پلیز۔" موحد نے فوراً ہی پانی کی بوتل اس ے تھمائی۔

"آپ دو منٹ کے لیے گاڑی سے اتریں گے؟

وہ سمجھ گیا اور فوراً گاڑی سے اتر آیا۔ مریم اب دوسری طرف سے گاڑی کا دروازہ کھولے جھکی ہوئی تھی۔ موحد نے دل میں تہیہ کیا کہ وہ اسے نہیں دیکھے گا۔ لیکن خود پر وہ ضبط نہ کرسکا اور ہلکا سا رخ موڑ کر دیکھنے لگا۔ اس کا اسکارف سر سے اترا ہوا تھا۔ لمبے بالوں کی چوٹی پشت پر لہرا رہی تھی، اور پانی وہ سر پر ڈالنے میں مصروف تھی۔ پانی کی بوتل ٹھنڈی تھی سو جلد ہی خون رک گیا۔

"مریم! آپ کا اسکارف خراب ہوگیا ہوگا، ڈیش بورڈ پر میری بہن کا اسکارف موجود ہے آپ اسے استعمال کریں۔" موحد کے کہنے پر اس نے بے اختیار سکھ کا سانس لیا۔ خون آنا بند نہیں ہوا تھا لیکن اب پہلے کی طرح تیزی سے بہہ بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے ڈیش بورڈ پر رکھے ٹشو بکس میں سے ٹشو اٹھائے، اور اسکارف بھی۔ وہ موحد سے بے خبر تھی۔ اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ اسے دیکھ کر پتھر کا ہوچکا ہے۔ مریم نے جلدی سے نقاب کیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ البتہ نقاب اس طرح کیا تھا کہ وہ آرام سے ناک پر ٹشو رکھ سکے۔ موحد بے جان سا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسے ڈراپ کر کے زبیر کے ساتھ کچھ وقت گزار کے وہ جلدی وہاں سے نکل آیا۔ مریم اس وقت ڈاکٹر کے پاس اپنا چیک اپ کروا رہی تھی۔ موحد کے لیے آج کا دن بے حد بھاری تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا مذاق بھی ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

رات گہری ہو رہی تھی۔ وہ کمرے میں لیٹا سوچوں میں الجھا تھا۔ زبیر کے سامان سے جو تصویر برآمد ہوئی تھی، اسے وہ اب تک زبیر کی محبوبہ سمجھتا آرہا تھا۔ مگر وہ اس کی بہن تھی۔ یہی وہ لڑکی تھی جس کی تصویر دیکھ کر اسے زبیر کی پسند پر شدید افسوس ہو رہا تھا۔ اور اب۔ اب وہ خود اسی لڑکی کو دیکھنے، اس سے بات کرنے کے لیے سو سو بہانے تلاش کرتا آرہا تھا۔

اسے اپنا حقارت آمیز رویہ یاد آیا جو اس نے اپنی فرینڈ کم گرل فرینڈ کے سامنے اپنایا تھا۔ پہلی بار تصویر دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ اگر کبھی وہ لڑکی اسے دکھائی دے گی تو وہ ایک نظر بھی بمشکل ہی اس پر ڈالے گا، اور نگاہ پھیر کر شکر کا سانس لے گا، مگر جب سے اسے دیکھا تھا، اس کے دماغ سے مریم کی شبیہہ چپک گئی تھی۔ وہ سخت پریشانی محسوس کر رہا تھا۔ دھیان بٹانے کو اس نے کیا کچھ نہیں کیا۔ فرینڈز کو فون کالز، موویز اور جب ان میں بھی جی نہ لگا تو گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر آگیا۔ ٹھنڈی ہوا میں جسم کے آر پار ہو رہی تھیں۔ اس نے سنسان سڑک پر گاڑی روکی۔ اور تھک کر سر اسٹیرنگ سے ٹکا دیا۔

''اس لڑکی کو دیکھنے کے لیے میں اتنے دن سے زبیر کے گھر چکر لگا رہا تھا؟ میرا دماغ خراب ہو گیا تھا کیا؟'' وہ بڑبڑایا۔ اس کی کھنکتی آواز، وہ ہاتھ، پیر، اس کے لمبے بال اور حسین سراپا۔ کیا یہ اسی لڑکی کے ہیں؟ تو پھر چہرہ؟ اس چہرے میں کوئی ایک بھی نقش غیر معمولی نہیں۔ بالکل عام سی ہے وہ۔ میں اس لڑکی کو اتنے دن سے سر پر سوار کیسے گھوم رہا تھا؟ اسے کس بات پر غصہ تھا؟ مریم کی عام شکل پر، اپنی بے چینی پر، یا جس لڑکی کے چہرے کا وہ تمسخر اڑا تا رہا تھا، اسی لڑکی کے لیے تگ و دو کرنے اور اس کے گھر کے چکر کاٹنے پر؟ موحد کے بڑے بول اس کے سامنے آرہے تھے۔ مگر وہ اس بات سے بے خبر تھا۔ رات دیر تک وہ سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ تھک ہار کر گھر واپس آیا جہاں عفان پہلے سے ہی اس کے کمرے میں موجود تھا۔ موحد اسے دیکھ کر حیران ہوا۔

''خیریت ہے؟ آپ اس وقت جاگ رہے ہیں۔ سب ٹھیک تو ہیں نا؟'' اسے ایک دم تشویش ہوئی۔

''ہاں سب کچھ ٹھیک ہے۔ تم پریشان نظر آرہے ہو کیا بات ہے؟'' عفان نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بس...... زبیر کی وجہ سے پریشان ہوں، کلاسسز شروع ہونے والی ہیں اور وہ ہسپتال کے بستر پر ہے۔ گھر کی کفیل اس کی بڑی بہن ہے۔ نجانے اس وقت پیسوں کا انتظام کیسے کیا ہوگا۔ جو بات اس نے سوچی بھی نہیں تھی وہ اس کے منہ سے پھسل گئی، اور بول کر وہ خود بھی چونک گیا۔

''تمہیں مجھ سے ذکر کرنا چاہیے تھا۔ میں کل چلوں گا ہسپتال۔ اس سے مل بھی لوں گا اور ہسپتال کے بلز بھی دے دوں گا۔ اچھا مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی۔'' عفان موضوع کی جانب آیا۔ موحد جو آتے ساتھ بستر پر ڈھے گیا تھا، اٹھ بیٹھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یقیناً اس کی ممی سے متعلق ہی کوئی بات ہوگی۔

''جی کیا بات؟'' اس نے پوچھا۔ عفان نے فون نکالا اور کچھ بٹن دبائے کچھ ہی سیکنڈز بعد اس کی ممی کی آواز گونجنے لگی، یہ ایک فون کال تھی جو آج انہوں نے عفان کو کی تھی۔ وہ جیسے جیسے سنتا جا رہا تھا شرمندگی کی گہرائیوں میں اترتا جاتا تھا۔ آخر میں اس نے سر پکڑ لیا۔

''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آخر ممی کو آپ لوگوں سے مسئلہ کیا ہے۔ وہ کیوں کر رہی ہیں یہ سب۔'' موحد سخت غصے میں آگیا تھا۔ عفان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''فون کال سنانے کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ تم ان کے بارے میں مزید غلط رائے قائم کرو۔ میں صرف اس وجہ سے ہی تمہیں یہاں نہیں رہنے دینا چاہتا تھا۔ وہ مجھے کچھ بھی کہیں لیکن اب دادی ماں ان کی باتیں برداشت کرنے کی سکت کھو چکی ہیں۔ وہ یہ سب سن لیں تو سوچو ان کے دل پر کیا گزرے؟ میں نہیں چاہتا کہ وہ اسی طرح کی کال دوبارہ سے دادی کو کریں۔ ایک بار کا نتیجہ دیکھ چکے ہو تم۔'' موحد کچھ بول نہیں سکا۔ محض سر ہلا دیا۔ عفان کچھ دیر مزید بیٹھا اور پھر شب بخیر کہہ کر چلا گیا۔ وہ بستر پر ڈھے گیا۔ آنکھیں موندیں تو مریم کا بھیگا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ آنکھیں کھولیں تو اس کی ممی جان کی چیختی چنگھاڑتی آواز اس کی سماعتوں میں گونجنے لگی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا مصیبت ہے بھلا؟" وہ جھنجلا گیا تھا۔ پچھلی بار بھی ساری بات اس کے علم میں نہیں آئی تھی لیکن اب فون کال سن کر اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے دادی سے کیا کیا کہا ہوگا۔ اس نے سائڈ پر پڑا فون اٹھایا اور پاپا کا نمبر ملایا۔ تیسری بیل پر ہی فون اٹھالیا۔

"کیسے ہو موحد؟ خیریت ہے نا؟ اس وقت فون کیا؟" اس کے پاپا کی پریشان آواز اس کی سماعتوں میں اتری۔

"نہیں بالکل خیریت نہیں ہے۔ ممی سے بات کروائیے میری۔" اس نے سخت انداز میں کہا۔ کچھ ہی دیر میں ان کی آواز آئی۔

"ممی آپ آخر چاہتی کیا ہیں؟ آپ کو کیا لگتا ہے کہ اس قسم کی باتیں کریں گی تو میں دادی اور عفان سے دور ہو جاؤں گا؟ ان سے جائیداد واپس لے کر آپ کے چرنوں میں بیٹھ جاؤں گا؟ ایک بات تو آپ یاد رکھیے گا، کل میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں صرف اس لیے کہ میری ماں کی وجہ سے میری دادی کو تکلیف نہ ہو۔ دوسری بات اب آپ کو ڈھونڈنے سے بھی میرا پتا نہیں ملے گا۔ اور اگر آپ نے دوبارہ عفان یا دادی سے غلط لہجے میں بات کی تو میں قسم کھاتا ہوں، اب تک پاپا نے جو کچھ میرے نام کیا ہے وہ میں سب کا سب عفان کے نام کر دوں گا۔ پھر بیٹھ کر انہیں کوستی رہیے گا۔" اتنا کہہ کر اس نے ریسور پٹخ کر فون بند کر دیا۔ اور سر کو دونوں انگلیوں سے دبانے لگا۔ اس وقت اس کے علاوہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ ناشتے کے بعد عفان کے ساتھ ہسپتال آ گیا جہاں زبیر اکیلا تھا۔ اطہر کو دو دن پہلے ہی چھٹی دے دی تھی لیکن وہ بھی ابھی بیڈ ریسٹ پر تھا۔ عفان زبیر سے ملنے کے بعد آفس چلا گیا۔ اس نے نیا نیا کام شروع کیا تھا، زیادہ وقت وہیں گزارتا۔ زلیخا زبیر کے پاس ہی تھیں لیکن بے حد تھکی ہوئی اور نڈھال لگ رہی تھیں۔ البتہ مریم غیر موجود تھی۔ اس کا نہ ہونا موحد کو بہت محسوس ہوا۔ ڈاکٹر سے بات کرنے پر اسے بتایا گیا کہ آج زبیر ڈسچارج ہو جائے گا۔ یہ خوش خبری اس نے زلیخا کو سنائی وہ وہیں شکر بجالانے لگیں۔ شام کو وہ زبیر کو لے کر گھر آ گئے۔ اس وقت بھی اسے مریم کی جھلک سے محروم رہنا پڑا۔ موحد کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں اس جیسی عام شکل کی لڑکی کو دیکھنے کے لیے خود کو بے چین و بے قرار پا رہا ہے؟ زبیر چل پھر سکتا تھا، مگر کمزوری بہت زیادہ تھی۔ ایکسیڈنٹ کے بعد اس کا خون کافی بہا تھا۔ انہیں گھر ڈراپ کر کے وہ جانے لگا تو زلیخا نے اسے روک لیا۔

"بہت شکریہ بیٹا، اس مشکل گھڑی میں تم نے ہمیں بہت سہارا دیا ہے۔" زلیخا کا لب و لہجہ ہی بدل گیا تھا۔ ان کے لہجے میں نرمی اور انکساری در آئی تھی۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔

"آنٹی آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" وہ سچ مچ اس سوچ میں مبتلا تھا کہ آیا اس نے ایسا کیا کام کیا ہے جو وہ اس کا شکریہ ادا کر رہی ہیں؟ کچھ دیر مزید باتیں کر کے وہ پھر سے رخصت لینے لگا تو انہوں نے اسے کھانے کے لیے روک لیا۔ کچھ ہی دیر بعد زلیخا چائے لے آئی تھیں۔

"آنٹی مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔ یہاں قریب میں کوئی ایسا گھر ہے جو کرائے کے لیے دستیاب ہو اور اس کی کنڈیشن بھی اچھی ہو۔" موحد نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہمارا اوپر کا پورشن خالی ہے۔ کسے مکان چاہیے؟" یہ جملہ سن کر اسے یوں لگا جیسے اس کی لاٹری نکل آئی ہو۔ اندر تک جیسے خوشی اتر گئی۔

"اصل میں مجھے رہائش کے لیے مکان کی تلاش ہے۔" موحد کی بات سن کر زلیخا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ۔۔" وہ بولنا شروع ہوا، اپنے اور اپنی ممی کے درمیان ہونے والے اختلافات کو لپیٹ لپیٹ کر بیان کر دیا۔

"ٹھیک ہے بیٹا تم اپنا سامان لے آؤ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ویسے بھی زبیر کے بہت سارے دن

ریسٹ میں گزریں گے تم ساتھ ہو گے تو وہ اچھا محسوس کرے گا۔" موحد کے اردگرد پھول مہکنے لگے تھے۔

☆☆☆

مریم کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ فون ہاتھ میں پکڑے وہ سخت مضطرب تھی، جب زلیخا اس کے کمرے میں آئیں۔ زبیر کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد سے ان کا رویہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔ زبیر آخری پیپر کے بعد گھر واپس آرہا تھا کہ اسے اطہر کی کال آئی تھی۔ اس کے پیر میں موچ آجانے کے باعث وہ بائیک نہیں چلا پا رہا تھا، اس نے زبیر سے ریکوسٹ کی تھی کہ وہ اس کے آفس آکر اسے لے جائے۔ یونی سے اس کا آفس دس منٹ کی واک پر تھا، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے آفس چلا آیا، واپسی پر ایک تیز رفتار گاڑی کے ساتھ ان کی بائیک سے ٹکرائی۔ دونوں معجزاتی طور پر زندہ تھے اور بہتر حالت میں تھے ورنہ ایسے روڈ پر ایکسیڈنٹ ہو جانے کے بعد ہاتھوں پیروں کا سلامت رہنا معجزہ تھا۔ اس واقعے کے بعد زلیخا کو عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ مریم کے ساتھ ان کا رویہ خود بخود بہتر ہو گیا۔

انہیں اندر آتا دیکھ کر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"تم سے ایک بات کرنی تھی۔ موحد کہہ رہا تھا کہ اسے رہائش کے لیے مکان چاہیے۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ وہ اوپری حصے میں رہ سکتا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن انہیں مکان کی ضرورت کیوں آگئی؟ وہ تو اپنی دادی کے ساتھ رہتے ہیں۔" مریم نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں وہ ان کے پاس شفٹ ہوا تھا۔ مگر اب الگ رہنا چاہتا ہے۔" اور جتنی تفصیل موحد نے بتائی تھی، وہ اسے سنا دی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بس اتنا ہی بول پائی۔

"کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی ہے؟" انہوں نے دوبارہ پوچھا

"میں نے اسکول سے جو چھٹیاں لی تھیں، اسکول ایڈمن نے ان چھٹیوں کی ڈبل سیلری کاٹ لی۔ اسی بات پر میرا جھگڑا ہو گیا ان سے۔ پورے محلے میں ایک ہی اسکول تھا جہاں اچھی سیلری دی جاتی تھی۔ اب میں کیا کروں گی۔" وہ سخت پریشان تھی۔ زلیخا بھی پریشان ہو گئیں۔

"تم نے کیا اسکول کو خیرباد کہہ دیا ہے؟" مریم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اب اگر میں اسکول جاتی ہوں تو بھی میرے سارے فری پیریڈز کو انگیج کر دیں گے۔ کام کروا کر بھرتا بنا دیں گے اور سیلری کاٹنے کے بہانے الگ۔" اس نے سر پکڑ لیا۔

"اوپر سے کمیٹی دینے کا بھی وقت آگیا ہے۔"

مریم گھر کی واحد کفیل تھی، زبیر کے علاج پر ساری جمع پونجی اور کمیٹی کی رقم خرچ ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے صحت افزا غذاؤں کی ایک لمبی لسٹ پکڑا رکھی تھی، اور دوائیں الگ۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ پریشان چہرہ لیے۔

☆☆☆

اگلے روز موحد سامان سمیت ان کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ اس کی دادی بھی تھیں۔ شام کا وقت تھا اور وہ بچوں کو پڑھانے میں مصروف تھی۔ سامنے چارپائی پر زبیر لیٹا تھا۔ اس کے قریب پھلوں سے بھری پلیٹ رکھی تھی جو مریم وقتاً فوقتاً زبردستی اسے کھانے پر مجبور کرتی۔ جہاں آراء اس کی مصروفیت دیکھ کر مسکرائیں۔ انہیں اندر آتا دیکھ کر وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی، کچن سے کھانے کی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ پورا گھر مہک رہا تھا۔ ان سے مل کر وہ انہیں اندر لے آئی۔ زلیخا کو ان کے پاس بٹھا کر اس نے فوراً ہی چائے چڑھا دی۔ اور زبیر کو بیٹھک میں بھیج دیا جہاں موحد موجود تھا۔ سات بجنے والے تھے۔ اس نے بچوں کو پندرہ منٹ پہلے ہی چھٹی دے دی اور چائے بنانے لگی۔ کھانے کا وقت بھی ہونے والا تھا تو خالی چائے ہی پیش کر دی۔ زبیر خود آکر چائے لے گیا تھا۔

"میں جب گھر میں داخل ہوئی تو اپنا زمانہ یاد آگیا۔ جب مغرب ہوتے ہی گھر میں کھانا تیار ہونے لگتا تھا، اور پورا گھر خوشبوؤں سے مہک رہا ہوتا

تھا۔" انہوں نے مریم کو دیکھ کر کہا، وہ مسکرائی۔
"پورا گھر اسی نے سنبھال رکھا ہے۔ کھانے پینے سے صاف ستھرائی، کمانے سے لے کر ہر چیز اسی کی مرہون منت ہے۔" مریم نے حیرت سے زلیخا کو دیکھا جنہوں نے پہلی بار اس بات کا احساس کیا تھا۔ نہ صرف احساس بلکہ اعتراف بھی۔ وہ زبیر کی خیریت معلوم کرنے آئی تھیں۔ پھلوں سے بھرے شاپرز باہر کچن میں رکھے تھے۔ مریم نے انہیں اٹھا کر فریج میں رکھا۔ ان کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر وہ پھر سے باہر آگئی جہاں زبیر چائے کے کپ سنک میں رکھ رہا تھا۔
"کچھ چاہیے؟" مریم نے اسے دیکھتے ہی مسکرا کر پوچھا۔ زبیر ہلکا سا مسکرایا۔
"نہیں، البتہ ایک فرمائش ہے۔"
"ہاں بولونا۔"
"جب پہلی بار موحد ہمارے گھر آیا تھا، اس وقت تم نے جو کباب بنائے تھے آج بھی وہی بنادو۔ موحد کی فرمائش ہے۔" زبیر کی بات سن کر مریم نے تحیر سے اسے دیکھا۔
"فرمائش؟ یہ کیا بات ہوئی۔" اسے برا لگ گیا۔
"اس میں برا منانے والی کیا بات ہے؟ اسے کباب بہت پسند ہیں، اس دن بھی بہت تعریف کر رہا تھا۔" زبیر نے پھر سے کہا۔
"بنادوں گی۔ تم جاؤ جا کر اندر بیٹھو۔ اتنی اتنی دیر کھڑے مت رہو۔" اس نے زبیر کو باہر جانے کی طرف اشارہ کیا اور کام میں مصروف ہوگئی۔ وہ بہت پریشان تھی کہ اب آگے وہ کیا کرے گی؟ اتنی بدلحاظی، وہ پچھلے کئی سالوں سے وہاں پڑھا رہی تھی۔ ہمیشہ اپنا بیسٹ دینے کی کوشش کی تھی۔ اور اب جب اسے سپورٹ کی ضرورت پڑی تو انہوں نے اپنی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ وہ اب اس جگہ دوبارہ کبھی کام نہیں کرے گی۔ کھانا بنا کر وہ بری طرح تھک گئی تھی، تھکن سے زیادہ ٹینشن تھی جو اس پر سوار تھی بے قدری کا احساس بہت برا ہوتا ہے اس وقت وہ بھی انہی کیفیات سے گزر رہی تھی۔ زلیخا نے اسے کہا کہ "وہ اندر جا کر جہاں آراء کو کمپنی دے وہ کھانا لگا دیں گی۔" مریم اس قدر تھک گئی تھی کہ اس نے رسماً بھی انکار نہیں کیا۔
"بہت تھک گئی ہو؟" وہ ابھی سامنے آکر بیٹھی ہی تھی کہ جہاں آراء نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ وہ صرف مسکرائی۔
"کس اسکول میں پڑھاتی ہو؟" انہوں نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔
"پہلے پڑھاتی تھی۔ اب کسی نئی جگہ کوشش کروں گی۔" وہ زبردستی مسکرا کر بولی۔
"میرا پڑپوتا جس اسکول میں پڑھتا ہے تم وہاں سی وی دے دو انہیں تو اچھے اساتذہ کی ضرورت ہے۔" ان کی تجویز پر وہ کھل اٹھی۔
"بلکہ ایک کام کرو، کل میرے ساتھ ہی چلو۔ بہت اچھا اسکول ہے۔" مریم نے اثبات میں سر ہلایا۔
"میں زبیر کی خیریت معلوم کرنے آئی تھی لیکن مجھے ایک اور کام بھی تھا تم سے۔" وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔
"زبیر کی زبانی مجھے علم ہوا تھا کہ تم ٹیچنگ کرتی ہو، میرے شہریار کے لیے بھی مجھے ایک ٹیوٹر چاہیے۔ اسی وقت میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی مگر طبیعت کی ناسازی کے باعث نہ آسکی نہ ہی بات کرسکی۔ اس سے تو تم مل ہی چکی ہو۔ بہت اچھا بچہ ہے۔ بالکل پریشان نہیں کرے گا۔" انہوں نے تعریفیں شروع کردیں، مریم کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
"ٹھیک ہے آپ اسے بھیج دیا کیجیے گا۔ ابھی وہ مزید بھی کچھ کہتیں کہ زلیخا آگئیں۔ وہ دوسرے کمرے میں سب کے لیے کھانا لگا چکی تھیں۔ جہاں زبیر، موحد، جہاں آراء اور زلیخا تھیں۔
"مریم اکیلی کھا رہی ہوگی۔ اچھا نہیں لگتا اس طرح۔ میں اسی کے ساتھ کھانا کھاؤں گی۔" انہوں نے کہا۔
اسے عادت ہے اکیلے کھانا کھانے کی۔ ہم گھر میں تین ہی تو لوگ ہیں۔ مختلف روٹین ہے سو کھانے کے وقت کبھی کبھار ہی ساتھ ہوتے ہیں۔ آپ آرام سے بیٹھ جائیں اور بسم اللہ کیجیے۔" یہ زبیر تھا۔ وہ بیٹھ

گئیں۔ کھانا بہت سادہ اور لذیذ تھا۔ دیر تلک جہاں آراء تعریفیں کرتی رہیں۔ موحد واش روم جانے کا بہانہ بنا کر کمرے سے نکلا کہ کیا خبر وہ باہر ہو، ابھی اس نے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ لائٹ چلی گئی۔

اوہ۔ سب کے منہ سے بے اختیار ہی ادا ہوا۔ مریم کچن میں تھی اس نے گیس لائٹ آن کی۔ وہ فوراً ہی اس جانب ہو گیا جہاں روشنی نہیں تھی مگر مریم اسے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ بے فکری سے گلے میں لٹکا دوپٹا، تیزی سے کام کرتے ہاتھ اور چہرے پر بکھری لٹیں۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا کوئی منظر اس کے لیے دلفریبی کا باعث بھی ہوگا۔ مگر اب تو سب کچھ بدل چکا تھا، اس کی پسند بھی اور خواہشات بھی، جس کا مکمل ادراک اسے اب تک نہیں ہوا تھا۔ کھٹکے پر وہ فوراً ہی ڈرائنگ روم میں گھس گیا۔ موحد کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ صوفے پر ڈھے سا گیا، اور آنکھیں موند لیں۔ مریم کی شبیہہ نگاہوں میں جھلملانے لگی۔

''یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ میں کیوں یہ سب کر رہا ہوں؟'' وہ سخت مضطرب تھا۔ بہت زیادہ پریشان۔ رات کے تقریباً نو بجے وہ دادی کو لے کر واپس آگیا۔

''کتنا بہترین طریقہ کار ہے اس بچی کا۔ خاطر تواضع سے لے کر کمپنی دینے میں مجال ہے کوئی کسر چھوڑی ہو۔ اب دیکھو دو گھنٹوں میں اتنا لذیذ کھانا بھی کھلا دیا۔ باتیں بھی ہو گئیں اور ہم وقت پر گھر بھی پہنچ آگئے۔ اللہ اس بچی کے نصیب اچھے کرے۔ موحد کل تم اسے لے کر یہاں آجانا پھر میں اسے شہریار کے اسکول لے جاؤں گی۔'' وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے کھولتے رک گیا۔ اور سوالیہ نظروں سے دادی کو دیکھنے لگا۔ جواب میں دادی نے تفصیل بتائی۔ ''میں نے اسے کہہ دیا کہ کل میرے ساتھ اس اسکول چلے۔ شہریار کی ٹیچر کی شادی ہونے والی ہے اچھا ہے مریم اس کی جگہ لے لے۔ ہمارا شہریار بھی یقیناً مریم کے ساتھ خوشی محسوس کرے گا'' انہوں نے ساری تفصیل بتائی۔ موحد مسکرایا۔

ملاقات کا ایک اور بہانہ مل گیا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ پھر جہاں آراء۔ کو ان کے کمرے تک چھوڑ کر واپس آگیا۔ زلیخا اسے سارے روٹ وغیرہ سمجھا چکی تھیں اور باہر کی طرف سے اوپر جانے والے راستے کا بھی بتا دیا تھا۔ وہ اوپر آیا اور زبیر کو فون کر کے بتا دیا کہ وہ پہنچ چکا ہے۔ زبیر کو دادی کا پیغام بھی دے دیا۔ اگلی صبح نو بجے موحد مریم کو لیے عفان کے گھر آیا۔ پورا رستہ وہ بالکل خاموش رہی۔ مجال ہے جو سلام کے جواب کے علاوہ اس نے کچھ کہا ہو۔ جہاں آراء کے آتے ہی دونوں نے باتیں شروع کر دیں۔ مگر مریم کی آواز بے حد دھیمی تھی۔ دونوں پچھلی سیٹ پر تھیں جبکہ آگے شہریار موجود تھا۔ آج ہفتے کا دن تھا بچوں کا اسکول سے آف لیکن ٹیچرز کا ورکنگ ڈے تھا۔ اسکول میں ڈیڑھ گھنٹے سے بھی زیادہ وقت لگ گیا۔ مریم کو اپائنٹ کر لیا تھا اور سیلری کا سن کر اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ وہیں سجدہ شکر بجا لائے۔ جہاں آراء اس کے چمکتے چہرے کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئیں۔ اس پر چھائی مردنی غائب ہو گئی تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ مریم کے چہرہ ڈھانپ کے رکھنے پر بھی انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا البتہ یہ ضرور تھا جب وہ بچوں کے پاس ہوگی تو نقاب اتارے گی۔ اس بات پر بھلا اسے کیا اعتراض ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تو بجی سنوری ٹیچرز کو دیکھ کر بے حد خوش ہوتے ہیں اور ایک فائدہ مند بات یہ بھی تھی کہ اسکول میں چوکیدار اور پیون کو چھوڑ کر سارا عملہ خواتین پر مشتمل تھا۔ لیکن اسکول اس کے گھر سے کافی دور تھا تقریباً بیس منٹ کی ڈرائیو پر۔ اس کا حل بھی جہاں آراء کے پاس تھا مگر مریم کو وہ بالکل بھی مناسب نہیں لگا۔ وہ روزانہ کی بنیاد پر موحد کے ساتھ اس کی گاڑی میں اسکول آنے جانے کے حق میں بالکل نہیں تھی۔ اور اس نے جہاں آراء کو صاف منع کر دیا تھا۔

☆☆☆

اس کی نئی روٹین شروع ہو گئی تھی۔ گھر کے حالات بہتری کی طرف گامزن تھے۔ زبیر اب بالکل

صحت یاب تھا اور یونی ورسٹی جانا شروع کر چکا تھا۔ موحد نے اسے عفان کے آفس میں ہی پارٹ ٹائم جاب دلوادی تھی۔ یونی ورسٹی سے وہ آفس چلا جاتا اور واپسی میں وہ دونوں ساتھ ہی گھر آتے۔ اکثر جہاں آراء موحد سے ملنے کے لیے بھی آجایا کرتیں۔ یہ بھی اسی طرح کی ایک شام تھی جب جہاں آراء عفان کے ہمراہ ان کے گھر آئیں۔ شہریار پڑھنے میں مصروف تھا۔ وہ موحد کے پاس اوپر چلی آئیں۔ وہ بستر پر گرا کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔ جہاں آراء کو دیکھ کر اٹھ گیا۔

''السلام علیکم دادی۔ کیسی ہیں آپ؟ ان سے ملتے ہوئے وہ خوش گواری سے بولا۔

''وعلیکم السلام۔ میرا بچہ کیسا ہے؟'' انہوں نے موحد کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ وہ انہیں ساتھ لگائے صوفے پر آبیٹھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ بتائیں کیا پئیں گی؟ عفان بھائی بھی آئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں وہ نیچے بیٹھا ہے۔ مریم نے چائے پانی پلادیا تم بیٹھے رہو میرے پاس۔ تم سے کچھ بات کرنی ہے مجھے۔'' انہوں نے موحد کا ہاتھ تھاما۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم اب واپس گھر جاؤ۔ یہ بے وجہ کی گھر بدری کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔'' موحد نے بے اختیار ان کے ہاتھ چھوڑ دیے۔

''میں کسی صورت اس گھر میں نہیں جاؤں گا۔''

وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

یہ کوئی طریقہ نہیں ہے موحد۔ وہ ناراضی سے بولیں۔

''دادی۔ ممی جب تک آپ سے معافی نہیں مانگتیں، وہ آپ کو خود گھر لے کر نہیں آتیں میں اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھوں گا۔'' موحد کا لہجہ اٹل تھا۔

''آپ اس بحث کو چھوڑیے۔ یہ بتایئے کہ۔۔۔'' موحد نے ٹاپک ہی بدل دیا۔ باتوں کے دوران جہاں آراء نے اسے یہ کہا تھا کہ وہ رات کا کھانا گھر جا کر ہی کھائیں گی۔ ہفتے میں دو بار تو وہ آتی ہیں۔ اور ہر بار مریم کھانا بنا کر بھیجتی ہے۔ انہیں یہ مناسب نہیں لگتا۔

ان کی بات سن کر موحد نے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ عفان کو ایک کال آگئی تھی جس کی وجہ سے اسے جانا پڑا۔ دونوں دادی پوتا کھانا کھا رہے تھے جبکہ شہریار نیچے مریم کے ساتھ تھا۔

''میں ایک بات سوچ رہی تھی۔ مریم بہت اچھی لڑکی ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔ شہریار بھی اس کے ساتھ گھل مل گیا ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے۔'' عفان اور مریم کا جوڑ کیسا رہے گا؟ ابھی انہوں نے بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ موحد کے حلق میں نوالہ پھنس گیا۔ جہاں آراء گھبرا گئیں۔

''کیا ہوا؟'' انہوں نے اس کی پشت سہلائی۔ کچھ دیر بعد وہ نارمل ہوا۔ ''احتیاط سے کھانا کھایا کرو۔ انہوں نے ناراضی سے کہا۔ موحد سے ایک لقمہ لینا بھی دو بھر تھا۔ وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھ گیا۔

''اب کھانا تو کھالو۔'' اسے بستر کی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ بولیں۔

''بس دادی کھالیا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ یکایک اس کا لہجہ انداز سب بدل گیا تھا۔ وہ بستر پر اوندھے منہ گر گیا۔ جہاں آرسب سمجھ کر بھی سمجھ نہیں پارہی تھیں۔ انہوں نے بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

''کیا بات ہے؟ کھل کر بتاؤ۔'' وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پیار سے بولیں۔ موحد نے سر اٹھایا اس کی آنکھوں میں پانی بھرا تھا۔ جہاں آرا ہکا بکا رہ گئیں۔

''کیا ہو گیا بیٹا؟'' وہ گھبرا گئی تھیں۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ کیا ہوا ہے۔'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''میں نے جب پہلی بار زبیر کے سامان میں مریم کی تصویر دیکھی تھی تو میں نے اس کے چہرے کا بہت مذاق اڑایا۔ اس وقت تانیہ نے مجھے بہت منع کیا کہ میں اس طرح کی بڑی بڑی باتیں نہ کروں۔ میں اس وقت یہ سمجھتا رہا کہ مریم زبیر کی پسند ہے اور مجھے اس کی پسند پر انتہائی افسوس تھا کہ وہ خود خوش شکل ہو کر ایسی معمولی لڑکی کی تصویر اپنے پاس رکھ کر گھومتا

ہے۔ مگر اس کے بعد جب میں نے سامان واپس کرنے کے لیے گھر کے نمبر پر کال ملائی تو فون مریم نے اٹھایا۔ مجھے اس کی آواز نے مسحور کر دیا۔ میں نہیں جانتا تھا، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس کی آواز سننے کے لیے میں بار بار فون کر رہا ہوں وہ یہی مریم ہے۔ جس کا چہرہ دیکھنے کے لیے میں تڑپنے لگا ہوں وہ یہی لڑکی ہے جس کا میں حقارت سے تمسخر اڑا چکا ہوں۔ اور جب میں نے پہلی بار اس کا چہرہ دیکھا، میں شاک رہ گیا، لیکن میں اس کے چہرے سے نگاہ نہیں ہٹا پایا۔ مجھے اس کا چہرہ بالکل بھی برا نہیں لگا۔ بلکہ میں اسے دیکھنے کے لیے خود کو اور بھی بے چین محسوس کرنے لگا ہوں۔ میری انا یہ بات برداشت نہیں کر پا رہی تھی کہ میں اس لڑکی کے پیچھے خوار ہوتا یہاں اس گھر میں پڑا ہوں۔ عفان کا گھر چھوڑتے ہوئے میرے دماغ میں صرف یہی ایک گھر آیا تھا۔ میں کسی بھی لگژری فلیٹ میں رہ سکتا تھا لیکن میں نے اس گھر کو ترجیح دی۔ جب مریم کی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے تو مجھے سکون ملتا ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے میں کبھی ایک بہانہ بناتا ہوں کبھی دوسرا اور ناکامی پر کسی بچے کی طرح رونے لگتا ہوں۔ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔'' وہ بولنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا۔ جہاں آراء ہکا بکا اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

☆☆☆

آج اتوار کا دن تھا۔ اتوار کے دن موحد سارا دن گھر سے باہر ہوتا۔ وہ آسانی سے گھر کے اوپری حصے کی تفصیلی صفائی بھی کر لیتی تھی۔ کچھ دن پہلے ہی وہ کچھ نئے پودے لے کر آئی تھی، ان میں پھول کھلے تھے۔ پودوں کو پانی دے کر وہ چھت سے اتر آئی اور موحد کے پورشن کی طرف بڑھ گئی۔ دوپٹا کمر سے باندھا اور صفائی میں جت گئی۔ پورا کمرہ کھانے کے مختلف خالی پیکٹس اور سگریٹ کے بجھے ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ بیڈ پر بری حالت میں پڑی چادر اٹھا کر جھاڑی تو اس میں سے موحد کی بلیک شرٹ نکلی۔ جو کل اس نے پہن رکھی تھی۔ اس نے بے اختیار شرٹ کو ناک کے قریب کیا۔

''اُفف کتنی اچھی خوشبو ہے۔ پتا نہیں کیا نام ہوگا اس کا۔ جو بھی نام ہو ہوگی بھی مہنگی۔ کاش میرے پاس اتنے پیسے ہوں کہ میں زبیر کے لیے یہ خوشبو خریدوں'' مریم نے سوچا اور شرٹ کو باسکٹ میں ڈال کر باقی کمرہ سمیٹنے لگی۔ وہ بری طرح کام میں مگن تھی۔ پورا ایک گھنٹہ لگا مگر اس نے ایک کمرہ صاف کیا اور پھر تھک کر وہیں بستر پر ڈھے گئی۔ سائڈ ٹیبل پر ایک تصویر رکھی تھی جس میں وہ تینوں بہن بھائی سر جوڑے مسکرا رہے تھے۔

''میں بھی ایک ایسی ہی تصویر زبیر کے ساتھ بنواؤں گی'' اور پھر اسے اپنے کمرے میں سجاؤں گی۔ مریم نے مسکراتے ہوئے بلند آواز میں خود کلامی کی اور تصویر چہرے کے سامنے سے ہٹا کر بستر سے اٹھی مگر حرکت کرنا بھول گئی۔ اس کے عین سامنے محض چند قدم کے فاصلے پر موحد کھڑا تھا۔ مریم کی طرح وہ بھی حیرت زدہ تھا۔ مریم کو یوں لگا جیسے کسی نے اس بیچ چوراہے میں چوری کرتے پکڑ لیا ہو، اس کی کیفیت اسی قسم کی تھی۔ وہ نہ اپنی جگہ سے حرکت کر پا رہی تھی اور نہ ہی اس کے منہ سے کوئی آواز نکل رہی تھی۔ موحد اس کے قریب آیا، اس کے ہاتھ سے فریم لیا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا مریم نے ساری ہمت مجتمع کر کے باہر کی جانب دوڑ لگائی۔ وہ جا چکی تھی مگر اپنی خوشبو کمرے میں ہی بھول گئی۔ اس نے تکیے پر سر رکھا تو وہ اسے نم محسوس ہوا۔ مریم کے بال یقیناً گیلے تھے۔ لیٹنے سے تکیہ بھی ہلکا گیلا ہو گیا تھا۔ موحد نے تکیہ اٹھایا اور اسے ناک کے قریب لے جا کر گہری سانس بھری۔ پھر اسے بازوؤں میں بھر کر آنکھیں موند لیں۔ نجانے اس کی یہ حالت کیا رنگ دکھانے والی تھی۔ ابھی اسے لیٹے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس کا فون بجا۔ پاپا کالنگ کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔

''السلام علیکم پاپا''۔ اس نے تکیہ سینے پر رکھا اور کال ریسیو کی۔

''وعلیکم السلام۔ کیسے ہو؟'' وہ بدلے نہیں تھے، لیکن

بیوی کی نگاہ سے دنیا کو دیکھنا کم کر دیا تھا۔ لہجے میں از خود انکساری در آئی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تکیہ گود میں آن گرا۔

"میری طبیعت آج کل ٹھیک نہیں، شاید موسم کا اثر ہے۔ تم گھر آ جاؤ نا یار۔ تمہارے بغیر گھر بہت سونا لگتا ہے۔" جملہ پورا کرنے کے دوران وہ دو بار کھانسے۔

"پاپا میں اس گھر میں کیسے آؤں؟ بالفرض آج اگر میں واپسی کا سفر اختیار کر بھی لیتا ہوں تو کل کو ممی پھر کوئی نہ کوئی ایسی وجہ بنالیں گی کہ مجھے گھر چھوڑنا پڑے گا"۔ اس نے صاف گوئی سے کہا، اور دوبارہ گھر چھوڑنے کی وجہ کچھ دیر پہلے ہی اس کے کمرے میں تھی۔

تم ماں سے اتنے بدگمان کیوں ہو؟ وہ ساس بہو کا معاملہ ہے، یہ سب تو زندگی کا حصہ ہے۔" وہ جو باپ کی خراب طبیعت کی وجہ سے اپنے دل میں نرمی محسوس کر رہا تھا، ان کی بات سن کر کھول گیا۔

"پاپا وہ ساس بہو کا معاملہ نہیں۔ وہ میری دادی کا معاملہ ہے، آپ کی ماں کا معاملہ ہے۔ آپ اتنے غیر جانبدار کیسے ہو سکتے ہیں" وہ دکھ سے بولا۔

"وہ ایک بوڑھی خاتون ہیں۔ اس عمر میں بھی انہوں نے مجھے کسی ننھے بچے کی طرح ٹریٹ کیا ہے، میرا خیال رکھا ہے۔ آپ کی بیوی آپ کے سامنے آپ کی ماں سے کہے کہ وصیت بنوالیں اور آپ اس کی تائید کریں۔ جب وہ گھر سے چلی جائیں تو فون پر ان کی بے عزتی کریں اور انہیں موت کے منہ میں پہنچا دیں۔ کل کو اگر یہی سارے عمل میں اور میری بیوی آپ دونوں کے ساتھ دہرائیں تب بھی آپ یہی کہیں گے کہ یہ ساس بہو کا معاملہ ہے؟ تب میری ماں بھی یہی جملے دہرائے گی؟" وہ بولا تو بولتا چلا گیا۔

دوسری جانب بالکل خاموشی چھا گئی۔

"تم مجھے لیکچر مت دو، دادی کے حقوق کے خیال میں تم اپنے والدین کو دکھی کر رہے ہو۔ اس بات کا احساس ہے تمہیں؟" انہوں نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"پاپا میں آج کے دور کا انسان ہوں۔ جو میرے ساتھ نیکی کرے گا میں صرف اسی کے ساتھ اچھائی کروں گا۔ فرائض کے سبق آپ دونوں نے مجھے پڑھائے کب؟ سکھائے کب؟ آپ کے منہ سے میں نے ہمیشہ یہی سنا ہے کہ ماں جی اس میں ہمارا بھی حق تھا۔ کبھی یہ نہیں سنا کہ ماں جی یہ ہمارا بھی فرض ہے۔" بولتے ہوئے اس کی آواز رندھ گئی۔ بیٹا باپ کے مقابل آ گیا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اس قسم کی باتیں کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاپا بیمار ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے پاپا دادی کے ہارٹ اٹیک کے بعد سے بدلنے لگے ہیں کیونکہ ان کی تینوں اولادوں نے وہی ساری حرکتیں شروع کر دی تھیں جو آج کل بوڑھے والدین کے ساتھ روا رکھی جاتی ہیں۔ وہ بری طرح خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اور موحد بھی یہی چاہتا تھا۔ اس نے مزید پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خدا حافظ کہہ کر فون کاٹ دیا۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔

☆☆☆

مریم جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے میں یہاں سے وہاں چکرا رہی تھی۔ بے چینی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ جب کچھ سمجھ نہ آیا تو تھک کر بستر پر بیٹھ گئی، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"مجھے کیا ضرورت تھی اس کے کمرے میں جا کر ایسی حرکت کرنے کی۔ وہ کیا سوچتا ہو گا میرے بارے میں۔؟ کہ میں کیسی لڑکی ہوں؟ جو ویسے تو پردہ دار بنتی ہے اور اب۔" اس نے سر پکڑ لیا۔

"میں کیا کروں اللہ۔ کہاں جاؤں۔" وہ رونے لگی۔ شاید کچھ تو دل کا بوجھ ہلکا ہو۔ کچھ دیر بعد بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر آنکھیں صاف کیں۔ اور دوپٹا اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر باہر آئی۔ وہ دوبارہ ایسی بے وقوفی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر اس سے پہلے ہی زلیخا نے دروازہ کھولا۔ اطہر اور ماجدہ آئے تھے۔ اطہر کے حادثے کا

سن کر وہ اگلے ہی دن دوڑتی بھاگتی آ گئی تھیں۔ اب جب کہ وہ نارمل روٹین میں آچکا تھا تو یہ ان کی پہلی آمد تھی۔ مریم پہلے ہی بہت تھک چکی تھی۔ مہمانوں کو دیکھ کر کچھ اور بھی تھکن بڑھ گئی۔ ماجدہ خالہ سے مل کر وہ فوراً چائے بنانے آ گئی۔ اچھی خاصی سردی تھی۔ وہ تینوں برآمدے میں دھوپ کے نیچے بیٹھ گئے۔ ہوا بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی، ابھی وہ چائے کپوں میں ڈال ہی رہی تھی کہ اطہر کچن میں آ گیا۔ مریم کے چہرے پر ناگواری ابھری۔

''میں تم سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں مریم''۔ اطہر نے اس کی پیشانی کے بل گنتے ہوئے کہا۔

''لیکن مجھے آپ سے کوئی ضروری بات نہیں کرنی۔ اگر میرے گھر کے لوگوں کی حیا سو چکی ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں بھی ان جیسی ہو جاؤں۔ انہیں شاید آپ کے ساتھ موجود رشتے اور میرے سوتیلے ہونے کے باعث آپ سے زیادہ ہمدردی ہے لیکن مجھے آپ جیسے بدنیت انسان سے کوئی سروکار نہیں۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میں گھر آئے مہمان کی تذلیل نہیں کر سکتی لیکن اگر آپ دو سیکنڈ میں یہاں سے نہیں گئے تو میں ہر لحاظ بھول جاؤں گی''۔ مریم کا ضبط جواب دیتا جا رہا تھا۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اطہر نے ایک دم سے کہا۔ مریم کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ اسے اس قدر شدید غصہ آیا کہ اس نے ٹرے اٹھا کر فرش پر پھینکی۔

''نکل جائیں میرے گھر سے۔ دفع ہو جائیں۔'' وہ جتنی بلند آواز سے دھاڑ سکتی تھی اتنی بلند آواز سے دھاڑی۔ وہ دونوں ان کی جانب متوجہ ہو گئیں۔ مریم کی آواز اور برتنوں کا گرنا موحد کی سماعتوں میں بھی اترا۔ وہ تیزی سے نیچے آیا۔ سامنے کا منظر حیران کن تھا۔

''پلیز میری بات سنو''۔ وہ لجاجت سے کہہ رہا تھا۔

''کیا بات سنوں میں آپ کی؟ یہ بات سنوں کہ آپ اور میری ماں مل کر مجھے کتنی ذہنی اذیت سے دوچار کرتے تھے یا یہ سنوں کہ جب آپ نے مجھ سے دست درازی کی کوشش کہ مجھے محلے بھر میں بدنام کروایا۔ میری ماں نے سارا الزام مجھ پر دھر کر آپ کو بری الذمہ قرار دے دیا؟ صرف اس لیے کہ میں ان کے شوہر کی پہلی بیوی سے ہوں اور یہ گھر میرے نام ہے؟ اگر ان کا رویہ اب بدل گیا ہے تو کیا میں پرانی ساری باتیں بھول کر آپ کے پروپوزل کے لیے ہاں کر دوں گی؟ اگر وہ میری سگی ماں ہوتیں نا تو اس قصے کے بعد وہ آپ کو دوبارہ اس گھر میں گھسنے تک نہ دیتیں کجا کہ مجھے پھر سے پروپوز کرنے کے مواقع فراہم کرنا۔'' مریم کی آنکھوں میں نفرت کی لالی تھی۔

''بس کچھ دن اور۔۔۔ میں یہ گھر زبیر کے نام کر کے یہاں سے چلی جاؤں گی۔ پھر آپ کا جب دل چاہے جسے چاہے یہاں بلائیے گا۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔'' وہ زلیخا سے کہہ کر کمرے میں گھس گئی اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔ ماجدہ وہیں چارپائی پر ڈھے سی گئیں۔

''مریم کیا کہہ گئی ہے''؟ انہوں نے غصے سے پوچھا۔ زلیخا نے کسی مجرم کی طرح انہیں ساری بات بتائی۔ انہیں صرف یہ علم تھا کہ اطہر نے اسے پروپوز کرنے کی کوشش کی تھی یہ نہیں معلوم تھا کہ آگے کا کیا قصہ ہے۔ زلیخا کی روداد سن کر انہوں نے سر پکڑ لیا۔

''مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ وہ بن ماں باپ کی بچی جس نے باپ کے چلے جانے کے بعد تمہیں اور تمہارے بیٹے کو کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ دن رات محنت کرتی رہی اس کے ساتھ ایسا سلوک؟ زلیخا تمہیں خوف نہیں آتا؟'' وہ دکھی لہجے میں بول رہی تھیں۔

''میں نے اطہر کو اس لیے یہاں بھیجا تھا کہ اگر دونوں کے مزاج ملے اور مریم راضی ہو گئی تو رضامندی اور خوشی سے اس رشتے کو طے کر دیں گے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اسے پریشان کرنے کے لیے تم دونوں نے ایسے ایسے حربے آزمائے ہیں''۔ زلیخا بھی نیچے بیٹھ گئیں۔

''میری بدبختی ہے۔ جو کچھ میں نے کیا مجھے اس پر سخت افسوس ہے لیکن آج میری نیت کھوٹی نہیں

تھی۔ میں چاہتی تھی کہ اطہر اور مریم ایک دوسرے کی بات سن لیں۔ اسی لیے میں نے اسے مریم کے پاس بھیجا تھا۔" سیڑھیوں پر کھڑا موحد ساکت تھا۔ مریم پر کیسے کیسے حالات گزرے تھے۔ دل چاہ رہا تھا کہ اطہر کو اتنا مارے کہ اس کا سانس رک جائے۔ وہ دبے قدموں واپس چلا گیا۔ اس نے موبائل اٹھایا۔

"ہیلو پاپا۔ میں ایک شرط پر گھر واپس آؤں گا۔ اگر آپ اور ممی میری پسند کی لڑکی سے میری شادی کرنے پر راضی ہوں گے تو میں نہ صرف گھر آؤں گا بلکہ آپ کا بزنس بھی سنبھالوں گا۔"

"کون لڑکی"؟ ان کی تحیر میں ڈوبی آواز ابھری۔

"میرے دوست کی بہن ہے مریم۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے گا پاپا۔ اگر ممی نے کسی بھی طریقے سے ان کی تذلیل کی یا اسٹیٹس کے فرق کو ظاہر کیا تو پھر آپ یہ سوچ لیجیے گا کہ آپ کا بیٹا مر گیا۔" موحد نے بات مکمل کی اور فون کاٹ دیا۔

"پتا نہیں ان دھمکیوں کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ مریم پہلے ہی پریشان ہے اگر ممی یہاں آئیں اور انہوں نے کچھ الٹا سیدھا کہہ دیا تو؟ وہ تو انکار کرنے میں لحہ بھی نہیں لگائے گی۔" وہ پریشانی سے یہاں وہاں ٹہلنے لگا۔

"موحد تم اسے پرپوز کر رہے ہو؟ ایک ایسی لڑکی کو جو تم سے کسی صورت مطابقت نہیں رکھتی۔" اس کے اندر سے آواز آئی۔

"مجھے اس سے محبت ہے اور یہی سب سے بڑی مطابقت ہے۔" اس نے خود سے اظہار کیا اور وجود جیسے ہلکا پھلکا ہو کر آسمان میں اڑنے لگا۔

"میرے لیے دنیا کی حسین ترین عورت مریم ہے۔" "مریم موحد۔" اس نے مسکرا کر زیر لب کہا۔

☆☆☆

ماجدہ اور اطہر کچھ ہی دیر بعد واپس چلے گئے تھے۔ مریم کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا اور موحد کا نمبر ملایا۔ موحد کا نمبر کچھ دن پہلے ہی اس نے اپنے فون میں سیو کیا تھا۔ دوسری بیل پر ہی کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو۔ میں مریم بات کر رہی ہوں؟" اس نے اپنا تعارف کروایا۔ دوسری جانب جیسے خاموشی چھا گئی۔

"ہیلو؟" مریم سمجھی کہ شاید کال کٹ گئی،

"جی جی فرمائیں"۔ موحد نے حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ سے ایک ضروری کام تھا۔ لیکن آپ یہ بات خود تک محدود رکھیں گے۔"

"جی فرمائیں"۔ موحد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کس ضروری بات کا کہہ رہی ہے۔

"اصل میں، میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے کسی وکیل سے ملوا دیں، کچھ ضروری امور نمٹانے ہیں"۔ وہ یقیناً اس بات سے ناواقف تھی کہ وہ اس کی ساری باتیں سن چکا ہے۔

"جی ٹھیک ہے۔ بتائیں کس دن جانا چاہیں گی آپ"۔ موحد نے فوراً حامی بھری۔

"کل؟ اسکول سے واپسی پر میں بارہ بجے وہاں سے آف لے لوں گی آپ مجھے پک کر لیجیے گا۔" اس نے سب کچھ سوچ لیا تھا جیسے۔ موحد مسکرایا۔

اگلی صبح وہ بتائے ہوئے وقت پر پہنچ گیا۔ مریم کچھ ہی دیر میں آ گئی۔

"یہاں سے پہلے بینک جانا ہے تاکہ میں ڈاکومنٹس نکلوا سکوں"۔ اس نے آہستگی سے بتایا۔ مگر موحد بینک جانے کے بجائے گاڑی سڑک پر دوڑاتا رہا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" مریم نے سخت لہجے میں پوچھا۔ موحد نے گاڑی سائیڈ پر روک دی۔

"مجھے آپ سے ضروری بات کرنی تھی مریم۔" اس کے سنجیدہ لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ مریم چونک گئی۔

"اگر میں آپ کو کل منع کر دیتا تو میں آپ سے روبرو بات کرنے کا موقع کھو دیتا، آپ پلیز تحمل سے میری بات سنیے گا۔" وہ لجاجت سے بولا، مریم کا فشار خون بڑھنے لگا۔

"جب میں نے پہلی بار آپ کی آواز فون پر سنی تو میں مسحور ہو کر رہ گیا۔ میں ایک دل پھینک انسان ہوں۔ مجھے ہر خوب صورت چیز اپنی جانب کھینچ لیتی

تھی، یہی معاملہ آپ کی آواز سن کر بھی ہوا۔ میں جان بوجھ کر آپ کے گھر آیا تاکہ آپ کو دیکھ سکوں لیکن میں ناکام ہوگیا۔ پھر زبیر کے ایکسیڈنٹ کے بعد جب آپ سے میری تھوڑی بہت بات چیت ہوئی تب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ جسے میں محض کشش سمجھ رہا ہوں وہ صرف کشش نہیں ہے۔ کچھ اور ہے۔ میرے دن رات صرف آپ کے بارے میں سوچتے ہوئے گزرنے لگے۔ گھر والوں سے جھگڑ کر گھر چھوڑنے کے بعد میں کسی بھی جگہ جا کر رہائش اختیار کر سکتا تھا لیکن میرے دماغ میں صرف آپ ہی کا نام آیا۔ میں بنا سوچے سمجھے یہاں شفٹ ہوگیا اور جب دادی نے مجھ سے رائے پوچھی۔ دادی کی خواہش تھی کہ عفان اور آپ کی شادی ہوجائے، اس بارے میں جب انہوں نے مجھ سے ذکر کیا تو تب مجھے جو تکلیف ہوئی، اسے میں بیان نہیں کرسکتا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے میری گردن میں خاردار رسی لپیٹ کر کھینچ دی ہو۔" مریم ہکا بکا آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے دادی نے بہت سمجھایا کہ میں اور آپ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ میری ممی آپ کو کبھی قبول نہیں کریں گی اور اگر میری ضد کے آگے ہار مان بھی گئیں تو آپ کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن۔۔۔ مجھے صرف آپ سے شادی کرنی ہے چاہے کچھ بھی ہوجائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو۔۔"

"تو؟" مریم کی سرد آواز ابھری۔

"میں اس پوری دنیا کو آگ لگا دوں گا"۔ موحد کو نجانے کیوں غصہ آگیا۔ وہ اظہار کرتے ہوئے ہانپ گیا تھا اور وہ تھی کہ غصے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مریم کی آنکھوں میں اسے اپنے لیے وہی رنگ دکھائی دیے جو کبھی مریم کی تصویر دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اترے تھے۔

"اچھا؟ یہ بات ہے تو جائیں جا کر لگائیں آگ۔ میری طرف سے انکار ہی سمجھیں"۔ اس نے لمحوں میں فیصلہ سنایا۔ موحد کو لگا اس کے کانوں نے غلط سنا ہے۔

"کیا کہا؟" اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے آپ سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" اس نے پہلے سے بھی سخت لہجے میں جملہ دہرایا۔ موحد کو یہ گمان تو تھا کہ وہ اسے اس طرح گاڑی روکنے اور اظہار محبت کرنے پر بے نقط سنائے گی مگر اس طرح انکار کردے گی یہ تو اس کے فرشتوں نے بھی نہیں سوچا تھا۔

"کیوں کیا کمی ہے مجھ میں؟" اس نے ضبط کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے کہا۔ رجیکشن کی تکلیف کیا ہوتی ہے اور انسان کے حواس کیسے اور کس طرح سلب کرتی ہے۔ اس بات کا احساس اسے آج ہوا۔

"میری ماں بچپن میں مرگئی تھی۔ میرے باپ نے دوسری شادی کی۔ اللہ نے ہمارے گھر زبیر کو بھیجا۔ میری سوتیلی ماں کو لگا تھا کہ زبیر کے آنے کے بعد میرے ابو مجھے بھول جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے پہلے سے بھی بڑھ کر مجھے محبت دی۔ لیکن وہ چوبیس گھنٹے گھر میں نہیں رہتے تھے۔ چوبیس گھنٹے میرے ساتھ زبیر کی سگی اور میری سوتیلی ماں ہوتی تھی اور جب بھی ابو مجھ سے اکیلے میں امی کے رویے کے بارے میں پوچھتے، میں کبھی انہیں حقیقت نہ بتا سکی۔ کیونکہ امی کے سخت رویے ان کے ایک گھنٹے کی توجہ اور محبت پر بھاری تھے، وہ خوف ابو کی طرف سے دی جانے والی محبت اور توجہ پر غالب آجاتا تھا۔ میں نے کئی سال پہلے سوچ لیا تھا کہ میں کسی ایسے مرد سے شادی کروں گی جس کے گھر والے مجھے اپنی خواہش پر بیاہ کرلے جائیں گے۔"

اس کی اس عجیب سی لاجک پر موحد کا دل چاہا وہ اپنا سر پیٹ لے۔

"تم سچ مچ ٹیچر ہی ہو نا؟" اس نے ایسے سنجیدہ اور خوف ناک ماحول میں یہ سوال اس انداز سے پوچھا کہ مریم ہونق ہوگئی۔

"تم کہہ کیا رہی ہو؟ تم سوچ کیا رہی ہو؟ اچھی خاصی عقل مند لڑکی بھی ایسی احمقانہ باتیں سوچ سکتی ہے؟" وہ حیرت زدہ تھا۔ مریم کو کچھ اور غصہ آیا مگر وہ بس اسے خونخوار نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

"یہ کوئی کلیہ نہیں کہ تم اگر کسی ایسے گھر میں شادی کروگی جہاں تمہاری ساس تمہاری واری صدقے جائیں گی تو تم وہاں جھوٹی محبتوں اور دوغلے رویے سے محفوظ رہوگی۔ ہمارے معاشریے میں اکثر شادیاں لڑکے کے والدین کی پسند سے ہوتی ہیں اور بعد میں فساد بھی اسی جانب سے شروع ہوتا ہے۔" ابھی موحد نے تمہید باندھی ہی تھی کہ مریم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں کسی صورت یہ طعنہ برداشت نہیں کرسکتی کہ تم نے میرے بیٹے کو پھانسا ہے"۔ موحد نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اسے بے اختیار شرمندگی محسوس ہوئی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میری فیملی میں سے کبھی کوئی بھی انسان تم سے یہ سب نہیں کہے گا۔ اگر کسی نے ایسا کچھ کہا تو میں تمہیں لے کر الگ ہوجاؤں گا"۔ اس نے یقین دہانی کی کوشش کی۔

"ہاں تاکہ بعد میں سب کہیں کہ بیوی نے شوہر کے کان بھر بھر کے اسے ماں سے الگ کردیا"۔

بیوی اور شوہر کا لفظ سن کر موحد کو یوں لگا جیسے کانوں میں کسی نے رس گھول دیا ہو۔ وہ اش اش کراٹھا۔ مریم کو بھی اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ مگر اب کیا کرتی کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تمہاری جانب سے انکار نہ ہو۔ باقی سارا کام میرا ہے۔" موحد نے بس اتنا کہا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

☆☆☆

وکیل سے بات کر کے وہ گھر واپس آئی۔ اور کمرے میں گھس گئی۔ اس کی بھوک پیاس سب اڑ چکی تھی اور کسی بھی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ موحد اچھا خاصا ہینڈسم تھا جبکہ وہ۔۔۔ پھر اسٹیٹس کا فرق وہ سمجھ نہیں پارہی تھی کہ کیا کرے۔ دل تھا کہ بار بار موحد کی جانب جھک جاتا۔ وہ اپنی کیفیات سے بھی سخت عاجز آئی ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ موحد کو سوچے اور بس سوچتی رہے۔ اس کے وجود سے اٹھنے والی خوشبو کو آنکھیں بند کر کے محسوس کرتی

رہے۔ اور بس زندگی یونہی گزر جائے۔ ذہن میں امڈنے والے سوالات نے اسے تھکا دیا تھا۔
"کیا گارنٹی ہے کہ تمہارے طبقے سے تعلق رکھنے والا مرد بھی تم سے وفا کرے گا؟ اور تمہاری موجودگی یا غیر موجودگی میں خود کو تمہاری وفا کا پابند پائے گا؟
میری جیسی عام شکل کی عورت جس کے لیے آج تک ایک پیغام نہیں آیا۔ جسے کسی نے بھی اپنی گھر کی بہو بنانے کا نہیں سوچا۔ صرف اس لئے کہ میں دودھ کی طرح گوری نہیں ورنہ کیا نقص ہے مجھ میں؟ میرا کردار، عادات، شرافت کیا کسی چیز کا مول نہیں۔ شکل کا کیا ہے وہ تو چند سالوں بعد جھریوں کے سائے میں چھپ جائے گی۔" آئینے کے سامنے کھڑی وہ خود کو غور سے دیکھ رہی تھی۔
"ہاں تو انہی سب خصوصیات کا مول موحد کے پاس ہے۔ اطہر کے پاس بھی تھا لیکن اس کی قسمت خراب تھی۔"
"میرے اور موحد کے درمیان کیا مطابقت ہے؟" اسی وقت اس کا موبائل بجا۔ اس نے فون اٹھا کر میسج چیک کیا۔ موحد کا میسج تھا۔
"میرے اور تمہارے درمیان محبت ہے اور یہی سب سے بڑی مطابقت ہے۔" میسج پڑھ کر وہ ساکت رہ گئی۔ ایک آنسو لڑھک کر گال سے نیچے جا گرا۔

☆☆☆

وہاں عاصم آگ بگولا بنی تنزیلہ کو سمجھا رہے تھے۔
"تم میری بیوی ہو، میں نے ہمیشہ تمہیں ہر معاملے میں خود سے زیادہ اہمیت دی۔ آج بھی دیتا ہوں۔ تم نے میری سگی ماں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا لیکن میں نے تمہیں کبھی ڈانٹا تک نہیں۔ وہ شاید جوانی تھی جس نے میری آنکھوں کے سامنے پٹی چڑھا کر رکھ دی تھی۔ مگر اب مجھے اس بات کا احساس ہو رہا ہے، ہم دونوں بوڑھے ہو چکے ہیں اور اماں ضعیف۔
میری ماں نے ہمیشہ مجھے بہت محبت دی۔ میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ بھائی جی بڑے۔ وہ سمجھ دار تھے میں نادان۔ جب تک غیر شادی شدہ رہا اماں کے سائے میں رہا۔ میں ان کی پہلی اور آخری ترجیح تھا لیکن۔۔ اس کے باوجود شادی کے بعد میں نے اپنی ماں کو بھلا دیا۔ سوچو جس عورت نے اپنی ساری زندگی بچوں کی پرورش اور محبت میں گزار دی اس کی اولاد ایسا صلہ دے رہی ہے تو ہمارے بچے ہمارے ساتھ کیا کریں گے؟ وہ ماڈرن دور کے ہیں، ایسے دور کے جہاں ماں باپ کو بوجھ سمجھ کر پھینک دینا انتہائی عام بات بن گئی ہے۔" تنزیلہ نے پہلو بدلا۔
"ہم دونوں کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ ہمارے پاس اتنی دولت ہے کہ بچوں کی کمائی کے بغیر بھی جی سکتے ہیں۔" وہ تنک کر بولیں۔
"بھائی صاحب کے پاس بھی بہت دولت تھی، صرف دو سال کے اندر وہ محل سے جھونپڑی میں آ گئے اور چل بسے۔ میرے ساتھ بھی یہی سب ہوا تو کیا کرو گی؟" انہوں نے سفاکی سے کہا۔ تنزیلہ دہل گئیں۔
"کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں آپ"۔ انہیں لگا جیسے کسی نے دل مٹھی میں لے کر مسل ڈالا ہو۔
"میں مزید کتنے سال بزنس سنبھالوں گا؟ چار سال پانچ سال اور بس؟ میں ساٹھ سال کا ہو چکا ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میں تھک گیا ہوں تنزیلہ۔ اب مجھ میں مزید کسی کا دل دکھانے کی سکت نہیں نہ ہی تمہارا ساتھ دینے کی"۔ ان کے لہجے سے تھکاوٹ چھلک رہی تھی۔
"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ کیا ہوا ہے"؟ انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔ جواباً عاصم نے موحد سے ہونے والی گفتگو ان کے گوش گزار کر دی۔ کچھ لمحے تو تنزیلہ بھی کچھ بول نہ پائیں۔
"تم خود کو بدل نہیں سکتیں میں جانتا ہوں۔ لیکن کیا تم میری خاطر خاموشی اختیار نہیں کر سکتیں؟ کیا تم موحد کی خوشی اور اپنی عزت کے لیے اس کی مرضی نہیں مان سکتیں؟" تنزیلہ نے بمشکل اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

کچھ ہی دن بعد جہاں آراء سمیت موحد کے

والدین باقاعدہ رشتہ لے کران کے گھر آئے۔ جہاں آراء کچھ روز پہلے ہی زلیخا سے آکر بات کر گئی تھیں۔ اس لئے وہ ان کی آمد پر حیران پریشان نہیں ہوئیں۔ زندگی میں شاید پہلی بار مریم نے ڈھنگ کا حلیہ اپنایا تھا۔ عارفہ کے ساتھ آج بھی اس کی دوستی تھی۔ اور جب اسے علم ہوا تو وہ فوراً اس کی طرف بھاگی آئی تھی۔ اسے ساتھ لے جا کر ایک خوب صورت رنگ کا جوڑا خریدا اور میک اپ کا ضروری سامان۔

''میں یہ فضول چیزیں چہرے پر نہیں لگاؤں گی۔ ان سب کو لگانے کے بعد میں حسین نہیں ہونے والی''۔ اس نے ناراضی سے کہا۔ عارفہ ہنسی۔

''تم بہت حسین ہو بس تم نے کبھی رگڑ کر منہ نہیں دھویا اس لیے چڑیل لگتی ہو''۔ عارفہ نے شرارت سے کہا، مریم نے اسے تھپڑ مارا۔ وہ ہنسنے لگی۔ عارفہ ہی اسے زبردستی پارلر لے گئی جہاں فیس پالش کے بعد اس کی صاف ستھری جلد مزید چمکنے لگی۔ آئی بروز بنواتے ہوئے اس کی چیخیں عارفہ نے فون میں ریکارڈ کیں۔ یہ ساری محنت وہ اس لیے نہیں کر رہی تھی کہ موحد کے والدین متاثر ہوں بلکہ اس لیے کر رہی تھی کہ موحد کو اس بات کا احساس ہو کہ وہ بھی اس کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔

جس دن وہ ان کے گھر آئے، لمبے بالوں کی اسٹائلش چوٹی اور ہلکے پھلکے میک اپ میں وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ تنزیلہ تو اس کی دراز قامتی اور اسمارٹنس دیکھتی ہی رہ گئیں۔ جہاں آراء اس کے واری صدقے جا رہی تھیں۔ تنزیلہ نے جب اس سے چھوٹے چھوٹے سوال کیے اور مریم جواب دینے لگی تو اس کی آواز سن کر وہ اش اش کر اٹھیں۔ ایسی لڑکی تو انہیں اپنی پوری سوسائٹی میں نہ ملتی۔

انہوں نے بہت صبر کیا مگر ان سے برداشت نہ ہوا اور انہوں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ وہ اتنی پرفیکٹ کیسے ہے؟

''میں صبح جلدی جاگتی ہوں۔ اسکول جانے سے پہلے گھر کا سارا کام کر کے جاتی ہوں۔ تین وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہوں اور جتنا کھاتی ہوں اتنا ہی استعمال بھی کرتی ہوں''۔ اس نے سادگی کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے کہا۔ جہاں آراء منہ چھپا کر ہنسنے لگیں۔ اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ تنزیلہ کو اس کا جواب اور جہاں آراء کا ہنسنا بالکل بھی برا نہیں لگا۔ اس وقت وہ مریم سے متاثر تھیں۔ اور ایسے وقت میں انہیں بھلا کیا برا لگ سکتا تھا۔ جس بات پر انہیں سب سے بڑا اعتراض تھا وہ اس کا متوسط طبقے سے تعلق رکھنا تھا مگر وہ اپنے بیٹے کی ہدایات پر عمل کرنے پر مجبور تھیں۔ جب سے وہ گھر چھوڑ کر گیا تھا اور جس قسم کی باتیں اس نے فون پر کی تھیں اور اس کے بعد شوہر کا رویہ، اس میں تبدیلی ان کی برداشت سے باہر تھی۔ دو دن تک وہ دکھ اور صدمے سے کھانا نہیں کھا پائی تھیں۔ صرف موحد گھر واپس آجائے اور عاصم صاحب کا رویہ پہلے جیسا ہو جائے اس لیے وہ فی الحال مثبت رویہ اپنائے ہوئے تھیں۔ جاتے جاتے انہوں نے مریم کے ہاتھ میں اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر پہنائی۔ اس لمحے کی کیفیت مریم کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتی تھی، کرتی بھی کیسے، اس کے پاس الفاظ ہی نہیں تھے۔ ایک عجیب سا سرور اور ایک ناقابل بیان کیفیت اس پر طاری تھی۔ جیسے اسے دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا

ہو۔ عارفہ نے اس لمحے کو موبائل میں قید کیا۔ اور اس کی ڈھیر ساری تصویریں کھینچیں۔
رات کو جب وہ بستر پر لیٹی تو اس نے موبائل اٹھایا۔ وہاں ڈھیر سارے پیغامات موجود تھے۔ وہ پہلے یہی سمجھی کہ موحد کے پیغامات ہوں گے مگر وہ میسجز اطہر کے تھے۔ ایک ایک کر کے وہ پڑھتی چلی گئی۔
"بہت برا کیا تم نے۔ ایک لمحے کے لیے بھی میرا نہیں سوچا۔
میں نجانے کتنے سالوں سے تمہاری محبت میں مبتلا ہوں، مگر تم نے آج تک مجھے اس قابل نہیں سمجھا کہ محبت قبولنا تو دور کی بات ہے تم نے مجھے برداشت تک نہیں کیا اور یہ کل کا آیا ہوا انسان اتنا اہم ہو گیا؟"
مریم نے باقی پیغامات پڑھے بغیر ڈیلیٹ کر دیے۔
اور آنکھیں موند لیں۔ اطہر کے لیے اس کے دل میں شاید گنجائش بن بھی جاتی اگر اس نے اسے اس قدر ذہنی اذیت سے دوچار نہ کیا ہوتا۔ جبکہ موحد، موحد نے اسے آج تک پریشان نہیں کیا تھا بلکہ اس کی پریشانیوں کو دور کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ دل خود بخود ہی اس کی جانب مائل ہو گیا۔ اس میں اس کی کوئی ذاتی کوشش شامل نہیں تھی۔ وہ بے حد مطمئن تھی اور خوش بھی۔

☆☆☆

کیا زندگی اتنی جلدی بھی بدلتی ہے؟ لمحوں میں؟
کچھ دیر پہلے ہی وہ مریم موحد بنی تھی۔ چہرے پر اس نام سے ہی ہزاروں رنگ پھیل گئے تھے۔ قوس و قزح سے بھی حسین۔ موحد اسے ایک ٹک دیکھتا رہ گیا۔
موحد نے جب گاڑی میں پہلی بار اس کا چہرہ دیکھا تھا تب وہ ہر قسم کی آرائش سے عاری تھا، نہ رنگ نہ ہی جذبات مگر تب بھی وہ چاہ کر بھی اس کے چہرے سے نگاہ نہیں ہٹا پایا تھا۔ اور آج، آج تو وہ اس کی بیوی کے روپ میں اس کے سامنے تھی۔ سجی سنوری، بوجھل پلکیں لیے، اس کے پہلو میں گھبرائی گھبرائی سی۔ موحد کو چپ لگ گئی تھی، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ابتدا کیسے کرے۔ جو لفظ وہ چنے گا کیا وہ مریم کے لیے اس کے دل میں موجود محبت کو بیان کر پائیں گے؟ اس وقت وہ موحد کو کتنی حسین اور اپنی اپنی لگ رہی ہے کیا وہ ان احساسات کو لفظوں کی مالا میں پرو کر اسے دے پائے گا؟
اس نے خود کو ناکام محسوس کیا۔ خاموشی سے شیروانی کی جیب سے سونے کی چین نکالی اور آگے بڑھ کر اس کی صراحی دار گردن میں پہنا دی۔ پھر اس کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دبانے لگا۔
"ان ہاتھوں نے بہت محنت کی ہے نا؟ دن رات کام کیا ہے۔ اب ان سے تم صرف ایک ہی کام کرو گی۔ رات میرے سو جانے کے بعد میرے بال سنوارنا۔" موحد نے اتنے پیار بھرے لہجے میں کہا تھا کہ وہ مسکراہٹ ضبط نہ کر پائی۔
"کرو گی نا"؟ مریم نے بمشکل ہی اثبات میں گردن ہلائی۔
"مجھے یوں لگنے لگا ہے جیسے میں کسی خواب میں جی رہا ہوں۔ تم سے محبت میں مبتلا ہونا، اور پھر دل کی ایسی حالت۔ میرے جیسا بندہ جس کے لیے سب کچھ ہی ظاہری حسن ہے، اسے تم سے محبت ہو گئی۔ اور محبت بھی کیسے؟ چلو تمہاری سیرت سے متاثر ہو کر میں عاشق ہو جاتا لیکن مجھے تمہاری کسی کوالٹی کا بھی علم نہیں تھا۔ صرف تمہاری آواز نے متوجہ کیا۔ اور میں کسی پاگل کی طرح تمہیں دیکھنے کے لیے بہانے ڈھونڈنے لگا۔" وہ اس کے چہرے کے نقوش کو نرمی سے چھوتے ہوئے بول رہا تھا۔ مریم سانس روکے نگاہیں جھکائے سن رہی تھی۔
"میری ممی کبھی نہ مانتیں، ان کے لیے اسٹیٹس بہت اہم ہے۔ لیکن میرے گھر چھوڑ کر چلے جانے نے شاید ان پر اثر کیا اور معجزاتی طور پر وہ مان گئیں اور خوشی خوشی تمہیں بیاہ کر میرے پاس لے آئیں۔ یہ سب کچھ خواب جیسا ہی ہے نا؟ کسی فلم کی طرح جس میں آخر میں سب اچھا اچھا ہو جاتا ہے؟" مریم نے مسکرا کر اثبات میں ہلایا۔ موحد نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ ان کی ایک نئی اور حسین زندگی کی شروعات ہو چکی تھی۔

☆☆

ایک سویرا تین رنگ

عمارہ خان

جگر جگر کرتی روشنیوں سے بھرے سیٹ کے ایک طرف جدید طرز کے صوفے رکھے ہوئے تھے تو دوسری طرف مصنوعی آبشار بنا کے کنارے پہ لکڑی کی بنچ رکھ دی گئی تھی، اسی کے دائیں سمت دو کچن کاؤنٹر رکھ کے سامنے مناسب اونچائی پہ دو سلیب کے درمیان سلینڈر کا چولہا سجا کے کچن کی سی شکل دینے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی کہ اچانک ایک تیز آواز نے اس پورے طلسم کا جادو توڑ دیا ہو جیسے۔۔۔

''کٹ۔۔۔تین منٹ کا بریک ہری اپ۔۔''

''پلیز، ون کپ کافی۔۔''

سویرا نے سکون بھری سانس لے کے، صوفے کی بیک سے ٹیک لگائی اور سر پیچھے کر کے بے اختیار دائیں ہاتھ سے پیشانی دباتے ہوئے آواز لگائی۔

''کیا ہوا سویرا، تھکی تھکی سی لگ رہی ہو۔'' میک اپ کوری ٹچ کرنے کے لیے کلثوم نے اپنا میک اپ کٹ اٹھا کے سویرا کے پاس رکھتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔

سویرا نے دو میٹھے بول سن کے، ایک زخمی سے مسکراہٹ سے شکریہ ادا کیا کلثوم کا اور دھیرے سے بات شروع کی

''کیا ہونا ہے۔۔۔۔!''

''تو مجھے تم چپ اور افسردہ سی کیوں لگ رہی ہو۔'' کلثوم نے آنکھوں پہ مسکارے کا ڈبل کوٹ لگا کے سویرا کی خوب صورت آنکھوں کو دو آتشہ کیا۔



سویرا نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی
"وہ ہی علی کی ٹینشن ہے۔"
"اوہ!" کلثوم کے منہ سے بے اختیار نکلا، جیسے وہ اس ایک لائن سے ہی، بات کی تہ تک جا پہنچی ہو۔
"کل بھی دو بجا دیے اس نے سوتے سوتے۔ فضول کے کام اور بحث والی باتیں کہ کچھ نا سہی تو بحث ہی سہی۔" سویرا نے اپنے دل کا بوجھ کلثوم کے آگے ہلکا کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ سویرا کو یقین تھا، اس کی کوئی بھی بات کلثوم کے ذریعے باہر نہیں نکلے گی۔ ادھ جلے چہرے کی مالک کلثوم کاشف، اس نوکری کو دلانے والی محسن، سویرا کے ساتھ تو کم از کم مخلص ہی تھی
"مجھے یقین ہے علی، جان کے جلدی نہیں سونے دیتا۔ معلوم جو ہے صبح مارننگ شو کے لیے اٹھنا ہوتا ہے۔۔ ویسے بھی اسی مارننگ پروگرام کی وجہ سے اس کا موڈ خراب رہنے لگا ہے اب۔۔"
سویرا آنکھیں موندے ہلکی آواز کے ساتھ کلثوم سے باتیں کرتی رہی، بنا جواب طلب کیے "دعا کرو جاب مل جائے اس کو، میں بھی گھر بیٹھوں ایک عام سی عورت کی طرح۔ تھک گئی ہوں یہ مصنوعی زندگی گزار گزار کے۔" سویرا نے یاسیت سے بالآخر بات پوری کی یا شاید کافی کے کپ کو سویرا کی طرف بڑھاتے سیٹ کے چھوٹو کی آواز سن کے خاموشی اختیار کی۔
"ہاں اللہ کرے گا جلد ہی علی کو جاب مل جائے گی۔ عورت گھر کی چار دیواری میں کتنی محفوظ ہوتی ہے یہ کوئی ہم سے پوچھے۔۔"
میک اپ کٹ کو بند کرتی کلثوم نے تھکی تھکی آواز میں سویرا کا دکھ بانٹتے ہوئے اپنی بھی دل بات کہہ دی۔
"ہاں کلثوم گھر کی چار دیواری کی اہمیت ہم جاب کرنے والی لڑکیوں سے پوچھو۔۔ یہ مارننگ شو کرنا جاب ہی تو ہے، روز بلا ناغہ صبح آنا، طبیعت جیسی بھی ہو، ہنسنا، قہقہے لگانا اور روز سج دھج کے کٹ پتلی کی طرح، ناظرین کو تین گھنٹے دینا۔۔۔
"بس اللہ ہی ہمت دیتا ہے۔" کلثوم نے اپنا ہاتھ سویرا کے ہاتھ پہ رکھ کر تسلی آمیز تھپکی دی۔۔
"شکریہ کلثوم، تم سے بات کر کے دل ہلکا ہو جاتا ہے ورنہ میری تو کوئی بہن ہی نہیں بس علی ہی ہے جو جاب لیس ہو کر بہت چڑچڑا ہو گیا ہے۔۔۔
سویرا نے پھیکی سی مسکراہٹ سے دور کھڑے کیمرہ مین کو دیکھا جو سویرا کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی سمت متوجہ کر رہا تھا۔ "دیکھو کیا لکھا ہے قسمت میں۔۔"
"ہم پانچ سیکنڈ میں آن لائن جا رہے ہیں۔ کم آن سویرا ٹیک یور سیٹ اینڈ سائلنس پلیز۔"

☆☆☆

"ہیلو پاکستان، کیسے ہیں آپ۔" ایک ہنستی مسکراتی، شوخ و چنچل سی آواز سے سویرا حبیب کی آنکھ کھلی۔ سامنے رکھے ٹی وی میں اس کی پسندیدہ ہوسٹ سویرا علی فریش فریش سی بیٹھی اپنے ہاتھ میں تھامے کپ سے چسکیاں لے رہی تھی۔
لیکن سویرا حبیب کو آج کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کیونکہ کل ہی اس کو، ایک بار پھر معاشرے کی چند احساس کمتری میں مبتلا عورتیں مسترد کر گئی تھیں کہ جب ان کو معلوم ہوا باپ سر پہ نہیں، بھائی شادی کر کے الگ ہو چکا ہے، اور ایک اماں بی کے ساتھ پرانے کھنڈر نما گھر سے اب کیا جہیز مل جانا تھا ان کو۔ جن کا کھانا پینا گھر کی چھت پہ بنے دو کمروں کے کرائے سے پورا ہوتا تھا۔ ایک ہی نظر میں پورے گھر کا جائزہ لیا اور کھا پی کہ اس کی ذات کا پوسٹ مارٹم کر کے چلتی بنیں۔۔
سویرا حسرت سے ٹی وی کو دیکھتی ہوئی بڑبڑائی۔۔
"آہ! یہ ٹی وی کی عورتیں کتنی خوش نصیب ہوتی ہیں۔ فکر نہ فاقہ عیش کر کاکا۔ ایک ہم ہیں پیٹ بھر کے کھانا کھاؤ تو کپڑے لتے کی فکر میں مر جاؤ۔۔ جس کا دل کرے۔ ہماری ذات کے بخیے ادھیڑ جائے

۔۔ یا اللہ کیا قسمت کا ہیر پھیر ہے نام ایک اور قسمتیں دیکھو۔"

"سویرا اٹھ گئی ہو تو ناشتا کر کے بریانی کا مسالا بنا دو۔۔" اماں بی نے صحن سے آواز لگائی۔۔

"اب اماں بی پورا دن مجھے وی آئی پی بنا کے رکھیں گی"۔ سویرا نے افسردگی سے سوچا۔۔

"لو اٹھی ہی نہیں ابھی تک چلو جلدی کرو تھوڑی زیادہ بنانا یہ اوپر والی سویرا کو بھی دے دینا۔ خوش ہو جائے گی وہ بچی۔۔"

اماں بی نے کمرے میں آتے ہوئے اپنے کرائے داروں کا ذکر کیا۔۔

"اچھا اماں بی لے جاؤں گی۔" سویرا نے بے دلی سے بولا، دل تو سامنے بیٹھی سویرا کے کپڑوں اور میک اپ میں لگا ہوا تھا۔

"اچھا میں ذرا کمیٹی والی کے پاس جا رہی ہوں۔ پھر بازار کا چکر لگاؤں گی۔" اماں بی نے اپنی چادر نکالتے ہوئے بٹوے میں پیسے ٹٹولے اور تنبیہی نظر سویرا پہ ڈالی۔ "کچھ چاہیے میری بچی کو!" اماں بی نے اپنی اکلوتی بیٹی کے چہرے پہ پھیلی حسرت سے نظریں چراتے ہوئے بے ساختہ پوچھا۔

سویرا نے یاسیت سے پہلے ٹی وی اور پھر اپنے بوسیدہ بدرنگے کپڑوں کی سمت دیکھتے ہوئے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا "اچھا چلو میں چلتی ہوں۔ تم یاد سے چاول زیادہ رکھنا، بھول مت جانا۔" اماں نے جاتے جاتے یاد دہانی کرائی۔

"اچھا نا اماں بی۔" سویرا نے چڑتے ہوئے کہا

☆☆☆

"سویرا باجی یہ بریانی لے لیں۔ اماں بی نے بجھوائی ہے۔۔" سویرا حبیب نے دروازے سے آواز لگائی تو نیم جان سی سویرا آصف نے بچی کچی جان لگا کر اٹھنے کی ناکام کوشش کی۔۔

"پلیز کچن میں ہی رکھ دو۔ میری طبیعت کچھ صحیح نہیں۔۔" سویرا نے اٹھنے میں ناکام ہوتے ہوئے، اپنی آواز کو بلند کرتے ہوئے کہا، مبادا وہ اندر کمرے میں ہی نہیں آ جائے، بھلا چہرے پہ سجے، نیل کہاں چھپائے جا سکتے تھے، لیکن اگر یہ راز عیاں ہو جاتا تو یقیناً سویرا دنوں تک نیچے جانے سے گریزاں رہتی۔

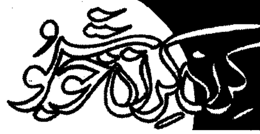
"اچھا باجی۔" سویرا حبیب نے صحن سے ہی کچن کا رخ کرتے ہوئے بولا تو سویرا آصف کی جان میں جان آئی۔

"شکر یہ میرے مولا تیرا ہی آسرا ہے اس دنیا میں۔ اماں بی کے ہاتھ آج تو یہ بریانی نہ بھیجتا تو بھوکا رہنا پڑتا مجھے۔۔" نیلو نیل سویرا دل ہی دل میں مالک دو جہاں کی شکر گزار ہوئی۔ رات میں خرچے کے پیسے مانگنے پہ ہی تو آصف نے چار چوٹ کی مار لگائی تھی اس کو، جس کے نتیجہ میں صبح سے بھوکی پیاسی پڑی سوچ رہی تھی۔ "کیوں کرتے ہیں ماں باپ شادی ہم نازوں سے پلی بیٹیوں کی۔ صرف ایک لفظ "شادی شدہ" کا اضافہ کر کے سب مطمئن ہو جاتے ہیں۔۔ یہ نہیں معلوم ہوتا اس ایک لفظ کو برقرار رکھنے کے لیے ہم کتنی بار ٹوٹتے ہیں کتنی بار جڑتے ہیں، اپنی روح کو زخم زخم ہوتے دیکھنا کوئی آسان بات تو نہیں۔

چھ بیٹیوں میں سے پانچویں نمبر پہ رہنے کی بدولت سویرا بچپن سے صبر و تحمل سے رہنے کی عادی تھی، لیکن بابل کے گھر بھوک تھی تذلیل نہیں۔ سویرا نے اپنے جسم میں موجود ننھی حرکت سے مجبور ہو کے کھانے کی پلیٹ تک جانے کی ہمت باندھتے ہوئے، ایک بار پھر اٹھتے ہوئے خود کلامی کی۔

"یہ بھی تو ہے سویرا کتنے سکون سے اپنی اماں بی کے ساتھ رہ رہی ہے بغیر کسی فکر کے۔۔ بس قسمت کی بات ہے ساری۔۔"

☆☆



نماز (القرآن)

☆ بامراد ہوا' جو شخص قرآن سن کر برے عقائد و اخلاق سے پاک ہوگیا اور اپنے رب کا نام لیتا ہے اور نماز پڑھتا ہے۔(سورۃ الاعلیٰ)

☆ جنت والے جب جہنم والوں سے پوچھیں گے کہ کیا چیز ان کو دوزخ میں لے آئی تو وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔(سورہ مدثر آیت' 43-40)

☆ صبر اور نماز کے ذریعہ (اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو)۔ یہ نماز بہت بھاری ہوتی ہے (سوائے ان لوگوں کے جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔) (البقرہ-54)

نماز (احادیث)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بندہ کے اور کفر کے درمیان نماز چھوڑ دینے ہی کا فاصلہ ہے۔" (مسلم)

☆ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص چالیس دن باجماعت نماز پڑھے اور اس کی تکبیر اولیٰ (یعنی پہلی تکبیر) فوت نہ ہو تو اللہ عزوجل اس کے لیے دو براء تیں لکھ دیتا ہے۔(1) منافقت سے براءت۔(2) دوزخ کی آگ سے براءت۔

(ترمذی رقم الحدیث 241)

اندھی بڑھیا

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو غائب پاتے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز کی ادائیگی کے لیے تو باقاعدگی سے مسجد میں آتے ہیں' مگر جوں ہی نماز ختم ہوئی وہ چپکے سے مدینہ کے مضافاتی علاقوں میں ایک دیہات کی طرف نکل جاتے ہیں۔ ایک بار وہ چپکے سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے چل دیے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک خیمے کے اندر چلے گئے اور کافی دیر بعد باہر نکل کر واپس مدینے کی طرف لوٹ گئے۔ ان کے جانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے خیمے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کے خیمے میں ایک اندھی بڑھیا' دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑھیا سے پوچھا: "اے اللہ کی بندی' تم کون ہو؟" بڑھیا نے جواب دیا: "میں ایک نابینا اور مفلس و نادار عورت ہوں۔ ہمارے والدین ہمیں اس حال میں چھوڑ کر فوت ہوگئے ہیں کہ میرا اور ان دو لڑکیوں کا اللہ کے سوا کوئی اور آسرا نہیں۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پھر سوال کیا: "یہ شخص کون ہے' جو تمہارے گھر میں آتا ہے؟"

بوڑھی عورت نے جواب دیا کہ "میں اس شخص کو جانتی تو نہیں' مگر یہ روزانہ ہمارے گھر میں آکر جھاڑو دیتا ہے' ہمارے لیے کھانا بناتا ہے اور ہماری بکریوں کا دودھ دھو کر ہمارے لیے رکھتا اور چلا جاتا ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سن کر رو پڑے اور کہا۔ "اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! آپ نے اپنے بعد کے آنے والے حکمرانوں کے لیے ایک تھکا دینے والا امتحان کھڑا کر کے رکھ دیا ہے۔"

صباحت۔۔۔ ایبٹ آباد

قابل توجہ

☆ دنیا میں سب سے زیادہ نفرتوں کا سامنا سچ بولنے والوں کو کرنا پڑتا ہے۔

(افلاطون)

☆ ہر کامیابی کا پہلا قدم امید ہے۔

(نپولین ہل)

☆ محنت میں کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

(قائداعظم)

☆ جوانی کے وقت روپیہ بچاؤ اور بڑھاپے میں بے دریغ خرچ کرو' تاکہ دین و دنیا میں سرخرو ہو سکو۔

(فرینکلن)

☆ جب انسان اندر سے مرجاتا ہے تو وہ حد سے زیادہ خوش اخلاق ہوجاتا ہے۔(اشفاق احمد)

عدیلہ نور۔ کشمیر

منحوس موبائل

گھر قریب آچکا تھا' میں نے بائیک مین روڈ سے اپنی گلی کی طرف موڑلی۔ لگتا تھا کہ لائٹ گئی ہوئی ہے' کیونکہ گلی میں اندھیرا تھا اور گھروں سے جنریٹرز کے چلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اچانک ایک نقاب پوش بائیک کے ایک دم سامنے آگیا' میں نے گھبرا کر بریک لگائی اور اس سے قبل کہ میں کچھ سمجھ پاتا' اس نے بائیک کے قریب آکر پستول میری کنپٹی سے لگادیا اور آواز کو دباتے ہوئے بولا۔ "موبائل نکالو۔" میں نے فوری طور پر نتائج کی پروا کیے بغیر اس کو زور کا دھکا دیا اور وہ جو بائیک سے چپکا کھڑا تھا' وہ اس فوری ری ایکشن کے لیے شاید تیار نہ تھا' لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ میں نے اس کو قابو کرکے اور ایک ہاتھ سے اس کا نقاب اتار دیا۔ اس کی شکل دیکھ کر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی' وہ کوئی اور نہیں' میرا اپنا نوکر تھا' جو آج چھٹی پر تھا۔

میرے غصے کی انتہا نہ رہی' میں چیخ پڑا۔ "احسان فراموش' تونے جس گھر کا نمک کھایا' وہیں نمک حرامی کی؟ ہم تجھ سے حسن سلوک سے پیش آتے تھے اور تونے اس کا یہ صلہ دیا کہ پستول لے کر آگیا؟"

اس کی شکل رونے والی ہوگئی۔ "نہیں صاحب' وہ پستول نقلی ہے' آپ خود چیک کرلیجیے۔"

میں نے غصے سے پوچھا۔ "تو پھر اس حرکت کی کیا ضرورت تھی؟ اب چلو تھانے۔"

وہ گھبرا کر بے اختیار بول پڑا۔ "نہیں صاحب تھانے مت لے جایئے' یہ حرکت میں نے بیگم صاحبہ کے کہنے پر ہی کی ہے۔"

"کیا..." میرے سر پر گویا حیرت کا آسمان گر پڑا تھا۔

وہ رونی صورت بنا کر بولا۔ "بیگم صاحبہ نے بولا تھا گھر آکر وہ اس منحوس موبائل میں ہی ہر وقت گھسے رہتے ہیں' تجھے ہر قیمت پر آج یہ موبائل چھیننا ہے' ورنہ تیری نوکری سے چھٹی۔"

حمیرا مہتاب۔ آسٹریلیا

بابا فرید رحمتہ اللہ علیہ

نہ غریب نوں ویکھ کے ہسیا کر
نہ بری نظر نال تکیا کر
لوکاں دے عیب لبھدا ایں فریدا
کدی اپنے اندر وی تکیا کر

سنہرے موتی

☆ جو قوم "عہد شکنی" کرتی ہے' اللہ اس پر دشمن مسلط کردیتا ہے۔

☆ جو قوم "ناپ تول" میں کمی کرتی ہے' وہ قحط سے دوچار ہوتی ہے۔

☆ جس قوم میں "بدکاری" بڑھ جاتی ہے' اس میں ناگہانی اموات بڑھ جاتی ہیں۔

☆ جو قوم "زکواۃ" نہیں دیتی' وہ خشک سالی میں مبتلا ہوجاتی ہے۔

☆ خدا جس قوم کی "تباہی" چاہتا ہے' اس کی قیادت عیاش لوگوں کے سپرد کردیتا ہے۔

انوش ابصار۔ اسلام آباد

موت

میں نے بارہا اس پر غور کیا ہے۔ موت کیا ہے۔ اس سے زندگی کا کیا رشتہ ہے' ایک دفعہ میں نے ایک سمندری جہاز دیکھا۔ جب وہ ساحل سے دور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ تب وہاں پر موجود لوگ کہنے لگے چلا گیا۔ میں نے سوچا دور ایک بندرگاہ ہوگی وہاں پر لوگ جہاز کو دیکھ کر کہہ رہے ہوں گے۔ آگیا اور شاید

اسی کا نام "موت" ہے۔ ایک پرانی زندگی کا خاتمہ اور نئی زندگی کی ابتدا۔ (خلیل جبران)

سعدیہ صابر۔۔۔ کوہالہ

طریقہ تبلیغ اسلام

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"لوگوں کو اسلام کی دعوت الفاظ استعمال کیے بغیر دیا کرو۔"

پوچھا۔ "کیسے؟"

فرمایا: "اپنے کردار اور اخلاق کے ذریعے۔"

افشاں سمیع۔۔۔ کراچی

جواب لاجواب

خواتین کا مجمع کافی بڑا تھا۔ تقریب کے ناظم نے حاضرین میں سے بارہ شادی شدہ خواتین کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ وہ سب نہایت خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہی تھیں۔ ناظم نے ان سے کہا کہ وہ واٹس ایپ پر اپنے اپنے شوہر کو یہ پیغام بھیجیں کہ وہ ان سے محبت کرتی ہیں۔ آنے والے جوابات کچھ یوں تھے۔

1۔ کیا آج پھر گاڑی کہیں ٹھونک دی!
2۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟
3۔ کیا کل پھر شاپنگ کا ارادہ ہے؟
4۔ شاید تمہیں میکے کی یاد آرہی ہے؟
5۔ پھر استری سے کوئی سوٹ جلا دیا!
6۔ تم نے غلطی سے یہ میسج مجھے بھیج دیا۔
7۔ کیا چابی گاڑی میں ہی لاک ہو گئی ہے؟
8۔ تمہیں کتنے پیسوں کی ضرورت ہے۔
9۔ گھر پر تمہاری امی کے ساتھ اور کون آیا ہوا ہے؟
10۔ پیسے کپڑوں کی الماری کے پچھلے خانے میں پڑے ہیں۔ سب نہ نکال لینا۔
11۔ دفتر سے واپسی پر کوئی سامان نہیں لاؤں گا۔
12۔ آج کون سا کراکری سیٹ ٹوٹا ہے؟

ملیحہ زہرا۔۔۔ کراچی

لاجواب

خلیفہ ہارون رشید بڑے حاضر دماغ تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے ان سے پوچھا۔ "آپ کبھی کسی کی بات پر لاجواب بھی ہوئے ہیں؟"

انہوں نے کہا۔ "تین مرتبہ ایسا ہوا کہ میں لاجواب ہو گیا۔ ایک مرتبہ ایک عورت کا بیٹا مر گیا اور وہ رونے لگی۔ میں نے اس سے کہا کہ آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھیں اور غم نہ کریں۔" اس نے کہا کہ "میں اس بیٹے کے مرنے پر کیوں نہ آنسو بہاؤں۔ جس کے بدلے خلیفہ میرا بیٹا بن گیا۔"

دوسری مرتبہ پھر مصر میں کسی شخص نے حضرت موسیٰ ہونے کا دعوا کیا۔ میں نے اسے بلوا کر کہا کہ "حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس تو اللہ تعالیٰ کے دیے معجزات تھے۔ اگر تو موسیٰ ہے تو معجزہ دکھا۔" اس نے جواب دیا کہ "موسیٰ علیہ السلام نے تو اس وقت معجزہ دکھایا تھا۔ جب فرعون نے خدائی کا دعوا کیا تھا تو بھی کر یہ دعوا تو میں معجزہ دکھاؤں گا۔"

تیسری مرتبہ لوگ ایک گورنر کی غفلت اور کاہلی کی شکایت لے کر آئے۔ میں نے کہا کہ "وہ شخص تو بہت نیک شریف اور ایمان دار ہے۔" انہوں نے جواب دیا کہ "پھر اپنی جگہ اسے خلیفہ بنا دیں' تاکہ اس کا فائدہ سب کو پہنچے۔"

نور فاطمہ۔۔۔ دادو

دوری

ایک دن کی دوری بھی
سال اور صدی بن کر
درد کی ندی بن کر
درمیان میں بہتی ہے
زندگی سے کہتی ہے
اس سے ملتے ہی رہنا
کس قدر ضروری ہے۔

(سحر علی)
نمرہ۔۔۔ کراچی

٭ ٭

بشریٰ محمود



نمرہ، اقراء، کی ڈائری میں تحریر

خالد معین کی غزل۔

خموشی بھی شکایت کی طرح ہے
اک اک لمحہ قیامت کی طرح ہے

لہو میں جیسے در آیا ہو سورج
یہ کیا مجھ میں رقابت کی طرح ہے

حقیقت جاننا چاہو تو جانو
یہ چپ بھی اک وضاحت کی طرح ہے

کسی سے کس طرح کر دیں بیاں ہم
وصال اس کا امانت کی طرح ہے

سبھی رشتے بدلتے جا رہے ہیں
محبت کیا محبت کی طرح ہے

تعلق کون سی منزل تک آیا
کہ اب ملنا عداوت کی طرح ہے

حجاب اُٹھنے کی ساعت آن پہنچی
سو اب جلوت بھی خلوت کی طرح ہے

دھیان میں آ کر بیٹھ گئے ہو، تم بھی نا
مجھے مسلسل دیکھ رہے ہو، تم بھی نا

دے جاتے ہو مجھ کو کتنے رنگ نئے
جیسے پہلی بار ملے ہو، تم بھی نا

ہر منظر میں اب ہم دونوں ہوتے ہیں
مجھ میں ایسے آن بسے ہو، تم بھی نا

عشق نے یوں، دونوں کو ہم آمیز کیا
اب تو تم بھی کہہ دیتے ہو، تم بھی نا

خود ہی کہو اب کیسے سنور سکتی ہوں میں
آئینے میں تم ہوتے ہو، تم بھی نا

بن کے ہنسی ان ہونٹوں پر بھی رہتے ہو
اشکوں میں بھی تم بستے ہو، تم بھی نا

میری بند آنکھیں تم بھی پڑھ لیتے ہو
مجھ کو اتنا جان چکے ہو، تم بھی نا

مانگ رہے ہو رخصت مجھ سے اور خود ہی
ہاتھ میں ہاتھ لیے بیٹھے ہو تم بھی نا

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر، کی ڈائری میں تحریر

عنبرین حسیب عنبر کی غزل

عدیلہ نور، کی ڈائری میں تحریر

ناصر کاظمی کی غزل

اپنی دُھن میں رہتا ہوں
میں بھی تیرے جیسا ہوں

او پچھلی رت کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں

تیری گلی میں سارا دن
دُکھ کے کنکر چُنتا ہوں

مجھ سے آنکھ ملائے کون
میں تیرا آئینہ ہوں

میرا دیا جلائے کون
میں ترا خالی کمرہ ہوں

تیرے سوا مجھے پہنے کون
میں تیرے تن کا کپڑا ہوں

تو جیون کی بھری گلی
میں جنگل کا رستہ ہوں

آتی رت مجھے روئے گی
جاتی رت کا جھونکا ہوں

اپنی لہر ہے اپنا روگ
دریا ہوں اور پیاسا ہوں

مسرت فاطمہ، کی ڈائری میں تحریر

قتیل شفائی کی غزل

پریشان رات ساری ہے ستارو تم تو سو جاؤ
سکوت مرگ طاری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

ہنسو اور ہنستے ہنستے ڈوبتے جاؤ خلاؤں میں
ہمیں یہ رات بھاری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

ہمیں تو آج کی شب پو پھٹے تک جاگنا ہوگا
یہی قسمت ہماری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

تمہیں کیا آج بھی کوئی اگر ملنے نہیں آیا
یہ بازی ہم نے ہاری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

کہے جاتے ہو رو رو کر ہمارا حال دنیا سے
یہ کیسی رازداری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

ہمیں بھی نیند آجائے گی ہم بھی سو ہی جائیں گے
ابھی کچھ بے قراری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

پروا کرن، کی ڈائری میں تحریر

نوشی گیلانی کی غزل

کوئی مجھ کو مرا بھرپور سراپا لا دے
مرے بازو، مری آنکھیں، مرا چہرہ لا دے

ایسا دریا جو کسی اور سمندر میں گرے
اس سے بہتر ہے کہ مجھ کو مرا صحرا لا دے

کچھ نہیں چاہیے تجھ سے اے مری عمر رواں
مرا بچپن، مرے جگنو، مری گڑیا لا دے

نیا موسم مری بینائی کو تسلیم نہیں
مری آنکھوں کو وہی خواب پرانا لا دے

جس کی آنکھیں مجھے اندر سے بھی پڑھ سکتی ہوں
کوئی چہرہ تو مرے شہر میں ایسا لا دے

کشتیِ جاں تو بھنور میں ہے کئی برسوں سے
اے خدا اب تو ڈبو دے یا کنارا لا دے

شگفتہ سلیمان



رباب راجپوت ——— اسلام آباد

چاہت کا اک میٹھا درد جگائے شام ڈھلے
تیری یادیں آجاتی ہیں ہم کو رُلاتے شام ڈھلے
دن کے اُجالوں میں تو مناؤں لاکھ جتن سے بہلالوں
لیکن دل کا پاگل پنچھی ایک نہ مانے شام ڈھلے

اقرأ اکرم ——— سرگودھا

تو کبھی در پہ گیا ہو تو خبر ہو تجھ کو
کس قدر کارِ اذیت ہے سوالی ہونا

حناکرن ——— پتوکی

تم اگر یاد رکھو گے تو عنایت ہو گی
ورنہ ہم کو بھی کہاں تم سے شکایت ہو گی
زندگی درد کے صحرا کا عنوان ہی تو ہے
تم اگر بھول بھی جاؤ تو روایت ہو گی

لبنیٰ نا ور ——— فیصل آباد

عشق کے بھی کچھ آداب ہوا کرتے ہیں
جاگتی آنکھوں میں بھی خواب ہوا کرتے ہیں
ہر اک رو کے دکھائے یہ ضروری تو نہیں
خشک آنکھوں میں بھی سیلاب ہوا کرتے ہیں

انیلا حسن ——— لیہ

اجنبی کتنا اکیلا ہے محبت کا سفر
تو میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں ڈھونڈتا رہتا
اس کو جانا تھا تو کوئی زخم ہی دے کر جاتا
اس بہلنے میں اُسے یاد تو کرتا رہتا

فرزانہ سرور ——— میاں چنوں

وہ جذبوں کی صداقت کا تو ہے قائل مگر اکثر
نہ جانے کیوں وفا کی انتہا ہونے نہیں دیتا
خدا جانے امیر شہر کو کیا بیر ہے مجھ سے
وہ میرے حق میں کوئی فیصلہ ہونے نہیں دیتا

پروا کرن ——— کوٹ چھٹہ

سرِراہ کچھ بھی کہا نہیں کبھی اُس کے گھر میں گیا نہیں
میں جنم جنم سے اسی کا ہوں اسے آج تک یہ پتا نہیں
یہ خدا کی دین عجیب ہے اسی کا نام نصیب ہے
جسے تو نے چاہا وہ مل گیا جسے میں نے چاہا ملا نہیں

نگہت مریم ——— مظفر گڑھ

تم یاد نہ کر کے بھی اچھے لگتے ہو
خدا جانے تم یاد کرتے تو کیا ہوتا

زینب صدیقی ——— کوٹ چھٹہ

بہت مشکل ہے ترکِ عاشقی کا درد سہنا بھی
بہت دُشوار ہے لیکن محبت کرتے رہنا بھی

عدیلہ نور ——— کشمیر

محفل آرا تھے، مگر پھر کم نما ہوتے گئے
دیکھتے ہی دیکھتے ہم کیا سے کیا ہوتے گئے
ناشناسی دہر کی، تنہا ہمیں کرتی گئی
ہوتے ہوتے ہم زمانے سے جدا ہوتے گئے

فرح نور ——— سکھر

میرا اس شہرِ عداوت میں بسیرا ہے جہاں
لوگ سجدوں میں بھی لوگوں کا برا سوچتے ہیں

حنا فرمان ——— شورکوٹ سٹی

یوں تیری شناخت مجھ میں اُترے
پہچان تک اپنی بھول جاؤں

مہوش فاطمہ ——— راجن پور

نہیں شکوہ مجھے کچھ بے وفائی کا تیری ہرگز
گلہ تب ہو اگر تو نے کسی سے نبھائی ہو

عذرا ناصر/ماقصیٰ ناصر ——— کراچی

زندگی بھر کوئی ساتھ نہیں دیتا یہ جان لیا میں نے
لوگ تو تب یاد کرتے ہیں جب وہ خود اکیلے ہوں

رُوبینہ شریف



ساس بہو

لڑکے نے دس لڑکیوں کو ایک قطار میں کھڑا کیا اور اپنی ماں سے کہا۔

"ان میں سے ایک لڑکی مجھے بہت پسند ہے۔ وہ آپ کی بہو بنے گی۔ پوچھیں تو وہ کون سی ہے۔"

ماں نے بہ غور سب کو دیکھ کر ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا کہ ان کے خیال میں یہ والی لڑکی ان کے بیٹے کی پسند ہے اور وہ اس سے شادی کرنے کا سوچ رہا ہے۔

لڑکا انتہائی حیرت سے بولا۔

"جی بالکل آپ نے کیسے پہچانا۔"

ماں نے جواب دیا۔ "کیونکہ ان سب میں صرف یہی لڑکی مجھے زہر لگ رہی تھی۔"

فوزیہ ثمرٹ' ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

سرکاری ملازم

سرکاری ملازم نے معالج سے کہا۔

"براہ کرم مجھے دبلا ہونے کا کوئی موثر طریقہ بتائیں۔"

معالج نے جواب دیا۔

"بے حد آسان طریقہ بتاتا ہوں' آپ بس اتنا کریں کہ صرف اپنی تنخواہ سے کھایا کریں۔"

ارم کمال۔۔۔ فیصل آباد

سوا سیر

ایک نان بائی نے ایک وکیل سے پوچھا۔

"اگر کسی کا کتا میری روٹیاں کھا جائے تو اس کا ہرجانہ مجھے کیا وصول کرنا چاہیے۔"

وکیل نے کہا۔ "کم از کم ایک سو روپے؟"

نان بائی بولا۔ "جناب کا کتا میری آج ہی روٹیاں چٹ کر گیا ہے۔ براہ کرم سو روپے عنایت کردیں۔"

وکیل نے کہا۔ "میرے مشورے کی فیس دو سو روپے ہے تم سو روپے کاٹ کر بقایا سو مجھے دے دو۔"

فہمیدہ شاہ۔۔۔ سکھر

باعث تشویش

ایک صاحب کوچ میں سوار ہوئے تو کنڈیکٹر نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"سر! کل آپ اس کوچ سے اترنے کے بعد خیریت سے گھر پہنچ گئے تھے نا؟"

"ہاں۔۔۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" ان صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ ایک آدمی کوچ میں سوار ہوا تو آپ اسے اپنی سیٹ دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے جب کہ اس وقت کوچ میں آپ دو ہی مسافر تھے باقی سب سیٹیں خالی پڑی تھیں؟" کنڈیکٹر نے آہستگی سے جواب دیا۔

شازیہ امجد۔۔۔ وزیر آباد

بچے ہمارے عہد کے۔۔۔۔

ماسٹر صاحب کا اسکول میں پہلا دن تھا۔ بچوں کو ڈراتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"اگر کسی نے ہوم ورک نہیں کیا تو میں اس کے والدین کو اسکول میں بلاؤں گا۔ اگر کسی نے کلاس میں شور مچایا تو اس کی چھٹی بند کردوں گا۔ اگر کوئی ٹیسٹ میں فیل ہوگیا تو میں اسے دو دن تک کلاس میں بیٹھنے نہیں دوں گا۔"

ایک بچے نے پوچھا۔ "ماسٹر صاحب! مستقل طور پر اسکول سے نکالے جانے کا جرم کیا ہوگا۔"

عدیلہ نور۔۔۔ کشمیر

شادی شدہ

مکان مالکہ کی لڑکی کی نئے آنے والے کرائے دار سے دوستی بڑھتی جارہی تھی' یہ دیکھ کرایک دن اس کی ماں نے اسے سمجھایا کہ یہ شخص شادی شدہ معلوم ہوتا ہے۔

لڑکی نے کہا۔ "نہیں! وہ کنوارہ ہے' اس نے مجھے خود بتایا ہے۔"

"نہیں' نہیں! میں نہیں مان سکتی۔" ماں نے قدرے ناراضی سے کہا۔ "وہ جب مجھے کرایہ دینے آتا ہے' جیب سے بٹوا نکال کر میری طرف سے پشت کرلیتا ہے۔"

ارم آفتاب..... فیصل آباد

خوش آمدید

مالک مکان نے غصے سے چیختے ہوئے کرایہ دار سے کہا۔ "ایک ہفتے کے اندر اندر بالکونی صاف ہونی چاہیے ورنہ سارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔"

کرایہ دار جو پہلے کافی دنوں سے سامان اٹھوانے کے لیے آدمی ڈھونڈ رہا تھا نہایت عاجزی سے گویا ہوا۔

"ایک ہفتہ گزرنے کا انتظار چھوڑیں' براہ مہربانی یہ کام آج ہی کردیں۔"

افشاں شریف..... کراچی

درست طریقہ

دو دوست مچھلیوں کا شکار کر رہے تھے۔ دونوں پانی میں بنسیاں ڈالے بیٹھے۔ اتنے میں جھیل کا محافظ آگیا' اسے دیکھ کر ایک دوست اٹھ کر بھاگا۔ محافظ نے اس کا پیچھا کیا اور کافی دور جاکر اسے پکڑلیا اور ڈانٹ کر پوچھا۔ "تم لائسنس کے بغیر مچھلی کا شکار کیوں کھیل رہے تھے؟"

اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں لائسنس کے بغیر مچھلی کا شکار کھیلنے کی ہمت بھی نہیں کرسکتا۔"

محافظ نے کہا۔ "اپنا لائسنس دکھاؤ۔" اس نے لائسنس جیب سے نکال کر محافظ کے حوالے کردیا۔

محافظ پھٹی پھٹی آنکھوں سے لائسنس دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "جب تم لائسنس رکھتے تھے تو بھاگنے کی حماقت کیوں کی تھی؟"

"محض اس لیے کہ میرے دوست کے پاس لائسنس نہیں تھا۔" اس شخص نے کہا۔

محافظ نے پلٹ کر جھیل کے کنارے اس کے دوست پر نظر ڈالی' وہ وہاں سے رفو چکر ہوچکا تھا۔

غزل..... ملتان

وفادار

امریکی فوجیوں کے ایک کیمپ میں رنگروٹوں نے اپنے اپنے صندوق پر اپنی گرل فرینڈ کی تصویر جب کہ مائیکل نے اپنے صندوق پر موٹر سائیکل کی تصویر چسپاں کی ہوئی تھی جو اسے پسند تھی اور جسے وہ اپنے گھر چھوڑ آیا تھا۔

ایک روز سب رنگروٹوں نے اس بات پر اس کا بہت مذاق اڑایا تو مائیکل جل کر بولا۔ "گرل فرینڈ کے بجائے موٹر سائیکل کی تصویر لگانا لاکھ درجے بہتر ہے۔ میں جب واپس جاؤں گا تو موٹر سائیکل کم از کم گھر پر موجود تو ملے گی۔"

حنا فرحان..... کوٹ مٹھن

اندیشہ

ایک صاحب جھومتے ہوئے نائٹ کلب سے نکلنے لگے تو دربان اس کے لیے دروازہ کھولنے کی غرض سے لپکا' مگر کسی چیز میں الجھ کر گر پڑا۔

کلب کے منیجر نے باہر آکر اس کو ڈانٹا۔ "ذرا احتیاط سے چلا کرو' تمہارے اس طرح سے گرنے سے کوئی سمجھے گا کہ تم دربان نہیں' کلب کے ممبر ہو۔"

سیما کنول..... راولپنڈی



کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

بے بس انسان

لکیریں اور تقدیریں ساتھ ساتھ چلتی ہیں کبھی ایک حاوی ہوجاتی ہے تو کبھی دوسری۔ ایک غالب.... ایک مغلوب اور ان کے لیے تجربہ گاہ... بس ایک معصوم زندگی... اور انسان کتنا احمق ہے سمجھتا ہے تقدیر کو لکیروں میں لیے بیٹھا ہے جب چاہا بدل ڈالی' مگر ایک اندھا موڑ ایسا آتا ہے جب وہ جان جاتا ہے لکیریں اور تقدیریں کیسا عجیب کھیل کھیلتی ہیں۔ وہ جان جاتا ہے انسان تو کچھ بھی نہیں جو ہے وہ ازل سے مقسوم کردیا گیا ہے۔

(سندس جبین... لکیریں اور تقدیریں)
ثنا شہزاد... کراچی

یک طرفہ محبت

یک طرفہ محبت میں دو بڑے فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں ناکامی کا اندیشہ نہیں ہوتا دوسرا یہ کہ اس کا دورانیہ کسی دوسرے کی مرضی پر منحصر نہیں۔ آپ جتنی دیر اس میں مبتلا رہنا چاہیں' بلاکھٹکے رہ سکتے ہیں۔ دو طرفہ محبت میں عاشق مزاج لوگوں کو ایک خدشے بلکہ کھلے خطرے کا سامنا ہوتا ہے۔ ذرا غفلت برتیں تو نکاح کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی... شام شعر یاراں)
افشاں سمیع... کراچی

غافل انسان

ایک تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ انسان اس قدر غافل کیوں ہے اسے پتا ہے کہ جب وہ کچھ برا کرے گا تو وہ اس کے آگے ضرور آئے گا' اس لیے وہ ایسے کام چھوڑ دے' مگر نہیں انسان بار بار غلطی کرتا ہے۔ بار بار پچھتاتا ہے' مگر جیسے ہی حالات قابو میں آتے ہیں' وہ پھر غلطی پر کمربستہ ہوجاتا ہے۔ عجیب ڈھٹائی ہے۔ شاید اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ بے ایمانی انسانی سرشت میں شامل ہے وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب تک تھوڑی سی ہیرا پھیری نہ کرے' مزا نہیں آتا' مگر کچھ عرصے بعد اس مزے کے بدلے وہ زبردست مزا چکھتا ہے کہ عقل ٹھکانے آجاتی ہے اور شاید تھوڑی بہت شرمندگی بھی محسوس ہوتی ہے' پھر رفتہ رفتہ شیطان دلوں میں قدم جمانے لگتا ہے اور سوچ پھر شر کی طرف مائل ہونا شروع ہوجاتی ہے۔

(فوزیہ فرخ... تسبیح روز و شب)
رائمہ... آزاد کشمیر

مایوسی اور امید

جو دانشور' قوم کو مکمل مایوسی کی طرف دھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں قوم میں کوئی اچھی بات نظر نہیں آتی۔ وہ بلا ارادہ قوم کو موت کی دہلیز پر پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم میں بہت سی خرابیاں ہیں' ان خرابیوں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ہمیں پاکستانی قوم کی خوبیوں کو بھی اجاگر کرتے رہنا چاہیے۔ مایوسی اگر انسان کو موت کی طرف تو امید زندگی کی طرف لے جاسکتی ہے تو اس کلیے سے قومیں مستثنیٰ نہیں ہیں۔ تقدیر سے ہم لڑ نہیں سکتے' مگر مایوسی کا مقابلہ' امید سے کیا جاسکتا ہے۔ جب کوئی ایسا شخص لوگوں کو منفی کے بجائے مثبت سوچیں اپنانے کا مشورہ دے۔ جس کی زندگی مثبت نتائج کی حامل نظر آئی ہو تو اس پر غور ضرور کرنا چاہیے۔

(روزن دیوار... عطاء الحق قاسمی)
حمیرا کلیم... ملتان

دعا

میں قدرت اللہ شہاب کے ساتھ مسجد الحرام کے صحن میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک قدرت نے پوچھا۔ "یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"یہ کاپی ہے۔"

"یہ کیسی کاپی ہے؟"

"اس میں دعائیں لکھی ہیں۔ میرے کئی ایک

دوستوں نے کہا تھا کہ خانہ کعبہ میں ہمارے لیے دعا مانگنا' میں نے وہ سب دعائیں اس کاپی میں لکھ لی تھیں۔"

"دھیان کرنا!" وہ بولے۔ "یہاں جو دعا مانگی جائے وہ قبول ہو جاتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میری ہنسی نکل گئی۔ "کیا دعا قبول ہو جانے کا خطرہ ہے؟"

"ہاں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دعا قبول ہو جائے۔" میں نے حیرت سے قدرت کی طرف دیکھا۔

بولے۔ "اسلام آباد میں ایک ڈائریکٹر ہیں۔ عرصہ دراز ہوا انہیں بخار ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر' حکیم' وید' ہومیو' سب کا علاج کر دیکھا' کچھ افاقہ نہ ہوا سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ آخر چارپائی پر ڈال کے کسی درگاہ پر لے گئے۔ وہاں ایک مست سے کہا کہ بابا دعا کر کہ انہیں بخار نہ چڑھے۔۔۔ انہیں آج تک پھر کبھی بخار نہیں چڑھا۔ اب چند سال سے ان کی گردن کے پٹھے اکڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی گردن ادھر ادھر ہلا نہیں سکتے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ انہیں بخار چڑھے۔ انہیں دھڑا دھڑ بخار چڑھنے کی دوائیاں کھلائی جا رہی ہیں' مگر انہیں بخار نہیں چڑھتا۔"

دعاؤں کی کاپی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ میں نے اللہ کے گھر کی طرف دیکھا۔ "میرے اللہ کیا کسی نے تیرا بھید پایا ہے؟"

(ممتاز مفتی۔۔۔ لبیک)

کنول۔۔۔ لاہور

بولنا شرط ہے

شیطان سب سے اچھا فرشتہ تھا' مگر برا تب بنا جب وہ بول پڑا' اسی لیے پیدا ہونے والے بچے فرشتے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں بولنا نہیں آتا اور جوں ہی وہ فر فر بولنا شروع کرتے ہیں ماں باپ کہتے ہیں یہ شیطان ہو گیا۔

(ڈاکٹر یونس بٹ۔۔۔ شیطانیاں)

صبا نور۔۔۔ لیہ

عبادت

ساری عمر دہری عبادت کی جیون! قلب سے بھی اور ہاتھ سے بھی۔ اسی لیے تو کہتا ہوں عبادت کا حکم ہر وقت ہے۔ پانچ وقت تو حاضری لگانی ہوتی ہے باقی عبادت تو سارا دن چلتی ہے۔

جیون: لیکن چاچا ہمہ وقت کیسے ہو سکتا ہے اللہ کا ذکر۔۔۔؟

جب تو ہل چلاتا ہے' عبادت کرتا ہے' جب میں صراحی' گلدان' تھال میں گل بوٹے بناتا ہوں' عبادت ہی تو ہوتی ہے۔ ہاتھوں سے رزق حلال کھانے اور کھلانے والا اور کیا کرتا ہے جیون بیٹا! جب میری جہاں آرا کشیدہ کاری کرتی ہے۔۔۔ روٹی بناتی ہے وہ بھی تو عبادت ہی کرتی ہے۔

(اشفاق احمد۔۔۔ من چلے کا سودا)

درخشاں۔۔۔ حیدر آباد

کتبہ

"کیا قبروں پہ کتبے لگانے ضروری ہوتے ہیں؟ جن لوگوں کی پہچان تمہیں ان کی زندگی میں نہیں ہوتی تو مرنے کے بعد ان قبروں کو نشانیاں دینے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ ہم نے قبروں کو ڈھونڈ کے کون سی ایسی خوشی دینا ہوتی ہے جو ان کے ساری زندگی کے دکھوں کا مداوا کر سکے؟ تمہیں نہیں لگتا ہمیں کتبوں کو زندہ لوگوں پہ نصب کرنا چاہیے تاکہ ان کی پہچان ہم ان کے جیتے جی ہی کر سکیں' پھر شاید انہیں قبروں تک پہنچنے کی اتنی جلدی نہ ہو۔"

(مصباح مشتاق۔۔۔ پتھر کر دو آنکھ)

آمنہ شیخ۔۔۔ کوئٹہ

ظرف

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب ہم انسانوں کو اپنے ظرف سے زیادہ ملنے لگے تو ہم اس کو ہضم نہیں کرپاتے اور جب ہضم نہیں کرپاتے تو تباہ ہو جاتے ہیں۔

(عنیزہ سید۔۔۔ شب گزیدہ)

فائزہ۔۔۔ راولپنڈی

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ سنہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔



ذوالقرنین



سیدہ نرجس رباب گیلانی .... جھنگ

س ۔ "نین بھائی۔ چپکے سے ایک بات تو بتائیں کہ آپ شیطان کی طرح مشہور کیوں ہیں؟"

ج ۔ "ہم دونوں میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہم دونوں کے نام کا آخری حرف "ن" ہے۔"

سیدہ خالدہ ادیب وارثی .... جھڈو

س ۔ "اگر پہلی تاریخ روز آتی تو؟"

ج ۔ "بیویوں کے عیش ہو جاتے۔"

ناز شمس قاضی .... کراچی

س ۔ "مانا کہ تو ہے حیوان مگر
انسانوں سے اچھا لگتا ہے
بھلا کیوں؟"

ج ۔ "لگتا ہے حیوانوں سے آپ کو پیار ہے اور وہ بھی انسان نما۔"

نصرت .... مردان

س ۔ "یہ لڑکا ذرا سا دیوانہ لگتا ہے
گاڑی کا کوئی ماڈل پرانا لگتا ہے"

ج ۔ "مردان کی نصرت، ایسا کرو کہ فوراً شاعری شروع کر دو۔ کیا خوب شعر ہے۔"

نین تارا .... حیدر آباد

س ۔ "ہیلو بھئی۔ کیسے ہو؟ کہاں رہے؟ ہم تمہیں بڑا یاد کرتے تھے؟"

ج ۔ "بہت اچھا کرتے تھے۔"

راضیہ بخاری، ربیعہ بخاری .... ملتان

س ۔ "اگر آپ کرن رسالے کے ایڈیٹر بن جائیں تو آپ کے کیا تاثرات ہوں گے؟"

ج ۔ "ارے میرا کوئی دماغ خراب ہوا ہے۔ ایڈیٹر صاحب کو روز چیف ایڈیٹر صاحب سے دن میں دس بار جھاڑ پڑتی ہے۔"

آئی ڈی شاہ .... حیدر آباد

س ۔ "بجلی کے کرنٹ اور پیار کے کرنٹ میں کیا فرق ہے؟"

ج ۔ "پیار کا کرنٹ جان لیوا بھی ثابت ہو جاتا ہے۔"

صبا جمیل احمد .... کراچی

س ۔ "ویسے بائی داوے بالکل سوٹ نہیں کرتے ایسے بے رخی سے جواب دیتے ہوئے؟"

ج ۔ "نہ تو بائی داوے۔ پہلے کب کرتے تھے سوٹ۔"

مُدیرہ کرن

نامے میرے نام

انوش ابصار... قائداعظم یونی ورسٹی

اس ماہ کا کرن افسانوں کی بھرمار سے جگمگا رہا تھا۔ کاش ایک افسانہ صدف آصف کا بھی ہوتا۔ رابعہ قانتہ اپنے مخصوص اسٹائل میں جلوہ گر ہوئیں۔ تمام افسانوں میں "کھوتی" بازی لے گیا۔ "ہم لوگ" "میں، تم اور بکرا" اور "میٹرک فیل" بھی پسند آیا۔ عابدہ احمد کا ناولٹ "کتنے پنے بکھرنے تھے" اس میں سندس لان ہیروئن اچھی لگی اور خاور اپنے نام جیسا جم کر نکلا۔ مکمل ناول کی بات ہو تو اب کیا کہوں مصباح علی سے ایک مؤدبانہ عرض ہے۔ "مجبور نشیمن" کا نام بدل کر "ہم نے کردی سانسیں ساکن" رکھ دیں۔ مجھے تو لگ رہا ہے قارئین کا وزن کم کرنے کے لیے مصباح جی یہ ناول لکھ رہی ہیں۔ میں بتائے دے رہی ہوں مصباح جی میں پہلے ہی سے پکی پتنگ ہوں۔ سلسلے وار ناول "راپنزل" کو تنزیلہ جی اب اینڈ کو الاسٹک بنا رہی ہیں۔ پلیز کونین کی شادی سمیع سے ضرور کروادیں۔ مستقل سلسلے مجھ سے زیادہ میری اماں نے پڑھے۔ میں "مقابل ہے آئینہ" میں صرف جوابات تحریر کروں۔

ج: پیاری انوش! آپ کو "کرن" میں افسانوں کی جگمگاہٹ اچھی لگی، شکریہ۔ جناب آپ لوگوں کا انتظار ختم اور نومبر میں "راپنزل" کی آخری قسط ہی شائع ہوگی۔ آپ بہنوں سے درخواست ہی کر سکتی ہوں کہ جو سلسلہ سوالات کے جوابات کا ہے، اس میں اپنے جوابات کے ساتھ سوالات بھی تحریر کردیا کریں، مہربانی ہوگی۔

صباحت... ایبٹ آباد

قاتل گیموں کا تو بہت شور مچا ہے۔ لیکن اب تو قاتل ناول بھی مارکیٹوں میں آگئے۔ "مجبور نشیمن" کسی بلو وہیل سے کم نہیں۔ پلیز مصباح جی! اروائیہ اور حنبل کو جدا مت کرنا، ورنہ ہم بھی خودکشی کرلیں گے۔ بس بہت ہوگیا، حنبل سے کہیں اب واپس آجائے۔ مصباح علی کی جملہ کاری بہت مضبوط ہوتی ہے۔ "من مورکھ کی بات نہ مانو" آسیہ مرزا آپ کے انداز کے ہم سب بہت ہی معترف ہیں بابر کے لیے یہ ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہدایت کے لیے ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے۔ اب حوریہ واپس آگئی ہے، دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ تنزیلہ جی نے کونین کو آخر راپنزل بنا ہی دیا، اس کا شادی کے لیے آفر کرنا ایسے ہی ہے جیسے راپنزل باہر نکل کر سانس لینے کے لیے اپنا روزن کھولنا چاہتی ہے۔

افسانے اس بار اتنے زیادہ اور سچ یہ ہے مزے کا ایک بھی نہیں لگا۔ ناولٹ تینوں اچھے تھے۔

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ راحت جبیں، فاخرہ جبیں سے بھی کچھ لکھوایا جائے۔ اب تو بہت یاد آنے لگے ان کے پیڑوں کے جھولے اور کزن کا ہنگامہ آہ...

ج: پیاری صباحت! آپ کے خط کے ذریعے راحت جبیں اور فاخرہ جبیں تک اب کی فرمائش پہنچائی جارہی ہے۔ ہمیں افسوس ہے آپ کو افسانوں میں سے کوئی پسند نہیں آیا۔ چلیں ناولٹ تو پسند آئے آپ کو۔

شازیہ امجد... وزیر آباد

اس ماہ کا کرن حسب معمول بہتر تھا۔ سرورق پر اوائے بے نیازی سے میرون لباس پہنے ماڈل واقعی پیاری لگی۔ سب سے پہلے چھلانگ لگائی۔ جی بالکل درست "مجبور نشیمن" کی طرف۔ پلیز ہاتھ ہولا مصباح جی! رب دا واسطہ حنبل نوں کچھ نا ہوئے سچی سانواں سوکھی ہوئی اے کہ حنبل تے اسی دل ہار گئے۔ بہترین ناول مبارکاں۔ دوسرا ناول "مجھے صرف وہ" قرۃ العین خرم کا بہت ہی پسند آیا۔ ویل ڈن۔ ناولٹ ویسے تو تینوں پڑھے مگر "تو کہ ہے اجنبی" فرح بھٹو نے کمال کردیا۔ واہ جی واہ، مزا آگیا۔ افسانے سارے تو نہیں پڑھ سکی، البتہ "تجھ پر قربان" اور "جذبہ ایثار" بہت زبردست لگے۔ قربانی کیسے کیسے منائی جاتی ہے یہ ہماری رائٹرز بہنیں بہت اچھا بتاتی ہیں۔ پتا نہیں ہم جن اپنی پیاری پیاری مصنفین کے نام اظہار خیال کرتے ہیں وہ خطوط پڑھنا گوارا کرتی ہیں یا نہیں مگر اس بات کی خوشی

لیے رسالے پڑھ کر ستا لیتے ہیں۔ آج کی بات نہیں برسوں بیت گئے "کرن" کو پڑھتے ہوئے۔ اس کی اشاعت طباعت پر تبصرہ کرنے کو اکثر دل چاہتا ہے مگر باجی کیا کریں ہمارے گاؤں تک رسالے آتے آتے اکثر ہی بیس تاریخ ہو جاتی ہے۔ اب اگر خط ڈالنے کو دل کرے تو بندہ کیا کر سکتا ہے۔ اس ماہ کا رسالہ بھی ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ خط پڑھ کر تو ہم بھی ان سے متفق ہیں۔ سب سے پہلے تو افسانے دیکھے 'توبہ توبہ باجی دس افسانے' میرا خیال ہے عید نمبر ہونے کی وجہ سے آپ نے بھی افسانوں کی عید سیل لگائی ہے۔ جو افسانہ سب سے اچھا اور الگ لگا وہ "عید من" ماورا طلحہ نے بہت خوب صورت انداز میں عید پر قربانی کا سبق دیا ہے۔ عید کا مقصد تو قربانی دینا ہے 'اپنی اچھی چیز کی اور گڈی کے ابے نے جو قربانی دی قابل تعریف ہے 'شاباش۔ فوزیہ سرور کا "میں اور بکرا 'تم" بہت ہی نیا آئیڈیا ہیرو 'ہیروئن کے ملنے کا۔ سلسلے وار میں "راپنزل" جس کے ختم ہونے کا انتظار شدت پکڑ گیا ہے۔ اتنی اچھی کونین سمیع کو پتا نہیں کیوں پسند نہیں آ رہی۔ ایک پیاری جوڑی بن جائے گی (تنزیلہ باجی غور کریں مشورے پر اگر ایسا نہ ہوا تو دل ٹوٹ جائے گا 'خیال کریں)۔ "مجبور نشیمن" سب سے پہلے مصباح نے کہانی کا نام مشکل رکھا 'اب ہر مہینے انتظار کی سولی پر لٹکا دیتی ہیں۔ اس کہانی نے اس طرح لپیٹ میں لے رکھا ہے 'کل میں سوچتے سوچتے اچانک اپنے میاں کو کہنے لگی۔ کتنا بدبخت نکلا ازلان 'انسان کے روپ میں شیطان۔ میاں جی نے چونک کر پوچھا کون ازلان۔ میری تو ہنسی چھوٹ گئی۔ اب تو خواب میں بھی روائیبہ اور کونین نظر آ رہی ہیں۔ خدا کے لیے ان کے ساتھ برا مت کرنا۔ ناولٹ "تو کہ ہے اجنبی" فرح بھٹو نے علیان اور بیلی پر پرانی کہانی دہرائی۔ پہلے اجنبی 'پھر ٹکراؤ 'پھر بن گئے کزن وغیرہ وغیرہ۔ عندلیب زہرہ کا "ہم لوگ" پسند آیا۔ "کھوتی" بھی خوب لکھا۔

ج۔ ثمینہ جی! تمام مشکلات کے باوجود آپ نے خط لکھا اور اس محفل میں شریک ہوئیں 'ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں۔ کہانیوں کو پسند کرنے کا بہت شکریہ! آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا دی گئی ہے۔

ارم کمال۔۔۔ فیصل آباد

امید ہے کہ بفضل خدا خیریت سے ہوں گی۔ چونکہ عرصے بعد آپ کی محفل میں آئی ہوں 'تھوڑی جگہ ملے گی یا۔۔۔ "کرن" ہر ماہ بڑی محبتوں کے ساتھ باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ تبصرہ کبھی کبھار لکھتی ہوں۔ کہیں آپ مجھ سے بور نہ ہو جائیں۔ اس دفعہ کا ٹائٹل جاذب نظر تھا مگر ماڈل کچھ پریشان سی نظر آئیں۔ حمد اور نعت سے ایمان کے ستونوں کو مضبوطی بخشی۔ بقرہ عید اسپیشل نے خوب مزا دوبالا کر دیا۔ "میری بھی سنیے میں" حریم فاروقی سے مل کر خوب انجوائے کیا۔ "آواز کی دنیا سے" ثمینہ امان کی گفتگو اور شعروں نے سماں باندھ دیا۔ سب سے پہلے "من مورکھ کی بات نہ مانو" پڑھا۔ بابر نے بدل کر دل میں گھر کر لیا ہے۔ حوریہ اب تم بھی اسے معاف کر دو یار 'کیونکہ محبت در پر دستک دے تو اسے لوٹانا نہیں چاہیے۔ تنزیلہ ریاض "راپنزل" میں خوب چک پھیریاں دے رہی ہیں کونین کی زندگی میں بھی اب کوئی قوس و قزح کے بادل برسنے چاہئیں۔ "کتنے پتے بکھرے تھے" میں بہو کی مخالفت میں صاعقہ بیگم نے ساری حدیں ہی پار کر لیں اور گناہ کی مرتکب ہوئیں۔ "مجبور نشیمن" بہت ہی ٹاپ پر جا رہا ہے۔ بس حنبل کے دل میں کوئی بدگمانی نہ آئے۔ ازلان سے ایسی امید بالکل بھی نہیں تھی۔ مکمل ناول "مجھے صرف وہ" انسانی کیفیات کے تمام جذبات کی بہترین عکاسی کا ترجمان تھا۔ مختصر تحریروں میں "تجھ پہ قربان میری جان" "ہم لوگ" اور "میرا لونگ گواچا" خاصے کی تحریریں رہیں۔ تمام مستقل سلسلے مجھے جی جان سے زیادہ پسند ہیں۔ اچھا اب اجازت دیں 'زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔

ج۔ ارم جی! آپ نے تو غیریت والی بات کر دی ہم آپ کے سب قارئین کے خطوط کے منتظر رہتے ہیں کجا کہ آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ کے خط سے بور نہ ہو جائیں۔ ارے بھئی "نامے میرے نام" کی محفل تو آپ سب قارئین کے لیے ہی تو ہے آپ نہیں ہوں گی تو محفل کیسے سجے گی۔ بے رونق ہو جائے گی۔ آپ سب کے دم سے تو یہ محفل پر رونق ہے۔

ثنا شہزاد۔۔۔ کراچی

ستمبر کا شمارہ پندرہ ستمبر کی شام کو میرے ہاتھوں میں آیا۔ "کرن" کے آنے کی جو خوشی ہوتی ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ ماڈل پسند آئی۔ سب سے پہلے اداریہ "حمد و نعت" اور "نامے میرے نام" پڑھتی ہوں۔ "راپنزل"

کا اختتام جلدی سے کردیں پلیز۔ ہر ماہ انتظار بہت مشکل سے ہوتا ہے۔ "من مورکھ کی بات نہ مانو" اس میں حوریہ بے کار میں بابر کے ضبط کو آزما رہی ہے۔ وہ علی شاہ کو چھین کر مومنہ اور حازم والی کہانی نہ دہرائے۔ اس بار ماشاء اللہ اتنے سارے افسانے دیکھ کر دل گارڈن گارڈن ہوگیا' سارے ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے جو سب سے زیادہ پسند آیا وہ ندا حسنین کا "چور راستے" تھا' جس میں ہم خود چور کو گھر کا راستہ دکھاتے ہیں۔ بہرحال ہر افسانے میں ایک میسج دیا گیا ہے اور اچھا میسج دیا ہے۔ "مہجور نشیمن" پر تبصرہ محفوظ ہے۔ بس کہانی نے اپنے سحر میں جکڑا ہوا ہے۔ جب تک مکمل نہیں ہوجاتی ہمیں رہائی نہیں ملے گی۔ "روشن چہرہ" ابھی نہیں پڑا' اگلے ماہ ایک ساتھ پڑھوں گی۔ "تو کہ ہے اجنبی" فرح بھٹو کا بہت اچھا لگا' خاص طور پر اینڈ۔ "کتنے پنے بکھرنے تھے" بس سو سو تھا۔ "مجھے صرف وہ" بہت پسند آیا۔ سعد اگر پہلے ہی امن کو سب بتا دیتا تو دونوں میں غلط فہمیاں نہ بڑھتیں۔ بقرہ عید کے حوالے سے سروے میں بتائی گئیں سب کی ڈش ٹرائی کروں گی۔ "مقابل ہے آئینہ" میں فوزیہ ثمر بٹ کے جوابات پسند آئے' ان کا تبصرہ بھی شاندار ہوتا ہے۔

ج ۔ پیاری ثنا! آپ کی انتظار کی گھڑیاں ختم' ان شاء اللہ اگلے ماہ "راپنزل" کی آخری قسط ملاحظہ کیجیے۔ "کرن" کی پسندیدگی کا شکریہ۔

ارم شہزاد۔۔۔ لاہور

کسی بھی ادارے میں بھیجا جانے والا یہ میرا پہلا خط ہے۔ "کرن" 17 ستمبر کو ملا اور میں نے 20 ستمبر تک مکمل پڑھ لیا۔ سب سے پہلے تو حوریہ کو سرسری دیکھا تو "نامے میرے نام" میں ثنا شہزاد کا خط پڑھا۔ جو بہت دل سے ہر سلسلے پر تبصرہ کرتی ہے۔ اس کے بعد ارادہ تو تھا ندا حسنین کا افسانہ پڑھوں پر ہاتھ ماورا طلحہ کے "عید من" پر رکے۔ "عید من" میں رائٹر نے پیغام تو بہت اچھا دیا تھا' پر ایک چیز جس سے میں متفق نہیں کہ بچوں کی خوشیاں پوری کرنے میں کوئی کسر آڑے آئے۔ بچپن کی محرومیاں انسان کو ناشکرا بنا دیتی ہیں۔ اس لیے ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اپنے وسائل کے لحاظ سے ضرور پوری کرنی چاہئیں۔ ندا حسنین اس بار بھی چھا گئیں "کرن" میں۔ لڑکیوں کے لیے بہت نصیحت۔ اس بار افسانوں کی بھرمار تھی اور سب کے سب عمدہ۔ "میرا لونگ گواچا" پسند نہیں آیا' کیونکہ میں پھوپھو کے خلاف نہیں سن سکتی۔ میں خود ایک پھپھو ہوں اور میری چار پھوپھیاں ہیں اور بہت اچھی ہیں۔ "مہجور نشیمن" مکمل ہونے پر پڑھوں گی۔ قرۃ العین' خرم ہاشمی کا تو نام ہی کافی ہے' بہت عمدہ لکھا۔ "راپنزل" میں پڑھتی نہیں۔ مجھے پسند ہی نہیں آیا۔

ج ۔ ارم جی! آپ پہلی دفعہ "نامے میرے نام" کی محفل میں شریک ہوئیں' بے حد شکریہ۔ کہانیوں کے بارے میں ہمارے قارئین کی مختلف رائے ہوتی ہے' جن کا ہم احترام کرتے ہیں لیکن آپ نے صرف پھپھو کی برائی کی وجہ سے ناپسند کیا ہے تو اس سے ہمیں اختلاف ہے۔ کہانیوں میں مختلف رشتوں کے مختلف رنگ پیش کیے جاتے ہیں' یہ ایک کردار تھا۔ اس میں پھپھو کے رشتے کو برا نہیں کہا گیا۔ یہ کردار چچی کا بھی ہوسکتا تھا۔ مامی یا خالہ کا بھی ہوسکتا ہے' ایک مزاحیہ کہانی تھی۔ جس میں نادیہ احمد نے ہر کردار بڑی خوب صورتی سے پیش کیا۔

مہرین جاوید' تنزیلہ ارشد' حبیبہ شاہد' طوبیٰ منصور۔۔۔ ایف جی ڈگری کالج لاہور

ہم پچھلے کئی سالوں سے "کرن" ڈائجسٹ کی قاری ہیں۔ اب ہمارا دل چاہا کہ ہم بھی "کرن" کی محفل میں شرکت کریں۔ ہم ایف ایس سی پری میڈیکل کی اسٹوڈنٹس ہیں۔ ہم سب اپنی ٹف پڑھائی میں سے وقت نکال کر پڑھتی ہیں۔ سب سے پہلے ہم ٹائٹل پر تبصرہ کرنا پسند کریں گی۔ ٹائٹل بس سو سو لگا۔ پھر ہم نے "مہجور نشیمن" کی طرف دوڑ لگائی' ہمیشہ کی طرح اے ون قسط رہی۔ حنبل ذکا کو روائیبہ کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہیے تھا۔ "راپنزل" کی قسط بہترین رہی۔ نیناں ہمارا فیورٹ کریکٹر ہے۔ افسانے ہم سب فرینڈز نے پڑھے۔ سب سے مزے کا افسانہ جس کو ہم نے مزے لے لے کر پڑھا وہ افسانہ "میں' بکرا اور تم" تھا۔ یہ افسانہ ہم سب فرینڈ کو نہایت اچھا لگا۔ اس میں سب ہی کردار اچھے تھے۔ "کھوتی" بھی بہتر لگا۔ عندلیب زہرا نے بھی اچھا افسانہ پیش کیا۔ مجموعی طور پر سارا ڈائجسٹ بہترین رہا۔ بہترین ڈائجسٹ ہم تک پہنچانے کا شکریہ۔ ہم اپنے کالج کے گراؤنڈ میں بیٹھ کر آپ کو خط لکھ رہی ہیں۔ پریڈ کا وقت ہوا چلا ہے۔ اس لیے اب اجازت۔ ہم سب فرینڈز نے یہ خط پہلی بار لکھا ہے'

ہم سب کو اس کے شائع ہونا کا بے صبری سے انتظار رہے گا۔

ج ۔ آپ سب کو "کرن" میں خوش آمدید۔ ہمیں امید ہے کہ آپ سب آئندہ بھی اپنی رائے سے آگاہ کریں گی۔ "کرن" کی پسندیدگی کا بہت شکریہ۔

عابدہ، ساجدہ... گاؤں کھونجہ، ضلع اوکاڑہ

پہلی بار خط لکھنے لگی ہوں، پتا نہیں "کرن" تک پہنچے گا بھی یا نہیں "کرن" اور ہمارا ساتھ تقریباً گیارہ سال سے ہے اور پتا نہیں کب تک رہے گا، کیونکہ زندگی کا کچھ پتا نہیں ہے نا۔ "کرن" کا سرورق اچھا ہوتا ہے۔ "کرن" پڑھ کر اچھا لگتا ہے۔ جولائی کا شمارہ بہت اچھا تھا اور اگست میں "ملال" پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ سپنے ایسے بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ پلیز ایک درخواست ہے کہ اگر آپ تک ہمارا خط پہنچ جائے تو شائع ضرور کیجیے گا۔ مہربانی۔ "کرن" کے تمام صفحات بہت اچھے ہوتے ہیں۔ "موتی چنے" تو بہت اچھے ہوتے ہیں جو کہ ہم لازمی اور اہم پڑھنا سمجھتے ہیں۔ "کرن" سے بہت لگن ہے ہمیں، ہمارا "کرن" ہمیشہ ایسے ہمارے ساتھ رہے گا۔ (آمین)

ج ۔ عابدہ، ساجدہ جی! آپ لوگ یہ کیوں سمجھتی ہیں کہ آپ کا خط "نامے میرے نام" میں شائع نہیں ہوگا۔ امید ہے کہ اب ہمیں آئندہ ہر ماہ خط لکھ کر "کرن" کی کہانیوں کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کریں گی کیونکہ ہمیں اس خط میں آپ کی آراء کی شدت سے کمی محسوس ہو رہی ہے۔

اقرا ممتاز... سرگودھا

اس دفعہ "نامے میرے نام" میں اپنا نام دیکھ کر زیادہ خوشی ہوئی، کیونکہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس دفعہ میرا لیٹر آپ تک ٹائم پر پہنچے گا بھی کہ نہیں۔

بقرہ عید اسپیشل سے سب شیفوں کو پڑھا "ایک دو ریسپیز پر ٹک کا نشان لگایا۔ "میری بھی سنیے" میں حریم فاروق کو پڑھا۔ فوزیہ ثمریٹ کے جوابات بھی فوزیہ کی طرح زبردست تھے۔ مکمل ناول "مجبور نشیمن" مصباح علی سید کی یہ قسط کیا فنٹاسٹک تھی۔ ازلان سے ایسی امید نہیں تھی۔ مصباح جی ناول کو کس طرف لے کر جا رہی ہیں۔ (ہاتھ ہولا رکھیں) ازمیر کی سزا معصوم سی رواشیبہ سے کیوں لی جا رہی ہے۔ وہ تو بہت پیار کرنے والی لڑکی ہے۔ مصباح جی آپ اسٹوری کو ایسے موڑ پر ختم کرتی ہیں کہ پورا ماہ سوچتے ہی گزر جاتا ہے کہ آگے کیا ہوگا۔ کیوں ہم معصوم قارئین کو سولی پر لٹکائے رکھتی ہیں۔ ویل ڈن پلیز جب یہ اسٹوری ختم ہو جائے تو مصباح علی کو ضرور روبرو میں لائیے گا۔ "مجھے صرف وہ" قرۃ العین خرم ہاشمی کی اسٹوری یونیک سی تھی۔ تینوں کی موج مستیاں انجوائے کیں۔ اس اسٹوری میں الفاظ کا چناؤ بہت خوب صورتی سے کیا گیا تھا۔ صد شکر ہے امن نے بھی سعد کو معاف کیا۔ ناولٹ "روشن چہرہ" عنبرین ویل اچھی اسٹوری تھی۔ یہ جائیداد بھی نہ ہر کسی کو ایک دوسرے کے خلاف کر دیتی ہے۔ جب ساری کہانی پڑھی تو آئندہ اگلے ماہ دیکھ کر دل چاہا اپنا سر اس بورڈ پر دے ماروں۔ "تو کہ ہے اجنبی" فرح بھٹو کی تحریر کمال کی تھی۔ عروہ نے کیا لینس لگائے۔ عروہ کے لینس نے تو اس کی زندگی ہی بنا دی۔ ان تینوں بہنوں میں کیا مثالی پیار تھا۔ منصب علی شکر ہے علیان ہی نکلا۔ علیان کو اس کی محبت مل گئی۔ میٹرک فیل منعم ملک افسانہ بھی زبردست تھا۔ دادی کے سوراخ نے تو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ ہلکی پھلکی تحریر بازی لے گئی۔ اس دفعہ سارا "کرن" سپرہٹ تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ اس دفعہ سارا "کرن" کہیں بہن، بھائی اور کہیں بہنوں کا پیار پڑھنے کو ملا۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ زندگی نے وفا کی تو پھر ملیں گے۔

ج ۔ اقرا جی! ان شاء اللہ ضرور ملیں گے اور ہر ماہ ملیں گے۔ کہانیوں کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ، آپ لوگوں کی رائے تو ہمارا حوصلہ بڑھاتی ہیں اور ہم "کرن" بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

سدرہ بتول... ملتان

اس ماہ "کرن" کا سرورق بہت اچھا تھا اور افسانوں کی بھرمار تھی۔ کرن کتاب میں انٹرویو کی جگہ ٹوٹکے شائع کیے جائیں تو زیادہ اچھا ہے کیونکہ انٹرویو تو ہر جگہ دیکھ لیتے ہیں، ٹی وی، اخبار، میگزین، رسالے۔ "راپنزل" کی آخری قسط آئندہ ماہ دو دفعہ پڑھا اور اب دوبارہ سے۔ باقی آئندہ ماہ۔ یہ کیا ہے بھئی، جلدی سے ختم کریں، بس سمیع کی بیوی کو اوپر بھیج کر نیناں کو اس کی جگہ دیں۔ "من مورکھ کی بات" میں مجھے شدت سے بابر اور حوریہ کی شادی کا انتظار ہے۔ ویسے کہانیوں میں میری ہمدردیاں دلہن کے ساتھ ہی ہوتی ہیں، ہاہاہا "کچھ موتی چنے" میرا فیورٹ سلسلہ ہے۔